

دین

اکتوبر 2015

PDFBOOKSFREE.PK



# کارآمد گھریلو ٹوٹکے

صفحہ نمبر 287 سے کارآمد گھریلو ٹوٹکے ملاحظہ فرمائیں

اب کرن ڈائجسٹ برائے ماہ اکتوبر اور کرن کتاب کارآمد گھریلو ٹوٹکے برائے ماہ اکتوبر یکجا

**PDFBOOKSFREE.PK**



چاندنگ روپڊ آف پبليڪيشنز

دڪان

رکن آل پاڪستان نيوز پيپر سوسائٽي  
رکن ڪونسل آف پاڪستان نيوز پيپر رائيٽرز  
MEMBER  
APNS  
CPNE

باني ————— محمود بابر فيصل  
يڪران ————— محمود رياض  
مديره ————— نادره خاتون  
مدير اعلیٰ ————— عامر محمود  
نائب مديره ————— شعاع عمير  
مديره خصوصي ————— اصت الصبور  
اشتہارات ————— خالدہ جيلاني





حمد 11 اثر فاضل جے پوری  
نعت 11 ماسر القادری

### بیرونی و فیصل

12 کون دیس سدھار گئے راجیل بلوچ

### انٹرویو

14 دیار غیر کی عید الاضحیٰ شاہین رشید  
20 زینب جمیل شاہین رشید  
25 میری بھی سنیے محمد بلال قریشی  
29 مقابل ہے آئینہ سیدہ نسبت زہرا

### ناول

32 راپن سنزل تنزیلہ ریاض  
236 ردائے وفا فرحین اطفر

خاک و کتابت  
کرنی

37- اہ و بالہ کراچی

### زمرہ سالانہ بک کیلئے رجسٹری

پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے  
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 6000 روپے  
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

### سلسل ناول

176 میں گمان نہیں نہیں بلہ برراجہ  
96 تمہارا اسیر شہناز صدیق

### ناولٹ

70 شاید فائرہ افتخار  
198 محبت ہم سفر میری شباہ شوکت  
152 جیت صدف آصف

### افسانے

56 اب کے برس عید صدف یحسان  
222 میں ہوں نا دیا شیرازی  
148 قریبانی نظیر قاطمہ  
229 تعاون امت العزیز  
265 خلش سیامت عامم  
259 بازی الٹ گئی آسیہ مظہر جعفری  
167 من کے عید متائیں عابدہ احمد

ماہنامہ خواتین، دانش اور ادب خواتین و دانش کے تحت شائع ہونے والے پہلے ماہنامہ شاعر اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق لوہا محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی دی مجسمیل پہ ڈرنا ڈرامائی تحلیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ جب صورت دیگر لوہا قانونی یا معمولی کا حق رکھتا ہے۔





282	روہینہ شریف	271	شعاع عمیر	کرن کرن خوشبو،
284	ذوالقسنین	274	بشری محمود	یادوں کے دیکھ سے
285	مدیرہ کرن	276	شگفتہ سلیمان	مجھے شیعہ پسند ہے
		269	ادارہ	موتی پختے ہیں
		278	خالہ جیلانی	کرن کار سترخوان
		280	ادارہ	حسن و صحت

اکتوبر 2015

جلد 38 شمارہ 7

قیمت 60 روپے

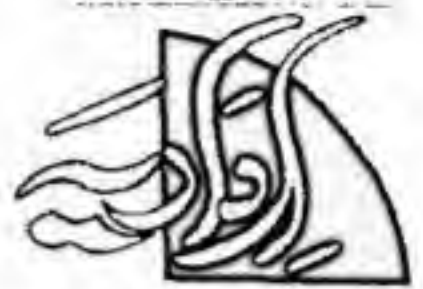
خط و کتابت کا پتہ: مہینہ گزشتہ 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، تار محمد ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com





مٹا کا اکتوبر کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔  
عسید قربان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وطن عزیز میں بخیریت گزری۔ سنت ابراہیمی کی پیروی کرتے ہوئے۔  
رسد کریم کی رضا و خوشنودی کی خاطر اپنی استطاعت کے مطابق قربانی کی گئی اور تمام عالم اسلام میں وحدت و  
یگانگت کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔  
حج اجتماعی طہارت ہے۔ تمام عالم اسلام سے لوگ مکہ معظمہ میں حاضر ہو کر حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔  
اس بار اس بابرکت موقع پر سانحہ صفا و مروہ اور سانحہ منی پیش آیا جس میں سینکڑوں حجاج کرام — مناسک حج  
کی ادائیگی کے دوران شہید ہو گئے۔ ہم ان تمام شہداء کے لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ  
سے دعا کرتے ہیں کہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور ان تمام شہداء کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ (آمین)

### محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

محمود بابر فیصل کو دنیا سے رحلت ہوئے دس عشروں سے زیادہ گزر گئے لیکن ان کی یاد دل کے نقوش آج بھی اسی طرح  
تازہ ہیں۔  
محمود بابر فیصل نے ناول بھی لکھا اور افسانے بھی لیکن ذوالقرنین کے روپ میں ان کی شخصیت کا ایک عظیم  
ہی رنگ تھا۔ ان کے شوخ، برجستہ جملے پڑھنے والوں کے لبوں پر مسکرائیں بکھر دیتے تھے۔ وہ جو سب کو ہنساتے تھے  
25 اکتوبر 1993ء کو دنیا سے رحلت ہو کر سب کی آنکھوں کو اشک بار کر گئے۔  
ان کی برسی کے موقع پر بہنوں سے دہلے مغزرت کی درخواست ہے۔

### اس شہرے میں،

• بیاد محمود بابر فیصل،  
• عید الاضحیٰ پر پردیس میں رہنے والوں کے احساسات کے حوالے سے شاہین رشید کا خصوصی سروے،  
• ادا کا رازہ زینب جمیل سے شاہین رشید کی ملاقات،  
• ادا کا رازہ بلال قریشی کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،  
• "اس ماہ میں" سیدہ نسبت زہرا کے مقابل ہے آئینہ،  
• "راہِ نازل" منزلیہ ریاض کا سلسلے وار ناول،  
• "ردائے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول،  
• "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ امیر راجہ کا مکمل ناول اختتام کی طرف،  
• "تہوارِ اسیر" شہناز صدیق کا مکمل ناول،  
• "شاید" فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ،  
• "محبت ہم سفر میری" شبانہ شوکت کا ناولٹ،  
• "محبت" صدف آصف کا ناولٹ،  
• "صدف" ریحان کیلانی، سیما بنت عاصم، نظیر فاطمہ، امت العزیز شہزاد، دیا شیرازی، عابدہ احمد اور  
آسیہ مظہر جوہری کے افسانے اور مستقل سلسلے،

### ہفت

کرن کتاب "کار آمد گھر بلوٹو ٹکے" ہر شہرے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

[[ کرن 10 | اکتوبر 2015 ]]





رسول مجتبیٰ کیسے، محمد مصطفیٰ کیسے  
 خدا کے بعد بس وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کیسے  
 جبین و رخ محمد کے تجلی ہی تجلی ہیں  
 کسے شمس الضحیٰ کیسے، کسے بدرالدجی کیسے  
 جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش بن جلتے  
 جب ان کا نام آئے مرجہا صل علیٰ کیسے  
 مرے سرکار کے نقش قدم شمع ہدایت ہیں  
 یہ وہ منزل ہے جس کو مغفرت کا راستہ کیسے  
 محمد کی نبوت دائرہ ہے جلوہ حق کا  
 اسی کو ابتدا کیسے، اسی کو انتہا کیسے  
 مدینہ یاد آتا ہے تو پھر آنسو نہیں رکتے  
 مری آنکھوں کو ماہر چشمہ آب بقا کیسے  
 ماہر القادری



تری حمد خالقِ دو جہاں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں  
 ہیں ہزاروں جلوے ترے عیاں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں  
 کہیں برگ گل میں عیاں ہے تو، کہیں بوئے گل میں نہاں ہے تو  
 تو کبھی عیاں تو کبھی نہاں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں  
 یہ زمین پہ لالہ و فستق، یہ فلک پہ نور کی انجمن  
 ترے حسن کی یہ نشانیاں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں  
 یہ جہاں جن و بشر ترا، یہ نظامِ شمس و قمر ترا  
 ترا حکم چاروں طرف رواں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں  
 کہیں بلبلوں کے ہیں چہچہے، کہیں قمریوں کے ہیں رزمے  
 سہمی ذاتِ پاک کے ہیں مدح خواں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں  
 تو ہی بے کسوں کی امید ہے، تو ہی بے نواؤں کی عید ہے  
 ترا لطف و جود ہے بکراں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں  
 اثرِ فاضل جے پوری



# گوں دیں سدھار کے

راحیلہ بلوچ

25 اکتوبر کا دن، ایک چاند کے بدلیوں میں چھپ جانے کا دن، ایک پھول کے مرجھا جانے کا دن۔ کیا کیا سانحہ نہیں توڑا اس دن نے۔ بیٹا روٹھا، بھائی پھڑا، باپ چھوٹا، دوستوں کا دوست گیا۔

مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے، جس سے بابر بھائی کی ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کر سکوں۔ یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم بابر بھائی کو خود سے جدا دیکھیں۔

یہ دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں، جب ایک بار انسان کے اندر گھر بنالیں۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں نکال نہیں سکتی۔ لاکھ اس دکھ کا ازالہ کریں، آنسو بہا کر، قلم کا سہارا لے کر لیکن ان کا وجود، ان کا نشان اندر کہیں نہ کہیں رہ ضرور جاتا ہے۔

اب بھی لگتا ہے جیسے وہ کہیں سے آجائیں گے، ہنستے مسکراتے، سگریٹ کے کش لگاتے، اپنی کرسی سنبھال لیں گے، اپنا پرچا سنبھال لیں گے، نئی لکھنے والیوں کو خط کا جواب لکھیں گے۔

”بی بی! ”کرن“ آپ بہنوں کا ہی پرچا ہے، اسے سنواریے، نکھاریے۔“

آپ کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے بابر بھائی کہ ”نیلے، پہلا“ کے پرانے سلسلے نہیں پڑھے جاتے، آپ نے ہمیشہ آگے اور آگے بڑھنے کا درس دیا ہے۔ اب ہم یہ ماضی کے سلسلے کیسے پڑھیں۔

بابر بھائی سے پہچان اس وقت ہوئی تھی جب ہم نے ”کرن“ پڑھنا شروع کیا۔ ان ہی دنوں لکھنے کا شوق چرایا اور پھر ہم نے بابر بھائی کو ایک طویل خط لکھا۔ پورے ایک مہینے بعد تک خط کا جواب نہ پا کر افسوس سا ہوا لیکن جب خط کا جواب ملا تو خوشی سے پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ بابر بھائی نے لکھا تھا۔

”راحیلہ بی بی! ”کرن“ آپ بہنوں کا پرچا ہے، اسے سنواریے، نکھاریے، کھلی اجازت ہے۔ تمہارے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اچھا لکھتی ہو، تو لکھو، خوب لکھو، اب جلدی سے ایک افسانہ بھیج دو۔ انتظار رہے گا۔“

یہ خط مجھے ان کی وفات سے ڈیڑھ ماہ پہلے ملا، کیا مستحکم تھا، میرے لیے یہ ان کی پہلی اور آخری تحریر ثابت ہوئی۔

بہت چاہتے ہوئے بھی میں افسانہ جلد نہیں لکھ سکی۔ یہی سوچا کہ بہترین افسانہ لکھ کر بابر بھائی کو بھیجوں گی مگر جو اندازہ انہوں نے میری تحریر سے لگایا ہے، وہ مجروح نہ ہو۔ لیکن میں اچھا لکھنے کے بارے میں سوچتی رہی اور بابر بھائی، ہم سب کو چھوڑ کر چل دیے یوں اچانک خاموشی سے۔

سب انتظار میں رہے اور وہ ایک شخص محفل سے خاموشی سے اٹھ کر چل دیا۔ ساری محفل اب بھی اداس ہے، منتظر ہے کہ ابھی کہیں سے ہنستا مسکراتا چہرہ نظر آئے گا اور سب کو اسی طرح شادمان کر دے گا۔

پھر میں افسانہ ”کرن“ کو روانہ نہ کر سکی۔ جس شخص نے محبت، شفقت اور اپنائیت سے لکھنے کو کہا، جب وہ نہیں رہا تو پھر میں اپنے دل کو افسانہ لکھنے کے لیے کس کے لیے تیار کرتی۔

پھر دل چاہا بابر بھائی کی برسی پر ان کی محبت، شفقت پر کچھ الفاظ صفحہ قرطاس پر بکھیروں مگر ہمت ہی نہیں ہوئی جب بھی لکھنے کو قلم تھامتا ہوں آنکھوں میں آنسو، اور گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹک جاتا جو مسلسل اذیت دیتا، دکھ دیتا اور میں قلم رکھ دیتی۔

اب بہت ہمت سے قلم تھامتا ہوں، ان کی ہر برسی پر یوں ہی لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو، وہ ایک شخص جسے



## بیادِ محمودِ بابر فیصل



میں نے رو برو دیکھا بھی نہیں، صرف ایک قاری کی حیثیت سے ان کی تحریروں کی مداح رہی، ان کے بارے میں پڑھتی رہی اور صرف ایک خط وہ مجھے لکھ سکے اور اتنی سی پر خلوص رفاقت میں بھول نہیں پا رہی، تو وہ لوگ بابر بھائی کو کیسے بھول پائیں گے، جن کے درمیان بابر بھائی رہے، ہنسے کھیلے، لمحہ لمحہ ساتھ رہے، جس گود میں انہوں نے بچپن گزارا، جس آنگن میں وہ کھیلے، بہنوں اور بھائیوں کا پیارا بھائی، باپ کا سہارا والا خرا، دیبا میں نہ رہا۔

اچھے اور مخلص نوکرا کو کون بھول پاتا ہے اور پھر بابر بھائی جیسی شخصیت، جن کی شخصیت کی تابانی اور تنوع ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ خدا ایسے پیارے شخص کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے عزیز و اقارب کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

بابر بھائی یاد آئیں گے، ہریل، ہر لمحے، جب وہ بکرن ہاتھ میں آئے گا، ان جیسا کسی کا نام سننے کوئے کا تو چونکیں گے۔ ان جیسی شکل نظر آئے گی تو ٹھنکیں گے۔ ان کے لفظوں جیسا کوئی لفظ بڑھنے کو ملا تو دل دھڑکے گا، چاہے وقت کی لہروں پر زندگی کے کتنے دن بیت جائیں، کتنی دور چلتی ہوئی دیران اور سنسان دوپہریں آکر ڈھل جائیں اور کتنی ہی شامیں اپنی فنا گاہوں میں ڈوب جائیں، جریوں چپ چاپ چلے جاتے ہیں، وہ کبھی بھلائے نہیں بھولے، امن و فافور دوستی کا پیغام دینے والا شخص کبھی بھول سیر پائے گا۔ بابر بھائی! آپ تو ہمارے افسانوں کے منظر رہے تھے اور کہتے تھے۔

”دیکھو! افسانے کا اینڈ خوشگوار ہونا چاہیے۔“

اب آپ خود افسانہ بن گئے ہیں اور ہمیں روتا چھوڑ گئے۔ آپ تو بڑے انصاف پسند تھے، پھر یہ بے انصافی کیوں؟ اس قدر جلد رخت سفر تو نہ باندھا ہوتا۔

ایسا اچانک اور بے ارادہ سفر نہ کوئی بھی نہیں کرتا۔ انشاء جی نے جو نوحہ اپنے دست کی جدائی میں لکھا تھا، جب پہلی بار پڑھا تھا تو میں رست راہی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یہ جدائی کے الفاظ پیارے اور راج دلارے بھائی کے لیے بھی لکھنے پڑیں گے کہ آج پڑھتے ہوئے بھی دور ہے ہیں اور لکھتے ہوئے بھی۔

نرا آپ کے نام خط لکھتے ہوئے خوشی ہوئی تھی۔ آج آپ کی جدائی پر یہ تحریر رلا رہی ہے۔ آنکھوں میں برسات ہے اور ہاتھ بھی لرزاں ہیں۔ آپ کی جدائی نے سب کو نڈھال کر دیا ہے بابر بھائی۔

خدا ہمیں اور آپ کے تمام عزیز و اقارب کو صبر دے اور آپ کو میرے پیارے بھائی کو خدا جنت کے بلند درجات پر پہنچا دے۔ (آمین اللہ اعلم)



### سردرق کی شخصیت

ماڈل ..... صائمہ  
میک اپ ..... روز بیوٹی پارلر  
فونو گرام ..... موسیٰ رضا



ہم چاہے ساری دنیا گھوم لیں۔ باہر کی خوب صورتی اور لاء اینڈ آرڈر سے کتنا ہی متاثر کیوں نہ ہو جائیں۔ باہر کی فضا کتنی ہی پرسکون کیوں نہ ہو کوئی ٹینشن بھی نہ ہو اور نہ ہی کسی قسم کی چوری چکاری ڈاکہ زنی اور اسٹریٹ کرائم ہوں۔ مگر پھر بھی ”ماں کی گود“ کی طرح اپنے وطن کے لیے دل مچلتا رہتا ہے اور جس طرح ”ماں کی گود“ میں سر رکھ کر سکون اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اس طرح اپنے ملک میں آکر بھی سکون اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

ہمارے بہت سے بہن بھائی اور بچے ملک سے باہر زندگی گزار رہے ہیں کوئی جاب کے لیے گیا۔ کسی نے بزنس سیٹ کر لیا اور کسی کی شادی ہو گئی اور اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ لیکن جب پاکستان میں کوئی تہوار ہو یا اپنوں میں کوئی دکھ سکھ ہو تو پاکستان کے لیے اور اپنوں کے لیے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ عید الاضحیٰ کا موقع ہے وطن سے دور رہنے والے کس طرح عید مناتے ہیں۔ آئیے ذرا معلوم تو کریں۔

سوال کچھ یوں ہیں کہ۔

- (1) کتنے سال سے ملک سے باہر ہیں؟ آخری بار کب پاکستان میں عید منائی تھی۔
- 2 پاکستان میں قربانی گھر کے باہر اور دوسرے ملک میں Slaughter House سلاٹھ ہاؤس میں ہوتی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا بہتر ہے اور کیوں؟

## دیار غیر کی عید الاضحیٰ

شاہین رشید

سے میں لندن میں ہوں لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ بقرا عید میں پاکستان میں ہی کروں کیونکہ اپنے ملک میں بقرا عید کرنے کا جو مزا ہے وہ اور کہیں نہیں ہے۔

2 سوائے پاکستان کے پوری دنیا میں حتیٰ کہ مسلم ممالک میں بھی گھر قربانی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لندن میں ایک صاحب نے اپنے گھر کے باہر قربانی کا جانور ذبح کیا تو اسے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ تو میں حیران ہوتی ہوں کہ پاکستان میں اس کی اجازت کیوں ہے۔ خیر جب ملک سے باہر عید کرتی ہوں تو پھر بھی ہوتا ہے کہ اپنے ارد گرد جو فیملیز ہوتی ہیں ان کے ساتھ مل کر گھر میں ہی پکوان پکا کر عید کا مزا لے لیتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو عید کا مزا اپنے ملک میں اور اپنوں کے ساتھ ہی ہے۔



رضوانہ پرنس :- فری لانس رائٹر، قیام لندن (برطانیہ)

1 بے شک میرا قیام لندن میں ہے اور کافی سالوں





ڈاکٹر ثاقب صادق :- (لوٹیکنکل  
ایڈوائزر مکینکل - قیام ہو سن ٹیکساس  
امریکہ)

ہو تو گوشت کی دوکان والے بگنگ کر لیتے ہیں اور ہم بعد  
میں جا کر گوشت گھر لے آتے ہیں۔ یہاں قربانی کے  
موقع پر یہ بات اچھی لگتی ہے کہ چاہے کتنے بھی جانور  
ذبح کیے گئے ہوں، باہر کوئی گندگی نظر نہیں آتی۔ یہی  
کچھ پاکستان میں بھی ہونا چاہیے۔ قربانی کے بعد گندگی  
کے جو ڈھیر سڑکوں پہ نظر آتے ہیں اور جو تعفن اٹھتا ہے  
اسے دیکھ کر بھلا کون ہمیں مذہب کے گاہاں اگر ہم  
گورنمنٹ کو مورد الزام ٹھراتے ہیں وہیں شہری بھی  
اتنے ہی ذمہ دار ہیں۔ ہم بھی تو صفائی ستھرائی اپنے طور  
پر کر سکتے ہیں جہاں ہم جانور کی خریداری اور عید کی  
تیاریوں میں اتنا پیسہ لگا دیتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ ہم  
صفائی کے لیے بھی پہلے سے ہی انتظام کر لیں۔ دنیا بدل  
گئی ہے ہمیں بھی بدل جانا چاہیے۔

فاخرہ گل :- (رائٹر + شاعرہ - قیام اٹلی)

1 میں تقریباً 12 سال سے اٹلی میں ہوں اور یہ یاد  
نہیں کہ آخری بار کب پاکستان میں عید الاضحیٰ منائی  
تھی البتہ 2015ء کی عید الفطر پاکستان میں ہی کی  
تھی۔

2 مجھے تو عید الاضحیٰ کے لیے پاکستان کا سٹم اس  
لیے پسند ہے کہ کم سے کم مہینہ نہیں تو ہفتہ پہلے تو  
قربانی کے جانور گھرا کر ان کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔  
ناز خرے اٹھائے جاتے ہیں۔ اور مجھے یاد ہے کہ ہم  
قربانی کے جانور سے اس حد تک مانوس ہو جاتے تھے کہ  
جانور کو قربانی کے لیے بھیجتے ہوئے دل بو جھل ہو رہا ہوتا  
تھا۔ تب امی ابو سمجھاتے تھے کہ قربانی کا تو اصل مقصد  
یہی ہے کہ اپنی پیاری چیز کو اللہ کی راہ میں قربان کیا  
جائے۔ بیرون ملک تو نہ جانور کو گھرا کر رکھا جاسکتا  
ہے۔ اور نہ ہی بچوں کو قربانی کی اصل روح سمجھائی جا  
سکتی ہے۔ سارا نیاؤس میں صفائی ستھرائی کے لحاظ سے تو  
بہتر ہوتا ہے۔ مگر میرے لحاظ سے تو بہترین طریقہ  
پاکستان والا ہی ہے۔ جب بچوں کے سامنے گوشت  
کے تین حصے کر کے انہیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارے مال

1 ماشاء اللہ سے تقریباً 14، 15 سال سے ملک  
سے باہر ہیں اور آخری بار ہم لوگوں نے 2001ء میں  
عید الفطر منائی تھی۔ اس عید کا مزایا کچھ اور تھا سب  
لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز سے پہلے سویاں کھانا، محلے  
کے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنا، نماز کے بعد مسجد کے  
باہر سب کا آپس میں عید ملنا، سب کچھ اچھا لگتا ہے۔  
مگر ظاہر ہے کہ جہاں ”رزق“ ہوتا ہے وہیں جانا ہوتا  
ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بہت سے لوگوں  
سے اچھا رکھا ہوا ہے۔ مگر پھر بھی اپنوں کے ساتھ عید  
کرنے کا بہت دل چاہتا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے  
کہ ہر بار چھٹی مل جائے۔ ہم ارادہ تو کرتے ہیں مگر ہر  
دفعہ کچھ نہ کچھ مسئلہ ضرور ہو جاتا ہے۔

2 عید الفطر یا بقرا عید اگر ویک اینڈ پہ آئے تو پورا  
دن عید کی مصروفیات میں گزرتا ہے لیکن اگر عید ویک  
ڈیز میں آئے تو نماز کے بعد آفس چلے جاتے ہیں،  
پاکستان میں بقرا عید کی تیاری بکروں کی خریداری سے  
ہی ہوتی ہے اور تب تک چلتی ہے جب تک جانور  
حلال نہ ہو جائیں سب سے بڑا مسئلہ قصائی ڈھونڈنے  
کا ہوتا ہے جو کہ یہاں نہیں ہوتا، یہاں اگر قربانی کرنی



میں رشتے داروں اور غریبوں کا بھی حق مقرر کیا گیا ہے۔  
اور بچپن میں سیکھی گئی باتیں ہمیشہ ذہن میں محفوظ رہتی  
ہیں۔



راحیلہ فردوس :- (بانی بزم مصطفیٰ  
امریکہ - قیام نیو جرسی امریکہ)

1 میں گزشتہ 15 سال سے یو ایس اے میں ہوں  
اور عید الفطر تو ہر سال پاکستان میں مناتی ہوں۔ البتہ  
عید الاضحیٰ منائے ہوئے کافی سال ہو گئے ہیں۔ اس  
لیے اپنے حصے کی قربانی پاکستان میں کرواتی ہوں۔  
کیونکہ وہاں اپنے رشتے دار بھی ہیں اور غریب غریبا بھی  
تو جو حصے خدا نے مقرر کیے ہیں رشتے داروں غریبوں  
اور اپنے لیے اس کی تقسیم منصفانہ انداز میں ہو جاتی  
ہے۔

2 یہاں بھی لوگ قربانی کرتے ہیں، لیکن پاکستان  
میں تو آپ جانور گھیر لاتے ہیں اس کی خدمت خاطر  
کرتے ہیں۔ تو قربانی کا جو تصور ہے وہ پورا ہو جاتا ہے  
یہاں تو ”میٹ شاپ“ پر رقم دے دی جاتی ہے اور عید  
کے دن گوشت لے آتے ہیں مگر بانٹیں کیسے؟۔  
پاکستان میں قربانی کرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ اب کچھ  
سالوں میں جب بقر عید گرمیوں میں آئے گی تو چھٹیاں  
ہوں گی تب میں پاکستان آکر بقر عید کروں گی ان شاء  
اللہ اور آخر میں میری طرف سے سب پڑھنے والوں کو  
دلی عید مبارک کہہ دیں۔

## نبیلہ ابرار راجہ :- (رائٹر)

1 میں اس سال جدہ شفٹ ہوئی ہوں۔ تو یہاں  
میری پہلی بقر عید ہوئی پاکستان میں گزاری گئی عیدیں  
اب میرے لیے یادگار عیدیں بن جائیں گی۔  
2 گھر کے باہر قربانی کرنے کا اپنا ہی مزا ہے۔ لیکن یہ  
صحیح ہے کہ ایسا کرنے سے گندگی بہت ہو جاتی ہے اور  
ہفتوں جانوروں کی لاشیں سڑکوں پہ پڑی رہ جاتی ہیں  
جبکہ سلاٹر ہاؤس میں قربانی کرنے سے گندگی سڑکوں پہ  
نہیں پھیلتی۔ اگر ایسا پاکستان میں بھی ہو جائے تو کیا  
بات ہے۔



ڈاکٹر شہناز قاسمی :- (یورک ان امریکن  
ریڈ کراس انٹرنیشنل سوشل سروس اینڈ  
ریسٹورنگ فیملی - قیام ہو سٹن ٹیکساس)

1 اگر دل سے پوچھیں تو جو مزا پاکستان میں عید  
کرنے کا ہے وہ مزا کہیں بھی نہیں آیا ہمیں پاکستان  
سے نکلے ہوئے تقریباً 14 سال ہو گئے ہیں اور  
پاکستان میں عید بھی نکلنے سے پہلے ہی منائی تھی۔  
پاکستان سے آنے کے بعد پہلی عید تو جتنی پھسکی ہو سکتی  
تھی اتنی ہی تھی۔ جاب سے چھٹی انورڈ نہیں کر سکتے  
تھے۔ ویسے بھی یہاں پرانے دوستوں کے سرکل میں  
جو پہلے سے رہ رہے ہوں زیادہ دیکھ نہیں کیا جاتا۔ اپنا



1 تقریباً 25 سال سے میں ملک سے باہر قیام پذیر ہوں اور آخری بار بقرہ عید میں نے گزشتہ سال ہی کی

2 گھر کے باہر قربانی کرنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنا مذہبی تہوار منا رہے ہیں۔ پھر ہمارے قریبی رشتے دار ہمارے قریب ہوتے ہیں۔ ہم اپنے ہاتھوں سے قربانی کا گوشت مستحق لوگوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یا کرتے ہیں۔ لیکن بچوں کے سامنے قربانی کا یہ عمل بچوں کے لیے بہت ہی Drammatic ہوتا ہے اور پریشان کن ہوتا ہے اور یہ ایک پریشان کن بات ہے کہ بچے اسے دیکھیں اور اگر حفظانِ صحت کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جائے تو گھر میں قربانی کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔



سحرش فاطمہ :- (فری لانس رائٹر۔ قیام مدینہ سعودی عرب)

1 تمام پڑھنے والوں اور تمام مسلمانوں کو میری طرف سے عید مبارک۔ میں گزشتہ ایک سال سے ملک سے باہر ہوں۔ اس لیے آخری بار گرب عید کی کا سوال کا جواب شاید چند سال بعد دے سکوں گی۔ اور ویسے بھی عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ اپنے ملک پاکستان میں ہی کرتی ہوں۔

سرکل بنانے میں ٹائم لگتا ہے۔ اب تو پھر بھی عید عید لگتی ہے۔ کینیڈا میں سات سال رہ کر اب امریکہ میں عید کا کوئی خاص فرق نہیں لگتا۔

2 بقرہ عید بھی ہماری عید الفطر جیسی ہی ہوتی ہے۔ نہ تو بکروں کی سے سے اور نہ ہی بچوں کی رونقیں جو جانوروں کو گھمانے پھرانے کے چکر میں گھر سے گھنٹوں غائب رہتے ہیں نہ ہی وہ صبح صبح انتظار کہ کب قربانی ہو اور کب کبھی پکا میں یہاں گوشت والے کے یہاں پہلے جانور کی بکنگ گراؤ پھر کنفرم کر کے تیسرے دن گوشت لاؤ اور پھر بانٹو تو کیا عید کا مزا۔ یہاں دور دور گھر ہوتے ہیں تو گوشت بانٹنے کے لیے بھی سستی آتی ہے۔ تو قربانی کا اصل مقصد تو پورا ہوتا نہیں ہے۔ یہاں تو صحیح معنوں میں کوئی حق دار ہی نظر نہیں آتا۔ اس لیے ہم تو پاکستان میں قربانی کے پیسے اپنے عزیزوں کو بھیج دیتے ہیں۔ تاکہ وہ ہمارے نام کی قربانی کر دیں۔ اور غریاء اور مساکین میں گوشت تقسیم کر دیں۔ ہم یہاں گوشت اور خاص طور پر کبھی پکا کر عید اشائل میں عید منا لیتے ہیں۔ بس عید کے دن اپنے دوستوں رشتے داروں اور پاکستان کی رونقیں بہت یاد آتی ہیں۔



ڈاکٹر اعجاز رحمن :- (NHS Trust) Consultant at قیام ہائمسٹر



کیونکہ یہاں حفظانِ صحت کا خیال رکھا جاتا ہے۔  
بندہ گندگی سے محفوظ رہتا ہے پاکستان میں گھر کے باہر  
ہوتا ہے جس سے بہت زیادہ گندگی ہو جاتی ہے روڈ پر  
خون پھیل جاتا ہے۔ آلائشیں اٹھانے والے دیر سے  
آتے ہیں اور بہت بدبو پھیل جاتی ہے۔ سلاٹر ہاؤس  
میں اگرچہ قربانی منگلی پڑتی ہے مگر انسان بکرے کی  
خریداری، قصائی کی منت سماجت سے بچ جاتا ہے اور  
سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان گھر میں اور گھر سے باہر  
پھیلنے والی گندگی سے بچ جاتا ہے۔



بینی زیدی :- (آرٹسٹ۔ قیام امریکہ)

1 مجھے ملک سے دور رہتے ہوئے 17 سال ہو گئے  
ہیں اور سترہ سال پہلے برائے میں نے پاکستان میں عید منائی  
ہوگی۔ درمیان میں عید منانے کی کبھی پاکستان نہیں گئی۔  
2 قربانی کا طریقہ جو پاکستان میں ہے وہ سب سے  
الگ ہے بلی سب جگہ ایک سا ہی ہے۔ لیکن جو مزا  
پاکستان میں عید کرنے کا ہے وہ کہیں نہیں ملتی تھوڑا ہو  
یا عید یا بقرہ عید ہو اس کا مزا پاکستان میں ہی ہے۔ یہاں  
تو عجب سی بے رونق ہوتی ہے۔ تو میں تو پیسے بھجوا دیتی  
ہوں پاکستان میں اور قربانی میرے نام کی ہو جاتی ہے۔  
اور زیادہ تر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ ہی لوگ ہیں جو  
یہاں قربانی کرنے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں۔ مجھے  
نہیں معلوم کہ وہ سلاٹر ہاؤس میں کرتے ہیں یا کہیں اور۔

2 پاکستان کی عید کی تو بات ہی کچھ اور ہے سب  
ایک ساتھ ہو کر ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد  
دیتے ہیں۔ پاکستان میں عید قرباں کرنے کا یہ فائدہ کہ  
جانور گھرا کر اس کی خاطر بدارات کر کے اسے قربان کیا  
جاتا ہے جیسا کہ ہمارے مذہب میں حکم ہے اور پھر  
اپنے ہاتھوں سے غریب مساکین اور ورہ رشتہ دار  
جو قربانی انورڈ نہیں کر سکتے گوشت تقسیم کرتے ہیں۔  
ویسے بھی عید اپنوں میں ہی اچھی لگتی ہے۔ باہر کے  
ملکوں میں گھر سے باہر قربانی کی اجازت نہیں ہوتی۔  
لہذا مسلم کیونٹی مل جل کر عید مناتے ہیں۔ اور یہ  
بھول جاتے ہیں کہ کون کس ذات کا اور رنگ و نسل کا  
ہے۔ باہر سلاٹر ہاؤس ہوتے ہیں لیکن بہتر یہی ہے کہ  
اپنے گھر میں اپنی آنکھوں کے سامنے قربانی کی جائے۔  
اپنے ہاتھ سے ادا کیے گئے فرض کی خوشی ہی کچھ اور  
ہوتی ہے۔



شیخ تنزیل :- (آئی ٹی فنکشنری۔ رائلٹ  
قیام دبئی)

1 پاکستان سے باہر دبئی میں رہتے ہوئے 3 سال  
گئے ہیں اور آخری بار عید الاضحیٰ 2011ء میں لاہور  
میں کی تھی۔  
2 دوسرے ملکوں میں سلاٹر ہاؤس میں قربانی ہوتی  
ہے اور میرے خیال میں یہ ایک بہترین طریقہ ہے



گزارہ - آخری بار عید 18 سال پہلے پاکستان میں گزارا تھی یا منائی تھی۔

2 پاکستان میں گھر کے باہر قربانی ہوتی ہے۔ مذہبی لحاظ سے یہ ہی طریقہ ہے مگر اس سے گندگی بہت ہو جاتی ہے۔ بدبو، کھیاں، ہر طرف خون اور پھران کے حصے بنانا۔ بے چاری خواتین بھی بہت تھک جاتی ہیں۔ اگر صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جائے تو یہ بہترین طریقہ ہے قربانی کا، بچے اور نئی نسل قربانی کے Concept سے آگاہ ہوتے ہیں۔ سلاٹر ہاؤس میں قربانی سے ٹائم کی بہت بچت ہو جاتی ہے اور اس ٹائم کو ہم اپنے رشتے داروں کے ساتھ گزار سکتے ہیں کیونکہ لائف آج کل بہت مصروف ہو گئی ہے۔ جدہ میں ہم سلاٹر ہاؤس میں قربانی کرتے ہیں اور کھالیں حکومت کی منظور شدہ چیرٹی آرگنائزیشن لے جاتی ہیں۔

✽ ✽



سمیرا عزیز :- (فلم میکر + آر جے اینڈ Activist + صحافی۔ قیام جدہ سعودی عرب)

1 میں سعودی نیشنل ہوں اور پہلی سعودیہ کی فلم میکر ہوں بالی ووڈ کی۔ بچپن کا کچھ عرصہ کراچی میں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول  
ہماری تھی



راحت جمیں

قیمت - 300/- روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز

قیمت - 550/- روپے

کسی راستے کی  
تلاش میں



میمونہ خورشید علی

قیمت - 350/- روپے

میرے خواب  
لوٹاؤ



نگہت عہدائند

قیمت - 400/- روپے

فون نمبر:  
32735021

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

بندہ کرن 19 اکتوبر 2015



# زنجبیل سے ملاقات

## شاہین رشید

- ”خبرناک“ سے اپنی پہچان بنانے والی زنبب
- جیل کو آپ آج کل ”سسرال میری بہن کا“ اور
- ”پارس“ میں دیکھ رہے ہیں۔ زنبب کے ابھی چند ہی
- سیریلز آن ایر ہوئے ہیں اور سب میں ان کا رول مختلف
- ہی رہا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زنبب کردار لیتے
- وقت خاص طور پر اس بات کا خیال رکھتی ہیں کہ کردار
- کا ٹکراؤ نہ ہو۔
- \* ”کیسی ہیں زنبب اور کیا مصروفیات ہیں؟
- ”سسرال میری بہن“ کے علاوہ؟ کیا آن ایر ہے کیا انڈر
- پروڈکشن ہے؟
- \* ”آن ایر تو آپ کو پتا ہی ہے“ سسرال میری بہن
- کا ”اور ”پارس“ ہے اور جہاں تک انڈر پروڈکشن کی
- بات ہے تو کچھ ڈرامے تکمیل کے مراحل میں ہیں اور
- کچھ شروع ہونے والے ہیں۔“
- \* ”مطلب کافی کام کر رہی ہیں تو سیریل ”آپ کی کنیز“
- میں آپ کا کام دیکھا تھا تو کیا وہ پہلا پروجیکٹ تھا آپ
- کا؟“
- \* ”نہیں نہیں وہ میرا تیسرا پروجیکٹ تھا پہلا
- سیریل ”مل کے بھی ہم نہ ملے“ تھا وہ فیصل بخاری کا تھا۔“
- \* ”مزا آ رہا ہے اس فیلڈ میں؟“ آپ کی کنیز میں
- بہت بولڈ کھانی گئیں۔ عام زندگی میں کیسی ہیں؟“
- \* ”ہاں بہت مزا آ رہا ہے اور عام زندگی کی بات کی تو
- عام زندگی میں بولڈ اور شائے (shy) کا مکسچر ہوں
- ۔ اور ایک اور ڈرامے میں ”آپ کی کنیز“ سے
- مختلف رول میں آؤں گی جو پوز ہو گا۔“







\* ”خبرناک میں تو بہت shy نظر آتی تھیں؟“  
 ☆ ”اصل میں تو شائے ہوں مگر کچھ جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں بولڈ ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو پھر لوگ آپ کو انڈر اسٹیمٹ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔“

\* ”نام آپ کا نہ نب جیل ہے۔ لڑکی آپ آج کے دور کی ہیں تو نام پرانا کیوں؟“  
 ☆ ہنستے ہوئے۔ ”بالکل اگر پرانا ہے تو کیا ہوا۔“

لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے اپنا نام بہت پسند ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے نام کی وجہ سے ہی بہت اسٹونگ ہوا۔ کیونکہ نام کا اثر آپ کی شخصیت پر بہت ہوتا ہے۔ اور میرا نام میرے والدین نے ہی رکھا تھا۔ اور یہ سارے مجھے گھروالے ”زینبی“ بلاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کس نے میرا نام پکاڑا نہیں۔“

\* ”کب کہاں پیدا ہوئیں؟“

☆ ”30 مارچ 1990ء میں میں اردو نوالہ میں پیدا ہوئی کیونکہ میرا خیال وہاں تھا۔ جبکہ میرا تلمیم و تربیت تولہور میں ہی ہوئی ہے۔ میرا ستارہ 12-ices ہے جبکہ میرا ایک بھائی اور میرے علاوہ دو بہنیں ہیں۔ میرا نمبر پلاٹ ہے اور میں گریجویٹ ہوں۔“

\* ”اس فیڈ میں آپ ہی ہیں یا گھر میں کوئی اور بھی ہے؟“

☆ ”کوئی نہیں ہے۔ سرن میں ہی ہوں۔“

\* ”اچھا۔ گھروالے سپورٹ کرتے ہیں آپ کی؟“

☆ ”گھروالے بہت سپورٹ کرتے ہیں۔ بہت خوش ہیں اور بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ نب میں کام کرتی ہوں اور نہ کہاں کر سکتی تھی۔“

\* ”گریجویٹ ہیں۔ کیا سوچا تھا کہ کیا بنتا ہے؟“

☆ ”بچ بتاؤں۔ ہاؤس وائف بننے کا سوچا تھا اور ہاؤس وائف بنوں کی مگر ابھی نام نہیں ہے۔“

\* ”اپنی پسند سے ہاؤس وائف بنتا ہے یا والدین کی پسند سے؟“

☆ ”جی ہم تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ فیصلے تو کہیں اور ہوئے ہوئے ہوتے ہیں ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“  
 ”اس فیلڈ میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ تو پھر آپ کیسے آگئیں اس فیلڈ میں؟“

☆ ”میں نے انٹرشپ کی تھی ”جیو“ میں تو پھر ”جیو“ ”خبرناک“ کے لیے آفر آگئی تو میں نے جوائن کر لیا یہ پروگرام۔“

\* ”تو ٹیلنٹ کام کیا یا آپ کی خوب صورتی کام آئی۔“

☆ ”میری اپیرنس Appearance کام آئی۔ انہوں نے کہا کہ کام کریں گی تو بڑا کام کریں گی۔ اور ”خبرناک“ دیکھنے کے بعد ”فیصل بخاری“ نے مجھ سے رابطہ کیا اور یوں میرا پہلا سیریل ”مل کے بھی ہم ملے“ تھا۔“

\* ”خبرناک میں شوپس کی طرح تھیں۔ بہت کم بوٹے نامزق ملتا تھا۔ اور معلومہ بھی کچھ ملتا تھا یا نہیں؟“

☆ ”شوپس تو نہ تھیں۔ اچھی خاصی پرفارمنس دینی پڑتی تھی تب ہی تو معلومہ ٹھیک ٹھاک ملتا تھا مجھے ایک



14 اگست کے دن بہت جذبہ ہوتا ہے تو گرین سوٹ پہن کر باہر گھومنے پھرنے بھی نکلی تھی تیو ایر جی مناتی ہوں اور عید تو بہت ہی بھرپور طریقے سے مناتی ہوں۔ ہاں روزوں کے لیے میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ پورے رکھوں۔

\* ”دن رات شوٹ گھبراتی ہیں۔ بھوک ستاتی ہے؛ برداشت کرتی ہیں یا چڑچڑی ہو جاتی ہیں؟“  
 ☆ ”شوٹ سے نہیں گھبراتی مزا آتا ہے۔ اور بھوک نہیں ستاتی، کیونکہ مجھے زیادہ بھوک لگتی ہی نہیں ہے تو چڑچڑی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی میرے پاس ایسی چیزیں ہوتی ہیں جنہیں کھا کر میں اپنی بھوک کو قابو میں رکھتی ہوں۔“  
 \* ”اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟“

☆ ”بالکل جی۔ بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ مجھے اپنے ہر ڈرامے کے آن ایر ہونے کا انتظار رہتا ہے۔ بہت غور سے اپنے ڈرامے دیکھتی ہوں کہ کہاں غلطی کی ہے تاکہ اپنے آپ کو سدھار سکوں اور لوگوں کی تنقید کو بھی بہت غور سے سنتی ہوں تاکہ خامیوں کو دور کر سکوں۔“

\* ”کبھی سوچا تھا کہ اس فیلڈ میں آئیں گی، نام کماؤں گی؟ سین کے لیے ڈائریکٹر کو تنگ کرتی ہیں یا جلدی اڑانے کے ہو جاتا ہے؟“

☆ ”نہیں کبھی نہیں سوچا تھا۔ بالکل سب کچھ اچانک ہی ہو گیا کہ ایک دم سے خبرناک کے لیے آفر آ گئی اور پھر ڈرامے کے لیے آفر آ گئی۔ اور ڈائریکٹر کو تنگ نہیں کرتی، اچھی بچی ہوں۔ ہاں ایک سین جو کہ سیریل ”آپ کی کنیز“ کا تھا اس میں مشکل ہوئی تھی جب دکھایا جاتا ہے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے تو۔ کیونکہ اللہ کا شکر ہے کہ میں ایک ہی لائف گزار رہی ہوں۔ تو بس رونے دھونے والے سین کرنے ذرا مشکل لگتے ہیں۔“

\* ”اور وہاں تنگ؟“  
 ☆ ”نہیں۔ وہ بھی بس ٹھیک ہو ہی جاتے ہیں۔“



یروگرام کے 22 ہزار لٹے تھے اور مجھے تو شوہر کی لائف بہت اچھی لگ رہی ہے اور برائیاں کہاں نہیں ہوتیں ہر جگہ ہوتی ہیں اور اب تو اس فیلڈ میں بہت پڑھے لکھے لوگ آگئے ہیں۔

\* ”لاہور میں آپ کی فیملی ہوتی ہے اور آپ یہاں کراچی میں۔ تو مسئلہ تو نہیں ہوتا؟ اور اپنے گھر جاتی ہیں تو کیسا لگتا ہے؟“

☆ ”نہیں جانے آنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور میرا دل چاہتا ہے کہ جب میں جاؤں تو اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی وقت گزاروں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میرے جانے سے پہلے گھر والے اپنے کام ختم کر لیں تاکہ وہ مجھے پر اپر ٹائم دے سکیں۔ تو کبھی کبھی اس بات پر مجھے تھوڑی پریشانی ہوتی ہے۔“  
 \* ”سوشل ہیں، دل چاہتا ہے بلکہ گلہ کرنے کو لاہور جا کر؟“

☆ ”نہیں ایسا بلکہ گلہ کرنے کو دل نہیں چاہتا میں سوشل تھی اور ہوں بھی لیکن جو مزا کالج کے زمانے کا تھا وہ اب نہیں ہے کالج میں تھی تو دوستوں کے ساتھ ویلنٹائن ڈے بھی مناتی تھی۔ لال کپڑے بھی پہنتے تھے مگر اب تو سارا وقت شوٹ میں ہی گزارتا ہے ہاں



\* ”فلمیں کس قسم کی پسند ہیں؟۔ آفر آئی؟“  
 ☆ ”مجھے ہر طرح کی فلمیں پسند ہیں اور فلم میں کام کرنے کا شوق بھی ہے اور ہمایوں سعید کی ایک فلم ”یہ جوانی پھر نہیں آئے گی“ میں کام بھی کر رہی ہوں۔“  
 \* ”رول کس طرح کے کرنا چاہیں گی؟“

☆ ”ہر طرح کے کروں گی، لیکن زیادہ تر پوزیٹو رول ہی کروں گی، ایک دہ میں نگہٹو کے ہیں۔ مگر کوئی خاص مزا نہیں آیا۔ ویسے ابھی تک کوئی کردار ایسا نہیں کیا کہ کر کے چھتاوا ہوا ہو۔“

\* ”بچپن کی کوئی برائی جواب تک برقرار ہے؟“  
 ☆ ہنستے ہوئے ”ہاں ہے مجھے بچپن سے ہی عادت نہیں ہے وقت کی پابندی کرنے کی اور یہ عادت آج تک برقرار ہے۔ اور چونکہ پاکستان میں کسی کو بھی یہ عادت نہیں ہے۔ اس لیے مجھے مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔“

\* ”ڈرامے کے کردار حقیقی ہوتے ہیں؟“  
 ☆ ”نہیں بالکل نہیں۔ اور ہم حقیقت کے برعکس پر فارم کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کو تو اداکاری کہتے ہیں۔ اور زندگی میں کون سچ سچ تھپڑ کھاتا ہے مگر

میں نے ڈرامے میں تھپڑ کھایا۔“  
 \* ”ہاؤس وائف بننے کے علاوہ کیا بننے کی خواہش ہے؟“

☆ ہنستے ہوئے ”ہاؤس وائف کے لیے بھی ابھی ٹائم چاہیے۔ ویسے میرا ارادہ بزنس کرنے کا اور فیوچر میں پروڈکشن ہاؤس کھولنے کا ہے۔“  
 \* ”کوکنگ سے لگاؤ ہے؟“

☆ ”نہیں کوئی خاص نہیں، لیکن اگر کبھی پکانا پڑ بھی جائے تو آلو گوشت اور قیمہ آلو اچھا پکالتی ہوں۔“  
 \* ”ویسے کھانا اور ناشتا کس کے ہاتھ کا پسند ہے اور غصہ کس پہ اترتا ہے۔ کھانے پر یا کسی اور پہ؟“

☆ ”انہی ماں کے ہاتھ کا۔ وہ بہت اچھا پکاتی ہیں۔ اور میں تو پہلے ہی بہت کم کھاتی ہوں، اگر غصے میں کبھی کھانا پینا چھوڑ دوں گی تو نقصان میرا ہی ہو گا۔“  
 \* ”لوگ عام جگہوں پہ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟“

☆ ”بھئی آج کل تو ایک ہی فرمائش ہوتی ہے کہ پلیز ایک سیلفی ہو جائے تو میں سب کے ساتھ تو سیلفی نہیں بنوائی جو لڑکیاں یا خواتین مجھے بہتر لگتی ہیں ان







کے ساتھ بنواتی ہوں۔“

میں زیادہ اچھی لگتی ہو اس لیے مجھے اتنی پروا نہیں ہوتی۔“

\* ”شادی کی رسومات میں شوق سے جاتی ہیں؟“  
 \* ”اگر مہندی ماپوں کا فنکشن ہو تو۔۔۔ اگر یہ رسومات نہ ہوں تو پھر نہیں جاتی بشرطیکہ کوئی مجبوری نہ ہو۔“

\* ”اپنے عادت و اطوار میں کیا کی محسوس کرتی ہیں؟“

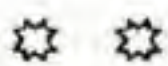
\* ”مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں مستقل مزاجی کی کمی ہے۔ تھوڑی ضدی بھی ہوں فیصلے کرنے میں سوچتی بہت ہوں۔“

\* ”غلطی تسلیم کر لیتی ہیں؟“

\* ”ہاں۔۔۔ جی بالکل۔“

\* ”اپنی شخصیت کے لیے کیا کہنا چاہیں گی؟“  
 \* ”میں خوابوں میں رہنے والی لڑکی ہوں۔ مجھے

خواب دیکھنا اور پھر ان کو اصلی کر دیکھنا پسند ہے۔“  
 اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نہ نب جمیل سے اجازت چاہی۔



\* ”لوگوں کو انڈین فنکاروں سے شکلیں ملانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ آپ کو لوگوں نے کس سے ملایا؟“

\* ”ہنستے ہوئے“ جی میرے لیے کہتے ہیں کہ تمہاری شکل انوشے شرما سے ملتی ہے۔ تو میں خوش نہیں ہوتی بلکہ بس سن لیتی ہوں اور مسکرا دیتی ہوں۔“

\* ”اگر انڈین فلم سے آفر ہو تو کس کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیں گی؟“

\* ”مجھے سلمان خان بہت پسند ہیں اور میری خواہش ہوگی کہ میں جب بھی انڈین فلم میں کام کروں تو سلمان خان کے ساتھ کروں۔“

\* ”نیند پیاری ہے یا کام؟“

\* ”کام تو سب کو ہی پیارا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے نیند بھی پیاری ہے۔ لیکن کام کے معاملے میں بہت ایکٹیو Active ہوں اور ذرا لیٹ ہو جاؤں اور بیڈ پر ہوں تو چھلانگیں مارتی ہوئی اٹھتی ہوں اور فوراً تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔“

\* ”تیار ہونے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوتا؟“  
 \* ”نہیں بالکل نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم سلوگی



میری بکھیٹ

## محمد بلال قریشی

شاہین رشید



وقت میں تو سب نصیب تھیں ہی کرتے ہیں۔

14 "میں ڈرتا ہوں؟"

"اے ہی غصے سے۔ بہت تیز ہے میرا غصہ۔"

15 "کس کا غصہ مجھ میں ٹرا سفر ہوا؟"

"شاید میری امی کا۔"

16 "مجھے کوئی شوق نہیں؟"

"اپنا فون نمبر بار بار بدلنے کا۔ دس سال سے ایک

ہی نمبر ہے میرے پاس۔"

17 "کس کو نمبر دے کر نہیں پچھتا تا؟"

بقیہ۔ "ٹڑکیوں کو۔ مگر اب سنبھل گیا ہوں۔"

شادی جو ہو گئی ہے۔"

1 "تام؟"

"محمد بلال قریشی۔"

2 "پیار کا نام؟"

"صرف بلال۔ یا پھر کبھی کبھی مدنی بھی کہہ دیتے

ہیں۔"

3 "جنم دن؟/ شہر؟"

"9 فروری / سعودی عرب (جدہ)۔"

4 "بہنیں اور بھائی؟"

"چار بہنیں، ہم دو بھائی۔"

5 "تعلیم؟/ شادی؟"

"گریجویٹ / الحمد للہ ہو گئی ہے۔"

6 "شوہر کا سفر؟"

"بہت مشکل سے ملے کیا ہے تب کہیں جا کر جگہ

نی ہے۔"

7 "آج کل آن ایئر سیریل؟"

"کانچ کی گڑیا۔"

8 "پہچان بنا؟"

"نہا سادل۔۔۔ مطلب ٹیلی فلم تھی۔"

9 "میری غیند کا نام؟"

"پہلے صبح سوتا تھا۔ شادی کے بعد روٹین بدل گئی

ہے۔"

10 "صبح اٹھ کر پہلا کام؟"

"پانی پینا۔"

11 "کونسا وقت زندگی میں ضرور آتا ہے؟"

"اچھا اور برا۔ برا پہلے آجائے تو اچھے وقت کی

بہت قدر ہوتی ہے اور بندہ بار بار شکر کرتا ہے۔ میں

نے بھی برے کے بعد اچھا ٹائم دیکھا تو بہت قدر کرتا

ہوں۔"

12 "کیا برا لگتا ہے؟"

"لوگوں کی نصیحتیں۔ نصیحت بچوں کے لیے کار

آمد ہوتی ہیں، بڑوں کے لیے نہیں اور میں اب بڑا ہو

چکا ہوں۔"

13 "برے وقت میں کوئی کام آتا ہے؟"

"سب اچھے وقت کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ برے



- 18 "کس کے ساتھ اداکاری کرنے کی خواہش ہے؟" "شاہ رخ خان کے ساتھ۔"
- 19 "دریہ خواہش؟" "فلم میں کام کرنا۔ جنون کی حد تک خواہش ہے۔"
- 20 "میں نے سوچا تھا کہ؟" "کہ ویلن ٹائن ڈے پر شادی کروں گا اور میں نے ایسا ہی کیا 14 فروری کو ہی شادی کی میں نے۔"
- 21 "ایک خواہش جو پوری ہوئی؟" "کہ جب میں رات کو تھکا ہوا گھر آؤں تو میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہو۔ سو ایسا ہی ہوتا ہے۔"
- 22 "میری ایک اچھی عادت ہے؟" "مجھے تو یہی لگتی ہے کہ میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہوں۔"
- 23 "کون بزدل ہوتا ہے؟" "جو خود کشی کرتا ہے۔ حالات سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ لڑنا چاہیے۔"
- 24 "معاف کرنے کی خوبی کس میں ہوتی ہے؟" "میرے خیال میں مرد کی۔ عورت میں ذرا کم ہوتی ہے۔"
- 25 "بہت خوش ہوتا ہوں؟" "جب چھٹی کے دو چار دن ملنے پر لاہور جاتا ہوں اپنے والدین کے پاس۔ میری مستقل رہائش لاہور میں ہے۔"
- 26 "کیا برداشت نہیں کر سکتا؟" "بھوک اور غنیمت۔ نیند تو کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے اور بھوک شدید ہو تو بس۔ فوراً کھانا چاہیے ہوتا ہے۔"
- 27 "ایک بری عادت جس پر قابو پانا سیکھ لیا ہے؟" "پہلے غصے میں بے قابو ہو کر اپنے آپ کو زخمی کر لیتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے۔ شکر الحمد للہ۔"
- 28 "کن کی بہت عزت کرتا ہوں؟" "خواتین کی عورت کا برتاؤ تباہ ہے خواہ وہ ماں کے بہن کے یا بیوی کے روپ میں ہوں۔ یا پھر بیٹی کے روپ میں۔"
- 29 "مہمانوں کی آمد؟" "بہت اچھی لگتی ہے۔ میں بہت مہمان نواز ہوں۔"
- 30 "خرچ کرتا ہوں؟" "دوسروں پر۔ اپنے اوپر خرچ کرنے کا شوق نہیں ہے۔"
- 31 "کھانے کا اصل مزہ؟" "فیملی کے ساتھ چٹائی پہ بیٹھ کر کھانے کا جو مزہ ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے۔"
- 32 "مجھے نشہ ہے؟" "انٹرنیٹ اور فیس بک کا، وہ نہیں سکتا ان کے بغیر۔"
- 33 "مستقبل میں میرے ارادے؟" "میاں بیوی اور بچے۔ خوشحال گھرانہ۔ اور ٹوٹ کر یعنی جان لگا کر محنت کرنا۔"
- 34 "چھٹی کا دن گزارتا ہوں؟" "اپنے بیڈ پر۔ اور کہیں نہیں۔"
- 35 "Sms الرٹ کس کے لیے رہتا ہوں؟" "ظاہر ہے بیوی کے لیے۔ اور کس کے لیے رہتا ہے۔"
- 36 "لوگ سمجھتے ہیں کہ؟" "ہم کوئی بہت خاص لوگ ہیں، جبکہ ایسا نہیں ہے۔ ہم بھی عام لوگوں کی طرح ہی ہیں۔ جیسے عام لوگ کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے ہیں ہم بھی ویسے ہی کرتے ہیں۔ بس نی وی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ اور تو کوئی خاص بات نہیں۔"
- 37 "گھر سے نکلتے وقت نہیں بھولتا؟" "موبائل فون اٹھانا۔ آخر بیگم کے Sms کے جواب بھی تو دینے ہوتے ہیں۔"
- 38 "مذہب سے میری قربت؟" "بہت زیادہ ہے۔ اور مزید قریب ہونا چاہتا ہوں مذہب کے۔"
- 39 "چوٹ لگ جائے تو؟" "چوٹ لگ جائے تو؟"



”سوائے امی کو پکارنے کے اور کوئی زبان پر نام نہیں آتا۔“

40 ”تو تازہ محسوس کرتا ہوں؟“

”جب کام کر کے گھر آتا ہوں۔ عموماً“ شام کو اور رات کو اپنے آپ کو تازہ محسوس کرتا ہوں۔“

41 ”فقیر کونسا ہوں؟“

”ایک فقیر دوسرے فقیر کو کیا دے سکتا ہے۔ پھر بھی حسبِ توفیق کچھ دے ہی دیتا ہوں۔“

42 ”کب بہت خوش ہوتا ہوں؟“

”جب کوئی دل کھول کر میری تعریف کرتا ہے۔“

43 ”گھر کے کس کو نے میں سکون ملتا ہے؟“

”پورے گھر میں۔ کیونکہ گھر ہی سکون کی جگہ۔“

44 ”لڑکیاں گھوریں تو؟“

”گھورتی رہیں۔ ہر اچھے اور خوب صورت انسان کو لوگ گھورتے ہی ہیں (مقبہ)۔“

45 ”خوشی میں پہلا جملہ؟“

”شکراً الحمد للہ۔“

46 ”ملک سے باہر جا کر کیا سیکھا؟“

”سیکھا تو بہت کچھ تھا۔ پر پھر جیسا دلیں و سہا

بھیس۔“

47 ”شاہِ دل یا کنجوس؟“

”اپنے لیے کنجوس دوسروں کے لیے شاہِ دل۔“

48 ”تحفہ میں میری ترجیح؟“

”پرفیوم۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔“

49 ”میری کوشش ہوتی ہے کہ؟“

”میری وجہ سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور سب مجھ سے خوش رہیں۔“

50 ”جھوٹ بولتا ہوں؟“

”ہاں‘ ہاں‘ بولتا ہوں۔ مگر دوسروں کو مشکل سے نکالنے کے لیے دوسرا کچھ ہی جھوٹ بولتا ہوں۔“

51 ”پہلی ملازمت؟“

”جب یو ایس پڑھنے گیا تھا تو چھوٹی سی ملازمت کی

تھی جس کے 100 ڈالر ملے تھے۔“

52 ”شاپنگ پہلی ترجیح؟“

”گھر سے باہر نکلتا ہوں تو پہلے کچھ نہ کچھ کھانے کو ترجیح دیتا ہوں پھر شاپنگ کرتا ہوں۔“

53 ”شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟“

”جہاں سے کچھ پسند آجائے خرید لیتا ہوں۔ کوئی خاص جگہ نہیں ہے شاپنگ کے لیے۔“

54 ”غصے میں پہلا لفظ؟“

”اب یہ تو نہ پوچھیں۔ ستر ہو جائے گا۔“

55 ”کیا وقت سے پہلے ملا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ ہمیشہ جو ملاویر سے ہی ملا۔ پھر بھی رب کا شکر ادا کرتا ہوں۔“

56 ”باہر جا کر کیا چیز متاثر کرتی ہے؟“

”ان کی ایمانداری‘ چیزوں کا خالص ہونا‘ جھوٹ نہ بولنا‘ مسکرا کر بات کرنا اور قوانین کو فالو کرنا۔“

57 ”کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟“

”کچھ خاص نہیں۔ پرفیومز مجھے پسند ہیں۔ سو اسی کی ایکسٹرا خریداری ہو جاتی ہے۔“

58 ”کیا چیزیں اس دنیا میں نایاب ہیں؟“

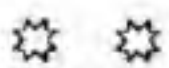
”محبت‘ خلوص اور دوسروں کے لیے اچھی سوچ۔“

59 ”زندگی کی ساری جدوجہد کس کے لیے؟“

”اپنے لیے ہرگز نہیں۔ انسان بہ ذاتِ خود تو وہ وقت کی روٹی اور سادہ لباس میں بھی گزارہ کر لیتا ہے۔ یہ ساری جدوجہد تو دوسروں کو سکھ دینے کے لیے ہی ہوتی ہے۔“

60 ”زندگی نے کب کروٹ لی؟“

”زندگی تو ہر وقت کروٹیں بدلتی رہتی ہے کبھی اچھا وقت آجاتا ہے تو کبھی برا۔ زندگی تو اتار چڑھاؤ کا نام ہے۔ دن اور رات کا نام ہے۔ عروج و زوال کا نام ہے۔“





مُقابل ہے آئینہ

## سیدہ نسبت زہرا

ادارہ

س۔ اے کاش! کہ میرے دوست مجھ سے پھر ایک بار آئیں، دوست کبھی نہیں پھڑکتے وہ ”آج“ بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے (آہ)۔

س۔ ”آپ کے لیے محبت کیا ہے؟“

ج۔ ”میرے لیے محبت، محبت خواہش کے موسم میں کیف آگئی بارش ہے جس لمحے برس جائے زندگی اسی لمحے میں قید ہو جاتی ہے۔ پھر اس ٹھہرے ہوئے لمحے میں اپنا آپ مڑ مڑ کر دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ محبت تو وہ ہے جو انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک لے جاتی ہے جو ”من“ اور ”تو“ فرق مٹانے کے عشق مجازی سے عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر طے کرائی ہے۔

نظن کے سفر میں اگر کوئی شے آسمانی ہے تو وہ ”محبت“ ہے جو دلوں پر چلنے سے ”وحی“ کی مانند اترتی ہے اور وجود کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہے۔“

س۔ ”مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟“

ج۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے ”میں نے خدا کو پہچانا، ارادوں کے ٹوٹ جانے، نیتوں کے بدل جانے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے۔“ تو میں کوئی بھی منصوبہ نہیں بناتی جب کرنا اس ذات نے ہے تو راضی بہ رضا۔“

س۔ ”پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور کیا ہو؟“

ج۔ ”میرے بھائی اکیم بی بی ایس کیمپٹ ہو ا سید آصف رضا (U.K) اور ڈائجسٹ میں پھر سے لکھنا

س۔ ”آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟“

ج۔ ”سیدہ نسبت زہرا۔ گڑیا اتنا مشہور اور فارملی ہو چکا ہے کہ اکثر لوگوں کو نہیں پتا کہ میرا نام کیا ہے۔ فرینڈز البتہ نسبت ہی کہتی ہیں۔“

س۔ ”کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟“

ج۔ ”ہا ہا ہا۔“ کچھ پوچھ کہا ہم تو اکثر آئینے کو ستاتے رہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر با آواز بلند۔

حسن والوں کو سنورنے کی ضرورت کیا ہے سادگی میں بھی قیامت کی ادا ہوتے ہیں اور یہ بھی اکثر

معصوم نظر بھولا مکھڑا، چہرے پر تبسم تصویر کا جب یہ عالم ہے تو حسن مجسم کیا ہوگا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے سب کچھ دیا کبھی کسی بات کی کمی نہیں لگی اللہ نے بہت جنم جنم بنایا ہے (آہم)۔“

س۔ ”آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟“

ج۔ ”میرے مام، ڈیڈ، برادرز، سسٹرز، ذریت حسن (بھانجا)۔“

س۔ ”آپ اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟“

ج۔ ”2002ء میں جب میرے ماموں سید سجاد بخاری کی ڈیڈ ہوئی وقت جلدی بیت جاتا ہے اور پھڑ جانے والے دوست ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں



ج "میری ٹانو، میری مام شاہدہ بخاری۔"  
 س "سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے  
 مکمل کر دیا ہے یا واقعی یہ ترقی ہے؟"  
 ج "کام جلدی ہو جاتا ہے، زندگی آسان اور سہل  
 ہے لیکن انسان ست ہو گیا ہے۔"  
 س "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

ج  
 ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے  
 بہت نکلے میرے ارمان مگر پھر بھی کم نکلے  
 "ایک خواہش کاش کہ بہت پیاری سی اپنی شاعری  
 کی کتاب کہ پبلش کروں۔"  
 س "برکھارت کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج  
 پھر ساڈن رت کی پون چلی تم یاد آئے  
 پھر پتوں کی پانہب بجی تم یاد آئے  
 بارشوں کے اداس موسم میں خود کو دیکھو تو یاد آئے کوئی  
 کاش ایک باریوں بھی ہو جائے میں پکاروں تو لوٹ آئے کوئی



اشارت کیا۔"  
 س "آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے  
 کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"  
 ج "اللہ پر ہمیشہ بھروسہ وہ بہتری کرنے والا ہے۔  
 خوش امید کی ترنگ۔"

س "آپ اپنے آپ کو بیان کریں؟"  
 ج "حساس، برداشت کرنے والی اور ہر کسی کا ادب  
 و احترام چاہیے وہ اپنا ہویا غیر چھوٹا ہویا بڑا۔"  
 س "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنچے آپ  
 میں گاڑے ہوں؟"

ج "2010ء میں میں بہت بیمار ہوئی، سوچوں تو  
 آج بھی کانپ جاتی ہوں۔"  
 س "آپ کی کمزوری۔ آپ کی طاقت کیا ہے؟"  
 ج "چیزوں میں پوچھا تو پوٹری، ذریت حسن  
 (بھانجا) طاقت، میرے بھائی، ماسٹرم رضا اکوٹنٹس فوجر  
 اور ڈاکٹر آصف۔"

س "آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"  
 ج "بہت ہنستی ہوں، اچھا کھانا بناتی ہوں۔ شعر  
 سناتی ہوں (کوئی سننا ہی نہیں ہلہا۔) اور فیملی اکٹھی  
 ہو کر انجوائے کرتے ہیں۔"

س "آپ کے نزدیک دولت؟"  
 ج "اچھی لائف گزارنے کے لیے ضروری ہے۔  
 لفٹی لفٹی۔"  
 س "گھر" آپ کی نظر میں؟"  
 ج "تحفظ" ملتا ہے گھر میں پرسکون ہونے کی جگہ۔"

س "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

ج "میری میموری بہت تیز ہے مجھے کچھ بھی کبھی  
 نہیں بھولتا، ویسے معذرت قبول کرنے میں ہی بہتری  
 ہوتی ہے۔"

س "اپنی کامیابیوں میں کس حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"



اچھی بات نہیں۔“

س ”کوئی ایسی شکست جو آج بھی اداس کر دیتی ہے؟“

ج ”میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے لگتی ہوں۔ اکثر ساری ساری رات میں روتی ہوں پتا نہیں کیوں مجھے دکھ ہوتا ہے۔ کاش میں بھی بے حس ہو جاؤں۔“

س ”کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جو آپ کو حسد میں مبتلا کر دیتی، د؟“

ج ”نہیں، نہیں، کبھی بھی نہیں۔ مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے کامیاب لوگوں کو دیکھ کر۔ ہاں! البتہ محسن نقوی کی شاعری پڑھ کر دل چاہتا ہے ایسے اشعار میں بھی کہہ سکتی کبھی۔ یہ رشک ہے۔“

س ”مطالعہ آپ کی نظر میں؟“

ج ”تنہائی سے بچاتا ہے۔ زندگی کا شعور سکھاتی ہے اور اچھے برے راستے کے تعین میں اچھی کتاب بہترین ساتھی ہے۔“

س ”آپ کی پسندیدہ شخصیت؟“

ج ”زوجہ حیدر کرار بی بی فاطمہ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔“

س ”ہمارا پورا پاکستان خوب صورت ہے آپ کا خاص پسندیدہ مقام؟“

ج ”پاکستان کو بہت خوب صورت کہنا بے جا نہیں، پاکستان بہت خوب صورت ملک ہے۔ بس امن و امان بھی قائم ہو جائے تو کیا کہنا۔ مجھے بر سکون جگہ اچھی لگتی ہے چاہے وہ گاؤں ہو، شہر ہو یا کوئی وادی کا خوب صورت دلکش حسین منظر۔“

یہ اشک تیرے میرے رائیگاں نہ جائیں گے  
ان ہی چراغوں سے روشن محبتیں ہوں گی

❦ ❦

اب بس یادیں بن گئیں یہ سب تو۔

س ”آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟“

ج ”اس بات سے خوش ہوں کہ اللہ نے جیسا بنایا۔ کوئی خواہش نہیں کہ ایسی ہوتی، ویسی ہوتی۔ پر سکون ہوں اپنی پر سنالٹی سے، اتنا منفرد بنایا سب سے۔ ہاں منفرد لوگوں کو ہمیشہ مار سنی پڑتی ہے۔ طعنوں کی یا تنہائی کی (بابا بابا)۔“

س ”آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟“

ج ”جب تلاوت کرتی ہوں تو لگتا ہے کہ کوئی سن اور دیکھ رہا ہے۔ جب اکثر راتوں کو رو کر اس ذات سے دعا مانگتی ہوں تو دل سے آواز آتی ہے۔“

آج دی رات میں کلاں وان

آج دی رات نے میرے سونہرے ربا

نیڑے ہو کے بول

س ”آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟“

ج ”خلوص اور محبت کبھی کبھی اچھی، سنی ہوئی پوشیز۔“

س ”اپنی خوبی یا خای جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟“

ج ”میری سب سے بڑی خوبی یا خای ہر کسی کی عزت، پیار، محبت کرنا لوگ نہ جانے پھر کیا سمجھتے ہیں کہ شاید مجھے کچھ سمجھ نہیں۔ ضرورت سے زیادہ حساس۔“

س ”آپ کیا مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں؟ یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟“

ج ”اگر کوئی مجھے چیلنج کرے تو پھر اس کو دکھاتی ہوں کہ دیکھو میں نے ایسا کر لیا۔ بہت پاور فل ہوں میں۔ اسٹرانگ۔“

س ”متاثر کن کتاب، مصنف، موعی؟“

ج ”سبح ابلاغہ، لیلیٰ جدون، تیری راہ میں دل گئی، موعی کی جگہ کہانی دی۔ موعیز نہیں دیکھتی۔“

س ”آپ کا غور؟“

ج ”فیملی، میرا قلم، ویسے آپس کی بات ہے غور کرنا



# راپنزل

مہر کو کہانیاں سننے کا بے حد شوق ہے۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے اس لیے اس نے اپنے پیپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سننے کی فرمائش کی۔ کہانی سناتے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراض رہتی ہے اور ان کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتی، وہ ابا سے جتنی نالاں اور متنفر رہتی، لیکن ایک بات حتمی تھی کہ اسی سے اسے بہت محبت تھی، لیکن اسے محبت کا مظاہرہ کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کی زبان ہمیشہ کڑوی ہی رہتی۔ نینا اپنے خرچے مختلف یوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔

سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ چند سال پہلے میٹرک کا رزلٹ پتا کر کے وہ خوشی خوشی گھر واپس آ رہا تھا کہ ایک گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ زہنی بیمار ہونے کی وجہ سے اس کی ماں نے مثبت قدم اٹھاتے ہوئے محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کھلوادی، سلیم نے پرائیویٹ انٹر کر کے بی ایے کا ارادہ کیا۔ سلیم کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہو جاتی ہے، جو اس نے نینا کے ہاتھ بھجوائی تھی۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا۔ وہ اپنی بہنوں میں قدرے دلی رنگت کی مالک، لیکن سلیقہ شعاری میں سب سے آگے تھی۔ صوفیہ کی شادی جب کاشف ثار سے ہوئی تو پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنا دیا گیا۔ کاشف نہ صرف چلتے ہوئے کاروبار کا اکلوتا ارث تھا، بلکہ وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ کاشف خاندان کی ہر لڑکی اور









دوستوں کی بیویوں سے بہت بے تکلف ہو کر ملتا، جو صوفیہ کو بہت ناگوار گزر جاتا تھا۔ صوفیہ کو خاص کر اس کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی تھی۔ جو بہت خوب صورت اور مارڈرن تھی اور اس کی خاص توجہ کاشف کی طرف رہتی۔ حبیبہ کی وجہ سے کاشف اکثر صوفیہ سے کیے ہوئے وعدے بھول جاتا تھا۔ صوفیہ کے شک کرنے پر کاشف کا کہنا تھا کہ یہ اس کا کاروباری تقاضا ہے۔

بی بی جان صوفیہ کی ساس کو کاشف سے جھگڑا کرنے سے منع کرتی ہیں، لیکن صوفیہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور اکثر و بیشتر کاشف سے بحث کرنے لگتی جو کاشف کو ناگوار محسوس ہوتا۔ صوفیہ پر یگننت ہو جاتی ہے اور بی بی جان کاشف سے صوفیہ کا خیال رکھنے کو کہتی ہیں۔

شہرین نے ضد کر کے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر سمیع سے شادی تو کر لی، لیکن بچپن سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ سمیع اسے بہت چاہتا ہے، اس کے باوجود اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے ہیں اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے اور زیادہ تر پلزلے کر اپنے بیدروم میں سوئی رہتی ہے۔ سمیع نے اپنی بی بی ایمن کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا جو گھر کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے تھیں۔ سمیع اور شہرین دونوں ایمن کی طرف سے لاپرواہ ہیں اور ایمن اپنے والدین کی غفلت کا شکار ہو کر ملازموں کے ہاتھوں پل رہی ہے۔ اماں رضیہ کے احساس دلانے پر سمیع غصہ ہو جاتا ہے اور ان کو ڈانٹ دیتا ہے۔ شہرین کے بھائی بسن راستے میں ملتے ہیں اور سمیع کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔

اب آگے پڑھئے

## چوتھی قسط

”زری یہ تو لیا تمہارا ہے یا نہنا کا؟“ امی نے کمرے میں آتے ہوئے سوال کیا تھا۔ زری نے فوراً ہاتھ میں پکڑا موبائل ٹیکے کے نیچے اڑسا۔

”مجھے تو ہمیشہ بھول جاتا ہے کہ سفید تولیا نہنا کا ہے یا گلابی والا۔ تم ہی بتاؤ۔“ امی نے اس کے آگے سفید تولیا رکھا تھا۔ ان دونوں بہنوں نے چند دن پہلے ہی نئے تولیے خریدے تھے اور امی کو پہچان نہیں ہو رہی تھی۔ آج کپڑے دھوئے تھے اور وہ ان کے کپڑے وغیرہ والگ والگ کر کے تہ لگا کر الماریوں میں رکھ رہی تھیں۔

”امی سفید والا اس کا ہے۔ گلابی والا میرا ہے۔ گلابی بڑا ہے۔ سفید چھوٹا ہے۔ میرے بال لمبے ہیں اس لیے میرا ٹاول بڑا ہے۔ آپ یہ نشانی یاد کر لیں نا“ زری نے مشورہ دیا تھا۔

”یہ بھی اچھی کہی کہ میں یاد کر لوں۔ تم لوگ خود ہی اپنی چیزیں سنبھال کر رکھ لو تو مجھے یاد کرنے کی ضرورت ہی نا پڑے۔ دھوپر سے کپڑے تار سے اتار کر وہاں صوفے پر رکھے ہوئے ہیں۔ رات ہو گئی۔ مجال ہے دونوں میں سے کسی نے ہاتھ بھی لگایا ہو۔ اتنا سا کام نہیں ہوتا تم دونوں سے کہ اپنے کپڑے ہی تہ لگا کر الماریوں میں رکھ لو۔ دھونا تو دور کی بات ہے۔ لوگوں کی بیٹیاں تو نا صرف ماؤں کے ساتھ کپڑے دھلواتی ہیں بلکہ استری کر کے الماریوں میں سجاتی بھی ہیں اور یہاں میری شہزادیاں خود الماریوں میں رکھنے تک کی روادار نہیں۔“ امی کا یہ روز کا سبق تھا جو وہ انہیں پڑھاتی رہتی تھیں۔

”امی میں تو کتنے ہی کام کرتی ہوں۔ مجھے کیوں ڈانٹ رہی ہیں۔ نہنا کو ڈانٹا کریں نا۔ وہ تو مل کر پانی بھی نہیں پیتی۔“ زری ناراضی سے بولی۔ اس کا خیال تھا کہ نہنا کی لاپرواہی کی وجہ سے اسے بھی بلا وجہ امی سے ڈانٹ پڑ جاتی ہے۔



”ارے ان محترمہ کی بھی خوب کھی۔ وہ خود اٹھ کر یونیورسٹی چلی جاتی ہیں۔ سمجھو قلعے فتح کر لیتی ہیں۔ ایم اے نہیں کر رہیں۔ ہمارے سر احسان کر رہی ہیں۔“ امی انتہائی چڑ کر بولی تھیں پھر انہیں یک دم احساس ہوا کہ نہنا موجود نہیں تھی۔

”ہیں کدھر تمہاری بہن صاحبہ۔ سو گئی کیا؟“ انہوں نے اس کے بستر کی طرف دیکھا جس پر لحاف کھلا پڑا تھا جو یقیناً ”شام کو سوتے وقت کھولا گیا تھا اور ابھی بھی“ تہ لگا کر رکھا نہیں گیا تھا۔ اس کی کتابیں کپڑے اور دوسری اشیا ایسے ہی بکھری رہتی تھیں۔

”نہنا کہاں ہے؟“ انہوں نے زری سے سوال کیا تھا۔ چہرے پر کچھ تفکر۔ مانتظر آیا۔ ردی نے سوال سے زیادہ چہرے کے تاثرات پر غور کیا تھا۔

”وہ خالہ کی طرف گئی ہے۔ کہہ رہی تھی سلیم سے کتابیں لینی ہیں دس منٹ پہلے ہی سیڑھیاں اتری ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”یہ ہر وقت منہ اٹھا کر خالہ کی طرف کس خوشی میں چلی جاتی ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد اسے سلیم سے کوئی نیا کام یاد آجاتا ہے۔“ امی کے چہرے پر بڑھتی ہوئی پریشانی کی لکیریں زری کو حیران کر رہی تھیں۔ خالہ کا گھر نہنا کے لیے اس کا اپنا ہی گھر تھا۔ وہاں جانے کے لیے وہ وقت اور اجازت دونوں کی کبھی محتاج نہیں رہی تھی۔ امی نے بھی کبھی ٹوکا نہیں تھا لیکن اب نجانے کیوں اس طرح پریشان ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ پہلے بھی اسی بات پر ناراض ہو رہی تھیں اور اب بھی برا مان رہی تھیں۔

”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی۔“ زری نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم کس لیے صفائیاں پیش کر رہی ہو؟ وضاحتیں دے رہی ہو۔ چپ کرو۔ عیسیٰ کا گواہ موسیٰ۔ جاؤ جا کر اسے بلا کر لاؤ۔“ امی اسے ٹپٹ کر بولیں۔

”امی آجائے گی۔ کون سا پہلی بار گئی ہے۔ آپ تو بلا وجہ ہی ناراض ہوئی جا رہی ہیں۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا۔ پہلے تو آپ نے کبھی نہیں ٹوکا نہنا کو۔“ وہ حیران تھی۔ امی نے اسے گھور کر دیکھا۔

”جتنا کہا ہے نا اتنا کرو۔ وکیل بن کر ماں سے سوال جواب نا شروع کر دیا کرو۔ اٹھو جاؤ۔“ وہ پہلے سے زیادہ ناراضی لہجے میں سمو کر بولی تھیں۔

زری کا موڈ بھی خراب ہوا۔ خالہ کا گھر ایک گھر چھوڑ کر ہی تھا لیکن اس وقت وہ سیڑھیاں اتر کر جانے کا سوچ کر ہی اکتا گئی تھی لیکن چونکہ امی غصے میں تھیں اس لیے وہ مزید بحث کیے بنا ان کے رویے میں آنے والی تبدیلی کے متعلق قیاس لگاتی اٹھی تھی اور سہانے پر پڑا دھنکا کندھے پر رکھ کر دروازے کی سمت بڑھی۔ چند لمحوں بعد وہ خالہ کے دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ ان کے گھر کا دروازہ کھلا ہی رہتا تھا۔

خالہ کی ایک بیٹی اور چار بیٹے تھے۔ بیٹی کی انہوں نے شادی کر دی ہوئی تھی اور اب گھر میں صرف لڑکے ہی تھے جن کا ہر وقت اندر باہر آنا جانا لگتا تھا اس لیے دروازہ بند ہوتا ہی نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے اندر آگئی۔ سنی بوی کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ خالہ پاکستانی چھینلز پر آنے والے سیریلز بڑے شوق سے دیکھنے کی عادی تھیں اور پھر ان سیریلز پر سیر حاصل بحث بھی کرتی تھیں۔ زری اس وقت کسی سیریل کی پوری روئیداد سننے میں انٹرسٹڈ نہیں تھی۔ سلیم کا گھر بیرونی دروازے کے بالکل ساتھ تھا۔ وہ خاموشی سے سلیم کے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔

”یہ ممکن نہیں ہے سلیم“ اس نے نہنا کو کہتے سنا۔ اس کے قدم وہیں جم سے گئے۔ یہ نہنا کے الفاظ نہیں تھے



بلکہ یہ اس کا اندازہ تھا جس نے اسے باہر رک جانے پر مجبور کیا۔ وہ اتنی بے چارگی سے سلیم کو کس "ناممکن امر" کے متعلق بتا رہی تھی۔ زری نے دروازے کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کان اندر جاری گفتگو کی جانب لگاتے ہوئے مزید کچھ سننے کی کوشش کی۔



"انسان ختم ہو جاتے ہیں۔ زندگی باقی رہتی ہے۔" حبیبہ نے افسردگی سے پھر پور لمبی گہری سانس بھری تھی۔ صوفیہ کے دل کو عجیب سے دھڑکے نے آکھیرا۔ ہلکے گلابی رنگ کے کرتا شلوار میں بنا کسی آرائش کے سادہ چہرے کے ساتھ بھی اس کا رنگ روپ کسی کا بھی دل موہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی دیکھتی ہوئی گندی رنگت اس کی چمک دار گہری آنکھیں، عینابی ہونٹ اس کا گلابی لباس اور کھائی میں موجود واحد سنہرا کنکرن۔ سفید کفن میں لپٹی مجید بھائی کی میت سامنے پڑی تھی۔ صوفیہ دیکھتی رہ گئی۔ بے رنگ بیوگی نے تو حبیبہ کو مزید رنگ دار بنا دیا تھا۔

اس نے سر پر ڈوٹھا اوڑھ رکھا تھا لیکن اس نزاکت کے ساتھ کہ اس کا چہرہ اس ڈوٹے کے ہالے میں مزید دکھتا ہوا لگتا تھا۔ لباس ریشم کا تھا اور ریشم کا لباس ہلکے رنگ کا ہو تو بھی دیکھنے والوں پر بڑا گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر چہرہ افسردہ تھا اور ان سب کے ساتھ بیٹھی صوفیہ، حبیبہ کو ہی دیکھتی جاتی تھی۔

حادثے کی اطلاع ملنے ہی اس کے حواس جیسے گم ہو گئے تھے۔ اس کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ اسے حبیبہ سے نفرت تھی لیکن اس کو کبھی یہ دعا تو نادی تھی اس نے۔ وہ اس کا برا تو نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کبھی اس کا سہاگ چھن جانے کی دعا نہیں کی تھی لیکن مجید بھائی کی حادثاتی موت نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اس کے ضمیر نے بہت ملامت کی تھی اسے۔ جنازے میں شرکت سے پہلے تک وہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھی کاشف کی لمبی زندگی کی دعائیں مانگتے ہوئے بے آواز روتی رہی تھی اور حبیبہ کے شوہر کی مغفرت کے لیے دعا بھی کرتی رہی تھی۔ جنازے میں شرکت سے پہلے تک اس نے حبیبہ کے اجڑے ہوئے سراپے کو کئی بار خیالوں ہی خیالوں میں اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھا تھا اور اسے دل ہی دل میں اس پر ترس آیا تھا۔

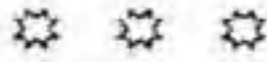
اس کا سہاگ چھن گیا تھا۔ اب کیا بچ گیا تھا اس کے پاس۔ صوفیہ کے خیال میں حبیبہ نام کا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے خاندان میں، عزیز و اقارب میں حتیٰ کہ فلموں ڈراموں میں بھی "بیوگی" مضمون کا وہ جملہ تھی جس کے بعد فل اشاپ لگا دیا جاتا ہے اور فل اشاپ کے آگے تو کچھ نہیں ہوتا۔ صوفیہ کے خیال میں بھی حبیبہ اب "کچھ" نہیں رہی تھی۔ اس لیے اس کی ہمدردی میں صوفیہ کا دل کافی افسردہ تھا۔ وہ اس کے دل کے صبر و قرار کے لیے بھی دعائیں کرتی رہی تھی لیکن جب جنازے میں شرکت کے لیے پہنچی تو سارا منظر جیسے اس کی توقعات کے برعکس تھا۔

حبیبہ افسردہ تو تھی لیکن اس کا حلیہ ویران نہیں تھا۔ اس کے بال بکھرے نہیں تھے۔ اس کی کلاہیاں خالی نہیں تھیں اور اس کا حسن ماند نہیں ہوا تھا۔ صوفیہ کو نجانے کس نے کہہ ڈالا تھا کہ بیوگی حسن کے چھن جانے کا نام ہے اور وہ حبیبہ کے حسن سے ہی تو خائف تھی جو مزید نکمیر کر سامنے آ گیا تھا۔ صوفیہ کو اس کی جانب دیکھتے ہوئے یہ تک بھول گیا کہ وہ موجود کہاں ہے۔ وہ کسی ملکہ کی طرح سنگھاسن پر بیٹھی نظر آتی تھی اور اس کا ہر انداز ثابت کر رہا تھا کہ ملکہ بیوہ ہو کر بھی ملکہ رہتی تھی۔

وقفے وقفے سے کاشف کو اس کے پاس آنا پڑ رہا تھا۔ اسپتال کے معاملات تھے۔ پولیس کی کارروائی تھی۔ قبرستان اور گورکن کے انتظامات تھے۔ کاشف مرنے والے کا بزنس پارٹنر تھا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ یہ سب معاملات سنبھالتا لیکن نجانے کیوں صوفیہ کو لگا کہ وہ سب سے زیادہ حبیبہ کو سنبھالنے کے لیے ہلکان ہوا جا رہا ہے۔



وہ عورتوں والے حصے کی طرف آتا تھا تو حبیبہ کی سسکیاں برہ جاتی تھیں۔ کاشف اسے دلا سہ دیتے ہوئے اپنے بازوؤں میں بھر لیتا تھا اور وہ بھی اس کے کندھے پر سر رکھ کر مرے ہوئے شوہر کا دکھ جی بھر کر روتی جاتی تھی۔ صوفیہ کا دل مزید ڈرنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا تھا یہ کیا ہونے جا رہا تھا۔



”یہ ناممکن ہے سلیم“ نہنانے پست لہجے میں گردن ہلاتے ہوئے اسے کہا تھا۔  
 ”میں جانتا ہوں۔ اور اس بات کے لیے میں تم سے شکایت کروں گا نا کوئی جرح۔ میں اپنی اوقات سے واقف ہوں۔“ سلیم نے دھیسے سے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بھی پست تھی اور شاید حوصلہ بھی۔ نہنانا اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

”اچھی بات ہے۔ امید ہے اب یہ محبت و حبت والی شاعری کرنے سے توبہ کر لو گے تمہ۔“ نہنانے کوئی تاثر ظاہر کیے بنا عام سے لہجے میں کہا تھا۔

”توبہ کا وقت گزر چکا ہے نہنانا۔ میں اب اس دلدل میں مکمل طور پر دھنس چکا ہوں۔ اب تو سزا کاٹنے کے دن ہیں۔“ وہ یہ اعتراف بھی آرام سے کر گیا تھا۔ نہنانا کے سامنے اعتراف نا کرنا تو کس کے سامنے کرتا۔ نہنانا چپ رہی۔ بالکل چپ۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کہے۔ اپنے اس معصوم سے کزن کو کس طرح سمجھائے کہ وہ دکھی ہوئے بغیر اس راہ سے ہٹ جائے۔

”یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن۔“ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پائی۔  
 ”نہنانا۔ تم اب میرے ساتھ یہ سب کرو گی۔ وضاحتیں دو گی۔ دلائل جمع کرو گی میرے لیے۔ مجھے یہ بتاؤ گی کہ تم مجھے ہرٹ نہیں کرنا چاہتی۔ کیا میں یہ بات جانتا نہیں ہوں؟“ وہ جڑ سا گیا تھا۔ نہنانا چپ ہو گئی۔ اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے اور بعض اوقات جہاں الفاظ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اختتام کی جانب گامزن ہوتے ہیں وہیں سے آنسو اپنے سفر کی ابتدا کر دیتے ہیں۔ نہنانا کی آنکھوں میں نمی سے مرچیں سی بھرنے لگیں۔ وہ کسی کے سامنے نہیں روتی تھی۔ اسے کسی کے سامنے رونے سے جڑ تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

”یہ کتابیں رکھی ہیں تمہارے لیے۔ لے جاؤ“ سلیم نے اشارے سے پٹائی پر پڑی کتابوں کی جانب اس کی توجہ مبذول کروائی۔ نہنانا پھر مڑی اور پٹائی پر پڑی وہ گائیڈ بکس اٹھالیں۔  
 ”شکریہ سلیم۔“ نجانے کس چیز کی تلافی کے لیے اس نے اظہار تشکر کا مظاہرہ کیا تھا جو کہ سلیم کے سامنے پہلے کبھی نہیں کیا تھا اس نے۔

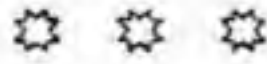
”دفع ہو جاؤ نہنانا۔ تم پر مرتے ہیں تو کیا ماری ڈالو گی ہمیں۔“ وہ مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔ نہنانا دروازے سے نکل رہی تھی۔

”دل تو یکی چاہتا ہے کہ تمہیں ماری ڈالوں۔“ وہ مڑتے ہوئے کہتا نا بھولی تھی۔ پھر نجانے کیا سوج کر دوبارہ اندر آ گئی۔

”مرے ہوئے کو کون مارتا ہے۔“ سلیم نے اسے واپس آتا دیکھ کر کہا۔  
 ”سلیم ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ تم ابھی بھی واپس پلٹ سکتے ہو۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ سلیم مسکرا دیا۔  
 ”نہنانا! محبت ناسور ہے۔ یہ اپنی ابتدا میں سمجھ ہی نہیں آتی اور جب سمجھ میں آتی ہے تو واپسی کے سب امکانات ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔“ وہ اتنی لا چاری سے بولا کہ نہنانا کا دل پھر رونے کے لیے ٹھلنے لگا۔ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کا بھرم رکھ رہے ہیں۔



”میں کچھ نہیں جانتی سوائے اس کے کہ محبت نقصان کا سودا ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہارے نقصان پر اور مجھے افسوس ہے کہ تم نے اپنا نقصان خود کیا ہے۔“ وہ اب کی بار رکی نہیں تھی بلکہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ بیرونی دروازے کی جانب بڑھے ہوئے اس نے کسی سمت نہیں دیکھا تھا بلکہ سر جھکائے باہر آگئی۔ ایک آنسو لڑھکتا ہوا اس کے گال سے پھسل کر نیچے جا گرا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور کچھ دیر دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں آنسو ہی نہیں تھے شکوہ بھی در آیا تھا۔ وہ واقعی سلیم کو دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن یہ سب اس کے اپنے اختیار کی بات بھی نہیں تھی۔



”ڈاکٹر بشری! بہت اچھی ہیں۔“ شہرین نے طمانیت بھری کمری سانس لیتے ہوئے سمیع سے کہا تھا۔ وہ اسپتال سے گھر واپس جا رہے تھے۔ شام کو کافی ہوا چلتی رہی تھی جس کی بنا پر موسم کافی خوش گوار تھا، لیکن ہوا کے ساتھ کافی گرد بھی فضا میں اکٹھی ہو گئی تھی جس سے سمیع کو ابھن ہوتی تھی اس لیے اس نے گاڑی کا اسے سی آن کر رکھا تھا۔ شہرین کو اسے سی کی وجہ سے اکثر مٹلی کی کیفیت محسوس ہونے لگتی تھی، لیکن آج وہ ایسا کچھ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس کا کریڈٹ بھی وہ ڈاکٹر بشری کو ہی دے رہی تھی۔ انہوں نے اسے ایک چوس کر کھانے والی ٹیبلٹ اپنے کلیٹنگ میں ہی کھانے کو دی تھی۔ ان سے مل لینے کے بعد وہ ذہنی طور پر کافی پرسکون ہو گئی تھی۔ ایک طرف اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ دوبارہ پریگنٹ نہیں ہوتی تھی اور دوسری جانب اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اسے کوئی بیماری نہیں تھی۔ ایک ذرا سا ڈپریشن تو تھا اور ڈاکٹر بشری نے کافی سبب بایا تھا۔

”ڈپریشن کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ زندگی کی طرف ہمارا عمومی رویہ ہے۔ ہم اگر شکر گزاری کا جذبہ اپنالیں اور یہ سوچتے رہیں کہ اللہ سب سے بہتر ہے۔ اسباب ہے تو ہم کبھی ڈپریشن نہ ہوں، لیکن ہم بلا ضرورت ان مسائل کو بھی سر پر سوار رکھتے ہیں جنہیں ہم خود حل ہی نہیں کر سکتے تو مایوسی ہمیں گھیرے رکھتی ہے، اور یہی مایوسی ڈپریشن کا باعث بنتی ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور کسی منفی سوچ کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیں۔“ وہ بہت اچھے طریقے سے اسے سمجھاتی رہی تھیں۔

ان کے کلیٹنگ سے نکلے ہوئے شہرین نے دل میں تہیہ کیا تھا کہ وہ اب کسی الٹی سیدھی سوچ میں گھر کر پریشان نہیں ہوگی اور نہ ہی ان باتوں پر کڑھے گی جو اس کے اختیار سے باہر تھیں۔ وہ جب بھی کسی نئی ڈاکٹر سے ملتی تھی ابتدا میں اسی طرح پر جوش ہوتی پھر آہستہ آہستہ سب بھولتی جاتی تھی۔ اسی لیے واپس گھر جاتے ہوئے وہ خود کو بہت فریش محسوس کر رہی تھی۔ کیوں کہ ڈاکٹر بشری کی باتیں اسے اچھی لگی تھیں۔

”تمہیں میرے علاوہ سب اچھے لگتے ہیں نا۔“ سمیع نے چڑایا۔  
”یہ میں نے کب کہا؟“ وہ ہنسی تھی۔

”اچھا ذرا یاد کر کے بتاؤ کہ لاسٹ ٹائم کب تم نے میرے لیے ایسے کہا تھا کہ سمیع تم بہت اچھے ہو۔“ وہ موڑ کاٹنے کے بعد اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”یہ تو میں دن میں کئی بار کہتی ہوں کہ سمیع تم بہت اچھے ہو۔“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”سو تے ہوئے کہتی ہوگی شاید۔ کیوں کہ میں نے جانتے ہوئے تو کبھی تمہیں اپنی تعریف میں ایک جملہ بولتے نہیں سنا۔ ہاں یہ ضرور سننا رہا ہوں کہ اماں رضیہ بہت اچھی ہیں۔ فہمیدہ (ملازمہ) بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹر بشری! بہت اچھی ہیں۔ بانی دادے کیا کبھی تم نے ان لوگوں کے سامنے یہ کہا ہے کہ سمیع بہت اچھا ہے۔“ وہ جتا کر بولا۔  
شہرین ہنسی۔



”تمہارے بارے میں اب میں ہر ایک سے بات تو نہیں کر سکتی تھی۔ تم تو میرا انتہائی پرستل میٹر ہو۔ میری ڈائری پر لکھی ہوئی وہ محبت بھری نظم جسے میں ہر ایک کے سامنے نہیں پڑھ سکتی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔ سمجھنے والے نے وہ ڈاکٹر بشری سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا۔

”ڈاکٹر بشری واقعی بہت اچھی ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ شہرین نے آنکھیں میکر کر مسکراتے چہرے کے ساتھ دیکھا پھر زور سے ہنسی۔

”کیوں اب کیا ہوا۔؟“

”انہوں نے ایک ہی وزٹ میں میری بیوی کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس لوٹا دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں یاد آگیا کہ میں تمہاری محبت بھری نظم ہوں۔ میں تو اسے معجزہ ہی کہوں گا۔“ وہ اسی انداز میں بولا تھا۔

شہرین ہنستی رہی۔

”جتنے مرضی طنز کرنے ہیں کر لو، لیکن اب تم دیکھنا میں خود کو بالکل پہلے جیسا کر لوں گی۔ خوش باش رہنے والی شہرین۔ ہمہ وقت ہنسنے کھیلنے والی شہرین۔ میں ان لوگوں کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں۔“ اس نے اپنی امی یا گھر والوں کا نام نہیں لیا تھا، لیکن سمجھ گیا تھا کہ وہ ”کن“ لوگوں کی بات کر رہی ہے۔ اس نے جواباً ”کچھ نہیں کہا۔ شہرین کے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے دل ہی دل میں سخت خار کھانے لگا تھا۔ اس کے دل میں ان کے لیے اب کوئی عزت باقی نہیں رہی تھی۔

”پہلے ہی میں الٹی سیدھی سوچوں میں گھر کر بہت وقت ضائع کر چکی ہوں۔ ایمن کو اور تمہیں وہ توجہ دے سکی ہوں نہ محبت جو تم دونوں ڈیزو کرتے ہو۔ بس بہت ہو گئی۔ اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا مجھے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی تھی۔ سمجھنے والے نے سگنل آجانے پر گاڑی روک دی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

”اب تم کیا سوچ رہے ہو؟“ شہرین نے اس کی خاموشی سے اکتا کر پوچھا۔ سمجھنے والے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہی کہ ڈاکٹر بشری واقعی بہت اچھی ہیں۔“ اس نے سارا زور ”واقعی“ پر لگا کر کہا تھا۔ شہرین ایک بار پھر زور سے ہنس دی۔



وہ بہت بوجھل دل کے ساتھ میٹرھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی۔ امی لاؤنچ میں بیٹھیں دھلے ہوئے کپڑے تہ لگا رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ انہیں مخاطب کیے بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔

”کدھر جا رہی ہو؟“ ادھر آؤ نہ ذرا۔“ امی نے اسے پکارا تھا۔ نہانے مڑ کر انہیں دیکھا۔ اس نے ایک دو آنسو ہی بہائے تھے اور چہرہ اور آنکھیں اچھی طرح پونچھ کر اوپر آئی تھی، لیکن پھر بھی اسے لگا کہ اگر اس نے امی کی جانب دیکھا تو وہ جان جائیں گی کہ وہ کسی بات پر افسوس ہے۔

”جی۔“ اس نے ان کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔

”یہ تم ہر وقت منہ اٹھا کر سلیم سے کیا لے چلی جاتی ہو؟“ وہ سخت ناراضی بھرے لہجے میں سوال کر رہی تھیں۔ نہانے کا دل مزید ٹوٹ گیا۔ اسے شکوہ تھا کہ امی کو کبھی اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت سمجھ نہیں آتی تھی جبکہ زری ذرا سا اداس ہو جاتی تھی تو امی کو فوراً ”ہا چل جاتا تھا۔“

”آئندہ جاتے وقت منہ اٹھا کر نہیں جاؤں گی بلکہ بیس میز پر رک جانا کہوں گی۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے بد تمیزی سے کہا تھا۔ امی کو اس کے انداز پر اتنا غصہ آیا کہ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہیں پائی تھیں۔



”پڑھ لکھ کر سہی سیکھا ہے کہ ماں سے بد تمیزی کیسے کرتے ہیں۔ کتابوں میں سر کھپا کھپا کر اتنا ہی علم حاصل ہوا کہ بٹوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ماں ہوں تمہاری۔ اتنا ہی یاد رہ جایا کرے تمہیں تو ہم سب کی زندگی میں سکون ہو جائے۔ بد تمیز، ناہنجار۔ ڈھیٹ لڑکی۔ اتنی تمیز بھی نہیں ہے کہ ماں سے بات کیسے کرتے ہیں۔“ امی انتہائی برا مان کر بولی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر اس کے منہ پر دو پھٹ مار دیں۔

”آپ بھی اس طرح مت پوچھیں نا۔ میں زری کو بتا کر گئی تھی۔“ وہ انجھی بھی ان کی جانب دیکھے بنا بول رہی تھی۔

”زری تمہاری ماں نہیں ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم مجھ سے اجازت لینے کی پابند ہو۔ مجھ سے پوچھ کر نہیں جاسکتی تھی۔“ وہ سابقہ انداز میں بولی تھیں۔ ان کے ہاتھ اب بہت تیزی سے کپڑے کی تہ لگا رہے تھے جو ان کی سخت خفگی کو ظاہر کر رہا تھا۔

”امی میں حج پر نہیں گئی تھی۔ سلیم کے پاس گئی تھی۔ جس کے پاس دن میں سات مرتبہ جاتی ہوں میں۔ سات مرتبہ اجازت لوں آپ سے؟“ وہ چڑ گئی اور یہ تو اس کا مشغلہ تھا۔ وہ ہر بات پر چڑ جایا کرتی تھی۔

”سات مرتبہ جانے کی ضرورت کیا ہے۔ ایسا کون سا راجا مہاراجا ہے وہ کہ جو اتنی مرتبہ حاضری دینی پڑتی ہے اس کے دربار میں۔“ امی بہت غصے میں تھیں۔ نہنانے کچھ حیرانی سے انہیں دیکھا۔ امی نے پہلے تو اس طرح اسے کبھی کہیں آنے جانے پر نہیں ٹوکا تھا۔ وہ پہلے ہی بوجھل دل لیے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ امی کی خفگی نے مزید دل توڑ ڈالا۔ وہ کچھ کہے بنا اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا کسی سے بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔



”تم نے جیبہ کو فون کیا تھا بیٹی۔“ لی بی جان نے زرمن کے پنگوڑے کی ڈوری کو ہلاتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔ صوفیہ اپنی ناگواری چھپا نہیں پائی تھی۔ اس کا کون سا دوستانہ رہا تھا جیبہ سے کہ وہ فون کرتی۔

”لی بی جان! میں کیا کروں گی فون کر کے؟“ اس نے ان سے بھی وہی کہہ دیا تھا جو اس کے منہ میں آیا تھا۔

”صوفیہ۔“ انہوں نے سرزنش بھرے انداز میں تا صرندہ پکارا بلکہ اس کی جانب دیکھا بھی تھا۔

”وہ عدت میں ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ گاہے بگاہے اسے فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی رہو۔ بہت سے کام ہوتے ہیں جو عدت میں بیٹھی عورت نہیں کر سکتی۔ تمہیں پوچھنا تو چاہیے اس سے۔“ انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ صوفیہ نے ان کی بات کا شادی۔

”لی بی جان کاشف ہیں نا پوچھنے کے لیے۔ جیبہ اور اس کے تمام امور کا خیال رکھنے کے لیے۔ وہ مجھ سے زیادہ انجھی طرح اس کی ذمہ داریاں بانٹ رہے ہیں۔“ وہ اپنی دلگرفکلی اور بے زاری کو حتی الامکان چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھی۔ کئی دن ہو چلے تھے مجید بھائی کی وفات کو اور کئی دنوں سے اس کی نیند اڑی ہوئی تھی۔

”اب کیا ہو گا؟“ یہ وہ سوال تھا جو ہمہ وقت اس کے اعصاب پر سوار رہنے لگا تھا۔ لی بی جان اور کاشف کو جیبہ سے ہمدردی کا اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ حرارت اسے اپنے وجود تک محسوس ہونے لگی۔ جیبہ کا بھرا بڑا میکا تھا سسرالی رشتے دار بھی کم نہیں تھے، لیکن کاشف اور لی بی جان ہمہ وقت اسے ”کیلا“ اور ”عدت میں بیٹھی مجبور عورت“ قرار دیتے ہوئے اس کی ساری ذمہ داریاں بانٹنے کے لیے ہمہ وقت بے تاب رہتے تھے اور یہ بات صوفیہ کو کاٹنے کی طرح چبھتی تھی۔

”صوفیہ وہ بیوہ ہے۔ اس کا خیال رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے بیٹی۔“ لی بی جان کو کافی نوکھ ہوا تھا اس کی بات



سن کر۔ وہ اپنی ناپسندیدگی چھپا نہیں پائی تھیں۔

”میری تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہی ہوں بی بی جان۔ وہ یہ وہ ہے۔ اس کے شوہر کو دنیا سے رخصت ہوئے دس دن بھی نہیں ہوئے۔ وہ عدت میں ہے۔ اسے غیر مردوں سے نہیں ملنا چاہیے۔ اس لیے اسے کچھ دیر اکیلا چھوڑ دیں۔ اپنے شوہر کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگنے دیں۔ احسان کریں اس پر بھی اور مجھ پر بھی۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو تم صوفیہ۔ مجھ سے اشادوں میں باتیں مت کرو۔ اس عمر میں ایسی ذہنی مشقت کے قائل نہیں ہوں میں۔“ بی بی جان نے چیتتی بسو کے انداز گفتگو کو بغور دیکھا تھا۔ وہ نرم و نازک سی، ٹھہر ٹھہر کر سمجھ داری سے گفتگو کرنے والی صوفیہ، جو انہیں پہلی نظر میں اپنے بیٹے کے لیے بھائی تھی جیسے کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

”بی بی جان کاشف ہر روز حبیبہ کے گھر کیوں جاتے ہیں۔؟“ اس کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ یہ سوال ان سے کرے گی، لیکن اس سے صبر نہیں ہوا تھا اور پھر ساس کے علاوہ تھائی کون جن سے وہ بات کر سکتی۔

”روز صرف یہ پوچھنے جاتا کہ اسے کوئی کام یا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اور پھر دو گھنٹے وہاں قیام کرتا۔ یہ کون سی نئی مذہبی رواداری ہے جس کا کسی کتاب میں ذکر آج تک میں نے تو نہیں پڑھا۔ یہ کوئی مناسب بات ہے کیا۔ لاکھ دوست کی پیوہ کی حیثیت سے اس کی بھلائی کے لیے اس سے ملتے ہوں گے، لیکن کیا یہ بات جائز ہے۔ آپ خود بتائیں۔“ اب کی بار وہ چڑ کر نہیں بولی تھی بلکہ عجیب طرح کا خروش تھا جو اس کے چہرے سے پھٹکنے لگا تھا۔

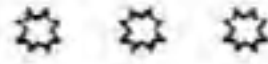
”صوفیہ! آج پہلی مرتبہ مجھے بھی یہ احساس ہو رہا ہے کہ کاشف صحیح کہتا ہے۔ تم بلاوجہ ہر بات کو سر پر سوار کے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑے کا سامان پیدا کر رہی ہو۔“ بی بی جان بہت لاچار سے انداز میں بولی تھیں۔ حقیقت یہ بھی تھی کہ وہ اس روز روز کی بحث سے اکتانے لگی تھیں۔ انہوں نے خود جوانی میں بیوگی کاٹی تھی اس لیے ان کے دل میں یک دم حبیبہ کے لیے بہت ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یہ بات سن کر ہی کافی ناراض ہو رہی تھیں کہ صوفیہ ایک عدت میں بیٹھی عورت پر بھی شک کر سکتی ہے۔

”میری بات سنو بیٹی۔ حبیبہ کا بہت نقصان ہوا ہے۔ شوہر کی اچانک حادثاتی موت نے اسے اعصابی طور پر بہت دھچکا پہنچایا ہے۔ اسے دوست احباب کے سہارے کی ضرورت ہے۔ زبانہ جو بھی کہے، لیکن میں جانتی ہوں کہ شوہر کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہو جاتا ہے وہ عورت کو بہت کمزور کر دیتا ہے۔ اسے جذباتی سہارے کی بھی ضرورت ہے اور پھر ظاہر ہے وہ اب مالی طور پر کاشف کی محتاج ہے کیوں کہ اس کے شوہر کا خطیر سرمایہ کاشف کے کاروبار میں لگا ہے۔ لین دین اور بینک کے معاملات کے لیے کاشف کو طوعاً کرہاً وہاں جانا ہی پڑتا ہے۔ تم یہ بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔ اپنے دل اور ذہن کو کشادہ رکھو۔ اب تو تم ماں بن چکی ہو۔ تمہارا قلعہ بہت مضبوط ہے میری بیٹی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح بہت شفقت بھرے انداز میں اسے نصیحت کر رہی تھیں۔ صوفیہ کچھ نہیں بولی۔ اسے اب بی بی جان کے پند و نصائح والے سب ابواب ازیر ہو چکے تھے۔ اسے ان میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی بلکہ اس کا دل دکھتا تھا کہ وہ کبھی اس کا ساتھ دینے کی بجائے اپنے بیٹے کی حمایت کرتی ہیں۔

”ہم چلیں گے کسی دن اس کی طرف۔ میں تمہارا انکار نہ سنوں۔“ ان کی بات حتمی اور آخری تھی۔ صوفیہ کا دل چاہا کہ صاف انکار کر دے، مگر احتراماً خاموش رہی، لیکن چہرے پر جو بے زاری چھائی تھی وہ ان سے چھپی نہیں رہی تھی۔

”اللہ کے یہاں صلہ رحمی کا بہت درجہ ہے میری بچی۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔





نہنا کو سلیم کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر زری مزید دروازے کے پیچھے ہو گئی کہ کہیں نہنا کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔ اس نے ان دونوں کی ساری گفتگو سن اور سمجھ بھی لی تھی۔ اس کے لیے یہ بہت حیران کن بات تھی۔ سلیم کو اس نے کبھی اپنے بہنوئی کے طور پر نہیں سوچا تھا۔ اسے سلیم کبھی پسند رہا ہی نہیں تھا۔

وہ نہنا کے جانے کے پانچ منٹ بعد نکلی تھی اور پھر گھر کی سیڑھیوں میں بھی پانچ منٹ رک کر انتظار کرتی رہی تھی۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ نہنا کو بلائے گئی تو تھی، لیکن خالہ نے اسے اپنے پاس بٹھالیا تھا۔ نہنا کو اگر بھٹک پڑ جاتی کہ وہ ان کی باتیں سن چکی ہے تو ایک معرکہ الارا جھگڑا ہو سکتا تھا اور جھگڑوں سے وہ بڑا بچتی تھی۔ اس کی اور نہنا کی زیادہ بنتی نہیں تھی، لیکن اس میں اس سے زیادہ نہنا کا ہی تصور ہوتا تھا۔ اس کی کسی سے بھی نہیں بنتی تھی۔ اس نے کزنز اور کلاس فیلوز کو بھی کبھی کھاس نہیں ڈالی تھی اور انہوں نے بھی اس کی غیر موجودگی میں ایک نام رکھ چھوڑا تھا۔ سب اسے ”نہنا پھڈے باز“ کہہ کر بلاتے تھے۔

جبکہ زری کزنز کلاس فیلوز حتیٰ کہ ماں باپ کی بھی ہر دلعزیز رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی بے مثال خوب صورتی تھی پھر اس کی عادتیں اور شوق بھی سب کی توجہ جلدی اپنی جانب مبذول کروا لیتے تھے۔ اسے کپڑے پہننے اور ڈھننے کا سلیقہ تھا۔ اس نے بہت چھوٹی عمر میں سلائی سیکھ لی تھی۔ کسی بھی شادی بیاہ یا دعوت پر جاتے ہوئے وہ اپنے کپڑے خود ڈیزائن کرتی تھی اور ایسے کرتی تھی کہ سب تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میک اپ اتنا اچھا کرتی تھی کہ اس کی سہیلیاں اسے اپنا بیوٹی پارلر بنانے کا مشورہ دیتی تھیں۔ خاندان کی ہر شادی پر دلہن کی مہندی اس کے ذمے رہتی تھی۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر وہ لڑکیوں اور ان کی ماؤں میں مقبول ہو جاتی تھی جبکہ نہنا کو ایسے شوق نہیں تھے۔ وہ بچپن سے آدم بے زار ٹائپ تھی۔ وہ تو زری کی عادتوں سے بھی چڑتی تھی جبکہ زری کو اس کی عادتوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تول سے دعا کرتی تھی کہ نہنا ٹارمل لڑکیوں کی طرح میک اپ مہندی چوڑیوں میں دلچسپی لیا کرے، اسی لیے یہ ساری باتیں سن کر اسے یہ کم از کم ضرور اچھا لگ رہا تھا کہ نہنا کی زندگی میں کوئی بات ٹارمل لڑکیوں والی بھی تھی، لیکن سلیم پھر بھی اسے پسند نہیں تھا۔ اسی لیے اسے نہنا کا دھوکا انکار بھی تسلی بخش لگا تھا۔ یہی سب سوچتی وہ سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔



”نہنا۔ زری۔ اٹھو نماز کا وقت نکل رہا ہے۔“ امی نے قرآن پاک شلیف پر رکھتے ہوئے بیٹیوں کے کمرے کی جانب منہ کر کے آواز دی تھی پھر باسی روٹیاں، سوکھی ڈبل روٹی اور رات کے بچے ہوئے تھوڑے سے چاول ایک پرات میں لے کر باہر صحن میں آ گئیں۔ یہ گھر کافی بڑا، لیکن پرانی طرز کا بنا تھا۔ نیچے کا سارا پورشن گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور وہ انہوں نے کرایے پر چڑھا رکھا تھا جبکہ پہلی منزل پر ان لوگوں نے رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ چار کشادہ کمرے، ٹی وی لائونج، ڈرائنگ روم اور ایک بڑے سے کچن پر مشتمل وہ پورشن ان کی ضرورت کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ مسئلہ صرف ایک تھا کہ سیڑھیاں چڑھ اتر کر باہر اندر آنا جانا پڑتا تھا جس سے وہ خار کھاتی تھیں، لیکن اچھی بات یہ تھی کہ صحن کافی بڑا تھا۔

امی نماز فجر کے بعد اطمینان سے وہاں چہل قدمی کر سکتی تھیں۔ یہ ان کی بہت بڑی روٹین تھی۔ نماز کے بعد باسی روٹیوں کے ٹکڑے تینچی سے کاٹ کاٹ کر چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر چڑیوں کو ڈالتی جاتی تھیں اور ساتھ



ساتھ اسم الہی کا ورد بھی کرتی رہتی تھیں۔

ان کاموں سے فراغت کے بعد وہ چائے چولھے پر رکھ دیتیں۔ نہیانا سب سے پہلے گھر سے نکلتی تھی اور اکثر زری اطمینان سے ڈٹ کر ناشتا کرنے کی عادی تھیں۔

انہوں نے معمول کے مطابق سب کام انجام دیے۔ چڑیوں کو روٹیاں ڈال کر انہوں نے چائے بنائی پھر دوبارہ بیٹیوں کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ زری کا بیڈ ٹخاف سے ڈھکا ہوا تھا جس کا مطلب تھا وہ سو رہی تھی جبکہ نہیانا نظر نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً "باتھ روم" میں تھی۔ امی دوبارہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئیں۔

"امی میں جا رہی ہوں۔ اللہ حافظ۔" نہیانا کمرے سے نکلتے ہوئے بولی تھی۔ امی نے اسے دیکھا۔ وہ اسے اطمینان سے اپنے پاس بٹھا کر اپنا موقف سمجھانا چاہتی تھیں کہ وہ سلیم کے ساتھ اتنا بے تکلف مت ہوا کرے۔ اس کے ابا کو یہ سب پسند نہیں ہے۔ وہ مناسب الفاظ ہی منتخب کر رہی تھیں۔ جو ان اولاد سے بات کرتے ہوئے بھی سو قسم کی احتیاطیں درکار ہوتی ہیں سو قسم کے پیر پھیر کر۔ انہیں باتیں سمجھانی پڑتی ہیں، لیکن نہیانا کا بچھا ہوا چہرہ اور متورم سرخ آنکھیں دیکھ کر امی کے دل کو کچھ ہوا۔ نہیانا بد مزاج چڑچڑی تھی۔ منہ پھٹ بھی تھی، لیکن ایک بات وہ حلفیہ کہہ سکتی تھیں ان کی بیٹی کردار کی بہت اچھی تھی۔ اسکول کالج تک لڑکوں کے ساتھ بڑھی مگر اور مجال ہے اس نے کبھی انہیں شکایت کا موقع دیا ہو۔ ایک سلیم ہی تو تھا جس سے وہ ذرا ہنس کر بات کر سکتی تھی ورنہ باقی سارے زمانے کو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اور انہیں یقین تھا کہ سلیم کے ساتھ اس کی صرف کزن کی حیثیت سے بے تکلفی تھی۔ ان کے شوہر کا ذہن جس پر سر ج رہے تھے اس سے وہ اتفاق نہیں کرتی تھیں۔

انہیں اس کے اپنی خالہ کے گھر جانے یا سلیم کے ساتھ بے تکلفی پر بھی اعتراض نہیں تھا، لیکن ان کے دل میں شوہر کا بھی اس قدر احترام اور عزت تھی کہ وہ ان کی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ کام تو زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اور اپنی طرف سے انہیں شکایت کا موقع بھی کبھی نہیں دیا تھا انہوں نے۔ اگر انہیں اس بات پر اعتراض تھا کہ نہیانا اور سلیم کے درمیان ضرورت سے زیادہ بے تکلفی ہے تو پھر امی کو بھی اعتراض تھا۔ حالانکہ انہوں نے اشاروں میں صرف ابھی اس بات کی نشاندہی کی تھی، لیکن امی چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر کو مزید کسی شکایت کا موقع نہ ملے اسی لیے انہوں نے رات کو نہیانا کو ٹوکا تھا، لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر انہیں بہت افسوس ہوا۔ اولاد کتنی ہی بد مزاج یا منہ پھٹ کیوں نہ ہو ماں کی محبت کو نہیں دبا سکتی۔ اولاد کی ذرا سی بے چینی ماں کو بھی بے چین کر دیتی ہے۔ نہیانا کا بے چین انداز دیکھ کر امی کو دل ہی دل میں افسوس ہو رہا تھا کہ وہ شاید ان کے ڈانٹنے کی وجہ سے اتنی اپ سیٹ نظر آتی ہے۔

"نہیانا! چائے بنی ہوئی ہے۔ پی کر جاؤ۔" انہوں نے رات والی ساری ناراضی بھلا کر اسے پکارا۔ نہیانا جا کر ز کے کمرے باندھ رہی تھی۔

"امی دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے انکار کیا تھا۔ اس کی آواز میں کسمندی تھی۔ امی کو مزید دکھ ہوا۔ اتنا تو کبھی ان کی بات کا برا نہیں منایا تھا اس نے۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے رات بھر روتی رہی ہے۔

"آدھا کپ ہی پی لو۔ خالی پیٹ مت رہا کرو۔ اتنے لمبے دن ہیں آج کل کے۔ کچھ کھا کر نہیں جاتی۔ پتا نہیں یونیورسٹی میں کچھ کھاتی ہو کہ نہیں۔ واپس بھی چار بجے ہوتی ہے۔ کچھ تو کھا جایا کرو۔" امی نے محبت سے چور کبجے میں کہا۔ وہ خاموشی سے سیڑھیوں سے ملحقہ دیوار پر لگے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر دیکھنا سیٹ کر رہی تھی۔ امی کو ایک بار پھر افسوس ہوا۔ اتنی سادہ اور لاپرواہی بیٹی تھی ان کی۔ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی مگر انہوں نے اسے



کبھی دوسری لڑکیوں کی طرح سجتے سنورتے نہیں دکھاتا تھا۔ یونیورسٹی میں انڈمیشن کے وقت سفید ٹراؤزرز کے ساتھ درجن بھر مختلف پرنٹس کی کالر والی جو شرتس سلوائی تھیں وہی بدل بدل کر پہنتی رہتی۔ ڈوپٹے بھی سفید ہی لے لیتی تھی اور وہ بھی مرضی بھی کبھی سر پر ڈال لیتی کبھی کندھے پر نکا کر نکل جاتی۔ کبھی رسی بنا کر گردن میں لٹکا لیتی اور کبھی کبھی اسکارف بھی لے لیتی تھی۔

ای کو بس اس کا رویا رویا چہرہ دیکھ کر افسوس ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اس کی ساری پڑمردگی اور کسٹمندی انہیں اپنی ڈانٹ کا شاخسانہ لگ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی اسے اس کی بد مزاجی اور بد زبانی پر ٹوکتی ڈانٹتی رہتی تھیں اور ان کی ڈانٹ کے جواب میں وہ پہلے کبھی روئی تو نہیں تھی۔ وہ اگر روئی ہوئی نا لگ رہی ہوتی تو انہیں بھی اس قدر افسوس نا ہو رہا ہوتا۔ امی اپنی جگہ سے انہیں اور دم پر رکھی چائے میں سے اس کے لیے ایک پیالی نکال کر ساتھ ہسکٹس بھی رکھ لائیں کہ شاید سامنے رکھ دیں تو وہ کھالے۔

”امی واقعی دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے انہیں چائے لا تا دیکھ کر کہا۔

”میری خاطر تھوڑا سا کھالو خالی پیٹ گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔“ انہوں نے محبت بھرے لہجے میں تاکید کی۔

”اللہ خیر۔ آج تو بہت مہمان ہو رہی ہیں آپ۔ دیکھوں ذرا سورج کس طرف سے نکلا ہے۔“ اس نے بلا وجہ کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ چہرے کے تاثرات ابھی بھی پہلے جیسے افسردہ تھے ان میں خوشگوار ست کی کوئی جھلک ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتی تھی۔

”ماں اولاد کے لیے ہمیشہ ہی مہمان ہوتی ہے۔ تم یہ بات وقت آنے پر سمجھو گی۔“ وہ دوبارہ سے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ نہننا نے کچھ نہیں کہا۔ امی کن انکھیوں سے بار بار اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”یہ وہی بادام کے بسکٹ ہیں جو تمہیں بہت پسند آئے تھے۔ اسی لیے تمہارے ابا سے دوبارہ منگوائے ہیں میں نے۔“ امی نے اسے لپچانے کی کوشش کی۔ گزشتہ بار جب یہ بسکٹ آئے تھے تو سب سے زیادہ اس نے ہی کھائے تھے نہننا نے انکار میں سر ہلایا۔

”امی بھوک نہیں ہے۔“ وہ لا چاری سے بولی۔ چہرے کی طرح لہجہ بھی الجھا ہوا تھا لیکن امی کے اصرار پر صوفے پر میز کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

”بھوک ہو گی بھی کیسے۔ تمہارے معدے کی عادت ہی نہیں رہی وقت پر کھانے کی۔ ناشتا نا کرنے کی عادت اور خالی پیٹ چائے پی پی کر معدہ جلا لیا ہے تم نے اپنا۔ اور پھر یہ جو سارا دن چپس اور الم غلم کھاتی رہتی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے نہننا۔ جوان بنی ہو۔ بھوک نا لگنے کا تو کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس عمر میں دوپرا کھے اور اتنا برا سا آلیٹ کھایا کرتی تھی میں ناشتے میں۔“ اس کے آگے ہسکٹس والی پلیٹ کرتے ہوئے وہ ٹوکتے ہوئے مسکرائیں تھیں۔

”اس کا مطلب زری بالکل آپ جیسی ہے۔“ نہننا سادہ سے لہجے میں بولی تھی۔ زری کو ڈٹ کر ناشتا کرنے کی عادی تھی۔ امی نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ مسکراہٹ ان کے چہرے سے یکدم غائب ہوئی۔

”ہاں۔ شاید۔“ انہوں نے تصدیق کی تھی لیکن تردید کے انداز میں نہننا نے بادام والا ایک بسکٹ اٹھا ہی لیا تھا۔



”رانی یہ والا بیڈ کور اتار کر یہ گرین اور زرد پھولوں والا بچھا دو۔“ اس نے بیڈ کور نکال کر رانی کو پکڑاتے ہوئے کہا تھا۔ رانی نے سر ہلا کر بیڈ کور پکڑ لیا تھا۔ شہرین کی طبیعت کیا ٹھیک ہوئی تھی سارے گھر میں تھر تھلی سی مچ گئی تھی۔



اس نے آج سارے گھر کی صفائی اپنی نگرانی میں کروائی تھی پھر ماں رضیہ کے ساتھ مل کر کھانا بھی بنایا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے سمیع کے لیے رس ملائی بنائی تھی اور اب وہ یہ سوچ سوچ کر خوش تھی کہ یہ سب دیکھ کر سمیع کتنا خوش ہوگا۔ آج اس نے کسی قسم کی مفتی سوچ کو قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا تھا۔ ڈاکٹر بشری کی ہدایت کے مطابق وہ اپنے معمولات تبدیل کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ رانی آرام سے سرہانے کا کور اتارتی ہوئی اس کے انداز و اطوار ملاحظہ کر رہی تھی۔

”ارے تم نے ابھی تک کور ہی تبدیل نہیں کیا۔ لاؤ مجھے دو۔ میں کرتی ہوں۔ تم ذرا بھاگ کر لان میں جاؤ اور جتنے بھی سرخ گلاب ہیں مناسب توڑ لاؤ۔“ اس نے اگلا حکم صادر کیا۔ شہرین کے ہاتھ کافی پھرتی سے چل رہے تھے۔

”میں یہ بدل کر چلی جاتی ہوں باجی۔ ابھی ایک منٹ میں۔“ رانی نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کیے تھے۔ شہرین نے اس دوران میں دو سرے سرہانے کا کور اتار کر نیا چڑھانا شروع کر دیا تھا۔ رانی کے کور چڑھانے تک وہ بیڈ پر چادر ڈال کر بچھانے لگی تھی۔

”باجی! آپ رہنے دیں میں کسکتی ہوں۔ سمیع بھائی کو ہتھیلے کا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ غصہ کریں گے۔“ رانی نے اس کے ہاتھ سے چادر پکڑنی چاہی تھی۔ اماں رضیہ کے حکم کے مطابق اب وہ مالکوں کے لیے باجی اور بھائی کے القابات استعمال کرنے لگی تھی۔ وہ شہرین کے سامنے کافی مستند نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ باجی شہرین حاملہ ہونے کے بعد اتنی پھرتی کیسے ہو گئی تھیں۔ کہاں وہ سارا دن اپنے کمرے میں سر پکڑ کر بیٹھی رہتی تھیں اور کہاں صبح سے سارے گھر میں تکی بنی اڑتی پھر رہی تھیں۔ اس نے حکم کے مطابق تیزی سے ہاتھ چلانے شروع کیے تھے۔

اس نے اگر اس دن ماں رضیہ اور شہرین کی باتیں مانتی ہو تو اسے کوئی پروا نہ ہوتی لیکن اب جہ جانتی تھی کہ گھر کی مالکین جلد ہی گھر میں ننھے مہمان کا اضافہ کرنے والی ہے تو وہ اس کا خیال رکھنے کی بھی زیادہ کوشش کر رہی تھی۔ اسے پتا کچھ بھی نہیں تھا۔ نو عمر سی لڑکی تھی لیکن فلمیں ڈرامے دیکھ دیکھ کر کافی کچھ سیکھ چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان دنوں مالکین کا خیال رکھے گی تو وہ خوش ہو کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دے گی اور ہو سکتا ہے ریشمی ستاروں والا سوٹ بھی دیوا دے۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ جو خبر اس نے دروازے کی اوٹ سے سن لی تھی اس میں ذرا سی بھی صداقت نہیں تھی۔

”سمیع تم لوگوں پر غصہ کرتا ہے؟“ شوہر کے ذکر پر شہرین کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی تھی۔

”نہیں جی زیادہ نہیں۔ بس ویسے ہی۔“ رانی کو سمجھ نہیں آیا کہ مزید کیا کہے۔ مالکین باجی اپنے میاں کو شکایت بھی کر سکتی تھی۔

”ڈروست۔ میں تمہاری شکایت نہیں کروں گی سمیع۔“ شہرین نے اسے تسلی دی تھی پھر اسے بیڈ پر چادر ٹھیک سے بچھا تا دیکھ کر وہ مطمئن ہو کر وارڈ روب کی سمت بڑھ گئی تھی۔ اب اسے اچھا سا لباس نکال کر تیار ہونا تھا۔

”نہیں باجی جی۔ شکایت والی بات تو نہیں ہے جی۔“ رانی نے ہتھیلیوں کی مدد سے چادر کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں تمہید پاندھ رہی تھی کہ کس طرح مالکین کو رضامند کر لے کہ وہ بیٹے کی ماں بن کر اسے ستاروں والا ریشمی سوٹ ضرور دے گی۔ چھوٹی عمر تھی اور چھوٹی چہرہ لیکن خوشیاں تھیں۔

”اچھی بات ہے۔ چلو اب جاؤ جلدی سے پھول لے کر آؤ پھر میں نے کپڑے بھی آرن کروائے ہیں۔“ وہ وارڈ



روپ میں منہ دیے ڈریس منتخب کرنے میں لگی ہوئی تھی۔  
 ”جی باجی جاتی ہوں۔“ اس نے میلے بیڈ کور کا گولہ سا ہاتھ میں پکڑا پھر مڑی تو نظروں وارڈروب پر پڑی۔ ایک  
 سے ایک بڑھیا سلا ہوا ریڈی میڈ سوٹ ہینگ کیا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے بڑا اچھا لگا۔ یہ کسی بھی بڑے گھر میں کام  
 کرنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اسے بہت سی چیزیں نئی سی لگتی تھیں۔ کچن کینٹینس میں پڑی گروی، فرق میں  
 موجود تازہ پھل، ڈانگ ہال میں سج چکے نئی نئی طرز کے برتن۔ ہاتھ روم کے ٹائلز، شافٹ پر بڑے وہ سب سیمپو  
 لوشن جو اس نے صرف لی وی میں دیکھ رکھے تھے۔ اب وہ تا صرف انہیں ہاتھ میں پکڑ سکتی تھی بلکہ نظر بچا کر  
 استعمال بھی کر سکتی تھی۔ دل بھانے کی کیا چیزیں تھیں جو اسے ہمہ وقت اس کے حواسوں پر سوار رہتی تھیں۔  
 وہ چند لمحے اسی طرح ان کپڑوں کی جانب دیکھتی رہی۔

”باجی۔ جب آپ مولی ہو جائیں گی تو یہ کپڑے کس کو دیں گی۔“ اس نے بے ساختہ ہی پوچھ لیا۔ شہین نے مڑ  
 کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

”نہیں بھئی۔ میرا موٹے موٹے ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔  
 ”پر باجی جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب عورتیں مولی ہو جاتی ہے۔ پھر تو کپڑے تنگ ہو جاتے ہیں نا۔“ رانی  
 معصومیت بھرے لہجے میں بولی تھی۔ شہین کے چہرے پر اب کی بار تا صرف حیرانی بلکہ ناپسندیدگی بھی تھی۔  
 ”کہاں ہے بچہ۔ کیا الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہو۔“ شہین چڑ کر بولی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ رانی نے  
 اس کی اور اماں رضیہ کی باتیں سنی ہوں گی۔ رانی سسم سی گئی۔  
 ”جاؤ جا کر پھول لے کر آؤ۔“ وہ اسے ڈپٹ کر بولی۔ اسے رانی کا یہ سوال اچھا نہیں لگا تھا اور رانی ہاتھ میں بیڈ  
 کور پکڑے کمرے سے باہر جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔  
 ”فلموں میں تو ایسی باتیں سن کر ہیروئینیں تو خوش ہوتی ہیں۔ یہ ہماری مالکن اس بات پر بھی غصے میں آگئی  
 ہے۔“



اس روز سرشام ہی آسمان کو بادلوں نے گھیر لیا تھا۔ برسات کے دن تھے اس لیے بادلوں کا آنا جانا اور آنے جانے  
 کے اس سفر کے درمیان میں دل کھول کر یا ترس کر برسا آج کل معمول کی بات لگتی تھی۔ کاشف نے کچھ عرصہ  
 پہلے ہی اپنی دکان کو ایک بڑے شوروم میں تبدیل کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اب اپنا ایک کشادہ الگ آفس بھی  
 بنالیا ہوا تھا مجید بھائی کے مرنے سے اس کی مستقبل کی منصوبہ بندی کو بڑی ٹھیکس پہنچی تھی کیونکہ وہ ان پر کافی  
 انحصار کرنے لگا تھا۔ وہی تو وہ صرف مارکیٹ کی جانچ پڑتال کے لیے جانا چاہ رہے تھے۔ ان کا اصل مقصد بعد میں  
 چین جانا تھا جہاں سے ہوم اپلائنسز امپورٹ کر کے خطیر منافع کمانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن فی الوقت یہ سب  
 معاملات التوا کا شکار تھے لیکن پھر بھی اس کا کاروبار کافی سے زیادہ وسیع ہو چکا تھا اسی وجہ سے اس کے معمولات  
 زندگی بھی تبدیل ہوتے جاتے تھے۔

اس روز وہ شوروم سے ذرا جلدی اٹھ گیا تھا۔ آج کل اس کی روٹین یہی تھی۔ اپنے گھر جانے سے پہلے وہ حبیبہ  
 کی طرف جاتا تھا۔ بادل دیکھ کر اس نے سوچا کہ ارادہ ملتوی کر دے لیکن پھر حبیبہ کی ناراضی کے متعلق سوچ کر اس  
 نے گاڑی اس کے گھر کی سمت موڑ دی تھی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ حبیبہ کو دیکھ کر  
 اس کے چہرے پر اور اس کو دیکھ کر حبیبہ کے چہرے پر مسکراہٹ خود بخود چمکنے لگتی تھی۔  
 ”کیا ہو رہا تھا سیٹھ صاحب۔“ ایک دوسرے کے قریب صوفے پر بیٹھ چکنے کے بعد اس نے سوال کیا تھا۔



”جناب کا انتظار ہو رہا تھا کہ آپ آئیں تو ہمارے آئے۔“ وہ اٹھلا کر بولی تھی۔ کاشف کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ صوفیہ کو ایسی دل بھانے والی باتیں کرنی نہیں آتی تھیں اور جیبہ ایسی باتیں کرنے سے چوکتی نہیں تھی۔ وہ صوفیہ کی پشت کا سہارا لے کر زرارہ کیلکس ہوا تھا۔

”میں آج جلدی چلا جاؤں گا۔ بادل کافی گہرے ہیں۔ ہلکی بارش ہو رہی ہے لیکن مجھے لگتا ہے آج بادل جی بھر کر برسنے والے ہیں پھر زرارہ کو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے آج ”ہمارا“ اپنے گھر جا رہی ہے۔“ وہ بات مکمل کر کے خود ہی ہنسا تھا۔

”یہ غلط ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ کاشف کے چہرے پر نڈھالی سے مسکراہٹ بکھری۔ ”کیوں سیٹھ صاحب۔ میرا اپنے گھر جانا غلط کیسے ہو گیا؟۔ کیا میں اپنے گھر جانا چاہوں؟“ وہ اسی انداز میں سوال کر رہا تھا۔

”میں گھر جانے کی بات کو غلط نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ٹھیک ٹھیک تمہارا جملہ غلط ہے کہ ہمارا اپنے گھر جا رہی ہے۔ یوں کہو کہ ”ہمارا“ اپنے گھر جا رہا ہے۔“ وہ تصحیح کر رہی تھی۔ کاشف نے سر ہلایا۔

”اوکے۔ ہمارا آج اپنے گھر جا رہا ہے۔ اب خوش ہو؟“ ”کاشف نار جس کے احباب میں شامل ہو گا۔ وہ خوش کیوں نہ ہو گا جناب۔“ ”اس عزت افزائی پر میں شکر گزار ہوں سیٹھ صاحب۔“

”عزت افزائی کا شکریہ ہی ادا کرنا ہے تو کھانا کھا کر جاؤ نا۔ یہ تو کوئی طریقہ نہ ہوا۔“ وہ پھر اسی ناز و ادا کو لہجے میں سمو کر بولی جو اس کا خاصہ تھا۔ کاشف نے کچھ دیر سوچا۔ جیبہ کو انکار کرنا آسان نہیں تھا۔ ”آج نہیں۔ صوفیہ انتظار کر رہی ہوگی۔“ اس نے پھر بہانہ بنانا چاہا۔ اس کے انکار کرنے پر جب جیبہ اصرار کرتی تھی تو اس کو بڑا اچھا لگتا تھا۔

”میں صرف انتظار ہی نہیں کر رہی۔ صبر بھی کر رہی ہوں۔“ اس کے جملے میں ایک اسرار تھا اور یہ اسرار صرف کاشف ہی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں اسی لیے تو آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں سیٹھ صاحب کہ آپ بہت صبر والی خاتون ہیں۔“ وہ اس کے ملائم ہاتھ کو نرمی سے سہلا رہا تھا۔ جیبہ کے گھر میں ملازم تو تھے لیکن کاشف کی موجودگی میں کسی کو ڈسٹرب کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سب کو پچھلی جانب بنے کو ارنڈز میں بھیج دیا کرتی تھی حتیٰ کہ چوکیدار کو بھی گیٹ سے ہٹ کر اپنے کیمپن میں بیٹھے رہنے کا حکم صادر کر دیا کرتی تھی۔

”تم صوفیہ کو میرے بارے میں کس بتاؤ گے؟“ اس نے کاشف کے لہجے کو نظر انداز کر کے سوال کیا تھا۔ اس کی عدت ختم ہوئی تھی یا ابھی کچھ ایام باقی تھے اسے کچھ خبر نہ تھی لیکن یہ بات حتمی تھی کہ اس کی شرم کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے اور کاشف کے درمیان تعلقات بہت پہلے سے استوار ہو چکے تھے۔

”وہ پہلے سے ہی تمہارے بارے میں جانتی ہے۔“ کاشف جو آج جلدی اٹھنے کے ارادے سے آیا تھا اب جیبہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

”کیا۔؟ کیا جانتی ہے وہ میرے بارے میں؟“ جیبہ اس کی پیش قدمی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ”یہی کہ کاشف جیبہ پر مرتا ہے۔“ ہاتھ اب چہرے کی جانب آچکے تھے۔

”تو پھر آج اسے یہ بھی بتاؤ نا کہ صرف کاشف ہی نہیں مرتا جیبہ پر۔ جیبہ بھی مرتی ہے کاشف پر۔ اور کاشف کی خاطر کسی کو بھی مار سکتی ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نڈھالی سے انداز میں بولی تھی۔ کاشف نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ بارش تیز ہونے لگی تھی اور خون کی روانی بھی۔





”تم نے حبیبہ کو ٹیلی فون تو کر دیا تھا نا؟“ بی بی جان نے سفید روپے کا آپٹل سر بردر دست کرتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔ وہ زمرین کو گود میں لیے گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ کاشف نے گھر کے لیے ڈرائیور رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں ساس بہو اب کہیں آنے جانے کے لیے اس کی محتاج نہیں رہی تھیں۔ وہ دونوں ساس بہو حبیبہ سے ملنے اور اسے گھر کھانے کی دعوت پر مدعو کرنے جا رہی تھیں۔ صوفیہ نے ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے آسمان کی جانب دیکھا۔ بادل کافی گہرے ہو رہے تھے۔ بارش کے کافی امکانات نظر آرہے تھے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد زمرین کو کیری کات میں لٹا دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں پڑھ کر اب اس پر پھونک رہی تھی۔ عام ماؤں کی طرح اسے بھی بہت خدشہ رہتا تھا کہ زمرین کو نظریہ ناگ جائے سو وہ کسی سے بھی ملتے وقت یا کہیں آتے جاتے وقت زمرین پر دعائیں پڑھ کر پھونکتی رہتی تھی۔ بی بی جان بھی اس کو اس ایکٹوٹی میں مصروف دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

”ٹیلی فون کرتی رہی لیکن اس نے اٹھایا ہی نہیں۔ ہمارا نمبر دیکھ کر وہ فون اٹھاتی کب ہے۔“ صوفیہ نے اپنا کام مکمل کر کے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ بی بی جان نے گہری سانس بھری لیکن بد مزگی کے خیال سے ملاحت بھرے لہجے میں بولیں۔

”ارے نہیں بیٹی۔ اس کی عدت ختم ہوئی ہے نا۔ شاید کہیں ملنے ملانے چلی گئی ہوں گی۔ اتنے دنوں سے گھر میں محصور تھیں۔ ہوا خوری کے لیے نکل گئی ہوں گی۔ ہمارے خاندان میں تو عدت کے بعد بھائی بھانج اپنے یہاں لے جاتے ہیں اور پھر کچھ دن بہت اہتمام سے مسمان بنا کر رکھتے ہیں۔ کیا پتا ان کے یہاں بھی ایسا ہی رواج ہو۔“

صوفیہ چپ رہی ڈرائیور اور دوسرے ملازمین کے سامنے وہ عموماً ”بی بی جان سے بحث سے احتراز برتی تھی۔ گاڑی فرائے بھرتی ڈیفنس کی جانب رواں دواں تھیں۔ اس دوران بارش بھی برسنے لگی تھی۔ زمرین کات میں لیٹی سو گئی تھی۔ صوفیہ بھی خاموشی سے گاڑی کے شیشے سے برستی بارش کو دیکھنے لگی۔ بارش کی رفتار زیادہ نہیں تھی اس لیے شیشے ابھی دھندلائے نہیں تھے۔ صوفیہ کو باہر دیکھتے ہوئے یکدم احساس ہوا جیسے کاشف کی سیاہ سوک پاس سے گزری ہے۔ وہ درویدہ سڑک تھی۔ ایک سیاہ رنگ کی گاڑی فرائے بھرتی ان کے قریب سے گزر کر متضاد سمت میں چلی گئی تھی۔

بی بی جان دل کی مریضہ تھیں اس لیے ڈرائیور کو ست رفتاری کی خاص تاکید کی جاتی تھی۔ صوفیہ نے ذرا سا آگے ہو کر گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اس سیاہ گاڑی کو کھوجنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس گاڑی کی رفتار کافی زیادہ تھی وہ منٹوں میں غائب ہو گئی تھی۔ صوفیہ کو یقین سا ہوا کہ وہ گاڑی کاشف ہی کی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی نئی گاڑی نکلوائی تھی۔ اسے ایسے بہت شوق تھے۔ اچھی گاڑی اچھا لباس، اچھی گھڑی۔ وہ دنیا کے سامنے اپنا اسٹینس برہا چڑھا کر ظاہر کرنے کا شوقین تھا۔

”ارے بی بی جان! یہ کاشف تھے نا؟“ اس نے ان سے پوچھا۔

”ہیں۔ وہ اس وقت اس سڑک پر کہاں ہوں گے بیٹی۔“ بی بی جان نے آنکھوں پر لگا چشمہ درست کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مڑ کر عقب میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ صوفیہ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ صوفیہ بھی خاموش ہو گئی۔ گاڑی حبیبہ کے گھر کی جانب بڑھ رہی تھی۔





”کیا ہوا ہے؟“ وہ وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے آگے ہوا تھا جب کسی نے پوچھا۔ باجی عذرا کاؤنٹر پر کھڑی اسے دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھیں۔

”یہ ساتھ والی گلی میں جو حسین صاحب رہتے ہیں ان کے بیٹے کا عقیقہ ہوا ہے۔“ اس نے ہنسا مسکرائے لیکن اپنے مخصوص بذلہ منج انداز میں کہا تھا۔ وہ آج بہت اداس تھا۔ کسی بھی گاہک کے ساتھ کام کے علاوہ اس نے کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ عذرا باجی مسکرائیں۔

”ساتھ والی گلی کی بائیں مت کرو۔ وہاں تو پرسوں پولیس بھی آئی ہوئی تھی۔ سنا ہے کسی کے گھر سے ہیروئن پکڑی گئی ہے۔“ وہ اپنی طرف سے بہت بڑی خبر دے رہی تھیں۔

”ہیروئن پکڑی گئی ہے۔؟“ سلیم نے مصنوعی تحیر سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے دہرایا پھر رازداری سے استفہامیہ انداز میں بولا۔

”کون سی ہیروئن۔؟ رہنمایا میرا۔ ریشم یا صائمہ۔؟“ صائمہ باجی نے قہقہہ لگایا۔

”میں ان کی نہیں۔ اس ہیروئن کی بات کر رہی ہوں جو سفید سفید رہتی ہے۔“ انہوں نے وضاحت کی۔

”اے تو یہ سب کون سا کالی ہیں۔ سب کی سب سفید سفید ہی ہیں۔“ وہ اسی انداز میں بولا۔

”بکو مت۔ میں تمہارا پوچھ رہی تھی کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ سنجیدہ ہوئی تھیں۔

”مجھے؟“ اس نے استفہامیہ انداز میں پھر دہرایا پھر آنکھیں میٹکا کر انہیں گھور کر بولا۔

”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔؟“ عذرا باجی کے ساتھ اس کی کافی بے تکلفی تھی۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی تھا۔

”میں بس ایسی ہی۔“ انہوں نے کندھے اچکائے پھر مزید بولیں۔

”دراصل سارے محلے کو صبح سے بے چینی ہے کہ آج سلیم بھائی پریشان ہیں۔“ واصل انڈے ڈٹل روٹی لے کر

گیا تو وہ کہہ رہا تھا کہ سلیم بھائی اداس لگتے ہیں آج۔ ابھی دوکان پر آتے ہوئے سبھی باجی مل گئیں۔ وہ بھی یہی کہہ

رہی تھیں کہ سلیم کسی بات پر پریشان لگتا ہے۔“ ان کی بات پر سلیم دل میں حیران ہوا۔ کیا سارا محلہ اس کے

چہرے سے اس کے دل کا حال جان سکتا تھا۔ وہ پریشان تو نہیں تھا لیکن دل کو بے چینی سے لاحق تھی اور اداسی بھی

تھی جو ماپوسی کے دھندلے روئے میں لپٹی تھی۔ دس بج چکے تھے اور نہ ابا بھی تک اپنی بل گم لینے نہیں آئی تھی۔

وہ یونیورسٹی سے چھٹی نہیں گرتی تھی اور پھر اب تو وہ ٹوشن کے لیے بھی جاتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ گھر سے

نکلے نا ہو۔ وہ اگر گھر سے نکلتی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس نے سلیم سے بغیر ملے جانا گوارا کر لیا تھا۔

”کیا وہ ناراض ہو گئی تھی؟“ یہ وہ سوال تھا جو سلیم کے حواسوں پر بوری طرح سوار تھا۔ ساری رات وہ ٹھیک

سے سو نہیں پایا تھا۔ اپنی کمپانی کا احساس پہلے بھی اس پر حاوی رہتا تھا لیکن نہنا کے دو ٹوک جواب نے اسے اندر

سے توڑ ہی ڈالا تھا۔ امید اس کی کوئی ہلکی سی کرن بھی اس نے اس کی زندگی میں رہنے نہیں دی تھی۔ وہ واقعی صبح

سے بچھا بچھا سا تھا۔ اس کی دوکان پر آنے والے گاہکوں نے یقیناً اس کی پرمردگی کو واضح طور پر محسوس کیا تھا جس کا

اظہار باجی عذرا بھی کر رہی تھیں۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں صحیح ہوں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ یہ احساس اچھا بھی لگا تھا کہ اس محلے میں اتنی

محبت کرنے والے لوگ موجود تھے۔

”میں نے بھی یہ نہیں کہا جناب کہ آپ غلط ہیں۔ لیکن یہ چہرے پر جو بارہ بجا رکھے ہیں نا یہ یقیناً غلط ہیں۔

ہمیں نہیں پسند ایسا سلیم۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ کیا ہوا ہے۔“ وہ لہجے میں شفقت سمو کر بولیں۔ وہ ان کے

بڑے بیٹے سے چند سال ہی چھوٹا تھا اور شروع سے ہی ان کا رویہ اس کے ساتھ محبت بھرا ہی رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔



”آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بخار سا ہے۔ سر میں درد محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”ارے تو آج کلیم یا علیم کو کہہ دیتے وہ بیٹھ جاتے دکان پر۔ تم آرام کر لیتے۔“ انہوں نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا تھا۔ سلیم نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ دونوں کالج گئے ہوئے ہیں نا۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باقی عذر ابولیں۔  
 ”میں تمہارے بھائی سے کہوں۔ ان کی شام کی شفٹ ہے۔ وہ دیکھ کر دیتے ہیں تمہاری۔“  
 ”ارے نہیں عذر ابا جی میں ٹھیک ہوں۔ ٹیبلٹ لی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی تھی۔

”اچھی بات ہے۔ جلدی جلدی ٹھیک ہو جاؤ۔ بالکل اچھے نہیں لگ رہے ایسے سنجیدہ سے مجھے بالکل نہیں قبول یہ والا سلیم۔ سارا محلہ مر جھایا ہوا لگ رہا ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولیں۔  
 ”آج تو بڑی دھماکا باتیں کر رہی ہیں آپ۔ مجھے تو سارا محلہ کھلا کھلا سا لگنے لگا ہے۔“ وہ آنکھیں منکاتے ہوئے کاؤنٹر پر ذرا آگے کی جانب ہو کر چڑانے والے انداز میں بولا تھا۔  
 ”شرم کرو بہن سے فکر نہ کرتے ہو۔“ وہ ہنس رہی تھیں۔

”اچھا آپ کریں تو ہال۔ ہم کریں تو حرام۔ ظالم لوگو۔“ وہ بساط بھر کو شش کر رہا تھا کہ وہ اپنی افسردہ کیفیت سے نکل سکے۔

”چلو مجھے وال مونگہ دودھلی ہوئی۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے اپنی مطلوبہ شے بتائی تھی۔  
 ”میں میلی کچلی چیزیں بچتا بھی نہیں ہوں۔ یہاں ہر چیز دھلی دھلائی۔ صاف ستھری۔ چکا چک ہوتی ہے۔“ وہ اپنی جون میں پلٹ رہا تھا۔  
 ”ایسے ہی رہا کرو۔ ہنستے کھیلتے۔ اللہ تمہیں بہت سی خوشیاں دے۔“ وہ ہنستے ہوئے دعا دے کر اور ادائیگی کر کے وال لے کر چلی گئی تھیں۔

”خوشیاں۔۔۔؟“ اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے سامنے کی سڑک دیکھا جہاں اس کی خالہ کا گھر تھا۔  
 ”نہانا ناراض ہو گئی ہو کیا؟“ وہی سوال پھر ذہن میں چکرانے لگا تھا۔ وہ افسردگی پھر دودھ پر چھانے لگی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر صبح سے رکھی بیل گم پر انگلی رکھی تھی۔



”رانی! ایمن کو میرے پاس لے آؤ۔“ شہرین نے ہاتھوں پر روشن ملتے ہوئے با آواز بلند ملازمہ کو پکارتے ہوئے حکم صادر کیا تھا۔ اس کی طبیعت سارا دن ٹھیک رہی تھی۔ سردرد کی شکایت ہوئی تھی نا اب کائی آئی تھی۔ اماں رضیہ نے تازہ انار کا جوس نکلا کر اسے پلایا تھا۔ وہ کافی فریض محسوس کر رہی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کے لباس میں تکسک سے تیار مناسب جیولری کے ساتھ اب وہ بی بی بلاؤنچ میں آئی تھی مگر اس کے سمجھ آئے تو دروازے پر اس کا استقبال کر سکے اور اپنی ساری کارکردگی اس کے گوش گزار کر سکے۔ وہ کافی خوش اور پر جوش نظر آتی تھی۔ ایمن رانی کے پاس تھی اور گب سے شہرین کو رانی کی آوازیں آرہی تھی۔ وہ ایمن کے ساتھ مسلسل باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

شہرین کو اپنے بیڈ روم سے باہر دیکھ کر ملازم کافی مستعد ہو رہے تھے۔ شہرین اماں رضیہ سے بہت خوش تھی اور رانی سے بھی بظاہر اسے شکایت نہیں تھی لیکن ایمن کے ساتھ اس کی باتیں سن کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ جس



طرح کا انداز گفتگورانی کا ہے اس سے ایمن کی زبان بھی خراب ہوئی اور پھر اس کے دوپہروالے سوال نے بھی شہرین کو ذرا الارٹ کر دیا تھا۔ ایمن کو سنبھالنے کے لیے کوئی سمجھدار لڑکی ہونی چاہیے تھی جبکہ رانی کے ساتھ کافی المیہ جڑ ہو چکی تھی۔ شہرین کو تو یہ خدشہ بھی تھا کہ ایمن اگلے سیدھے الفاظ بولنا سیکھ لے گی۔ بولنے لگی تھی اور اس کا کریڈٹ بھی رانی کو جاتا تھا۔ وہی چھوٹے چھوٹے جملے بولتی رہتی تھی جس کی وجہ سے ایمن باتیں کرنا سیکھ رہی تھی۔

شہرین کو آج ایمن کے متعلق نا صرف اپنی ذمہ داریوں کا بلکہ اپنی لاپرواہی کا بھی بہت احساس ہو رہا تھا۔ اس کی بیٹی اس کی طبیعت کی بنا پر بہت اگنور ہوتی رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر بشری کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنے معمولات کو تبدیل کرنے کا سوچا تھا۔ اماں رضیہ بھی تاکید کرتی تھیں اور اسے بھی احساس ہو رہا تھا کہ اس کی طبیعت کی خرابی کا سب سے زیادہ نقصان ایمن کو ہو رہا تھا۔ وہ اس کے کسی کام میں دوپچھی نہیں لیتی تھی۔ اس کے کھانے پینے سے لے کر صفائی ستھرائی اور کھانے پینے تک کے لیے وہ اماں رضیہ کی محتاج تھی۔

”او ایمن گڑیا آپ کی ماما جانی بلارہی ہیں۔“ رانی نے فوراً ہی بے بی واکر لا کر اس کے پاس رکھ دی تھی جس میں ایمن مزے سے بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے اور ہاتھ پاؤں صاف شہرے تھے۔ اماں رضیہ بلاشبہ بچی کا خیال ٹھیک سے رکھ رہی تھیں۔

”ایمن۔ بے بی۔ کیسی ہو میری جان۔“ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے گود میں لے لیا تھا۔ ایمن لمحہ بھر کے لیے کسمپائی پھر اطمینان سے اس کی گود میں کھلنے لگی۔ رانی بغور ما لکھن کے اطوار دیکھ رہی تھی۔ شہرین نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور خود ایمن کو گود میں ہی کیے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں ایمن کے وجود کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ بہت دن کے بعد اسے اس طرح گود میں لے کر بیٹھی تھی۔ وہ اپنی ہی بیٹی سے بہت کتراتے تھے اور اس کی وجہ کیا تھی یہ اس نے کبھی سمجھ کو بھی نہیں بتایا تھا۔

ایمن بنی بنائی شہرین تھی۔ بالخصوص اس کی آنکھیں بالکل شہرین جیسی تھیں۔ بہت روشن اور غلانی آنکھیں۔ جو پہلی نظر میں دل موہتی تھیں اور این پر بہت گہری پلکوں کی باڑھ تھی۔ ذرا سانس ہونے پر ہی اس کی آنکھیں پلکوں کی وجہ سے بہت زیادہ بھیگ جاتی تھیں اور یہی شہرین کے ساتھ بھی ہوتا تھا۔ وہ چہرہ دھو کر خشک بھی کر لیتی تھی تو آنکھیں پھر بھی نم ہی رہتی تھیں۔ پانی کی ننھی ننھی بوندیں اسی پلکوں میں پھنس سی جاتی تھیں جس سے وہ بھیگنے کے بعد مزید خوب صورت لگنے لگتی تھیں۔ اس کی کزنز اور مسولہ ماں اکثر اس کی آنکھوں کے لیے بہت خوب صورت اشعار پڑھا کرتی تھیں اور سب سے بھی اس کی آنکھوں کے لیے بہت اچھے کھیلنے پھیلنے پاس کرنے کا عادی تھا۔

شہرین نے ایمن کے بھورے بالوں میں انگلیاں نرمی سے چلاتے ہوئے اس کی آنکھوں کے بعد تیکھی مغرور ناک اور پھر ہونٹوں کو بغور دیکھا۔ وہ بالکل شہرین کا عکس تھی۔ اس کا رنگ روپ نقش ہر چیز شہرین سے مشابہ تھی۔ حتیٰ کہ دونوں کے بالوں کا رنگ بھی ایک جیسا بھورا تھا۔ ایمن کے جو دانت نکل آئے تھے اس سے اس کے چہرے کی شہرین مزید جیسی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی لمبی گردن میں شہرین کی گردن کی مشابہت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ مسکراتی تھی تو دونوں گالوں میں ڈھیل پڑتا تھا۔ اس کی مخروطی منہ انگلیاں اور ہتھیلیاں بالکل اپنی ماں کے جیسی لگتی تھیں۔

شہرین نے غیر ارادی طور پر اس کے بال کانوں کے پیچھے اڑتے ہوئے اس کے کانوں کو چھوا تھا۔ اس کے اپنے کان بہت چھوٹے اور نرم سے تھے اور کان کی لو بالکل پٹلی سی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ایمن کے کان بھی اس جیسے ہیں یا نہیں۔ ایمن کے کان بھی اس کے جیسے ہی تھے وہی نرمی وہی ملائمت۔ وہ کچھ دیر بلا وجہ اس کے کان کی



لو پرانگی پھیرتی رہی۔

”اللہ تمہیں بیٹی دے گا اور وہ بالکل تمہارے جیسی ہوگی۔ رکھنا بالکل تمہارے جیسی۔ ہو ہو تمہارا عکس۔ یاد رکھنا میری بات۔“ کسی کا کہا ہوا جملہ اس کی یادداشت میں جیسے چنگاری بن کر پھوٹا تھا اور پھر جیسے دھیرے سے ہوا میں دھواں بن کر زائل ہو گیا تھا۔ اذیت اس کے اندر راکھ بن کر اڑی تھی۔ اس کے سر میں درد کا احساس جاگا اور پھر ایسے ہی غائب ہو گیا جیسے پانی کا بلبلہ ہوا میں پھٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

”رائی! ایمن کو لے جاؤ۔“ اس نے بو جھل دل کے ساتھ رائی کو آواز دی تھی۔ ایمن ماں کے تاثرات سے بے خبر اس کی گود میں کسی شہزادی کی طرح بیٹھی تھی۔



”نہنا کتنے بچے آئے گی۔“ زری نے چائے کا پانی چولھے پر رکھنے سے پہلے احتیاطاً ”ای“ سے پوچھا تھا۔ ای نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ چار بج چکے تھے۔

”آئی ہوگی دس منٹ میں۔“ انہوں نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ وہ اون کے لمحے لیے بیٹھی تھیں جو انہوں نے دروازے پر آنے والی پٹھانی سے خریدے تھے۔ ان پٹھوں کو اب وہ گولے کی شکل میں لپیٹ رہی تھیں۔ انہوں نے آلتی پالتی کی پوزیشن میں بیٹھ کر اس موٹے لمحے کو گھنٹوں میں پھنسا رکھا اور گولہ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا جس پر وہ تار تار کر کے ساری اون لپیٹتی جاتی تھیں۔

”اس کا موڈ کیسا تھا۔ ناراض تھی؟“ وہ سوچ سوچ کر سوال کر رہی تھی۔ ای نے عینک کے شیشوں سے سوالیہ انداز میں اس کے سوال کو سنا تھا پھر افسوس کرنے والے انداز میں بولیں۔

”کس وقت ناراض نہیں ہوتی وہ اور تم بار بار ایک ہی بات کیوں پوچھتی جا رہی ہو۔ ناشتے کے وقت بھی یہی سوال کیا تھا اب بھی یہی پوچھ رہی ہو۔ تمہارا کیا جھگڑا ہوا ہے اس سے۔“ ای کو ایک بار پھر نہنا کا رویا انداز یاد آیا۔

”میں کب جھگڑے و گڑے کرتی ہوں اس سے۔ اسے ہی عادت ہے یہ سب کرنے کی۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ آپ نے ڈانٹا تھا نا اسے۔“ وہ چائے کا پانی چولھے پر رکھ کر دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھی تھی۔ نہنا اور سلیم کی باتیں سن لینے کے بعد اس نے نہنا کے فیصلے کو ہی درست قرار دیا تھا۔ سلیم نہنا کے لیے قطعاً ”مناسب جوڑ“ نہیں تھا لیکن اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ای کی ٹوہ بھی تولے۔ آخر ای یکدم نہنا اور سلیم کی دوستی سے کیوں چڑنے لگی تھیں۔ کیا وہ اس سارے معاملے سے باخبر تھیں۔

”اسے ڈانٹ کتے ہیں؟ میں تو اسے صرف سمجھانا چاہ رہی تھی کہ یہ روش ترک کر دے۔ اب وہ بچی تھوڑی ہے کہ جب دل چاہے جہاں دل چاہے چلی جائے۔ لڑکیوں کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔“ ای گولہ باندھتے ہوئے چڑ کر بولی تھیں۔ بلاوجہ کے سوالات انہیں جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتے تھے۔ زری نے سر ہلایا اور پھر ای کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”لیکن ای وہ بچپن سے خالہ اور ان کے بیٹوں سے الگ رہی ہے۔ وہ ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہی ہے۔ سلیم سلیم کے ساتھ کھیلتی رہی ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی رہی ہے۔“ وہ رک رک کر بولی تھی۔ ای نے اسے گھور کر دیکھا۔

”میں اس بات سے انکار کر رہی ہوں کیا۔ آپا اور ان کے خاندان نے بہت پیار دیا ہے نہنا کو۔ سلیم ہی نہیں باقی تینوں بھی بہن سمجھتے ہیں نہنا کو۔ بہت پیار کرتے ہیں اس سے لیکن یہ بات لوگوں کو نہیں سمجھائی جاسکتی۔ وہ اپنے



حساب سے اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ”وہ ہاتھ روک کر ساری توجہ زری کی طرف مبذول کر کے اس کی بات کا جواب دے رہی تھیں کہ جب زری کی بات ہونہنا سے تو وہ ان کے موقف کو اس تک پہنچا سکے۔ زری نے لفظ ”ہسن“ پر بمشکل اپنے تاثرات کو قابو میں رکھا۔

”لوگوں کی باتیں رہنے دیں۔ لوگ ہمیں کھانے کو نہیں دیتے۔“ زری منہ بنا کر بولی۔ امی کو اس کے انداز پر بڑا غصہ آیا۔ ان کی دونوں بیٹیاں بحث مباحثے کی بڑی شوقین تھیں۔

”تمہارا باپ تو دوتا ہے نا۔ ان کی باتیں کر لوں۔“ وہ چڑ کر بولی تھیں۔

”کیا مطلب؟“ زری نے حیران ہونے کی بھرپور اداکاری کی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ شاید ابانے ہی امی کو کہا ہو گا کہ وہ نہنا کو ٹوکیں۔

”تمہارے ابا کو نہیں پسند نہنا کا سلیم سے زیادہ ملنا جلنا۔ اور اب سوال پر سوال کرتی جاؤ گی یا اس چائے کی خبر بھی لو گی جو چولھے پر انتظار میں کھانے کو چڑھائی تھی۔“ انہوں نے اپنی جانب سے بات ختم کر دی تھی۔ زری کو بھی یاد آیا کہ چائے چولھے پر رکھی تھی۔ وہ کچن تک گئی پھر آنچ دیکھی کر کے وہیں سے بولی۔

”امی یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ سلیم اور نہنا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں۔ میرا مطلب ہے۔“ اس نے جان بوجھ کر بات اور دوری چھوڑ دی۔ اسے ڈر تھا اب امی اس پر برس برس کی ہلکیں وہ چند لمحے کچھ نہیں بولی تھیں۔ زری نے کچن سے جھانک کر دیکھا کہ وہ کس گہری سوچ میں گم ہو گئیں لیکن وہ اطمینان سے اون کا گولا بنانے میں مگن تھیں۔ اس کے دیکھنے پر جیسے ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ جواب کی غلطی تو بولیں۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ زری چپ کی چپ رہ گئی۔ یہی تو نہنا نے بھی سلیم سے کہا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ امی اور نہنا کا موقف ایک تھا۔



وہ پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔ رات کو اکثر اسے پاس لگ جایا کرتی تھی اس لیے وہ گلاس سائیڈ پر رکھ کر سونے کا عادی تھا۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے گلاس کا کورا اٹھایا تھا اور پھر کھونٹ کھونٹ پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس نے کروٹ لی تھی اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ شہرین اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ اس نے فوراً ”واش روم کی سمت دیکھا جس کے دروازے کے جھری سے کوئی روشنی آرہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا تھا۔

”شہرین۔ شہرین۔“ اس نے بہت آہستگی سے آواز دی تھی لیکن کوئی رد عمل سنائی نہیں دیا تھا۔ وہ بستر سے اتر اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ بالکونی کا دروازہ کھلا تھا اور ساتھ ہی کچھ غیر معمولی ٹپ ٹپ کی آوازیں آرہی تھیں۔ بارش ہو رہی تھی۔ وہ آہستگی سے چلا ہوا بالکونی میں آگیا۔ بارش کے ہوتے ہی گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ صبح کا استقبال لہلہاتی بل کھاتی ہوائ نے کیا تھا۔ اسے ہوا کی ملاحت بڑی بھلی لگی۔ ”نیند سے بھری آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔ وہ شہرین کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ اس کے بھورے بال جن میں ہلکا سا کرل تھا، کھلے ہوئے تھے اور اس کی پشت پر بھرے تھے۔ اس نے بہت زری سے شادیت کی انگلی سے اس کے بالوں کو چھوا جیسے کوئی موسیقار اپنے طنبورے کو چھوتا ہے۔ شہرین نے چونکے بنا کر اس کی جانب دیکھا۔

”صبح۔ دیکھو۔ کتنی خوب صورت بارش ہو رہی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”میرے پاس دیکھنے کے لیے اور خوب صورت چیزیں نہیں ہیں کیا۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ شہرین اس کا اشارہ سمجھ کر مسکرائی۔

”میری تعریف کر رہے ہو۔ اشاروں اشاروں میں۔ گھما پھرا کر۔“ وہ دیکھ سامنے ہی رہی تھی جہاں بارش کا پانی



سڑک کو پوری طرح بھگو چکا تھا اور اب بارش کی مخصوص مہک چاروں طرف پھیلی تھی۔  
 ”کوئی اعتراض؟“ سمیع نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ وہ ابھی بھی اس کی لٹوں پر انگلی پھیر رہا تھا۔  
 ”نہیں۔ لیکن اتنی تعریف بھی مت کیا کرو۔ کچھ معاملات میں فراخ دلی اچھی نہیں ہوتی۔“ وہ چڑانے والے  
 انداز میں بولی۔ سمیع نے مصنوعی خیر چہرے پھیلاتے ہوئے استقبالیہ انداز میں اسے دیکھا۔  
 ”شادی کے پہلے سال تم کھل کر میری تعریف کیا کرتے تھے۔ شادی کے چوتھے سال تم اشاروں میں تعریف  
 کرنے لگے ہو۔ شادی کے دس سال بعد تم تعریف کرنا چھوڑ دو گے۔ اس لیے اپنے الفاظ بچا بچا کر رکھو۔ مختصر  
 تعریف کیا کرو اور کبھی کبھی یہ۔ تاکہ دس سال بعد بھی کام آسکیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے اکتا جاؤ۔“ وہ اپنی  
 جانب سے دلیل دے رہی تھی۔ سمیع نے اس کا رخ اپنی جانب موڑا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے کمرے  
 کی جانب لے جاتے ہوئے بولا۔

”ایک بات یاد رکھیں شہین بی بی۔ بلکہ کہیں لکھ کر محفوظ کر لیں۔ سمیع دنیا کے ہر کام سے اکتا سکتا ہے لیکن  
 آپ سے نہیں۔“  
 ”کیوں؟“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”کیوں کہ سمیع کو آپ سے محبت ہے۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔

”کیوں؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔

”کیوں کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔“ سمیع نے ترنت جواب دیا جیسے کوئی مقابلہ ہو رہا ہو اور وہ اس میں  
 ہارنا چاہتا ہو۔

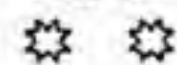
”سمیع! کیا محبت کے لیے خوب صورتی سب سے اہم شرط ہے۔ کیا خوب صورتی ہی محبت کے لیے ضروری  
 ہے۔“ شہین کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیں تھیں۔ سمیع نے گہری سانس بھرتے ہوئے برا سامنے بتایا۔  
 ”یعنی تم نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ رات کے اس پہر جب اتنی دیر تک بارش ہو رہی ہے۔ ہوا میں میٹھی سی  
 خوشبو بکھری ہے اور تم اتنی خوب صورت لگ رہی ہو۔ لیکن تم اپنے شوہر کو جی بھر کر بور کر دو گی۔ تو کرو گی۔“ وہ  
 مصنوعی ناراضی لہجے میں سمو کر بولا تھا۔

شہین مسکرائی تک نہیں۔ سمیع نے اس کے کندھوں پر ہاتھ پر رکھا تھا۔

”محبت میں حساب کتاب جانچ پڑتال کی باتیں بے معنی ہوتی ہیں۔ یہ فلسفہ تھوڑی ہے کہ اس کے وجود اور عدم  
 وجود پر مناظرے کیے جائیں۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے بنڈال سجائے جائیں۔ محبت طبعیات نہیں ہے۔ یہ  
 مابعد الطبیعات ہے۔ انسانی ذہن سے اور کی چیز۔ عقل و دانش سے ماورا۔ علم محبت کے اپنے مکتب اپنی کتابیں  
 ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی منطق کوئی دلیل کام نہیں آتی۔ یہ اگر ہے تو ہے اور اگر یہ ہے تو اسے ثابت کرنے کے  
 لیے دنیا کے کسی قانون کسی فارمولے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیوں، کیسے، کس لیے، کس طرح حوالی باتیں اس میں  
 نہیں ہوتیں۔“

اس میں نا کوئی شق ہوتی ہے نا شرط۔ یہ ایک خود کار اضطراری جذبہ ہے۔ اس لیے اس کے ہونے اور نہ ہونے  
 کی بنیادی شرائط پر بحث کرنا صرف وقت کا ضیاع ہیں۔ ”وہ ایک ایک جملے کو بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بھی  
 دیکھ رہا تھا۔ آخری جملے پر اس نے اپنا سر نرمی سے اس کے سر کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ شہین کچھ نہیں بولی۔ سمیع  
 بعض اوقات اتنی اچھی باتیں کرتا تھا کہ اسے اپنے الفاظ اس کے الفاظ کے سامنے کمتر لگنے لگتے تھے۔“

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)





# کے پس واسد

ہاں بس ایک جو ادا ماموں اور دوسرے ہماری والدہ ہی تھیں جنہوں نے کبھی ہمیں ان فضول تک نہم سے نہ پکارا بلکہ ہمیشہ ہمارے پورے نام ہی لیے گئے کیوں کہ بقول ان کے بچوں کے بے معنی اور آدھے ادھورے ناموں سے ان کی شخصیت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔

خیر جانے دیجئے۔ میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ ایک جوگیلی میں کوئی باقاعدہ قصہ گو تو ہوں نہیں کہ مجھے علم ہوتا کہانی کیسے شروع کرتے ہیں اور کیسے لفظوں کے طومار باندھ کر پڑھنے والوں کو ان کا اسیر کرتے ہیں۔ مجھ پر تو بس اس گود کا اثر ہے جس میں نے پرورش پائی اس لیے تو چند حرف جوڑنے آگئے اور اسی بنا پر آج جی چاہا کہ اپنی داستان حیات دنیا کے سامنے لے کر آؤں۔ جی ہاں۔ اپنا قصہ غم جو میری شادی کے ساتویں روز سے شروع ہوا۔

کیا کہا؟ پہلے چھ دن کی باتیں؟ ارے واہ آپ کو کیا میں اتنا ہی چغد نظر آتا ہوں کہ آپ سے ہر بات شیر کر لوں جتنا بتا رہا ہوں نا اتنا ہی چپ کر کے جانسیے اور خبردار کسی نے مجھے ٹوکنے کی کوشش کی۔ اور ڈیرائیڈ میٹر یہ جو میں نے چند ایک جملے سیدھے کرنے کی سعی ناکام کی ہے نا اس کی تو آپ نے بالکل تراش خراش نہیں کرنی کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ آپ کسی ماہر ٹیلر سے بھی زیادہ مہارت رکھتی ہیں۔ قینچی پھیرنے میں۔ ہاں نہیں تو۔



افس۔ میرا پیارا کمرہ جو میری شریک حیات کے

میں ہوں مصمصام عبید موسوی۔  
”ارے کیا ہوا؟ چونک گئے۔ ارے نہیں بھئی اب اتنا بھی مشکل نام نہیں کیا نام ہے ان کا وہ اپنے چاچا جی۔ مس۔ تن۔ اوہ ویاد نہیں آ رہا۔ ہاں ان سے تو کم ہی مشکل ہے میرا نام۔“

دراصل بات کچھ یوں ہے کہ بقول راوی ہماری عزیز از جان والدہ محترمہ اپنے دور جوانی میں خاصی ”ناولز لورز“ میں سے رہی ہیں جس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے باقاعدہ پورے خاندان کے ساتھ ہنگمے لے لے کے اپنے بچوں کے نام جن جن کر ایسے افسانوی رکھے صرف اس خیال سے کہ دنیا دنگ رہ جائے۔ اب دنیا دنگ رہی یا نہ رہی یہ الگ ایشو ہے ہاں تنک ضرور رہے وہ بھی بے چارے ہم۔ کیوں کہ جو بھی پہلی بار ہمارا نام سنتا وہ ضرور منہ کھول آنکھیں پھیلا کر ہماری طرف دیکھتا۔

”یہ کیا نام ہے بھلا؟ کس نے رکھا تھا؟ مطلب کیا ہوا؟“ اس سے زیادہ اوکھا نام نہیں تھا ملا؟ حد ہو گئی بھی۔“

اتنے سوال ہوئے کہ کیا امتحانی پرچے میں ہوتے ہوں گے اور ہم جواب دے دے کہ عاجز پھریوں ہوا کہ زبان کو ممکنہ بل پڑنے سے بچانے کے لیے دنیا نے ہمارے لمبے ترنگے ناموں کو ہی اچھا خاصا کانٹ چھانٹ دیا۔ جیسے میں مصمصام عبید سے ”صمی“ ہو گیا۔ ضعیف رضا صاحب صرف ”عمی“ رہ گئے شاندا نہ ”شمنی“ اور شازمہ ”شمنی“ رہ گئیں دھت تیرے کی یہ دنیا والے بھی نا۔



اور بر سکون ہو جائیں، مگر ہائے کاش)  
 مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ شادی کرنا کوئی آسان کام  
 نہیں۔ افسوس ایسی ایسی بے ہودہ رسمیں ہیں ہمارے  
 ہاں کہ بعض اوقات تو مجھے لگا کہ میں کوئی تماشہ کرنے  
 والا بندر ہوں مجھ پر ٹکٹ لگی ہوئی ہے اور سارا مجمع  
 مجھے دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوا ہے (کیا آپ کو بھی اپنی

آنے کے بعد اور زیادہ حسین ہو گیا تھا، مگر آج میں  
 پورے دو دن بعد یہاں آیا تھا ایک تو شادی کے دنوں  
 کی تھکان اس کے علاوہ چوتھی پانچویں کی فضول  
 رسمیں جو ہم لوگوں نے جانے کیوں خود پر لاگو کر رکھی  
 ہیں۔ مجھے ان رسموں کی کوئی ضروری وجہ سمجھ نہیں  
 آتی، مگر میں حیران ہوں کہ ہم لوگ انہیں اتنی عقیدت  
 و محبت کے ساتھ ادا کرتے ہیں جیسے یہ کوئی قومی فریضہ  
 ہو (اگر ہم اسی طرح بر خلوص ہو کر نہایت ضروری  
 فرائض بھی ادا کرنے لگیں تو ہماری زندگیاں کتنی سہل





کی ناک پر دمک رہی تھی اور اس لمحہ مجھے کہیں زیادہ خوب صورت لگی۔

ویسے آپس کی بات ہے یہ صنف نازک میں اتنا کسبیکس کیوں پایا جاتا ہے اپنی خوب صورتی کے متعلق۔ اللہ تعالیٰ نے مکمل حسن دے رکھا ہوتا ہے، مگر پھر بھی انہیں کمی سی کیوں لگتی ہے۔ اتنے پیارے چہرے پر مختلف ہونق سے رنگ پھیر کر وہ سمجھتی ہیں کہ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں؟ شکر ہے اللہ کا اس معاملے میں ہم مرد بہت بے فکر ہیں۔ نہ کلو و کلو میک اپ نہ چارپانچ کلو کی جو لری نہ آٹھ دس کلو کے کپڑے، صرف منہ دھویا، شیو کی یا نہ کی، ہلکے ہلکے صاف ستھرے کپڑے پہنے اور لوجی تیار اور تیار بھی ایسے کہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین و خوبو لگنے لگتے ہیں۔ (ماشاء اللہ)

ہمیں اپنی خوبوئی کو اجاگر کرنے کے لیے کسی بھی مصنوعی سہارے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیوں کہ بھی ہمیں کوئی احساس کمتری نہیں ہے۔ ہمیں پتا ہے ہم خوب صورت ہیں اور ہم بغیر کسی محنت و کوشش کے دل فریب نظر آتے ہیں (آہم۔ آہم۔)

اوہو! مگر یہ خواتین کو کون سمجھائے؟ اور چلو چھوڑو بھئی ساری خواتین سے مجھے کیا لینا دینا۔ میرا واسطہ صرف اپنی پیاری بیگم سے ہے اور میں اسے تو سمجھا سکتا ہوں اور میں نے یہی تو کیا، میں نے زرنش سے کہا۔

”تمہیں میک اپ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم ایسے ہی بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“ اور وہ میرے لفظوں پر یک لخت یوں شرمائی کہ اس کا کچی اسٹرابیری سا چہرہ سرخ انار میں بدل گیا۔

”اور دیکھو پلیز آئندہ یہ لٹے پٹے رنگ اپنے چہرے پر ایلانی مت کرنا، سچ میں خواتین، بہت عجیب لگتی ہیں مجھے اس حلیے میں۔“ اور میرے اگلے لفظوں کا الٹا اثر ہوا اس کا چمکتا چہرہ ایسے ہو گیا جیسے دن میں دسویں بار ہمارے کمروں کے انرجی سیور ہو جاتے ہیں۔ یک لخت اس کے نقوش تن سے گئے۔

شادی کے وقت ایسا ہی لگا تھا سچ بتائیے گا۔ لگا تھا نا۔) زرنش کی سہیلیوں اور کزنز نے تو مجھے اچھا خاصا زچ کیا ایسی چلبلی اور شوخ لڑکیاں، کئی ایک کی فضول باتوں پر تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ حد نہیں، کئی بار تو بے اختیار جی میں آئی کہ ایک ایک لگا ہی دوں، مگر آہ! یہ مروت یہ رواداری۔ یہ تو اگر میں کوئی شائے، پیاسا بچہ ہوتا تو ان کے ہاتھوں مزید پٹ جاتا، مگر میں بھی صمصام عبید موسوی ہوں، میں نے بھی ایسے ایسے کرارے جواب دیے کہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے پھر کئی ایک کو میں نے زرنش سے کہتے سنا۔

”ہائے ہائے تمہارا میاں تو بہت ہی گھنا ہے، بے حد چالاک۔ سچ کر رہنا۔ زرنش تمہاری زندگی تو لگتا ہے سختی میں گزرے گی۔ اب مرد اگر حاضر دماغ اور حاضر جواب ہوتا تو عورت بے چاری کو سوال کرنا بھی بھول جاتے ہیں۔ سچ سچ۔ زری اچھا نہیں ہوا تمہارے ساتھ۔“ اور میں دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ یہ سب باتیں میرے حق میں جارہی تھیں اور یقیناً زرنش پر اثر انداز بھی ہو رہی ہوں گی اور جو میرے لیے ہی فائدہ مند رہیں گی۔ اچھا ہے ناشروع کے دنوں میں اگر شوہر بیوی پر رعب شوب ڈال کر اسے اپنے قابو میں کر لے تو پھر سکون میں رہتا ہے، لیکن اگر وہ اوائل دنوں میں ہی بیوی کے نخروں کے جال میں پھنس جائے تو پھر بے چارا تمام عمر ماہی بے آب کی طرح پھر پھرتا رہے گا۔ (کیوں بھائیوں اتفاق کرتے ہوتا میرے ساتھ) دیسے بھائی لوگ تو کم ہی پڑھیں گے میری پتا۔ ہاں بہنوں سے معذرت کے ساتھ۔

”کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہے ہیں؟“ تو ویسے سے چہرہ تھپتھپاتی زرنش بیڈ کے دوسرے کنارے پر آ بیٹھی، میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے بے شمار میک اپ کر رکھا تھا۔ جھلملاتے کپڑے خوب ساری جیولری اور تب وہ اچھی لگ رہی تھی اور اب دھلا دھلایا بے دماغ خوب صورت چہرہ، صاف شفاف رنگت زیور کے نام پر صرف ایک لونگ جو اس



”کیا مطلب ہے آپ کا! کیا میں سارا میک اپ اٹھا کر باہر پھینک دوں۔ آپ کو پتا ہے کتنا اعلا معیاری برانڈڈ امپورٹڈ میک اپ پر چیز کیا تھا میں نے میری تو صرف آئی شیڈ اور بلش آن کٹ ہی سات ہزار کی آئی تھی۔“

”کیا؟ سات ہزار۔“ میں لیٹے سے اٹھ بیٹھا اک بجلی کا جھٹکا تھا جو مجھے لگا۔

”جی ہاں پورے سات ہزار اور باقی کی چیزوں کا تو پوچھیے ہی مت چیدہ چیدہ چیزیں لیتے بھی پچیس تیس ہزار لگ گئے تھے میرا تو بیوی بکس ہی لگ بھگ چالیس ہزار کا بن گیا تھا۔ آپ کی طرف کا بیوی بکس تو اس لیول کا ہی نہیں وہ تو میں نے دیکھتے ہی سوچ لیا تھا کہ یوز نہیں کرنا وہ ادھر ادھر کسی نہ کسی موقع پر آپ کی بہنوں کو ہی گفٹس دینے کے کام آجائے گا لیکن دیکھ لیں میں نے آپ سے اس بارے میں کوئی بات کی کوئی گلہ کیا۔ لڑکی کے بھی سواران ہوتے ہیں میری بھی خواہش تھی کہ مجھے سسرال کی طرف سے اچھا میک اپ ملے گا۔ اتنا شوق ہے مجھے تو اس کا۔“ وہ تڑتڑ بولے جا رہی تھی اور میں نے اس کا خوب صورت منہ دیکھتے اپنا خشک ہوتا حلق ترکیا اس کی ساری باتوں میں سے صرف ایک بات ہی تسلی بخش لگی تھی۔

”آہ اچھا۔ اب یہ جو تمہارا چالیس ہزار کا برانڈڈ امپورٹڈ میک اپ ہے یہ کم از کم دس سال کے لیے تو کافی ہو گا تمہیں۔“

”کیا۔“ اس نے گویا چیخ ماری۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیسی عجیب بات کر رہے ہیں آپ کو تو واقعی کچھ نہیں پتا میک اپ صرف ایک سال تک یوز ابل ہو سکتا ہے اس کے بعد استعمال کرنے کا مطلب اپنی جلد خراب کرنا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں میں گندہ میک اپ یوز کر کے بیمار پڑ جاؤں ایک طرف کہہ رہے ہیں میک اپ یوز نہ کرنا اور اب چاہ رہے ہیں دس سال تک وہی استعمال کروں۔ افو! آپ مرد لوگ بھی نا۔“

اسے یقیناً ”میری بات نے صدمہ پہنچایا تھا اور جو صدمہ مجھے ملا تھا اس کا کیا۔“

”چالیس ہزار کا میک اپ اور صرف ایک سال کے لیے۔ اوہ گاڈ! چلو ایک سال تک تو خیریت رہے گی گزارہ ہو جائے گا مگر باقی کے سالوں میں کیا بننے والا تھا میرا۔ میں ایک پرائیویٹ ادارے میں محنت کرنے والا ایک عام مزدور نما کھشور۔ جس کی قلیل تنخواہ کا ایک کثیر حصہ یہ بد نما میک اپ ٹیکس کی صورت ہڑپ جایا کرے گا۔ ہر سال چالیس ہزار۔ ارے نہیں بھئی قیمتیں اور منگائی تو روز بھوسے کے ڈھیر کو لگی آگ کی طرح بڑھتے جا رہے ہیں ہمارے برہائے تک تو یہ فالٹو خرچہ لاکھوں تک پہنچ جائے گا۔ کس پائل کے پتر نے بنایا تھا یہ میک اپ۔ وہ ضرور دنیا کا بد صورت ترین انسان ہو گا کم بخت خود تو مر گیا مصیبت ہمارے لیے گر گیا۔ ضرور کیڑے پڑے ہوں گے اس کی قبر میں۔“

”اچھا بات سنیں۔ میری سب سہیلیاں مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ ہنی مون پہ کب اور کہاں جا رہے ہو؟“

”کیا۔“ اب چیخنے کی باری میری تھی۔ میں نے جھٹکے سے سر اٹھایا وہ اک پل کو سسم سی گئی پھر منہ پھلائے بولی۔

”توبہ ہے آہستہ تو بات کریں میں نے ایسا بھی کیا پوچھ لیا۔ شادی کے بعد ساری دنیا ہنی مون پر جاتی ہے اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے آپ نے تو ایسے ری ایکٹ کیا جیسے کوئی انوکھی بات کر دی ہو میں نے سچ ہی تو پوچھ رہی تھیں میری فرینڈز کتنے دن ہو گئے ہماری شادی کو اور ہم نے اس موضوع پر کوئی ڈسکشن ہی نہیں کی۔ ہمیں تو یہ معاملہ بہت پہلے طے کر لینا چاہیے تھا میں تو اتنی امپریس ہوئی تھی فرینڈز



کے سامنے کہ کیا بتاؤں، اچھا بتائیں تاکہاں جائیں گے ہم لوگ؟ آپ نے کچھ تو سوچا ہوگا۔" وہ بے حد پر استیاق لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہک ہاں اگر سوچنے کا پوچھا جائے تو انسان کیا نہیں سوچتا کیا کیا ارادے نہیں باندھتا، مگر کبھی اپنا سوچا اور ارادہ بھی پورا ہوا ہے یا رے بے بسی کے میری آنکھوں میں غضب بھرنے لگا۔ ارے بھئی زرنش کے لیے نہیں اس کی ان بد تمیز سیلیوں کے لیے جنہوں نے میرے لیے اک نئی مصیبت جگادی تھی۔ کاش وہ چھچھوری لڑکیاں میرے سامنے ہوتیں تو میں ان کے گھونسلہ نما بالوں کو ایک ایک جھٹکا ضرور دیتا۔ آہ مگر کاش۔"

"بات سنو۔ ہنی کچن میں رکھا ہو گا لے آؤ۔ اور کھڑکی کھول لو مون یہیں سے نظر آجائے گا جب ہم ایک ہی چمچ سے ہنی کھائیں گے اور مل کر مون دیکھیں گے تو ہمارا ہنی مون یہیں ہو جائے گا۔" باجوہ غصے کے میں نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں اس سے کہا اس کا منہ کچھ اور کیا ہوا۔

"بہت پرانا لطیفہ ہے۔ آپ مجھے باتوں سے نہیں بہلا سکتے۔ آخر میری بھی اپنی چار دوستوں میں کوئی عزت ہے میں نے بھی انہیں ملنا ہے۔ صبح مجھے ضرور بتا دیجیے گا، ہم کہاں جائیں گے۔" اس نے چادر کھول کر سر تک تان لی تھی۔

"اوہ! دراصل بات یہ ہے تمہیں دوستوں کو منہ دکھانے کی فکر ہے۔ کچھ تو خوف خدا کرو بیوی۔ منہ دکھانے کی فکر صرف اللہ کے لیے کرو۔ بھاڑ میں جھونکو دنیا کو حد ہو گئی آخر یہ آج کل کے لوگوں کی عزت کا معیار ظاہری بھونڈی شو شاہی کیوں بن کر رہ گیا ہے۔ دنیا والوں کو دکھانے جلانے کی تک وہ میں لیے رہتے ہیں دن رات۔ ارے یہ جو دو کاندھوں پر دائیں کاندھے والا اس کے لیے بھی کوئی کام کر لیا کرو ظالمو۔ اور ابھی شادی پر اتنا خرچہ ہو چکا ہے میرا کہ کسی فالتو خرچے کے لیے تو میری جیب بالکل اجازت نہیں دے گی۔ اور اتنی چھٹیاں کر چکا ہوں آفس سے اب بھی

میرا کھڑوس باس کبھی نہ دے گا مجھے چھٹی۔ اور ویسے بھی یہ ہنی مون۔ سنی مون سب پیٹ بھروں کے مشغلے ہیں ہم جیسے لوگوں کا ان مشغل بازوں سے کیا واسطہ۔ اس لیے یہ ٹاپک یہیں کہ یہیں کھوز کرو۔ اور آئندہ کے لیے اپنی سیلیوں کو خبردار کرونا ہماری ذاتیات میں دخل اندازی مت کرس ورنہ میں تمہارا ان سے میل ملاپ بالکل برداشت نہیں کروں گا۔ بند کروں گا تمہارا ان سے ملنا تم اب میری بیوی ہو صرف۔ باقی سب فالتو کے رشتے بھول جاؤ۔ سمجھیں تم۔" اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں یہ ساری باتیں کیا میں زرنش کے ساتھ کر رہا ہوں ارے نہیں بھئی اب اپنی اتنی پیاری من موہنی سی دلہن کا نازک سادل میں یوں بے دردی سے نہیں توڑ سکتا۔ یہ سب باتیں تو میں آپ سے کر رہا ہوں۔ ویسے ایسے لیکچر بھی ضرور ملانے چاہئیں بیوی کو اس سے گرائی نہیں ہوتی۔ مجھے بھی میرے دوستوں نے بتایا تھا مگر کم بخت یہ بتانا بھول گئے کہ جاگتی بیوی کے سامنے یہ سب کیسے کہتے ہیں۔ اب میری بیوی تو سو رہی ہے ناں اور مجھے اس کی پیاری نیند میں خلل ڈالنا گوارہ نہیں۔ آخر اتنی اتنی فضول رسموں نے اسے بھی تھکایا ہے ناں۔ اور ہاں یارو تھک تو میں بھی گیا ہوں۔ اچھا اب میں بھی سونے لگا "گڈ نائٹ"



اور یہ تذکرہ ہے۔ شادی کی آٹھویں صبح کا۔ آفس کا پہلا دن زرنش نے تیاری میں میری بھرپور مدد کی تھی۔ پریس کے کپڑے پالش شدہ جوتے، ضرورت کی ہر چیز سامنے موجود بغیر کسی پریشانی کے یعنی وہ جو ہر صبح ایک ہڑبونگ میرے کمرے میں مچتی تھی اب یکسر غائب "میں تو ہر شے بکھیر کر رکھ دیتا تھا اب ہاتھ کے ہاتھ سب کچھ سمٹتا بھی گیا۔ جو کہ مجھے بے حد اچھا بھی لگا۔ انتہائی پرسکون طریقے سے ڈریس اپ ہو کر میں ناشتے کی ٹیبل پر آیا۔

"صبح بخیر امی، بابا جان۔" میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔



”جیتے رہو جگ جگ جیو۔ ماشاء اللہ بڑا پیارا لگ رہا ہے آج تو میرا بیٹا۔“ امی نے پیار بھری نظر میرے چہرے پر ڈالی۔ ان کے پیار کا انداز اب بھی وہی تھا جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں۔ میں مسکرا دیا۔ بابا جان نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔

”ہاں۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج تو ٹائی کی میچنگ بھی بالکل ریفریکٹ ہے ورنہ اس گھونچو نے تو مجھے درست ٹائی تک نہیں لگائی تھی۔ اس سے لگ رہا ہے کہ ہماری ہوسلیقہ مند ہے۔“ وہ سر ہلاتے تعریف بھی کر رہے تھے تو میرے بجائے اپنی بہو کی۔ مگر مجھے ان کے الفاظ نے عجیب سی خوشی دی۔ اب میں اور زرنش الگ الگ تو نہیں تھے ناں بھئی۔ اب میرے سارے کریڈٹس اس کے تھے اور اس کی ساری خوبیاں میری۔ ”لو جی۔ آپ نے ایک ٹائی کی میچنگ سے ہی فیصلہ کر لیا بہو کی سلیقہ مندی کا۔ بہو کے اصل ہنر تو تب کھلیں گے جب وہ گھر سنبھالے گی۔ ٹائی کا کیا ہے تو یہ تو کوئی عقل کا اندھا پکڑ کر باندھ لے۔“ بابا جان کے برعکس امی جس لہجے میں بولی تھیں۔ اس بدلاؤ نے میرے مسکراتے چہرے پر یکدم پریشان کن سنجیدگی کا پوچھا پھیر دیا۔ اس قدر اپنی ذوق رکھنے والی میری پیاری ماں بھی کیا بہو گھر لاتے ہی بدل گئی ہیں۔ کیا وہ بھی وہی روایتی ساس ثابت ہوں گی جن کی وجہ سے گھروں کے گھر بے سکونی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ یا اللہ! کیا اب مجھے بھی ایسے دن دیکھنا پڑیں گے جو آئے دن آس پاس دوستوں اور کولیگز سے سنتا رہتا ہوں۔

اف! کیا اب میں بھی وہی گیند بن جاؤں گا جسے کبھی ماں اپنے کورٹ میں ڈالنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی ہے اور کبھی بیوی۔ اوہ۔ میرے تو بس سر پکڑنے کی کسر رہ گئی تھی کہ تب ہی تروتازہ چہرہ لیے زرنش کمرے سے نکلی۔ ہلکے پھلکے میک اپ میں انتہائی خوب صورت ڈریس پہنے۔ اور اس ڈریس کو کیا کہتے ہیں۔ ٹیل فرائڈ؟ لانگ فرائڈ؟ آڑی فرائڈ؟ اوہو۔ اللہ جانے کیا اور اس کے کپڑوں کا رنگ۔ ارے بھئی اس وقت تو میرے اپنے چوکھٹے کارنگ اڑ گیا تھا۔ میں اس

کے کپڑوں کا رنگ کیا پہچانتا۔ ویسے بھی میں کون سا عمیرہ احمد، راحت جبین، سمیرا حمید یا صدف رحمان گیلانی ہوں جو سامنے والے کا سر سے پاؤں تک خاکہ کھینچ دیں۔ سارے لوازمات اور سارے رنگوں سمیت۔

ہائیں۔ کیا کہا۔ صدف رحمان گیلانی کو نہیں جانتے۔ چلیں چھوڑیں ان کو۔ باقیوں کو تو جانتی ہیں ناں۔ ہاں تو میں شکر منار ہا تھا کہ زرنش نے امی کی بات نہیں سنی ورنہ ضرور اسے دکھ ہوتا۔ اور اب یقینی سی بات ہے اسے کوئی وجہ دکھ دے گی تو کیا میں دکھی نہ ہوں گا۔ اب ہمارے سکھ دکھ سا بچے ہیں بھئی۔ وہ سیدھی کچن میں گئی تھی شازمہ ناشتا بنا رہی تھی جو وہ لاکر ہمیں سرو کرنے لگی۔

”ماشاء اللہ! بہت پیاری ہے ہماری بیٹی۔ میرے تو گھر کی رونق دو بالا ہو گئی ہے سچ میں، بچھے تو بیٹھے بیٹھے تیسری بیٹی مل گئی اور وہ بھی اتنی اچھی۔“ بابا بٹے مسکراتے اسے سراہ رہے تھے اس کے چہرے پر بھی مسکان تھی میرے اندر طمانیت سی اتری۔ کنکھیوں سے امی کو جانچا۔ جن کے چہرے پر ایک لا تعلق سا رنگ غالب تھا۔ زرنش پلٹ کر پھر کچن کی جانب چلی گئی تو بابا امی سے کہنے لگے۔

”تم بھی اگر یونہی مسکرا کر دو بول تعریف کے بچی سے کہہ دو گی تو کوئی خرچہ نہیں آئے گا تمہارا۔ وہ اب ہماری ہے ہمارے گھر کا حصہ ہے اور اس نے یہاں کیسے رہنا ہے یہ ہم نے اسے اپنے طریقے سے سیکھانا ہے۔ تم مسکراؤ گی وہ بھی مسکرائے گی۔ اور اگر ہم ہی اسے گھورنے لگے تو کوئی شک نہیں کہ وہ ہماری جانب دیکھے بھی نا۔ دیکھو بیوی مجھے گھر میں صرف سکون چاہیے، بے سکونی برداشت نہیں کروں گا میں۔ ہم ایک بیٹی لے کر آئے ہیں تو گھر سے ایک بیٹی وداغ بھی کی ہے۔ اور یہ سوچ لینا جو عمل آج بہو سے کرو گی کل کو وہی تمہاری بیٹی کے ساتھ بھی دوہرایا جاسکتا ہے اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم اچھا عمل کرو یا برا۔“ اوہو۔ یہ بابا جان کے الفاظ تھے یا کوئی امرت



دھارا جو میرے دل پر برسا تھا یعنی صرف میں نے ہی نہیں انہوں نے بھی امی کے بدلے رویے کو محسوس کیا تھا۔ بے اختیار میرا جی چاہا اٹھ کر ان کے ماتھے پر بوسہ دوں جبکہ امی نے انہیں اک سر دنگا نہ دیکھ کر میری جانب رخ پھیرا۔

”اچھا مصمصام بیٹا شادی کی ساری رسمیں تو مکمل ہو چکی ہیں خیر سے۔ اس کے علاوہ شاندانہ اور اس کے سرالیوں کی دعوت بھی بہت اچھی رہی۔ ماشاء اللہ! وہ سب ہی بے حد خوش تھے اس روز اور اس کی ساس تو بہت متاثر ہوئیں ہمارے گھر کے طور طریقوں سے۔ اور آج انہوں نے ہم سب کو اپنے ہاں ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ تم ذرا جلدی آ جانا آفس سے۔“

”جی کو شش کروں گا۔“ میں نے سر ہلایا۔  
”لیکن یہ دعوت ضروری تھی کیا؟ آپ انہیں منع کر دیتیں۔“

”ارے کیسے منع کر دیتی، بیٹی کی سسرال کا معاملہ ہے۔ پھر اب کس کس کو منع کروں گی۔ تمہارے چاچا، پھوپھی، خالہ، ماموں، جس کو منع کروں گی وہی ناراض ہو گا اور پھر جب تمہارے تایا نے تین بچے بیاہے پھوپھی نے دو تو ہم نے بھی تو سب کی دعوت کی تھی اب ریت رواج کے مطابق وہ بھی ہماری کر رہے ہیں اس میں نیا کیا ہے۔ اور بھی میں نے تو سب کو حاضری بھروی ہے۔ ہاں تمہاری وجہ سے سب کو رات کے کھانے کا ہی کہا ہے۔ اس بارے میں فکر نہیں کرو تم۔“ یہ امی کیا کہہ رہی تھیں میں نے بوکھلا کر انہیں دیکھا۔

”یعنی ہر روز کہیں نہ کہیں جانا ہو گا؟“  
”ہاں بالکل۔ اور ہاں یاد رکھنا خالی ہاتھ تو کسی کے گھر نہیں جاتے دو کلو مٹھائی تو لازمی ہوگی۔“

”کک۔ کیا۔“ میرے حلق میں نوالا اٹک گیا میں نے بے چارگی سے ابو کو دیکھا جو ہماری گفتگو سے بے نیاز نرم خستہ پرائیڈ اور مزے دار پھولے پھولے آلیٹ میں الجھے ہوئے تھے۔ اور میری تو بھوک ہی اڑ گئی بالکل اس طرح کہ جیسے ناگہانی آفات کے دنوں

میں امداد کے ٹرک اڑ جاتے ہیں۔ یا خدا! یہ میں نے شادی کی تھی یا کوئی پھندا گلے میں ڈال لیا تھا۔ یعنی کہ ایک اور اضافی خرچہ۔ افس۔ میں تو اپنے ہی بال نوچنے کے درپے ہو چلا تھا۔ اب میرے اس ری ایکشن سے آپ مجھے کتنوس بالکل مت سمجھ بیٹھے گا۔ میرا پریشان ہونا قطعاً ”فطری“ تھا۔ میں کیا کرتا۔ میری شادی کے ساتھ ہی شاندانہ کی شادی بھی ہوئی تھی۔ اب آپ خود اندازہ کر لیں دو دو شادیوں کے کتنے خرچے ہوئے ہوں گے۔ آپ کی شادی ہو گئی ہے تو آپ کو ضرور علم ہو گا اگر نہیں ہوئی تو کسی سے پوچھ لو ناں بھی۔

میرے ساتھ تو وہ ہوا جو کسی دشمن کے ساتھ بھی نہ ہو۔ ابھی فقط ڈیڑھ برس ہی تو ہوا تھا کمائیاں کرتے کہ امی جان کو میرے سرے کے پھول دیکھنے کا شوق چرا گیا۔ اب آپ ہی بتائیں ایسے ہو شریا منگالی کے دور میں۔ معمولی سی ننھاہ رکھنے والے آدمی نے کتنی سیونگ کر لی ہوگی۔ مگر کس کو کیا لگے، امی جان اور بہنوں کے ہزاروں ارمان تھے جو انہوں نے رنج رنج کر نکالے پھر شاندانہ کو بھی ٹھیک ٹھاک جیڑ دیا گیا۔ بھئی امی کا وہی مشہور زمانہ شوق کہ بس دنیا دیکھے اور دنگ رہ جائے۔ پھر چاہے خود جتنا چاہے تنگ ہو جاؤ وہ پروا نہیں پاپا جان کی تو جمع پونجی لگی ہی۔ میری شامت الگ بلائی گئی۔ ہم تو بہتر اچھے کھاتے فالتو فضول قسم کی رسموں سے اجتناب برتا جائے اور جو بھی ضروری کام کیا جائے اس میں ہاتھ ہولا رکھا جائے مگر نہ جی۔ سنتا کون۔ اور میری تو رہی سہی کسر شادی کے بعد ڈھیر ساری خزانہ قسم کی سالیوں نے مختلف موقعوں پر نیگ لے لے کر پوری کر دی۔

اب میرا تو یہ حال تھا کہ دن گن رہا تھا کہ کب سیلری ملے جبکہ امی جان میری جان نکالنے کے درپے ہو چلی تھیں۔ روز کتنا خرچہ ہو گا۔ دو کلو مٹھائی۔ آنے جانے کا پیٹرول۔ پھر اس کے علاوہ۔ میں حساب کتاب میں جت گیا۔

”ارے ہاں بھئی یہ دعوتیں تو چلتی رہیں گی مجھے یاد



آگیا تھوڑے دن ہی تو رہ گئے ہیں بڑی عید کے آنے میں۔ قربانی بھی تو ضرور کرنا ہوگی ورنہ لوگ کیا کہیں گے اتنا خرچہ کر کے بچوں کی شادیاں کر لیں۔ فرض ادا نہ کیا گیا ان سے۔ ارے بھی سچی بات ہے لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں دیے جاتے۔ آپ دونوں اس بارے میں بھی صلاح مشورہ کر کے ابھی سے سوچ لیں۔ ”امی کانیا فرمان۔ جانے بابا جان کیا کہہ رہے تھے میں ٹکر ٹکر دونوں کے منہ دیکھ رہا تھا۔ بند منہ میں زبان چل چل جا رہی تھی کہ چیخ کر کہہ دوں۔

”آپ ساری قربانیاں چھوڑیں بس مجھے ہی قربان کریں“

اف۔ دل کر رہا تھا نیمبل پر سر رکھوں اور بھیس بھیس کر کے رو دوں۔



اور یہ احوال ہے پانچویں دعوت کا۔ اور گزشتہ دعوتوں میں چاچا جی، خالہ، تایا جی، پھوپھو، نجمہ اور ذکیہ کے ہاں ہم جن حالوں سے ہو کر آئے اس کا اب کیا تذکرہ کروں بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ کل گئے تھے جن کے ہاں وہ تو رہتے بھی اللہ میاں کے پچھواڑے ہیں۔ آفس میں ایک بھرپور تھکا دینے والا دن گزار کر واپسی پر پھر نئے سرے سے تیاری اس کے بعد بھام بھاگ پورے دو گھنٹے کی ڈرائیو پھر ایک رہنگام گید رنگ اس کے بعد پھر دو گھنٹے کی ڈرائیو۔ سمجھیں گھر آتے آتے رات کا ڈیزہ بج گیا سوتے سوتے من۔ صبح سات بجے پھر نیند میں اٹھ کر شتم شتم آفس کی تیاری۔ اور اس ساری حالت کے بعد آج اپنے پورے جاب ٹائم میں۔ میں نے اپنی سیٹ پر جتنی جھپکیاں لیں اس سے کہیں زیادہ مجھے باس سے جھٹکیاں کھانے کو ملیں سارے کو لیکز میری حالت زار پر منہ چھپا چھپا کر ہنس رہے تھے اور مجھے کوئی کوتاہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہاں میں منہ چھپا لیتا۔ اوئے۔ ہوئے۔ روز روز کی اس خواری نے تو تھکا ڈالا تھا مجھے جتنا خرچہ کہیں آنے جانے میں ہو رہا تھا۔ اس سے کہیں کم بجٹ میں ہم اگر گھر پر بہت

اچھا سا کھانا کھا لیتے تو کیا برا تھا ہمیں۔ مگر مار پڑے ان رسموں رواجوں پر جو اتنے خاصے لوگوں کی چوکیں تک ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں تو گھن چکر بن کر رہ گیا تھا قسم سے۔

جو ادا ماموں، ماشاء اللہ کثیر العیال ہیں ہمارے پورے خاندان میں۔ ان کے بڑے سارے گھر میں ان کے بچوں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیوں کے علاوہ ہماری فیملی کے ہونے سے خوب رونق بنی ہوئی تھی۔ وہاں کھانے میں کیا کیا تھا؟ سب کس ٹاپک پر بات کر رہے تھے۔ کس کٹیفے پر ہنس رہے تھے؟ میں اپنے بکھرے حواسوں کے باعث کچھ زیادہ نہیں جان پارہا تھا کھانے کے بعد کشمیری چائے سرو کی گئی میں اپنا کپ لیے ڈائننگ ہال سے نکل آیا۔ بھی تو یہ بد تہذیبی مگر میں کیا کر تا وہاں سب کے درمیان بار بار بھاڑ جیسا منہ کھولنا بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ باہر اک اور ہلچل مچی تھی۔ لان میں بڑا سائیل بندھا تھا اور سب بچے اس کے ارد گرد اسے چھو کر چارہ کھلا کر خوش ہو رہے تھے۔

”یہ نیل دیکھا کتنا خوب صورت ہے ماشاء اللہ“ قربانی کا جانور ہے ناں علیحدہ ہی روپ ہے اس کے وجود پر۔ ”زر نش میرے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

”کتنے خوش ہیں ناں سب اور سہا کی رونق دیکھ کر تو میرا بھی دل کر رہا ہے ہمارے بھی صحن میں ایک بڑا حسین سائیل بندھا ہو۔ جسے میں اپنے ہاتھ سے چارا کھلاؤں اس کے ماتھے پر مندی سے چاند تارا بناؤں“ گلے میں رنگ برنگے پھولوں والا ہار ڈالوں“ ہائے ان بچوں کو دیکھ کر تو مجھے بھی اپنا بچپن یاد آگیا۔ کتنا مزا آتا تھا ناں۔ کیا دن تھے وہ بھی، اور اب تھوڑے دن تو رہ گئے ہیں عید میں اور پھر قربانی کے جانور کی خدمت کرنے کا تو بڑا ہی اجر و ثواب ہے۔ آج امی کا بھی فون آیا تھا بابا جان نے بھی جانا تھا منڈی اور میری فرزند ہے ناں گل زارا اس کے میاں تو لے بھی آئے بکرا۔ وہ بتا رہی تھی کہ اتنا خیم خیم اور۔“

اوہ گاڈ! ایک تو یہ زر نش بولتی بہت ہے اور نہایت



ہی بے تکا بولتی ہے میری اچھی بھلی کشمیری چائے پکد مہی بد مزہ ہو گئی جی میں تو آئی کپ زور سے فرش پر تنخ دوں اور خود ایک چھوٹے بچے کی طرح فرش پر لیٹ کر ایزیاں رگڑ رگڑ کر روؤں اور روتے روتے سو جاؤں۔ کتنا کما تھا سب نے بڑی عید کے بعد شادی کی تاریخ رکھوا لو۔ آٹھ ماہ رہی بھی زرنش کے ساتھ میری منگنی اور یہ میرا ہی شوق تھا۔ بہت محبت ہو گئی تھی مجھے اس سے، میری ہی شدید خواہش تھی کہ چھوٹی عید تو جیسے تیسے گزر گئی اب کم از کم بڑی عید تو میں اس کے ساتھ گزاروں۔ اور اب گزارو بیٹا۔ رنج رنج کر گزارو، بلکہ بھگتو آج جانور کی فرمائش آئی ہے کل شاپنگ کی ہوگی پھر اس کے بعد۔

اب یہ سلسلہ رکنے والا نہیں ہے دل بڑا کرلو، کمر کس لو، اتر آؤ میدان میں، بھول جاؤ وہ دن بہار کے، جب سب ہری ہری سو جھتی ہے اب تو بال کی بھی کھال اترے گی، بچو۔ وہ بھی صحیح معنوں میں۔ اب بس بھی کریں کوئی آگیا تو کیا کہے گا۔ زرنش خوا مخواہ شرمائی مسکائی میں جو اپنے آپ میں گم خود کو کوستا بے دھیانی میں اسے ہی دیکھے جا رہا تھا اس کی ادا پر جھنجلا کر رخ ہی پھیر گیا۔ اب۔ یہ بیوی بھی مل گئی بڑے امتحان کا چھوٹا سا نام ہوتا ہے۔ کاش پہلے کوئی مجھے یہ بات سمجھاتا۔

”ماموں آپ کا نیل بے حد خوب صورت ہے۔“ سامنے سے ہی جواد ماموں چلے آ رہے تھے کھانے کے فوراً بعد وہ نماز عشاء کی ادائیگی کے لیے مسجد چلے گئے تھے سفید بے داغ کپڑوں میں چنی سفیر ٹوپی سر پر لیے بارعب اور پر نور چہرے والے ماموں جنہیں دیکھتے ہی زرنش بہت جوش و خروش سے بولی تھی جس پر وہ ہلکا سا مسکرا دیے۔

”یہ میرا کہاں ہے بیٹا یہ تو میرے اللہ کا ہے۔ میرے پاس تو مہمان آیا ہے۔ چند دن کے لیے۔ میں کچھ دن اس کی مہمان نوازی کر لوں تو بڑی سعادت ہے۔ میرا مالک اسی کے صدقے میرے گھر میں بھی برکت اتار دے۔“ نیل کو پیار بھری نظروں سے

دیکھتے۔ ماموں بولے تھے زرنش نے جتنا قی نظروں سے اسے دیکھا۔

”بالکل ماموں جی۔ میں بھی ابھی ان سے یہی بات کہہ رہی تھی اب کتنی کے دن تو رہ گئے ہیں عید میں اب ہمیں بھی قربانی کے لیے جانور لے لینا چاہیے۔ بہت ثواب ہے ان کی خدمت کا تو۔“

”بے شک۔ اللہ توفیق دے۔ اور ہم سب کی نیوٹوں اور اعمال کو قبول کرے۔“ ماموں کا انداز دعائیہ تھا۔ مجھے زرنش پر غصہ آیا تھا بھلا ان کے ساتھ یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہے میں نے اسے وہاں سے دوڑانے کی سوچی۔

”زرنش جاؤ۔ ماموں کے لیے چائے لے کر آؤ۔“ ”اوہ ہاں! ماموں جی نے تو چائے پی نہیں تھی میں ابھی لے کر آئی۔“ صد شکر وہ فوراً تابعداری سے چل دی۔ میں یوں ریلیکس ہوا گویا انکی سانس بحال ہوئی۔ ماموں نے بچوں سے کہہ کر دو کرسیاں منگوالی تھیں ایک پہ خود فروکش ہو گئے ایک مجھے مرحمت فرمائی۔

”کیا بات ہے میاں مصصام عبید موسوی بہت تنگ ہوئے اور کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ انہوں نے تو مجھ سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا مگر میرے تو جیسے کسی نے زخم چھیر دیئے تھے۔ ویسے بھی میں ماموں کو بچپن سے ہی اڈا کرتا ہوں ان کی شخصیت میں بے شمار خوبیاں ہیں جنہیں اس وقت احاطہ تحریر میں لانا میرے لیے ممکن نہیں (بھئی اپنے حواس جو یکجا نہیں) ماموں کے تو بولنے بات کرنے کا انداز اتنا اچھا اتنا پیارا ہوتا ہے کہ بے اختیار سب کچھ کہہ دینے کو دل گرتا ہے اس پل میری ساتھ بھی یہی ہوا ہے تو جیسے کس سائی (سامع) کی ضرورت تھی (جی ہاں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کیا یارم صرف آپ نے ہی پڑھ رکھا ہے) میں جو بولنا شروع ہوا تو اپنے اندر غبار بن کر اودھم مچاتے تمام کے تمام الفاظ ان کے سامنے دھکیل پا کر کیے ماموں مہرہ لب سب سنتے گئے جب میں نے تھک کر منہ بند کیا تو انہوں نے میرا کاندھا تھپکا۔



”بس بیاباں ہے سمجھنے کی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج کہ انسان نے سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور اسی لیے وہ اتنے مسائل کا شکار ہے اور خاص طور پر ہم لوگ جن کے لیے باری تعالیٰ نے بے شمار آسانیاں رکھیں۔ زندگی یہ سب اصول ہمیں سکھلائے۔ اور اسے اتنا خوب صورت بنایا گویا پھولوں کی نرم بیج۔ مگر افسوس ہم نے خود اپنی نا عاقبت اندیشی سے اس پر جھاڑ کے کانٹے اگالے ہمیں تو یہ بتایا گیا کہ دیانت کو اپنا شعار بناؤ۔ قناعت پسند بنو۔ اسراف مت کرو، ایثار کرو، نمود و نمائش سے بچو۔ اسی میں تمہاری فلاح ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اپنی نیت صاف اور دل کشادہ رکھو۔ ایک کام جسے آپ دنیا دکھاوے کے لیے بہت سی دنیاوی دولت خرچ کر کے بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں تو اللہ بے نیاز ہے۔ اسے آپ کے ایسے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر وہی آپ ایک جھوٹا سا عمل مکمل دلی اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں تو کوئی شک نہیں کہ وہ در قبولیت تک رسائی پا جائے۔“

بس میرے بچے ہمیشہ سے دھیان رکھو کہ نیت میں کھوٹ نہ ہو۔ جتنا ہم اپنے سماجی معاملات کی فکر کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہمیں اپنے دینی فرائض کی پروا کرنا چاہیے۔ وہ کتنا اچھا ہوتا جو شادی کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کرنے سے قبل آپ قربانی جیسے اہم فریضے کے لیے بھی ایک مخصوص رقم محفوظ کر لیتے۔ اور آپ کو میرے طریقے کار کا بھی پتا ہے مصمصام بیٹا ہر ماہ اپنی آمدن میں سے کچھ حصہ ایک طرف بچا مارتا ہوں اور اس لیے اللہ کے کرم سے ایسے کسی بھی موقعہ پر پریشانی نہیں ہوتی۔ ماموں بتا رہے تھے اور میرا سر جھکا ہوا تھا۔ اور مجھے پتا تھا ان کے طریقہ کار کا اور ہم بہت سے لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں ان کے اصولوں کو پسند بھی کرتے ہیں اور یہ بھی علم رکھتے ہیں کہ اگر ہم بھی عمل کریں گے تو بہتر نتائج پائیں گے مگر جانے کیوں ہماری عادت سی بن گئی ہے ہمیشہ اس بات کو اپنائیں گے جہاں ہمیں امید ہو کہ اس پر واہ واہ کے خوب ڈونگر برسیں گے۔

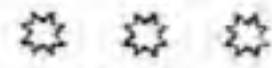
ہم اس دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں اس دنیا کا سامنا کرنا ہوتا ہے ہمیں ہر وقت میں دنیا کی ہی فکر ہے۔ تو کیا ہمارے لیے یہی دنیا ہے؟ ہمیں یہاں کے ہر کام اور اس کی مکمل تیاری کی سُنش رہتی ہے مگر اگلی دنیا اگلے سفر کے لیے کیا زور اور ضروری ہے؟ اسے کیوں بھلائے بیٹھے ہیں ہم۔ میرے اللہ نے تو ہمارے لیے بہت سی آسانیاں رکھیں۔ ہمارے ہر نیک عمل کو ہمارے لیے نجات کا ذریعہ قرار دیا تو کیا ہمیں یقین ہے کہ ہمارا ہر عمل نیک ہوتا ہے اوہ۔ میرے خدا! میرا سراور نہیں اٹھ رہا تھا۔ ماموں کا ہاتھ ایک بار پھر میرے شانے پر آٹھرا۔

”مصمصام بیٹا ہمارے دین میں کوئی سختی نہیں۔ میرے مولانا بہت کرم کیا ہے اپنے بندوں پر۔ وہ ان کے سب دکھ سکھ جانتا ہے۔ تم یوں پریشان مت ہو۔ وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ معاف کرنے والا ہے۔ اگر اس بار تمہارے پاس گنجائش نہیں ہے تو اگلی بار یہ فریضہ ادا کر لینا اور رہی بات زرنش بی بی کی خواہش کی تو میثادہ اب تمہاری شریک حیات ہے تمہاری زندگی کا حصہ اس کی ہر امید اب تم سے ہے۔ اس کی سب خوشیاں تمہارے ذمہ ہیں اور اسی طرح وہ بھی تمہاری ہر آسانی اور پریشانی میں ساتھ دار ہے۔ تم نے اسے اپنے موجودہ حالات نہیں بتائے جو تمہارا اس پر کم اعتمادی کا اظہار ہے۔ جبکہ میں یہ کہوں گا اپنی ہر اچھن سے آگاہ کرو۔ اسے بتاؤ تاکہ وہ کسی بھی متوقع بے گمانی کا شکار نہ ہو اللہ نے اسے تمہارا عمر گسار بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن جب تم ہی اسے بے خبر رکھو گے تو وہ کیسے سمجھے گی ہر بات ہر مسئلے کو بے شک ”ایک چپ سو سکھ۔“ والا مقولہ جھوٹا نہیں لیکن بیٹا زندگی میں بہت سے مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں بولے بنا درستی نہیں آتی۔ تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات۔ میں بالکل ہی گوئے کاگز کھانے بیٹھا تھا انہوں نے بغور میرا چہرہ دیکھا میں نے بمشکل ایک مسکان کھینچ کر ہونٹوں پر سجائی۔

”شباباش“ میرے بچے۔ دیکھو دن اور رات تو زندگی کا لازمی جز ہیں۔ بات یہ ہے کہ اجالا دیکھ کر کبھی آپے



سے باہر نہ ہونا اور اندھیرے میں کبھی گھبراتا نہیں۔ پھر دیکھنا کیسے سب کلفتیں دور ہوتی ہیں۔ ”یہ ماموں کی حوصلہ دیتی مسکراہٹ ہی تھی جس نے میری تھکان دور کر دی۔ پھر امی بابا جان اور باقی سب بھی باہر آگئے تو بہت دیر تک محفل جمی رہی۔



اور اگلے ہی دن ناشتے کی ٹیبل پر امی جان نے پھر سے ”مسئلہ قریانی“ چھیڑ دیا۔

”بھئی بھئی پوچھو تو میرے سر پر تمہاری ہی وجہ سے قرض چڑھ گیا تھا۔“

”میری وجہ سے؟ ہائے ہائے مجھے کون سے سونے

کی دس بیس سیٹ بنا کر دے دیئے آپ نے۔“ بابا

جان چڑکریو لے تھے تو جواباً ”امی کا سچا ہونا بھی بنتا تھا۔“

”بس تمہاری ہی کسر رہ گئی تھی۔ باقی جو تمہارے

مشوروں پر اتنا خرچہ ہوا وہ سمجھاتا بھی رہا کہ اللہ کی

بندی بے دریغ خرچ مت کرو۔ مگر تم نے جینے دیا ہے۔“

آخری دنوں میں مجبور ہو کر کچھ قرض لے لیا تھا۔ اب مجھے

بتاؤ میں گھر کے خرچے ضرورتیں پوری کروں یا پھر

تمہاری نیت کے مطابق دنیا دکھاوے کو قریانی جیسا

متبرک فریضہ ادا کروں۔ بتاؤ کہاں سے کروں سب۔“

اب تم اتنا بھی جانتی ہوگی قریانی نہ ادھار سے ہوتی ہے

نہ قرض دار پر فرض۔ یہ تو خلوص نیت سے ہوتی ہے

فقط رضائے الہی پانے کے لیے اگر وہی تم پہلے میری

بات مان کر بہت سے غیر ضروری خرچوں اور اپنی

فضول شاپنگ کی قریانی دے دیتیں تو اب ہم بھی اس

قابل ہوتے مگر اب میں بہت مجبور ہوں اس روز بھی

معذرت کی تھی آج پھر کر رہا ہوں ایک ہی بات بار بار

دہرا کر مجھے شرمندہ نہ کیا جائے پلیز۔“ بابا بچ پریشان

تھے اور ان کے کندھوں پر قرضے کے بوجھ کا تو بھی

اس وقت ہی پتا چلا جس نے مجھے بھی سوچ میں ڈال

دیا۔ وگرنہ تو میری رات ہی ماموں سے بات ہو گئی تھی

ان کے ٹیل میں ایک حصہ دار کم تھا اور میرا ارادہ تھا کہ

سیلری ملتے ہی انہیں رقم ادا کروں گا۔ اب الگ سے

جانور خریدنے کی تو استطاعت پچی نہیں تھی۔ پھر جب میرے اللہ نے ہم جیسوں کے لیے ”مسکون پیکیج“ جو رکھے ہوئے ہیں تو ان سے فائدہ لیا جائے یہی سوچ رکھا تھا مگر اب تو یہ بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ ناشتا جوں کا توں ہمارے آگے دھرا تھا۔ امی دونوں ہاتھوں پر سر رکھے بیٹھی تھیں۔ بابا جان کا موڈ آف، زرنش بھی سر نیہو ڈائے کسی سوچ میں گم تھی میں نے گلا کھنکارا۔

”بے شک قریانی بے حد اہم اور بابرکت فریضہ

ہے۔ خواہش تو میری بھی تھی کہ ہم ادا کرتے مگر

میرے خیال میں بابا جان پہلے قرض کا ادا کرنا ضروری

ہے۔“

”بالکل ضروری ہے۔ کیونکہ قرض دار شرعی حکم

کے مطابق قریانی ادا نہیں کر سکتا۔ ہے ناں بابا جان!“

ہماری طرف آتے ہی غم نے میری بات سن لی تھی اور

وہ بولا تھا۔ بابا نے اسے صرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور سر

جھکا لیا۔

”ڈونٹ وری بابا جانی۔ آپ قرض کی اماؤنٹ

بتائیں۔ ہم سب مل کر ادا کریں گے۔ یہ ہم سب کا

مشترکہ مسئلہ ہے۔“ غم نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا

تھا۔

”بالکل۔ بلکہ یہ ہماری وجہ سے ہی تو مسئلہ ہے۔“

مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ ان کی پریشانی کا پورا پورا

احساس تھا مجھے۔ بابا جان نفی میں سر ہلاتے رہے تھے۔

”کوئی اتنا زیادہ بھی نہیں ہے تم لوگ پریشان مت

ہو۔“

”ارے کیسے پریشان نہ ہوں۔ اب یہ قرض ہمارے

سر سے اترے گا تو ہی ہم کوئی اگلا قدم اٹھا سکیں گے۔

گھر کی خوشیوں کا سوال ہے پلیز بابا۔“ میں نے منت

کی۔

”تو اور کیا۔ اور یہ میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ

میری شادی کے سب انتظامات آپ کریں گے جیسے

آپ کو مناسب لگے۔ چاہیں تو سیدھا مسجد میں لے

جا کر نکاح پڑھا لیجیے گا۔ نوٹیشن۔“ غم نے بھی لقمہ



دیا تھا۔ سب کے بچے چروں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔  
پھر بابا کے بتانے پر میری اور ان کی سلیری، ضمیمہ کی  
سیونگ، امی کا خفیہ کھانا سب مل ملا کر اتنے ہو گئے کہ  
تمام قرض ادا ہو سکتا تھا اور اس کے علاوہ بفضل تعالیٰ  
سنت ابراہیمی بھی۔

ہم حساب کتاب میں الجھے تھے کہ میں نے زرنش  
کو اٹھ کر جاتے دیکھا۔ اور کچھ دیر میں اس کی واپسی  
ہوئی تھی مگر خالی ہاتھ نہیں ایک پھولا ہوا سا ہینڈ بیگ  
لا کر اس نے بابا کے سامنے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے سر  
اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس میں وہ رقم ہے جو سلامی میں اکٹھی ہوئی  
تھی۔ اب جب آپ سب کی سیونگز قرض کی مد میں  
چلی جائے گی تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ پھر اور بہت سی  
ضرورتیں۔ اس لیے بابا جان یہ آپ رکھ لیں۔“ وہ  
جھکے سر سے کہہ رہی تھی۔ میں نے بابا کی آنکھوں میں  
ایک چمک اترتی دیکھی اور میرا ہنسل عجیب خوشی سے  
بھر گیا۔ وہ مجھے اتنی پیاری اس لمحے سے پہلے کبھی نہ لگی  
تھی۔

”دیکھا بیگم میں نہ کہتا تھا میری بیٹی بہت اچھی  
ہے۔ نہایت حساس اور سمجھ دار۔ جیتی رہو بیٹا۔ خوش  
رہو۔“ بابا نے امی سے کہا پھر اسے دیکھا۔

”لیکن بیٹا یہ آپ رکھو اپنے پاس۔ یہ سب آپ  
کے ہیں۔ ان پر صرف آپ کا حق ہے آپ انہیں جیسے  
چاہو خرچ کرو۔“ انہوں نے بیگ اس کے آگے کھسکا  
دیا تھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مگر بابا۔“ زرنش نے کچھ کہنا چاہا کہ انہوں نے  
ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں روک دیا پھر اس کا سر تھپتھا کر  
چلے گئے۔ اس نے میری جانب دیکھا۔ میں نے مسکرا  
کر سر ہلا دیا۔

”زرنش بچے اٹھا لو بیگ۔ اگر گھر میں ضرورت  
پڑے گی تو پھر تم، ہم سے الگ تو نہیں ہونا بیٹانی الحال  
رکھو انہیں اپنے پاس۔“ امی بھی اس سے کہہ رہی  
تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی میں نے طمانیت بھری  
مسکان دیکھی۔ چار ونا چار زرنش نے بیگ اٹھا لیا۔

میں اس کے پیچھے ہی کمرے میں آیا تھا۔  
”تھینکس۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔  
”کس بات پر۔“ اس نے مھنویں اچکائیں۔  
”تم بہت اچھی ہو۔“ میں نے پیار سے اس کا  
حیران چہرہ دیکھا۔

”آہم۔ وہ تو میں ہوں۔ پتا ہے مجھے۔ لیکن دکھ ہے  
کہ آپ اتنے بھی اچھے نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔  
یہ کل خبر ہوئی ہے۔“  
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں تو دل میں آئی ہر بات کر لیتی  
ہوں آپ سے مگر آپ اتنے کے ہیں جو دل میں ہوتا  
ہے وہ بتاتے نہیں۔“ وہ ہاتھ پھڑا کر پرے جا کھڑی  
ہوئی۔

”میرے دل میں تو بس تم ہی تم ہو۔ میں مسکراتا  
آگے بڑھا۔

”بس جانیں دیں بتائیں مت مجھے۔“ وہ روٹھی  
روٹھی اور پیاری لگ رہی تھی۔ میں جانتا تھا وہ کن  
باتوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی مگر اسے ستانے کو  
بولا۔

”کیا یہ قوف۔ ارے بھئی وہ تو تم بنی بنائی ہو۔ میری  
کیا مجال کہ میں بنا سکوں۔“ اور اس نے مجھے گھور کر  
دیکھا تھا میں زور سے ہنس دیا۔

تمہاری اپنی لکھی ہوئی



فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے



”جہاں تمہارے اندر بہت سی خوبیاں ہیں وہاں مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ تم دور سے 007 کی بھانجی بھی لگتی ہو۔ کل جب میں اور ماموں باتیں کر رہے تھے تو پھلوں کے پیچھے لہراتا تمہارا بوٹا میں نے دیکھ لیا تھا۔“ میں نے مزے سے بتایا زرنش کا ذرا سا منہ کھلا پھر وہ خفگی سے بولی۔

”وہ تو میں ویسے ہی وہاں سے گزری تو آپ کے کچھ لفظ میرے کانوں میں پڑ گئے اور یقین کریں مجھے بہت دکھ ہوا۔ جب میں نے پہلی بار آپ کے سامنے قربانی کے حوالے سے بات کی تھی آپ اس وقت مجھے کھل کر بتا دیتے تو کیا میں دوبارہ آپ سے کوئی ذکر کرتی۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا۔“

”غلط بات یہ نہیں ہے دراصل میں تمہاری امید تو زنا نہیں چاہتا تھا مجھے اللہ پر بھروسہ تھا کہ ضرور وہ میری مدد کرے گا۔ مگر تمہارے سامنے ہی میرے حالات ہیں۔ میں خود بہت تھک چکا تھا فالٹو کی تین روایتیں نبھا کر بس اللہ ہم لوگوں کو ہدایت دے، ہم دنیاوی رسومات کی ادائیگی سے زیادہ اپنے مذہبی فرائض کی جانب دلی خلوص سے متوجہ ہو جائیں۔ اور سچ مانو تو ان گزرے دنوں میں خوب نصیحت ملی ہے کہ پہلے وہ کام کرو جو ہماری اس دنیا کو ہی نہیں بلکہ آخروی سفر کو بھی سہل بنادیں۔ اور تم نے سنا ہو گا ماموں کیا بتا رہے تھے۔ میں اپنی ساری آمدن تمہارے حوالے کر دیا کروں گا۔ بس اسے سنبھال کر خرچ کرنا تمہاری ذمہ داری۔“

”کیا۔۔ یعنی سب سے مشکل کام مجھے سونپ رہے ہیں۔ مجھے تو حساب کتاب نہیں آتا۔“ وہ گھبرا کر گویا ہوئی۔

”آجائے گا۔ جب اپنا گھر سنبھالو گی تو سب آجائے گا۔ یہ گھر تمہارا میں تمہارا سب کچھ تمہارا تو اب سیکھنا تو پڑے گا ناں۔“ میں نے اس کے شانے پر بازو پھیلا کر ساتھ لگا لیا وہ پرسوج انداز سے سر ہلا رہی تھی۔ ”پریشان مت ہو۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ

ہوں۔ جہاں تم لڑکھڑاؤ گی میں سنبھال لوں گا۔ جہاں میں ڈمگایا تم میرا سہارا بن جانا۔ اس طرح مل جل کر ہر راستے پر سفر پر چلیں گے تو ہر منزل آسان تر ہو جائے گی اور میں چاہوں گا کہ ہماری زندگی میں پہلی ترجیح ہمیشہ اس عمل کو دیں جو ہمیں اس دنیا میں نہیں بلکہ ہمیں اس دنیا میں سرخروئی دلو اسکے جو ابدی ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔“

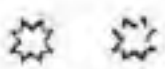
”ان شاء اللہ۔ ایسا ہی ہو گا۔“ اس کے چہرے پر مدہم سی مسکان پھیل گئی۔ مجھے لگا کمرہ کچھ اور روشن ہو گیا ہے کھلی کھڑکی سے اندر آتی سورج کی کرنیں بتا رہی تھیں کہ سفر عروج کی جانب گامزن ہے اور ایک سخت مجھے یاد آیا میں تو ناشتا کر رہا تھا اور مجھے آفس جانا ہے۔

”اوہ یار تم نے مجھے یاد ہی نہیں کرایا۔ اف پھر۔“ اس کی جھنجھکیاں۔ ”میں جلدی سے اٹھا لپک جھپک جھپک کر نکلتی ہوں۔“

”اف! آپ کتنا ڈرتے ہیں اپنے پاس سے۔“ زرنش ہنس رہی تھی میں یک سخت نہمہ گیا۔ ”کیا واقعی میں ڈرتا ہوں؟“ میں نے سوچا۔ پھر میں مسکرا دیا۔

”ماں واقعی میں ڈرتا ہوں۔ مرنے والا نف باس سے نہیں بلکہ اس بے عزتی سے جو وہ چار بندوں کے سامنے بے دھڑک کر دیتا ہے۔ اور میرے خیال میں ہم سب کو ڈرتا چاہیے اس ذلت سے جو ہمیں اس روز اٹھانا پڑے گی جب کوئی بھی مددگار نہیں ہو گا۔ اسی لیے ڈرتا ہی اچھا۔ کیا خیال ہے؟“

”بالکل۔“ زرنش نے پوری شد و مد سے سر ہلایا۔ اور میں مطمئن ہو کر باہر کوچل دیا۔ آج بہت سی ذہنی الجھنوں سے نجات مل گئی تھی۔ اور دل کو یقین تھا ہماری اس بار کی عید ضرور انوکھی اور خوب صورت عید ہوگی۔ کیونکہ جب جذلوں کو خالص کرنے کی کوشش شروع کر دی جائے تو پھر کوئی شک نہیں کہ زندگی گھرنگ نہ ہو۔







رسم ہے۔ وہ تو آپ کی خوشی کی خاطر اس نے اعتراض نہیں کیا ورنہ وہ تو سرے سے ان مہندی مایوں کی تقریبات کے ہی خلاف ہے۔ سادگی سے کرنا چاہتا تھا شادی۔

ام ہانی کو ذرا سا حوصلہ ہوا۔ بھلا شادی کے دن نہ آنے کا کیا جواز پیش کرے گا۔ آہی جائے گا۔ بس ایسے ہی ڈر رہا ہے۔

”چلیں۔ جیسے اس کی خوشی۔“ نائلہ نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

”کوئی بات نہیں۔ خیال اس کا بھی درست ہے۔ آپ آئیں بیٹھیں تو سہی۔ مہ پارہ انہیں ہانی کے قریب لے جاؤ۔“

ام ہانی پیلے روٹے سے سر ڈھانے خود کو ڈھارس دے رہی تھی کہ یہ شخص خالی خولی دھمکی ہے۔ سالار اعظم جیسا سمجھ دار انسان ایسا نہیں کرے گا اور۔ اور پھر رات کو ان سب ہنگاموں سے فارغ ہونے کے بعد بالا خرہ اسے منالے گی۔ منت سماجت کر کے محبت سے کسی بھی طرح بس تھوڑی دیر تک۔

اور یہ تھوڑی دیر سالار کے لیے بہت طویل مدت کے برابر تھی۔

اپنے کمرے کی نیم تاریکی میں بیٹھا ہاتھ میں پکڑے فون کو بے تاثر نگاہوں سے تکتا سالار خوش رنگ زہر کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

نشہ جیسے جیسے اس کے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔ ام ہانی کی جانب سے کسی مہیج یا کل نہ آنے کی جھنجھلاہٹ اور کوفت رفتہ رفتہ طیش میں بدلتی جا رہی

ام ہانی اس نئی فرمائش۔ شرط مطالبہ۔ یا ضد جو بھی یہ تھا۔ اس پر حق دق سی رہ گئی۔ جواب میں ایک لفظ تک نہ تھا کہنے کو۔

نہ معذرت کا نہ اپنی مجبوریاں بیان کرنے کے لیے نہ اس سے رحم کی اپیل کر سکی۔

نہ نظر ثانی کی درخواست۔۔۔ بس مردہ ہاتھوں سے فون ایک طرف رکھ کے سالار کے الفاظ اور لہجے کو یاد کرنے لگی۔ بہت غور کرنے پہ بھی ان پہ کسی قسم کے مذاق کا شائبہ نہ ہو رہا تھا۔



”اٹھو بھئی۔ نیچے چلو۔ رسم ہونی ہے۔“ مہ پارہ ایک دو لڑکیوں کے ہمراہ شور مچاتی اندر آئیں۔

”لہنگائیں پکڑیں گی آئی کا۔“ بلی بڑے شوق سے آگے بڑھی، کسی معمول کی طرح ان کی سنگت میں کمرے سے نکلتے نکلتے ام ہانی نے بڑی بے بسی اور رحم طلب نظموں سے بیڈ پر پڑے فون کو دیکھا۔ جہاں سے حکم صادر ہو چکا تھا۔

اور اس نے خالی خولی دھمکی نہیں دی تھی۔ وہ واقعی نہیں آیا تھا۔ نیچے اماں نائلہ اور مہ پارہ سے معذرت کر رہی تھیں۔

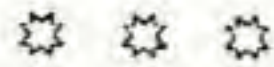
”دراصل سالار کو یہ مہندی وغیرہ کی رسمیں پسند نہیں ہیں اسی لیے نہیں آیا۔“

”مگر آنا تو چاہیے تھا۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ مہ پارہ کو اللہ موقعہ دے اعتراض اور نکتہ چینی کا۔

”بس۔ وہ اس کا کہنا ہے کہ یہ خالفتا“ خواتین کی



تھی۔



ناچتے گاتے۔ مست خوش حال سب کے سب  
زہر لگ رہے تھے مجھے ان سب کی محبتوں سے میرا  
ایمان ہی اٹھ گیا۔ حتیٰ کہ امی کی مامتا سے بھی۔ بڑے  
دادا جی کے لاڈ سے بھی۔

اگر ان سب کو واقعی مجھ سے محبت ہوتی تو کیا  
میرے چہرے سے میرے دل کا درد نہیں جان سکتے  
تھے۔

اور اگر جان رہے تھے۔ ہلکا سا شائبہ بھی ہوا تھا تو  
نظر انداز کیسے کر رہے ہیں۔ خوشیاں کیسے منا رہے  
ہیں مجھے اس آگ میں جلتا دیکھ کے بھی۔

رسم ہو رہی تھی مہندی کی۔ اور میں ایک کونے  
میں کھڑا شعلے برساتی نظموں سے یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہا  
تھا۔

سب سے پہلے خالہ بتول کو آگے لایا گیا۔ رسم کی  
ادائیگی کے لیے۔ اور وہ اپنا بھاری بھر کم وجود سنبھالتی





ام ہانی کے پاس بیٹھ کے اس کے ہاتھ پہ شگن کی ہندی لگانے لگیں۔ کسی چھپھورے نے گانا لگا دیا۔

ہندی ہاں سجدی

جے نچے کڑی دی داوی

اور شور مچ گیا۔ ام ہانی کے منہ میں ذرا سی مٹھائی ٹھوستی ہوئی خالہ بتول نے پہلے تو لجا کے شور کرتی لڑکیوں ہالیوں اور ہو بیٹیوں کو واجی سا گھورا۔ پھر ٹھنوں پہ ہاتھوں کا دیاؤ ڈال کے انھیں اور تین چار ٹھمکے ہلا دیے۔

پھر تو جیسے سب کی باری آگئی۔

ہندی ہاں سجدی۔

جے نچے کڑی دی ہاں۔

اور امی جی رسم کی ادائیگی کے بعد شوپہر سے انگلی لگی ہندی صاف کرتے ہوئے بس ذرا سا ہاتھ ہلا کے رہ گئیں۔ شاید یہی تھا ان کا ڈانس۔ سب پھر بھی یوں تالیاں بجا کے داد دینے لگے۔ اب مہ پارہ پھوپھو کی باری تھی۔ میں خود پر جبر کرتے ہوئے یہ سب تماشا دیکھنے پہ مجبور تھا۔

”ہندی ہاں سجدی۔“

جے نچے کڑی دی پھوپھی۔

اور کڑی دی پھوپھی تو پھر ایسا جھوم کے ناچی کہ خالہ بتول کو پکڑ پکڑ کے انہیں ہٹھاتا پڑا۔

نجانے مجھے کیا ہوا۔ میرے قدم خود بخود آگے بڑھنے لگے اور راستے میں بھنگڑا ڈالتے نیاز ماموں نے مجھے پکڑ کے اس واہیاتی میں شامل کرنا چاہا۔ مگر میں ان کا بازو جھٹک کے آگے بڑھتا گیا۔ ایک پل کے لیے بھی نظر ام ہانی سے ہٹا نہیں پار ہاتھ۔

اور عین اس وقت جب امی کی کوئی قربی سہیلی ام ہانی کو ہندی لگانے کی نیت سے انھیں۔ میں ام ہانی کے بالکل نزدیک بنجوں کے بل بیٹھ چکا تھا۔ اور وہاں رکھے بڑے سے سجے سجائے تھال میں موجود تیل، اینٹن اور ہندی کی پیالیوں میں سے ہندی میں اپنی انگلی بھگو چکا تھا۔

”اوسے۔ منڈے نہیں کرتے یہ رسم۔“

خالہ بتول نے لکارا۔ مگر امی نے ٹوک دیا۔ ”رہنے دیں ناں خالہ جی کرنے دیں اسے اپنا شوق پورا۔“

ہندی ہاں سجدی

جے نچے منڈے داماما۔

نیاز ماموں کے ناپنے پہ سب تالیاں بجا بجا کے داد دے رہے تھے اور میں ہندی میں بھیگی انگلی لیے گھونگھٹ سے ذرا سا جھٹکتا ام ہانی کا کھیرایا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ جسے اس نے فوراً ہی آچل کے اندر کر لیا۔ پھر بھی میں نے مضبوط گرفت کے ساتھ اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے سامنے کیا کہ اس پہ ہندی لگا سکوں۔ مگر اب وہ سختی سے مٹھی بھینچ چکی تھی۔ میں نے اس کا گھونگھٹ ہٹکا سا ہٹایا۔ زرد رنگ میں اس کی رنگت بھی زرد تھی۔ چہرے پہ ایک خوف و ہراس۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے اس کی مٹھی کھولنا چاہی تو اس بار وہ مزاحمت نہ کر سکی۔

ہندی ہاں سجدی

جے نچے کڑی دی بہن۔

اب پہلی اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی اس لیے میری جانب کوئی متوجہ نہ تھا سب اس کی قلابازیاں دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہندی سے اس کی ہتھیلی پہ اپنے نام کا پہلا حرف ایس لکھ دیا۔

وہ جو نظر حرم کا چکی تھی۔ ایک بار پھر مجھے دیکھ کے رہ گئی۔ اس کی نڈا ہوں میں گلہ تھا شکوہ تھا ناراضی تھی۔

مگر اتنی نہیں جتنی میری نڈا ہوں میں تھی۔ شاید اسی لیے وہ تاب نہ لا سکی۔ نظر بھی چرا لی اور گھونگھٹ بھی کھینچ کر خود کو ایک بار پھر مجھ سے چھپا لیا۔ میں بو جھل قدموں کے ساتھ اٹھ کے وہاں سے جانے لگا۔

ہندی ہاں سجدی۔

جے نچے کڑی داوی۔

کسی نے گانے کے بول اچانک ہی تبدیل کر دیے



تھے اور ٹھک ٹھک کے ناچتا علی مجھے کھینچ کر اپنا ساتھ  
 دینے پہ زبردستی مجبور کر رہا تھا۔ میں نے بے زاری  
 سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے واجبی  
 سے ایک دودھکے بھی دیے۔ مگر اب وہ خود اپنے بھونپو  
 جیسے حلق سے آوازیں نکالتا لگانے لگا۔ ساتھ ساتھ  
 میرا بازو اٹھا کے مجھے ناچنے پہ اکسارہا تھا۔

او مهندي تان سجدی۔

جے نچے کڑی واویہ۔

یہاں میری برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ میں  
آپ سے باہر ہو گیا۔ اور بھنا کے اسے نور کا ٹھنڈ  
دے مارا۔

تالیاں بجاتے سب نفوس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

سے نے جادو کی چھتری گھما کے سارے ماحول کو  
سویا ہوا محل میں تبدیل کر دیا تھا۔ میوزک بھی بند ہو  
جاتا تھا اور میں صیش میں آ کے اب علی کو بے تحاشا  
بٹ رہا تھا۔

... سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔“

میں نے اپنے دوستوں کو

— محمد پھولوانی —

میں ایک ہاتھ سے اس کی سرنگ دوپٹے  
 دوسرے ہاتھ سے ہونے اس کی کمر میں مارے جا رہا  
 تھا اب ابو کے ساتھ ساتھ نیاز ماموں بھی مجھے اس  
 سے الگ ہانپنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ ادھر خالہ بتوں کی دہائیاں۔

”ہائے ہائے۔ میرے پوترے کو ماروے گلیہ منڈا۔“

”سعد سن نہیں رہے تم؟“

امی بھی وہیں کھڑی کھڑی ففے سے چلائی تھیں اور  
میں مارتے مارتے اب اسے نیچے گرا چکا تھا۔

”اب بولے گا اب کرے گا کیو اس؟“

قرب تھا کہ میں نیچے گرے علی پہ پیٹھ کے اس کاٹھا  
 رہا تھا کہ آخر ابو اور ماموں اور شاید دو تین اور بھی کوئی

لوگ تھے مجھے کھینچ کر، ٹھینے میں کامیاب ہو گئے۔  
 ”چھوڑوں گا میں میں اسے۔“

میں ابھی تک کسی بے قابو بپھرے ہوئے سائنڈ کی طرح خود کو چھڑا کے ایک بار پھر علی پہ پل پڑنے کی تمک و دو میں تھا کہ ابو کے زوردار طمانچے نے میرے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔

جھاگ کی طرح بیٹھ کے اب میں گل پہ ہاتھ رکھے  
ڈری ڈری نظروں سے سب کے چہروں کے سوال بڑھ  
رہا تھا۔ ایک نظریں نیچے گرے علی پہ ڈالی جو لیروں لیر  
کرتے کے ساتھ کراہ رہا تھا۔

”سید۔۔۔ دلغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا؟ یہ کیا حرکت تھی۔“ ابو نے گرج کے پوچھا۔

”وہو علی۔ علی نے۔“

مجھے اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا جواز پیش کروں۔  
 ”اے علی اس کو چھیڑ رہا تھا۔“ اچانک مجھے سامنے  
 بلی نظر آئی تو میں نے اس کی جانب انقلی کا اشارہ کر دیا۔  
 ”اے اس کے بارے میں بری بری باتیں کر رہا تھا۔“  
 مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔“

۱۔ سب کی نظروں کی طرف توجہ نہ دیا۔  
 ۲۔ سب کو اوجھل کر دیا۔  
 ۳۔ سب کو نظر سے دور کر دیا۔  
 ۴۔ سب کو نظر سے دور کر دیا۔  
 ۵۔ سب کو نظر سے دور کر دیا۔  
 ۶۔ سب کو نظر سے دور کر دیا۔  
 ۷۔ سب کو نظر سے دور کر دیا۔  
 ۸۔ سب کو نظر سے دور کر دیا۔  
 ۹۔ سب کو نظر سے دور کر دیا۔  
 ۱۰۔ سب کو نظر سے دور کر دیا۔

میں ایک عظیم انسان۔

ایک غیرت مند شخص۔

واہ ایک لڑکی کی بے عزتی ہوتے دیکھ کر نہ ماحول  
دیکھانہ سماج کی پروا کی۔ اور دھنک کے رکھ دیا اپنے  
ہی عزیز دوست کو۔

ابو نے بھی میری مزید مرمت کا ارادہ موقوف کر دیا  
مگر مجھے کہتے ہوئے وہاں سے لے ضرور گئے۔

”تماشا ہنا کے رکھ دیا تم نے۔۔۔ یہ کوئی طریقہ ہے، مجھے بتا دیتے۔ خالہ بتول سے کہہ دیتے۔ بڑے مر گئے تھے کیا؟ یہی سوچ لیتے کہ لڑکے والے کیا تاثر لیں گے اس غل غپاڑے سے، حق ایسی باتیں پی جاتی ہیں۔



”مجھ سے شادی کرو گے؟ عمر دیکھی ہے اپنی انیس سال کے ہو ابھی اور تمہاری اسٹڈیز بھی مکمل نہیں ہوئی باتیں اور شوق دیکھو اپنے۔“ وہ باقاعدہ لعنت ملامت کرنے لگی۔

”تو تم کچھ سال انتظار کرلو۔“

”کیوں کروں میں انتظار میں سالار کو پسند کرتی ہوں۔ کل میری شادی ہے اس سے سمجھے؟“

”کیا نظر آ رہا ہے تمہیں سالار میں؟“ بے بسی کے احساس سے کچلا میں رو ہی پڑا۔

”انتا بڑا ہے وہ تم سے عمر میں۔ وہ تمہیں مجھ سے زیادہ پیار بھی نہیں دے سکتا۔“

”ہاں ہو سکتا ہے وہ مجھے تم سے زیادہ پیار نہ دے سکیں مگر وہ مجھے نہ تحفظ دیں گے جو تم کبھی نہیں دے سکتے۔ ابھی تو تم خود کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہو بات بے بات تمہارے آنسو نکل آتے ہیں۔ گڑ گڑانے لگتے ہو۔ میں سالوں سے تمہارے آنسو صاف کرتی آرہی ہوں اور سالار۔ وہ میری آنکھ میں ایک آنسو نہیں دیکھ سکتے۔“

وہ ایسے گمن گمن کے میری کمیاں اور سالار کی خوبیاں بتا رہی تھی کہ میں اور شدت سے رونے لگا۔

”دیکھو۔ دیکھو تم پھر سے رو رہے ہو۔“

اس کے استہزائیہ انداز میں بازو موڑ کے اپنی آستین کے کف سے آنسو پونچھنے لگا۔

”تم تو اتنے چھوٹے اور ناتجربہ ہو سجدے کہ ابھی تک محبت کا مطلب تک نہیں جانتے۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ پیار کوئی من پسند کھلونا نہیں ہے جو بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑ کے ضد کر کے یا پھر رد و ہوا کے پالیا جائے۔“ اس کے طعنوں تشنوں نے مجھے غصہ دلادیا۔

”تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ سنانے والی کہ مجھے پیار کا مطلب آتا ہے یا نہیں۔ بچہ ہوں میں ٹھیک ہے۔ اب یہ بچہ ہی تمہیں بتائے گا کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔“

”اچھا کیا کر لو گے تم؟“

میں اس کے سوال پہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا۔

اچھائی نہیں جاتیں۔“

اور مجھے کمرے میں دھکیل کے آخری دھمکی دی۔

”خبردار جواب تم کل تک اس کمرے سے نکلے۔“

دروازہ بند ہونے کے بعد میں ڈھے سا گیا اور بیڈ پہ جا گرا۔ آج کی رات بس ایک آخری رات۔

یہ ایک واحد موقع ہے میرے پاس جو کرنا ہے آج کی رات کرنا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرانی ہو جائے گی۔ کچھ دیر میں وہیں پڑا نیچے سے آنے والے ہنگاموں پہ کان دھر رہا جب سارا شور دم بڑا۔ حتیٰ کہ گاڑیوں کے اشارٹ ہونے اور گیٹ سے نکلنے کی آوازیں بند ہوئے بھی گھنٹہ گزر گیا۔ تو میں چپکے سے اپنے کمرے سے نکلا۔



سالار کا فون مسلسل بزدل رہا تھا۔ اور ام ہانی اس گھنٹے میں یہ چوتھا صبح اسے کر رہی تھی۔

”سالار۔ پلیزیات کو سمجھیں۔ میں کیسے آؤں۔ گھر میں اتنے مہمان ہیں۔ شادی والے دن کتنا مشکل ہو گا نکلنا۔ میں آپ کو منالوں کی۔ جو کہیں گے ویسا کروں گی۔ وعدہ آپ پلیزی مجھے ایسے نہ ستائیں۔ اتنی کڑی شرط نہ۔۔۔“

دروازہ کھلنے کی آواز پہ وہ بری طرح ہڑبڑا کے پلٹی اور مجھے دیکھ کے فون ایک جانب رکھ دیا۔

”سعد۔ کیا کرنے آئے ہو تم؟ ابھی اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے میری برداشت کی حد ویسے ہی ختم ہو چکی ہے۔“

”مجھ سے بھی اب اور برداشت نہیں ہو رہا۔“ اس کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں آگے بڑھتا رہا۔

”میرا دل پھٹ رہا ہے ہنی۔ میں تمہیں کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کے لیے یہ مت کہو۔ نہ کرو یہ شادی میں ہوں ناں۔ میں تم سے شادی۔“

”یا گل تو نہیں ہو گئے تم۔“ وہ زور سے چلائی تھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔



کوئی جواب نہ تھا۔ میرے پاس واقعی میں کیا کر سکتا تھا لیکن اس وقت اس کی سچی باتوں نے مجھے اتنا کم تر محسوس کروادیا تھا کہ مجھے کچھ تو کہنا تھا کوئی دعوت کرنا تھا چاہے کھوکھلا ہی سی۔

”تمہارے اس سالار کو تو میں دیکھ لوں گا۔ کیسے لاتا ہے بارات اور کیسے لے کر جاتا ہے تمہیں مجھ سے دور۔“

”سعد۔“

میرے اس کھوکھلے دعوے اور بے جان سی دھمکی بھی وہ اتنی حراساں ہوئی کہ اس کا زرد چہرہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کے میری کلی انا کو تسکین سی ملی بڑا بچہ سمجھ رہی تھی ناں مجھے کیسے اوسان خطا کر دیے میں نے مجھے مزا آنے لگا اسے ڈرانے میں۔

”بڑا اترا رہی ہونا اس پہ۔ میں بتا رہا ہوں ہنی۔ یہ بے ہوتے ہوئے تم کسی اور کی نہیں ہو سکتیں۔“

”جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ جان دے بھی سکتا ہوں جان۔“

”جیسا کہ میں نے کہا تھا۔ جان دے۔ دفعہ ہو جاؤ۔“ وہ رست سے چلائی تھی۔

”دنی اور یہ بات کرتا تو مجھے غصہ آتا۔ مگر تم سے سن کے شرم آ رہی ہے کہ کبھی تمہیں دوست جانا تھا میں نے۔ نکل جاؤ میرے مرے سے۔ اور میری زندگی سے بھی۔“

اس کا وہ ڈر جو مجھے لطف دے رہا تھا۔ بس چند لمحوں کا مہمان تھا اور بس اب پھر وہی نفرت بے پناہ نفرت میں پھر سے رو پڑا تھا شکست کے بھرپور احساس نے مجھے گھٹنوں کے بل کرادیا تھا۔

”ہنی۔؟“

میرے سک کے کہنے پہ وہ پھر سے چلائی۔ اسی شدید نفرت کے ساتھ۔

”کبھی بھی مجھے ہنی کہہ کر مخاطب نہ کرنا۔ تم یہ حق کھو چکے ہو۔ بلکہ مجھے میرا اصل نام لے کر بھی مخاطب نہ کرنا اور۔ اور سعد رضوان شاہ ہو سکے تو کبھی مجھے بنا نام کے بھی مخاطب مت کرنا کبھی ملنا تو ایسے

جیسے دو اجنبی ملتے ہیں۔“

زہر کے چھینٹے مجھ پہ اچھال کے وہ رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔ میں ہارے ہوئے انداز میں اسے حسرت سے دیکھتا رہا۔

کل تک جو ہلکی سی امید میرے اندر سانس لے رہی تھی کہ وہ میری محبت پہ ایمان لے آئے گی۔ آج اس امید نے آخری سسکی لے کر دم توڑ دیا۔ میں اسے کھونے نہیں والا تھا۔

میں اسے کھو چکا تھا۔

اٹنے قدموں میں اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتا وہاں سے نکل آیا اور باقی کے آنسو اپنے کمرے میں آکے بہائے۔

روتے روتے تھک گیا تو بیگ نکال کے اس میں کپڑے نھونسنے لگا۔ میں اسے کسی اور کا ہونے سے روک نہیں سکتا تھا۔ مگر کسی اور کا ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

بس یہ ایک تھا جو فی الحال میرے بس میں تھا کہ میں یہاں سے دور چلا جاؤں۔ کم از کم اس ایک دن کے لیے۔ جب وہ میری آنکھوں کے سامنے سالار کے ساتھ چلی جاتی۔

اتنا حوصلہ کہاں سے لاتا بچا ہی کہاں میرے پاس جو تھوڑی بہت ہمت تھی وہ مجتمع کر کے یہاں سے نکلنے لگا۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے مڑ کے دیکھا تھا۔ ہنی کے کمرے کی کھڑکی کے پردے مڑے ہوئے تھے اور ان کے اس پار گھپ اندھیرا تھا۔

”کہاں جا رہا ہے سعد۔ سن تو۔“ نکلز اتار کھڑا تا علی مجھے پکارنا پیچھے آ رہا تھا۔

”کہیں بھی۔ تجھے کیا؟“

”میں نے مڑ کے دیکھا تو اس کے چہرے پہ نظر آتے مار پیٹ کے نشان مجھے ندامت میں بھگو گئے۔“

”مگر کیوں؟ شادی ہے کل۔“

”اسی لیے تو۔“ میں بدستور چلتا رہا۔ اور وہ میرے پیچھے پیچھے۔

”مجھ سے ناراض ہو کے؟“



وہ لپک کے سامنے آگیا اور میرا راستہ روک لیا۔  
مجھے ہنسی آتی چاہیے تھی اس کی اس درجہ خوش گمانی  
پہ۔ مگر اس کی سادگی بہ رونا آگیا۔

”دیکھ تو اور مار لے۔ نکال لے غصہ مگر قسم سے  
میں نے بلی کو نہیں چھیڑا تھا تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔“  
”علی۔ ہٹ جا سامنے۔“

”نہیں میں تجھے ایسے ناراض ہو کے نہیں جانے  
دوں گا۔“

”نہیں علی۔ میں تجھ سے ناراض نہیں ہوں۔“  
میں نرم سا پڑ گیا اس کے سامنے۔

”اور سوری یار۔ رات تمہیں خواہ مخواہ ہی۔ پتا  
نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے مہنی سے بھی میں نے ابھی اتنی  
فضول بکواس کر دی۔ جو نہیں کرنی چاہیے تھی لگتا ہے  
میں پاگل ہو رہا ہوں۔ اسی لیے جانا چاہتا ہوں تاکہ  
شادی کے موقع پہ مجھ سے پھر کچھ الٹی سیدھی حرکت  
نہ ہو جائے۔“

”مگر تو جائے گا کہاں؟“

”ہاسٹل یا کسی دوست کے پاس اور ہمیشہ کے لیے  
نہیں جا رہا واپس آ جاؤں گا خود ہی ایک دو روز میں مگر  
 وعدہ کرتا کسی کو نہیں بتائے گا کہ میں کہاں ہوں۔ ابو کو  
تو ہرگز نہیں۔“

”مگر تو جا کیوں رہا ہے اور تیرے بغیر یہ شادی کیسے ہو  
گی آخر؟“ اس کی بے تکلی بات نے مجھے پھر سے تاؤ دلا  
دیا۔

”کیوں؟ میرے بغیر کیوں نہیں ہو سکتی؟ میرے  
ساتھ ہو رہی ہے کیا؟“

ہاتھ سے اسے بری طرح اپنے سامنے سے ہٹاتا  
میں وہاں سے نکلا تو پوچھنے والی تھی۔



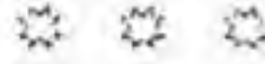
”ام ہانی بیٹا۔“

تاکہ اس کا عروسی لباس اور زیورات کے ڈبے  
اٹھائے اندر داخل ہو میں تو اسے خلاف توقع اور  
خلاف معمول سوتا پایا۔

”ام ہانی۔ بیٹا آج اتنی دیر تک سوو گی، اٹھو بیٹا۔“  
وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ بلی کے ساتھ پارلر بھی جانا  
ہے تمہیں۔“

اور پاس آنے پہ اسے جگانے کی نیت سے جیسے ہی  
چھو اتو چونک اٹھیں وہ بری طرح تپ رہی تھی۔

”یا اللہ اتنا تیز بخار۔ اٹھو ام ہانی تمہیں تو سخت  
بخار ہے پھٹک رہی ہو۔ اٹھو ناشتا کرو تو میں تمہیں  
دواؤں ذرا طبیعت سنبھلے تو پھر ہی بھیج سکوں گی پارلر۔  
ام ہانی کراہ کے اٹھی اور سب سے پہلے جلتی بلتی  
آنکھوں کے ساتھ تکیے کے نیچے سے زن نکال کے  
دیکھا۔ سالار کو بھیجے کسی مسیج کا کوئی جواب نہیں  
تھا۔“



اماں پریشان نظروں سے سالار کے کمرے کی حالت  
دیکھ رہی تھیں۔ خالی بوتلیں لڑھکتے گلاس۔  
اور خود وہ بے سدھ پڑا تھا۔

”سالار یہ کیا حرکت ہے۔ آج تمہاری زندگی کا اتنا  
اہم دن ہے کچھ تو خیال کرتے۔ ساری رات پیٹے  
رہے کیا؟“

”وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھیں مگر اس کی  
مدھوشی ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔“  
”سالار۔“

بہت پکارنے۔ بہت جھنجھوڑنے پہ اس نے  
بمشکل آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کی سرخ انگارہ  
آنکھیں دیکھ کے ڈر کے تھوڑا سا چھپے نہیں۔ عام  
حالات میں ہی وہ خاصا بد لحاظ ہوتا تھا تو تھکے میں تو۔  
”میں تو تمہیں بتانے آئی تھی کہ ام ہانی کی تائی کا  
فون آیا تھا۔“

وہ کرنٹ کھا کے اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلا خیال  
یہی آیا کہ کہیں ام ہانی نے خود کشی نہ کر لی ہو اب یاد آیا  
کہ کس سے اسے کیسے کیسے خوفناک اور دھمکی آمیز  
پیغام بھیجے تھے۔

”بتا رہی تھیں کہ ام ہانی کو تیز بخار ہے۔“



”اوہ۔“

وہ پرسکون سا ہو کے دوبارہ لیٹ گیا اور اماں بیماری کی خبر پہ اس کا اطمینان بھرا سانس لینے پہ حیران رہ گئیں۔ پھر وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور الماری سے کپڑے نکالنے لگا تو اسے قدرے معمول پہ آتا دیکھ کے اماں کی جان میں بھی جان آئی۔

”تیار ہونے لگے ہو؟ ماشاء اللہ مجھے تو کبھی کبھی لگتا تھا تمہیں دلہا بنے دیکھے بنا ہی میں اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔ مگر خدا کا کرم ہے۔ اس نے یہ دن دکھایا۔“ وہ بے تاثر چہرے اور سرد انداز کے ساتھ کوٹ سے ٹائی میچ کر تان کو سن رہا تھا۔

”آج تمہارے ابو زندہ ہوتے تو تمہیں دلہا بنے دیکھ کے وہ بھی بہت خوش ہوتے۔“

سالار نے ہاتھ میں پکڑا سوٹ غصے سے دور فرش پہ اچھال دیا اور دھاڑا۔

”آپ نے قسم کھا رکھی ہے، ہر موقع پہ میرے سکون کو برباد کرنے کی؟ جان بوجھ کے آپ مجھے تکلیف دیتی ہیں۔“

”سالار میں تو۔۔“

وہ گڑبڑا کے وضاحت دینے لگیں۔

”کتنی بار کہا ہے آپ سے۔۔ مت کیا کریں اس شخص کا ذکر میرے سامنے اگر آپ کو اتنی ہی یاد آتی ہے ان کی تو اپنے کمرے کی تنہائیوں میں ان کو یاد کر کے رو لیا کریں۔“

وہ خاموشی سے آنسو چتی وہاں سے جانے لگیں اور سالار نے اندر کی تپش پہ چھینٹے مارنے کے لیے ایک اور بوتل کھول لی۔

\*\*\*

”کسی کو بتا کے بھی آیا ہے یا نہیں؟“ شعیب تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“

بہت دقت کے بعد میں یہ مختصر جواب دینے کے قابل ہو سکا۔۔۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اس کے کسی

سوال کا جواب دینے کو۔

”غلط کیا سعد۔۔ وہ سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”کسی کو میرا خیال بھی نہیں آئے گا۔ ابو نے خود مجھے کمرے سے نہ نکلنے کی تاکید تھی اور آج سارا دن سب بہت مصروف رہیں گے۔“

پھر میں نے جیب سے فون نکال کے اسے آف کرتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

”اور جب تک خیال آئے گا۔ تب تک بہت دقت ہو چکا ہو گا۔ شادی کے عین وقت کوئی مجھے ڈھونڈنے یا واپس لانے کے لیے نہیں نکلے گا۔“

شعیب میرے برابر بیٹھ گیا اور میرے کاندھے پہ ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے خلوص سے کہنے لگا۔

”مردہا کے حالات کا سامنا کرتے ہیں۔ ان سے فرار نہیں ہوتے سعد۔“

مگر میں اس کے مخلصانہ مشورے پہ بھی تڑپ اٹھا۔

”ہاں تو بھی دے لے مجھے مردانگی کا طعنہ۔ کیا مردوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟ اس دل میں درد نہیں ہوتا؟ اور کیا یہ درد ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں لا سکتا اور۔۔ اور جو روتے ہیں۔ کیا وہ محبت نہیں کر سکتے۔“

\*\*\*

سالار نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا کار تک آ رہا تھا جہاں اماں پہلے سے تیار اس کی منتظر تھیں۔ اسے اس حال میں دیکھ کے وہ دھکی سے زیادہ پریشان ہو گئیں کہ وہ بھی نہیں سکتیں تھی کچھ نہ ٹوک سکتی تھیں کہ وہ برامان کے جانے سے انکار ہی کر دیتا تو کیا کر لیتیں بھلا مگر یہ سوچ سوچ کے ان کی روح ضرور فنا ہو رہی تھی کہ وہاں جانے تک بھی اس کا نشہ نہ اترتا تو اس حال میں دیکھ کے سب لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے۔

”آپ میرے ساتھ نہیں جائیں گی۔ دوسری گاڑی میں جائیں۔“



”ماشاء اللہ کتنا نکھار آیا ہے۔“ نائلہ نے اس کا ماتھا چوما۔

”اوہو بخار ابھی بھی ہے۔۔۔ مہ پارہ اسے ایک اور خوراک دے دینا واکا“ مگر دودھ کے ساتھ۔“

”یہ سعد کہاں ہے بھابھی صبح سے نظر نہیں آیا۔“ مہ پارہ کے پوچھنے پر وہ بھی فکر مند سی ہو گئیں۔

”ہا نہیں میں سمجھ رہی تھی رضوان نے ڈانٹ کر کمرے میں بند کیا ہے تو احتجاجاً“ نہیں نکل رہا اب جا کے دیکھا تو وہ ہے ہی نہیں۔۔۔ نہ کمرے میں نہ حویلی

۔۔۔ نہ جانے کب نکلا کسی کو نہیں پتا۔“ ام ہانی بلا وجہ ہی سر جھٹکا کے اپنی مہندی رچی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔

”کمال ہے فون کرنا تھا بھابھی۔“ ”تو کیا نہیں کیا ہو گا؟ مگر فون آف مل رہا ہے۔“

”یا اللہ۔۔۔ یہ لڑکا۔“ ام ہانی کو اس ذکر سے وحشت ہونے لگی۔ دل چاہا ہاتھ جوڑ کے خاموش کرادے ان دونوں کو۔

”اللہ گجرے آئے یا نہیں۔“ بلی افراتفری میں اندر داخل ہوئی ہمراہ خالہ بتول بھی تھیں۔

”کڑیو۔۔۔ نیاز بتا رہا ہے بارات مہنہ پہلے نکل چکی ہے۔ آنے والے ہوں گے وہ لوگ۔۔۔ جا کے نیچے تیاری کرو۔“

”دیکھو تو کیسی لگ رہی ہیں بانی آپ۔“ بلی نے اشتیاق سے گھونگھٹ میں جھانکا۔

”میں ذرا جا کے رضوان سے کہوں۔ ایک بار پھر سعد کی خبر لیں۔“ نائلہ مہ پارہ کو لیے کمرے سے نکلیں۔

”اف۔۔۔ قیامت آفت۔“ ادھر بلی اسے دیکھ دیکھ کے جھوم رہی تھی۔ خالہ بتول نے اس کے سر پر ایک چپت لگا کے خاموش کرایا۔

”ماشاء اللہ کہتے ہیں۔۔۔ بے عقل۔۔۔ بے ہدایتی۔۔۔ دلہن ہو یا دلہا۔ نظر فوراً لگ جاتی ہے اس دن ہر

اس کی آواز تک میں نشہ ڈول رہا تھا۔“ ”مگر سالار۔۔۔ پہلے ہی تمہارے کہنے پر میں نے سب مہمان کو براہ راست ہی ہانی کی حویلی پہنچنے کا کہہ دیا ہے حالانکہ بارات کو قرینے سے جانا چاہیے تھا پھر بھی۔۔۔ اب کم از کم تم مجھے تو۔۔۔“

مگر وہ ان کی بات نظر انداز کرتا اب ڈرائیور پر برس رہا تھا۔

”منہ کیا دیکھ رہے ہو میرا۔ نکالو گاڑی۔“ ”تم خود ڈرائیور کرو گے؟“

وہ اس کا ارادہ بھانپ گئیں جبکہ وہ ان کا سوال ان سنی کرتا جیب میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔

”سالار ضد مت کرو۔ تمہاری حالت نہیں ہے خود کار ڈرائیو کرنے کی۔ تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں۔ ٹھیک ہے میں دو سری گاڑی میں چلی آتی ہوں لیکن تم ڈرائیور کو ساتھ لے لو بیٹا۔“

سالار نے جیب سے ایک لفافہ نکال کے ان کی جانب بڑھا دیا۔ سرد مہری امنڈ امنڈ کے چھٹک رہی تھی۔

”میری شادی کا تحفہ آپ کے لیے۔“

”یہ کیا ہے؟“ وہ حیران تھیں۔

”آپ کا ٹکٹ امریکہ کے لیے کل صبح کی سیٹ ہے۔“

”سالار؟ اتنی جلدی آج رات دلہن گھر آرہی ہے اور میں صبح ہی امریکہ چلی جاؤں۔“

”میری دلہن آرہی ہے۔ میرے لیے آرہی ہے آپ کے رکنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ لا تعلقی سے مڑا اور دو سری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ دیکھے بنا کہ ماں ٹولے ہوئے دل کے ساتھ ہی اسے آنسوؤں میں بھیگی دعائیں دے رہی تھی۔

کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ام ہانی کے چہرے کی سوگواری اور بڑبڑدگی دلہناپے کے نکھار میں بھی چھپ نہیں پاری تھی۔



پل بھاری ہوتا ہے۔“  
پھر ان کی نظر مچلی کھڑکی پہ جا پڑی رات کی سیاہی  
میں سرخی سی کھل رہی تھی۔  
”یا اللہ خیر کیسی لال آندھی اٹھی ہے۔ یہ تو شر ہے  
نرالال آسمان سے تو ہمارا کتنی چاہیے۔“  
باہر نالکہ بھی رضوان سے فکر مندی جتلا رہی  
تھیں۔

”اتنا خراب موسم۔ پتا نہیں کہاں منہ پھلا کے  
بیٹھا ہو گا آپ بھی حد کرتے ہیں اتنا ڈانٹنے کی کیا  
ضرورت تھی۔“

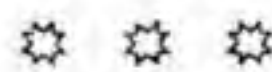
”تو ڈانٹ کھا کے وہ کونسا سدھر گیا۔ اب دیکھ لو نئی  
حرکت یہ کوئی موقع ہے ایسی اموشنل بلیک میلنگ کا  
۔ ان سب کاموں کو دیکھیں ہم یا اسے ڈھونڈ کے اس  
کے آگے ہاتھ پیر جوڑ کے منا کے لائیں۔ ذرا فارغ ہو  
لوں پھر اس کی طبیعت صاف کرتا ہوں۔ آئندہ مجال  
نہیں ہوگی اس کی کہ یہ ڈرامے کر سکے۔“

”اچھا۔ کرتے رہیے گا۔ ابھی تو ایک بار پھر کال  
ملائیے۔ سب لوگ بار بار اس کا بوجھ رہے ہیں۔ امہالی  
کچھ کہہ نہیں رہی مگر اسے بھی کمی محسوس ہو رہی ہو  
گی سعد کی۔ اس کی خاطر ہی اس گدھے کو واپس  
بلا لیں۔“

”اچھا ابھی تمہارے کہنے پہ کرتا ہوں ایک بار۔  
مگر یہ تم اسے شہرہ دے رہی ہو۔ اس بار اچھا ہونا کہ  
اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا جاتا ذرا سا بھی احساس  
ہوتا۔“

انہوں نے ابھی فون جیب سے نکالا ہی تھا کہ بج  
اٹھا۔

”اوہ۔ ایک منٹ۔ سالار کی والدہ کی کال ہے ہیلو  
جی۔“ اور کچھ ایسا سنا انہوں نے کہ رنگت فق ہو گئی۔  
”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔“



شعیب میس سے کھانا لے کر اندر داخل ہوا تو  
سرہانے رکھا فون مسلسل بج رہا تھا اور میں جیسے کانوں

میں روٹی ڈالے صم بکم بیٹھا تھا۔  
”فون سننا نہیں ہے تو آف ہی رہنے دیتے پہلے کی  
طرح کان پکا دیے تو نے۔“ وہ ٹرے میرے سامنے  
رکھتے بڑبڑایا۔

”بند تھا۔ مگر تب عجیب بے چینی تھی۔ اب بار بار  
آنے والی فون کالز اور مسیجز سے اتنا تو ہتا چل رہا ہے  
کہ وہاں میری کمی محسوس ہو رہی ہے۔ کوئی اتنے  
ہنگامے پہنچل اور مصروفیت میں بھی مجھے یاد کر رہا ہے۔  
پتا نہیں وہ یاد کر رہی ہے یا نہیں۔ سہتا نہیں اسے اپنے  
کنصورین کا احساس ہوا کہ نہیں۔ سہتا نہیں وہ مجھے فون  
کرے گی یا نہیں۔“

”سعد۔ تم تم ازیت پسند ہو۔“  
”نہیں۔ ہوتا تو یہاں نہ آتا۔ وہاں رہ کے خود کو  
شوق سے ازیت دیتا اسے کسی اور کی دلہن بنا دیکھ  
کے۔“

”بے حس انسان۔ خود کو نہیں۔ تم خود سے وابستہ  
لوگوں کو ازیت دے رہے ہو سوچو ان سب کا کیا حال ہو  
رہا ہو گا۔“ تبھی دوبارہ فون بج اٹھنے پہ وہ اٹھا۔  
”تم نے نہیں کرنی تو نہ سہی۔ میں کرتا ہوں بات  
۔“ میں تڑپ کے اٹھ بیٹھا اور فون کی جانب بڑھتے  
شعیب کو روکا۔

”خبردار جو تم نے انہیں میرے بارے میں کچھ بھی  
بتایا تو۔“

”بتاؤں گا۔“ وہ میری دھمکی کو خاطر میں نہ لایا۔  
”ویسے بھی اب کونسا وہ شادی کے وقت سب چھوڑ  
کے اتنی دور تمہارے خیرے اٹھانے آئیں گے۔ کم از  
کم میں انہیں اتنی تسلی تو دے دوں۔ کہ تم خیریت  
سے ہو۔“

اب کے میں نے نہ روکا۔ دل میں خیال سا آیا۔  
امی کا ابو کا واقعی شادی کی خوشی بھی نہ ڈھنگ سے منا  
رہے ہوں گے وہ۔ چلو ان کو یہ سکون تو ملے۔

”ہیلو۔ جی السلام علیکم جی میں سعد کا دوست  
ہوں۔ شعیب جی وہ سو رہا ہے اس کی طبیعت ٹھیک  
نہیں ہے۔ جی جی کہہ دیجئے کیا؟ اوہ کب؟ کون سے



ہسپتال۔“  
ہسپتال کا سنتے ہی میں اٹھ گیا اور اس کے پاس چلا آیا۔

”جی ٹھیک ہے وہ آتا ہے ابھی۔“  
چہرے پہ پریشانی کا واضح تاثر لیتے وہ فون بند کرتا میری جانب پلٹا۔

کون سے ہسپتال؟ بڑے دادا گزر گئے؟“  
شعیب نے ایک ملامتی نگاہ مجھ پہ ڈالی اور بتایا۔  
”بارات لاتے ہوئے سالار کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال ہے۔“



اور ایسا پہلی بار نہیں تھا کہ میں نے ہاسٹل سے اپنے قصبے تک کا دو گھنٹے کا سفر کمنے بھر میں کیا ہو، کتنی بار میں کسی افراتفری میں اڑتا ہوا اپنی سے منے گیا تھا۔ اور آج تو جیسے مجھے صرف پر نہیں گئے تھے۔ ان میں اب بھی گئی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا وہاں پہنچا۔

سہ سے کٹا۔ تناؤ وقت لگا۔  
میں نے وہ سڑک تیز رفتاری سے آتے ٹرکوں اور دیمینوں میں سے بے پار کی۔ ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد کس سے تفصیل لی تھی اور اس نے کیا روم نمبر بتایا تھا بس میں بھاگتا چلا گیا۔ بھاگتا ہی رہا۔ اس وقت تک۔ جب تک میری نظر سامنے ان جانے پہچانے چہروں پہ نہ گئی جن پہ ایک انجانی سی دہشت اور خوف اس وقت نظر آ رہا تھا۔

پریشانی سے شملتے ابو۔  
تسبیح کے دانوں پہ زیر لب کچھ ورد کرتیں امی۔  
جائے نماز پہ بیٹھی خالہ بتول اور۔ اور ام ہانی۔  
دلہن بنی ام ہانی وہ سر جھکائے ہچکیاں لیے رو رہی تھی۔  
میں جب اس سے پہلی بار ملا۔ تو وہ یونہی رو رہی تھی اور میں دور کھڑا سیاہ لباس میں ملبوس اس روٹی ہوئی لڑکی کے آنسوؤں کے ساتھ بہتا چلا گیا تھا۔  
آج وہ سیاہ لباس کی بجائے سرخ لباس میں تھی۔

مگر میں، میں آج بھی بہہ رہا تھا ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ آج ہی اس کے آنسو مجھے اندر تک گیلا کر سکتے ہیں۔ میں آج بھی اس کے رونے سے اسی طرح ٹوٹ کر بکھر سکتا ہوں۔ جیسے پہلی بار بکھر گیا تھا۔

مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ بھلے یہ آنسو وہ سالار کے لیے بہا رہی ہے پھر بھی۔ پھر بھی میں اس کی آنکھوں میں یہ آنسو نہیں دیکھ سکتا، مجھے سالار کی حالت جان کے خوشی ہوئی چاہیے تھی۔ جس شادی کو روکنے کے لیے میں نے ہر حربہ آزمایا اور ناکام رہا وہ شادی اب رک گئی تھی اور ہو سکتا ہے کبھی نہ ہو پائے اگر سالار۔ مگر میں خوش نہیں ہو پا رہا تھا کیسے ہوتا۔ اسے رلا کے کیسے خوش ہوتا؟

نہیں ام ہانی تمہیں رونا نہیں چاہیے نہ میری وجہ سے نہ ہی سالار کی وجہ سے اگر سالار کے دور جانے سے تم دھبی ہوئی ہو۔ تو ٹھیک ہے۔ سالار و تم سے دور نہیں۔ ہونا چاہیے۔ بس تم دھبی مت ہونا تم روتا مت رونا تم۔

میں اس سے کچھ قدموں کے فاصلے پہ کھڑا غم آنکھوں سے اسے دھتا جا رہا تھا۔ امی مجھے پکارتے ہوئے آنکھیں۔  
”سعد آگئے تم۔“

میرا نام سن کے اس کا ہچکیاں لیتا وجود تھا اس نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ انھی اور پھر برق رفتاری سے میری جانب دوڑتی آئی۔ میرے بازو خود بخود پھیل گئے اور دل میں ایک یقین سا اتر آیا۔ کہ تمام تر ناراضیوں۔ گلے شکوؤں کے باوجود آج بھی۔ میری ہنی کو آنسو بہانے کے لیے میرا ہی کا ندھا چاہیے ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ میرے ہی گلے لگ کے اپنا غم ہکا کرتی ہے۔

میں اس کے آنسو اپنے اندر اتارنے اور اس کا درد خود میں سمونے کے لیے بازو پھیلائے اس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور ایک زناٹے دار ٹھپڑ میرے چہرے پہ دے مارا۔



”کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں؟“

میرے بازو بے جان ہو کے میرے پہلو میں آن گئے اور میں بہت جلد اسے چلا تے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ تھپڑوں کے مارنے چلی گئی۔ میرے ساتھ باقی سب بھی حیرت کے اتنے شدید اثر میں تھے کہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکے۔ وہیں جے ششدر انداز میں اس کی ہدایتی کیفیت کو دیکھ رہے اور شاید سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور تم اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو؟ یہ کیسی محبت ہے سعد؟ محبت تو دکھ نہیں دیتی۔ محبت اعتبار نہیں توڑتی محبت کرنے سے پہلے محبت کرنا تو سیکھ لیتے۔“

میں اس سے تھپڑ کھانا جا رہا تھا۔ بنا کسی مزاحمت کے۔ اور اب وہ میرا کالر و بوج کے میرے گریبان کو جھٹکے دے رہی تھی۔

”تمہیں پتا بھی ہے محبت ہوتی کیا ہے؟ محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے کہ کچھ بھی کر کے کسی بھی طرح بس پالیا جائے۔ حاصل کر لیا جائے۔ محبت دینے کا نام ہے۔ بتاؤ کچھ دینے کا حوصلہ ہے تم میں؟“

روتے روتے وہ ادھ موٹی سی ہو گئی۔ بے جان اور بھر بھری رست کی طرح ڈھسے کرینچے کرتی جا رہی تھی۔ میرا کالر اب بھی اس کی مٹھیوں میں قید تھا تو میں بھی آہستہ آہستہ نیچے ہوتا گیا اور گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا جہاں بیٹھی وہ بلک بلک کے دم توڑتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”بہت غصہ آتا ہے ناں۔ جب میں تمہیں چھوٹا کہتی ہوں لیکن اب تم خود اپنی نظروں میں کتنے چھوٹے ہو گئے ہو اس کا احساس ہے تمہیں۔ کیوں کیا تم نے ایسا بولو تم سے ناراض ہونے کے باوجود تمہاری سب فضول حرکتوں کے بعد بھی میں تمہارے لیے دعا میں کرتی رہی اور تم۔ تم نے میری زندگی کی واحد خوشی مجھ سے چھیننا چاہی۔ مار دیا اسے۔ مار

ریا۔“

میرے پیروں تلے زمین نکل گئی اور اگر ابو آ کے اسے سنبھالتے ہوئے یہ بات نہ کہتے تو شاید میں کھڑے کھڑے وہیں خود کو بھی مار ڈالتا۔

”ہانی بیٹا ایسے مت کہو۔ کچھ نہیں ہوا سالار کو۔“

وہ اسے کاندھوں سے تھام کے اٹھانے لگے۔

”معمولی اہکسمڈنٹ تھا۔ ڈاکٹر ز تسلی دے چکے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں تم خود اسے صحیح سلامت دیکھ لیتا۔“

یہ سنتے ہی وہ ابو کے سینے لگ کے پھر سے رو دی۔ ابو نے بہت دھیرے سے میرا گریبان اس کی مٹھیوں سے آزاد کر لیا پھر ایک گہری خاموش نظر میرے چہرے پر نظر آئے اس کے تھپڑوں کے نشان پہ ڈالی۔ مگر امی خاموش نہ رہ سکیں ابھی تک وہ شاید حیرت کے شدید دھچکے کے زیر اثر تھیں مگر جب ام ہانی کی باتوں کا مطلب سمجھ آیا تو پاس آتے ہوئے بلی ہوئی آواز میں مگر شدید غصے میں کہنے لگیں۔

”رضوان۔ کیا بکواس کر رہی ہے یہ۔ یہ یہ صلہ دے رہی ہے یہ ہمارے اتنے سالوں کے احسان کا؟“

یہ سن کے میرے ساتھ ساتھ ہانی نے بھی ابو کے سینے سے سر اٹھا کے بے یقینی سے انہیں دیکھا کیونکہ ان کا یہ انداز۔ یہ روپ یہ لہجہ سب نیا تھا۔

”کیوں تماشا بنا رہی ہو اپنا بھی اور ہمارا بھی۔ یاد رکھو کہ تمہارا ہونے والا شوہر اور اس کی ماں بھی یہیں موجود ہیں۔ انہیں بھنک بھی پڑی تو سعد کا تو کچھ نہیں بگڑے گا تم ہی۔“

”امی پلیز۔“

میں نے ٹوکا اور پھر انہیں کاندھوں سے تھام کے وہاں سے لے جانے لگا۔ اور ابواب ہانی کو تسلی دے رہے تھے۔

”پریشان ہے نائکہ بھی۔ تم دل پہ مت لیتا اور فکر مت کرو ڈاکٹر ز نے اطمینان دلایا ہے کہ سالار کو کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی۔ شاید ایک نہیں تو دو دن میں اس کو ڈسچارج بھی کر دیں گے۔ اور بیٹا سعد کا اس



سارے قصے میں کوئی قصور نہیں۔ سالار نے ابھی خود پولیس کو بیان دیا ہے کہ اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے کار ایک ٹرالر سے ٹکرائی تھی اور سعد۔ وہ تو سیدھا ہاسٹل سے آ رہا ہے۔

امی کو وہاں سے لے جاتے ہوئے میں نے یہ سب سنا تو۔ مگر مڑ کے ہانی کے تاثرات دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پتا نہیں اس نے اس سب پہ یقین بھی کیا یا نہیں۔



خالہ بتول کی زبانی سارا واقعہ حویلی کے ایک ایک فرد تک پہنچ چکا تھا۔

”حیرت ہے۔ یہ سب ہوتا رہا حویلی میں۔ اور کسی کو پتا ہی نہیں تھا۔“ مہ پارہ کو موقع ملا تھا کھولن نکالنے کا۔

”اور دیں بچوں کو آزادی۔ میں کچھ کہتی تھی تو آپ میری زبان پکڑ لیتی تھیں۔ بچے ہیں۔ بچپن کا ساتھ ہے۔“

”ایک ساتھ بے بڑھے بچوں میں لگاؤ تو ہو ہی جاتا ہے۔ بلا وجہ بات کا بھٹکنا نہ بناؤ۔“ رضوان نے ٹوکا تو وہ بگڑ گئیں۔

”میری تو ہر بات بری لگتی ہے۔ میں ہمیشہ بھابھی کو خبردار کرتی رہی کہ سعد کو دور رکھیں ہانی سے وہ اس پہ چھائی جا رہی ہے۔ سعد کو کچھ سوچتا ہی نہیں ہانی کے علاوہ اور یہ ٹھیک نہیں ہے مگر۔“

”مہ پارہ۔“

اس بار رضوان نے ذرا زیادہ سختی سے ٹوکا۔

”گھر مہمانوں سے بھرا ہے کیوں معاملے کو اچھل رہی ہو۔“

”ہونہ۔“

وہ سر جھٹک کے احتجاجاً وہاں سے چلی گئی۔ اور اب تک خاموش بیٹھی نائلہ نے اس کے جانے کے بعد اس کی تائید کی۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے اور ہمیشہ صحیح ہی کہتی تھی

۔ میں ہی تھی جو جان بوجھ کے ثالثی تھی یہاں ہوں کیا سعد کے دل کے حال سے انجان رہ سکتی تھی مگر انجان بنی رہی کہ بات دہلی ہے تو دہلی رہے۔“

رضوان نائلہ کے اس انکشاف یا اعتراف پہ دنگ رہ گئے۔

”نائلہ۔ تم جانتی تھی سعد کی چاہت؟“

”ہاں۔“ انہوں نے تسلیم کیا۔

”مگر یہ چاہت نہیں۔ اس کا بچپنا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کتنی ہے اور پھر ہانی۔ وہ اس سے بڑی ہے کافی، خیر جو ہوا سو ہوا۔ مگر ہانی کو بھی سعد کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا پہلے میرے معصوم بچے کو شہہ دی پھر شادی کے لیے کسی اور پسند کیا۔ اور تو اور اس۔ اتنا بڑا الزام تک نہ گارہا۔ کیا میرا معصوم بچہ قاتل ہو سکتا ہے۔“



”نہیں نہیں ایسی کوئی تشویش والی بات نہیں ہے۔“ ڈاکٹر سالار کی اماں کو سلی دے رہا تھا۔

”معمولی چوٹیں ہیں ایک دو دن میں ڈسچارج ہو جائیں گے۔“

”دراصل مجھے آج ہی امریکہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مگر دل نہیں مانتا۔ ملتی تو کر دیا ہے ارادہ۔ بس یہ جانتا چاہتی تھی کہ ابھی اسے میری ضرورت ہے تو میں کب تک رکوں یہاں؟“

”آپ مل ہیں۔ آپ کی ضرورت تو انہیں تا عمر رہے گی۔“ ڈاکٹر مسکرایا تھا۔ مگر وہ جواب میں مسکرا تکی نہ سکیں۔

”ایکسیڈنٹ تو بہت خطرناک تھا۔ یہ تو معجزہ ہے کہ ان کو کوئی بہت سیریس انجری نہیں ہوئی۔ لیکن اس طرح ڈرنک ہو کر ڈرائیونگ کرنا ضرور خطرناک ہے۔ انہیں احتیاط کرنی چاہیے۔“

ڈاکٹر کی بات سن کے تو وہ شرمندہ ہوئیں ہی۔ مگر تبھی دروازے پہ اندر آتے آتے ٹھٹھک کے رکتی نائلہ کو دیکھ کے تو مارے شرمندگی کے سر ہی جھکا لیا۔



”اس ایکسیڈنٹ میں تو انہیں کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا۔ مگر الکو حل انہیں کوئی دوسرا نقصان ضرور پہنچا سکتی ہے کب سے کر رہے ہیں یہ شراب نوشی؟“  
 نائلہ بچھے دل کے ساتھ پلٹ گئیں مگر پھر وہیں رک کر ان کا انتظار کرنے لگیں دل میں عجیب سے دوسوے بھی جاگ رہے تھے اور عجیب سی کشمکش اور تذبذب بھی۔

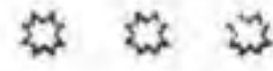
کچھ دیر بعد اماں اسی شرمندگی کے تاثر کو چہرے پہ سجانے لگیں تو نائلہ نے فوراً ”ان کا راستہ روکتے ہوئے پوچھا۔“

”سالار ایکسیڈنٹ کے وقت نشے میں تھا؟“ وہ خاموش رہیں تو دوسرا سوال۔

”صرف اس وقت؟ یا اکثر رہتا ہے؟“  
 ”شادی کے بعد چھوڑ دے گا آہستہ آہستہ۔“ اماں کا لہجہ پست تھا۔

”ام ہانی بہت اچھی بچی ہے۔ بڑی نیک بخت۔ اس کی سب بری عادتیں پھڑوا دیے گی۔“

نائلہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔ اور پھر ایک سرو آہ بھر کے رہ گئیں۔ آنے والے وقت میں نظر آتا موہوم سا خدشہ انہیں اس تلخ سچائی کو پی جانے پہ مجبور کر رہا تھا۔ انہوں نے سالار کی ذات کے حوالے سے سامنے آنے والی اس بد صورت اور کرمہ سچائی کو مصلحت کے پردے سے ڈھانپ دیا۔



آج دو سرا دن تھا مجھے یہاں۔ جب سے آیا تھا۔ ہاسپٹل میں ہی تھا علی ابو امی سب بار بار مجھے جانے کا کہہ رہے تھے۔ مگر میں میں اتنا بد صورت داغ لے کر یہاں سے کیسے چلا جاتا۔ بنا اسے دھوئے۔

سالار کو خون کی فوری ضرورت تھی۔ وہ میں نے دیا۔ اگر میری جان کی ضرورت پڑتی۔ میں وہ بھی دے دیتا۔

اگرچہ سالار کی نظموں میں میرے لیے ایک مرد مر بے زاری تھی۔ لیکن میں کسی بھی بات کی پروا کیے

بغیر دن رات اس کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ پروا تھی تو اس بات کی کہ ہنی کو یقین دلا سکوں کہ مجھے اس کی خوشیاں عزیز ہیں۔ اس کی خوشی کی خاطر میں اسے سالار کا ہوتے دیکھنے کا بھی حوصلہ کر سکتا ہوں۔

وہ سب دیکھ رہی تھی۔ میرا رات بھر جاگنا۔ دن بھر سالار کے روم کے باہر ایک ٹانگہ پہ کھڑے رہنا۔

سب دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ۔

اور میں بھی سب دیکھ رہا تھا چپ چاپ۔ اس کا سالار کے سرہانے بیٹھ کے آنسو بہاتے دعائیں مانگنا۔ سالار کے ہوش پہ اس کا بھاگ کر اس کے روم میں جانا۔ مگر اب کسک نہیں ہوتی تھی نہ جلن۔

صرف ایک خلش باقی تھی۔ کہ کاش اس رات میں نے یونہی وہ بے تگے دعوے نہ کیے ہوتے۔ وہ کھوکھلی دھمکیاں نہ دی ہوتیں تو ام ہانی کے دل میں پل بھر کے لیے یہ وہم نہ آتا کہ میں ایسا کچھ کر سکتا ہوں۔



وہ سالار کے ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک مسلسل اس کے سامنے بیٹھے روئے جا رہی تھی۔ اور وہ مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”آپ کو کچھ ہو جاتا تو۔“  
 ”تو تم اور زیادہ رو تمیں۔“  
 ”نہیں۔ میں بھی زندہ نہ رہتی۔“

”زندہ نہ رہنے کی خواہش کرنا بہت آسان ہے مگر اس خواہش کو پورا کرنا مشکل۔“ وہ طنز سے مسکرایا تھا۔

”زندہ رہنا پڑتا ہے ہانی۔ جانتی ہو میں نے تم سے کہا تھا کہ جب تک تم خود چل کے نہیں آؤ گی مجھے منانے۔ میں کبھی اپنے کئے الفاظ سے پیچھے نہیں ہٹا۔ جو کہہ دیا وہ پتھر پہ لکیر لیکن اس بار میں نے خود سے کیا عہد توڑنا چاہا۔ میں آ رہا تھا ام ہانی۔ اپنی زبان سے پھر کے مگر قدرت کو منظور نہیں تھا۔ اس نے میرے عہد کا بھرم رکھ لیا۔“ ام ہانی نے بے تابی سے



مشکل سے مانی تھیں اب ملک سے باہر بھیجنا چاہتی ہو۔

”اس کی اور ہانی دونوں کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔ ہانی کا گھر کبھی نہیں بس سکے گا اگر سعد یونی۔ اور ہاں۔۔۔ سالار کی اماں اگلے ہفتے جا رہی ہیں امریکہ اس سے زیادہ نہیں رک سکتیں آپ دو تین دن کے اندر سالار کا نکاح پڑھوائیں ہانی سے اور رخصت کریں۔“

”نانکھ تم یکے بعد دیگرے اوٹ پٹانگ باتیں کرتی جا رہی ہو کل صبح سالار ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہا ہے اور میں پرسوں اسے بیٹی رخصت کرانے کا کہوں۔“

”پرسوں نہ سہی دو دن بعد۔ سادوں سے کروادیں۔ مگر خدا کے لیے اب تاخیر نہ کریں۔ تبھی میری گھبراہٹ اور خوف ختم ہوں گے اور سعد کا پاگل پن بھی ٹھکانے لگے گا۔“

وہ روپڑیں تو رضوان کچھ مزید نہ کہہ سکے۔



اندر عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی تو میں باہر نکل آیا۔ حالانکہ باہر رات کے اس وقت خنکی بڑھ جاتی ہے۔ میں بازو سینے سے بچنے باقاعدہ ٹھٹھرا رہا تھا جب علی آ گیا۔

”مجھے انکل نے بھیجا ہے یہاں رات رکنے کو۔ تو واپس چلا جا سعد۔“

”نہیں۔۔۔ تمہیں رکنا ہے تو رکو۔ میں نہیں جاؤں گا۔ جب تک خود سے یہ الزام نہیں دھولیتا۔“

میں ستون سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ اور علی سنجیدہ سا ہو کے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہنے لگا۔

”مجھے تو انداز ہی نہیں ہوا سعد۔ اور جب پتا چلا تو۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔“

”جانتے ہو علی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ جب سے اسے دیکھا ہے اس سے محبت کی ہے۔ مگر میں مالا نکت۔ بدھو محبت سیکھنا بھول گیا۔

اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں اب آپ کو منار ہی ہوں ناں۔۔۔ سوری بھی کہہ رہی ہوں میں نے جان بوجھ کے آپ کو نظر انداز نہیں کیا تھا نہ کبھی کر سکتی ہوں۔ آپ سے اہم میرے لیے کچھ بھی نہیں اور میں نے واقعی آنے کی بہت کوشش بھی کی تھی۔ مگر۔“

وہ پھر سے روپڑی اور سالار اس کا ہاتھ سلاتے ہوئے مندی دیکھنے لگا جو ابھی بھی مدھم نہیں پڑی تھی۔

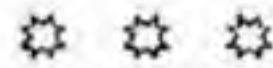
”تم نے اپنے ہاتھ پہ مندی سے میرا نام لکھا؟“

ہانی چونک کر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ جہاں ہتھیلی کے ابھار پہ ایس لکھا تھا۔ وہ رونا ہی بھول گئی۔ کم سم آئی۔

”کیا تم نہیں جانتی کہ مندی کا رنگ کتنی جلدی پھیکا پڑ جاتا ہے۔ مٹ جائے گا میرا نام۔“

”مگر وہ لکھے نام کو کون مٹائے گا سالار۔“

اس نے سالار کی نظروں سے چھپانے کے لیے مٹھی ہی نور سے بھیج لی۔ جیسے ڈر ہو وہ جان ہی نہ جائے یہ حرف اس کے نہیں کسی اور کے نام کا حصہ ہے جسے اس نے خود لکھا تھا۔



”سعد آج بھی نہیں آیا؟“

نانکھ نے رضوان کو پھر سے اکیلے ہی واپس آتے دیکھا تو تشویش سے پوچھا۔

”نہیں بہت کہا۔ مگر نہیں ملتا۔“

”کمال ہے۔ وہاں اتنے لوگ ہیں اس کا خیال رکھنے کو۔ سعد کا کوئی ضروری نہیں ہے ہسپتال رکنا۔ آپ بس کسی طرح اسے واپس بلا لیں۔ اس کا اور ام ہانی کا بار بار سامنا ہونا ٹھیک نہیں ہے بلکہ۔۔۔ بلکہ اسے کل ہی دوبارہ ہاسٹل بھیجیں نہیں۔ بیرون ملک بھیج دیں۔“

نانکھ کے گہرائے انداز پہ رضوان حیران ہوئے۔

”نانکھ تم تو دوسرے شہر اسے بھیجنے کے لیے اتنی



پہلے سیکھنی چاہیے تھی ناں یا۔۔۔ اب کم از کم اب تو  
مجھے سیکھنے دے۔۔۔ کچی کچی سی ہانڈی اتار کے اس کے  
سامنے رکھ دی بھول گیا کہ بہت وقت لگتا ہے پتھر کو  
پارس بننے میں۔۔۔

علی کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کے دیکھا تو ہانی  
کبل لیے میرے بالکل پیچھے کھڑی تھی۔ نجانے کب  
۔۔۔

”یہ لے لو۔۔۔ سردی ہے۔“

”مجھے نہیں لگتی۔“ میں نے دوبارہ رخ پھیر لیا۔  
”آگ سردی سعد۔۔۔ مجھے حقیقت جاننے سے پہلے  
تمہیں الزام نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”کیس نہ کہیں تو میں ہوں ذمے دار۔۔۔ اور قصور  
وار بھی میری بددعا میں تمہاری دعاؤں سے اور میری  
نفرت تمہاری محبت سے لگرا رہی تھی۔ جس خدا  
سے تم نے سالار کو پانے کی منت مانی تھی۔ اس خدا  
سے میں نے بھی سالار کو تم سے دور کرنے کی منت مانی  
تھی۔ شاید اسی لیے۔“ وہ خاموشی سے کبل علی کو  
تھما کے چلی گئی۔ وہ رات بھی کٹ گئی۔

صبح سالار ڈسپانچر ہو کے اپنے گھر چلا گیا اور میں دو  
راتوں کی تھکن چہرے پہ لیے حویلی لوٹ آیا۔

”سالار چلا گیا گھر؟“

جو گرز اتار رہا تھا جب امی نے اندر آتے ہی بلا  
مقصد سوال کیا۔ جبکہ جواب یہ یقیناً ”جانتی ہیں۔“  
”جی۔۔۔“

”چلو اچھا ہوا اب تم کم از کم اس کے پیچھے گھر نہ  
چلے جانا ویسے تو ہسپتال بھی اتار کئے کی ضرورت نہیں  
تھی۔ خیر اب ذرا احتیاط کرو۔ گھر میں کلنی مہمان ہیں  
۔۔۔ مہ پارہ کی زبان کے آگے تو ویسے بھی خندق ہے اور  
اوپر سے خالہ بتول کہیں بات پھیل نہ جائے۔“

”کیوں رکے ہیں سب ابھی تک واپس کیوں نہیں  
جاتے۔“ میں نے بے زاری سے جاگرز ایک جانب  
پھینکے۔

”چلے جائیں گے جس کام کے لیے آئے تھے اب  
وہ کام کر کے ہی جائیں گے۔ پرسوں نکاح کے بعد ہم

ہانی کو ساوگی سے رخصت کر رہے ہیں۔“  
اپنے تئیں یہ انکشاف کرنے کے بعد انہوں نے  
بڑی ٹوٹتی اور کریدتی سی نگاہ مجھ پہ ڈالی تھی۔ مگر میں  
کمال ہو سیاری سے اپنے اندر کے طوفان کو چھپائے  
اب الماری سے کپڑے نکل رہا تھا۔

”اچھا۔“ بڑے سکون سے میں نے فقط اتنا کہا۔  
”اور اس سے اگلے دن کی تمہاری سیٹ کنفرم  
ہے۔“

ایک جانب سے مطمئن ہوتے ہی انہوں نے اگلا  
دھماکا کیا جو کہ یقیناً ”زیادہ بڑا اور چونکا نے والا نہیں تھا  
کہ ابو مجھے بتا چکے تھے۔ مگر پھر بھی میں زچ ہوا تھا۔  
”آپ کیوں چاہتی ہیں ایسا؟ کیوں مجھے گھر سے اور  
خود سے دور کر رہی ہیں؟ سزا کے طور پر۔“

”ماں ہوں سعد۔۔۔ اولاد کا ہر رنگ، ہر ڈھنگ  
پہنچاتی ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہارے  
اشارے کنایے نہیں سمجھتی تھی سب سمجھتی تھی  
۔۔۔ سعد۔ مگر ہنس کے ٹالتی تھی تمہاری بے قراریاں  
نظر آتی تھیں مجھے اور حماقتیں بھی۔۔۔ مگر چشم پوشی کرنا  
لازمی تھا۔“

یہ تھا اصل دھماکا۔۔۔ میں مل کے رہ گیا۔  
”ٹالتی رہی۔۔۔ نظر انداز کرتی رہی۔۔۔ جان کے  
انجوان بنی رہی کہ تم کھل کے مجھ سے وہ نہ مانگ لو جو  
میں نہ دے سکتی تھی نہ دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے تو ہانی  
کے رشتے کے لیے اتنی بے چین تھی میں کہ وہ حویلی  
سے تمہاری زندگی سے دور ہو جائے تاکہ تم اس کے  
اثر سے آزاد ہو جاؤ۔“

”امی۔۔۔“  
میں بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔  
ایک ایک کر کے بہت سے ماں اور بہت سے بھرم  
ٹوٹ گئے۔

”آپ۔ آپ جانتی تھیں۔ تو پھر۔ کیوں؟ مائیں تو  
اولاد کی ہر خواہش پوری کرتی ہیں۔“

”یہ خواہش نہیں بچپنا تھا وپانچ چھ سال بڑی سے تم  
سے۔ تم میرے اکلوتے بیٹے۔ بلکہ اس حویلی کے



اکلو تے وارث۔ تمہیں لڑکیوں کی کیا کمی۔ جب تک تم تعلیم مکمل کر کے اس قاتل ہو گے۔ وہ تیس سال کی بچی عمر کی عورت ہوگی۔ میں نے بھی کچھ خواب دیکھ رکھے ہیں تمہارے بارے میں۔ کیا میرے بیٹے کی دلہن بن کے ایک پختہ عمر کی یتیم لڑکی آتی۔“

میں کتنی دیر انہیں افسوس اور ملامت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اب سارے گلے شکوے فضول تھے۔ بوجھل دل کے ساتھ میں کھنڈر کی جانب آ نکلا۔

وہی دیواریں۔ وہی جا بجا لکھے اس کا اور میرا نام۔ کاش جتنا آسان دیوار اور پیڑ یہ ان دونوں کو ایک ساتھ لکھتا تھا۔ اتنا ہی آسان زندگی میں ان کو ایک ساتھ دیکھنا بھی ہوتا۔

”آئی لو یو۔ آئی لو یو۔“ اپنے ہی کسے الفاظ کی بازگشت مجھے چاروں جانب، گونجتی سنائی دی۔ میں نے گھوم کے دیکھا۔

کھائی میں کچھ گرتا نظر آ رہا تھا۔

پھر دھڑام سے کچھ گرنے کی آواز آئی۔

”تمہارے یہ تین الفاظ ان دیواروں سے ٹکرا کے اس کھائی میں جا گرے ہیں۔ ان کی یہی اوقات تھی۔“ میرے کانوں میں ہنی کی سرگوشی پھنکار بن کر ابھری۔ میں نے جیب سے وہ آخری پتھر نکالا۔ جو بھی اس نے اپنے ہونٹوں سے چھو کے پھینکا تھا۔ اس پتھر کو۔ اس لمس کو اس کھائی میں ان تین لفظوں کے برابر گرا کے میں نے خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کیا میں اب دل و دماغ دونوں طرح سے بھرپور تیار تھا پورے حوصلے، کمال ضبط اور وقار کے ساتھ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہارنے کو۔



آج پورے چالیس گھنٹے بعد میں اس کا سامنا کرنے جا رہا تھا۔ یہ چالیس گھنٹے ہم نے ایک ہی چھت کے نیچے گزارے تھے مگر میں دانستہ اس سے کترا رہا تھا۔ لیکن کب تک۔ وہ اس حویلی میں چند گھنٹوں کی مہمان تھی۔

دروازہ کھولنے پہ ہنی نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ وہ پھر سے دلہن کے روپ میں تھی۔ میں تاب نہ لاسکا اور نظر جھکا کے کہا۔

”میں۔ میں سوری کہنے آیا ہوں ہنی۔“

”سوری تو مجھے کہنا چاہیے تھا سعد۔“ اس دن بنا سوچے سمجھے سب کے سامنے میں نے۔ ورنہ سالار کو تو زندگی اور صحت شاید ملی ہی تمہاری دعاؤں اور خدمت سے ہے جو تم نے اتنی محبت سے کی۔

”تم ٹھیک کہتی تھی ہنی۔ یہ شاید محبت نہیں تھی۔ محبت تو اتنی جلدی ہار نہیں مانتی۔ اور میں نے۔ میں نے ہار یاں لی ہے۔ شاید نہیں۔ یقیناً۔“ یقیناً یہ محبت نہیں تھی۔ مگر محبت جیسی کوئی چیز ضرور تھی۔ اور اس چیز نے میرا بڑا نقصان کیا۔ میری سب سے اچھی دوست مجھ سے چھین لی۔“

”ایسا نہیں ہے سعد۔“

”ایسا ہی ہے اور میں اس کے لیے تمہیں الزام نہیں دوں گا۔ قصور وار میں ہوں۔ غلطی میری تھی۔ سزا بھی مجھے ملنی چاہیے۔ اور مل بھی رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں ہنی۔“

”جا تو میں رہی ہوں بدھو۔“ وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

اور کتنے دنوں بعد اس نے مجھے ”بدھو“ کہہ کر پکارا تھا۔ میں آگے بڑھا اور پیروں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کے اس کی گود میں رکھے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ کتنی بار میں نے ان ہاتھوں کو تھاما تھا۔ سہلایا تھا۔ اور آج چھوٹے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ شاید میری جھجک کو بھانپ گئی۔ دھیرے سے اس نے خود اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

ایک ممنونیت بھری نگاہ اس پر ڈال کے میں مسکرایا۔

”اچھی لگ رہی ہو۔ امید تو نہیں تھی۔ مگر لگ رہی ہو۔“ اس نے پھر مسکراتا چاہا۔ مگر آنکھیں ساتھ نہ دے پائیں۔ چند آنسو چھلک کے گل پہ بہہ نکلے جن کو انگلی کی پور پہ میں نے چن لیا۔



بلکہ آگے آگے وصول کی تھاپ۔ بھنگڑا ڈالتا دیکھ رہے  
تھے کئی ایک نے تو دبے لفظوں میں کہا بھی۔  
”ارے۔۔۔ سجدہ۔۔۔ تم لڑکی والے ہو بارات کے  
ساتھ کیوں بنا چ رہے ہو۔“

مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں بس خود کو بے حد خوش بہت سرشار دکھانا چاہتا تھا یا شاید۔ شاید میں اپنے اندر کی تڑپ کو اس بہانے نکالنا چاہ رہا تھا۔ ہستے

مسکراتے میں نے سلاار کا سواگت بھی کیا۔ نکاح کے

بعد چھوہارے بانٹنے اور مٹھائی سے سب کا منہ میٹھا کروانے میں بھی میں ہی پیش پیش تھا۔ ہر ایک کے ساتھ چپک چپک کے اور سارے دانت ہونٹوں کے شوکیس پہ سجا کے تصویریں بھی بنوائیں۔ اور پھر رخصتی کے وقت قرآن پاک ہاتھ میں لے

بھی میں ہی سب کے درمیان راستہ بھاتا آگے آیا اور

ابو کے گلے لگی ام ہانی کے سر پہ اس کا سایہ کر کے وہ بلیز پار کرائی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے ذرا سامڑ کے منجھے دیکھا میرے جہرے یہ صبح سے وہی بھرپور

مسکراہٹ بھی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی کار کے نظموں سے  
اوجھل ہونے کے بعد بھی یہ مسکراہٹ نہ گئی۔ سب  
ایک ایک کر کے چلے گئے۔

کچھ حوصلے کے اندر کچھ واپس اپنے گھروں کو، مگر میں وہیں گیٹ کے پاس کھڑا مسکراتا ہوا اس موٹر کو دیکھ رہا تھا۔ جو اسے کسی اور راستے کا مسافر بننا کے لئے گیا تھا پھر کسی کے سسک کے رونے کی آواز۔ بلیٹ کے دیکھا

”تم کیوں رو رہی ہو؟“ میں اس کے پاس چلا آیا۔ وہ دو ٹوٹے تاک صاف کرتی۔ سوری۔

١٥٤

”آ رہا ہے“ مگر میرے رونے یہ پابندی ہے

”ہاں آپ کیوں روئیں گے آپ تو ایسے ناچ رہے تھے بارات کے ساتھ جیسے لڑکے کے شہ بالا ہوں۔“ وہ ناک چڑھاتی اٹھ کے جانے لگی۔

”ہی آپ کیوں روئیں گے آپ تو ایسے تاج رہے تھے بارات کے ساتھ جیسے لڑکے کے شہ بلا ہوں۔“ وہ ناک چڑھاتی اٹھ کے جانے لگی۔



”سنو بلی۔“

”اب کیا ہے؟“

”تمہیں پتا ہے کہ اس دن میں نے علی کو کیوں

مارا؟“

”ہاں میری وجہ سے۔ تھینک یو۔“

”نہیں وہ نہیں میں۔ تمہیں چھیڑنے والا تھا چٹکی  
کاٹنے جا رہا تھا تمہیں اس نے تو روکنے کی کوشش کی  
اور میں نے اسے پیٹ ڈالا۔“

”کیا؟“

”ہاں۔ سچ۔ اچھا سنو یہاں اس وقت کوئی نہیں  
ہے اب چھیڑ لوں تمہیں؟“

”لٹنگ۔ بد معاش۔ میں عزت دے رہی ہوں  
اندر سے کیا نکلے لو فر۔ ابھی بتاتی ہوں پھوپھو نائلہ  
کو۔“

وہ غصے سے دھمکاتی۔ نفرت سے گھورتی پیر پنچ کے  
اندر جانے لگی اور میرے بے ساختہ قہقہے اٹھنے لگے۔  
اندر کچھ تھا۔

کچھ عجیب سا۔

جو بات کے ساتھ پاگلوں کی طرح تاج کے بھی نہ  
نکل رہا تھا اور نہ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرنے کے  
بعد بھی کم ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیا تھا کوئی آنسوؤں کا ریلہ  
نہ ہو جو بند توڑ کے نکلنا چاہتا ہو۔

میں قہقہوں کا ایک اور بند باندھنے لگا۔ اور بلا وجہ  
بٹتے بٹتے اندر کی طرف بڑھا تو برآمدے کے ستون سے  
لپٹی سسکی کو بھی چسکوں پہسکوں رو تے پایا۔

”لو۔ تم بھی۔ تمہیں بھی ہانی کے جانے پہ رونا  
آ رہا ہے کیا؟“ تب ہی بانسری کی وہی درد بھری صدا  
ابھری۔

”مجھے تو اپنے نصیبوں پہ رونا آ رہا ہے جی۔“ وہ  
ہچکیاں لے رہی تھی اور میں جو ہمیشہ بانسری کی اس  
آواز پہ کھوسا جاتا تھا۔ مسحور ہو جاتا تھا۔ اس بار جھنجلا  
اٹھا۔

”ارے ہے کون یہ بے سرا۔ وقت بے وقت  
شروع ہو جاتا ہے۔“

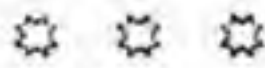
”خدا بخش ہے جی۔ کہہ دوں گا لڑکا۔ وہ جس کے  
ساتھ میں۔“ وہ کہتے کہتے رکی۔

”بھاگی تھی؟“ میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔  
”ہاں جی۔ روز بانسری بجا کے مجھے بلاتا ہے اب  
میں اسے ایسے بتاؤں کتنی مجبور ہوں کل مجھے بھی نکاح  
کر کے خدا بخش سے الگ کرنے والے ہیں یہ  
لوگ۔“ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھے بے تحاشہ قہقہے  
لگتا دیکھ کے وہ رونا بھول کے اب حیرت سے میرا منہ  
تک رہی تھی۔

”یہ تمہیں بلاتا تھا؟ تمہارے لیے بجاتا تھا بانسری؟  
دھت تیرے کی اور میں سمجھتا تھا اور والے نے میرے  
لیے کسی اسپیشل بیک گراؤنڈ میوزک کا انتظام کیا ہوا  
ہے رومانٹک فلموں کی طرح۔“ پھر اچانک میں نے  
اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کے برآمدے کی چار سیڑھیاں  
اتارنے لگا وہ گھبرا اٹھی۔

”سعد صاحب۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔“  
”بھگا رہا ہوں تمہیں جلدی کرو۔ بھاگ جاؤ اس  
پاگل کے بچے کے ساتھ ورنہ یہ ایسے ہی بانسری بجا بجا  
کے دیاں پکاتا رہے گا۔“

”نمر۔“ وہ بے چاری ہکا بکا تھی۔  
”کہاں نا۔ نکل جاؤ میں سب سنبھال لوں گا۔ آج  
دیے بھی کسی کو ہوش نہیں ہے۔“ میں نے کوٹ کی  
جیب سے والٹ نکل کے پورا کا پورا اسے تھما دیا۔  
”لو۔ جلدی۔ ایک دو تین چار۔“ اور پانچ کہنے  
سے پہلے پہلے وہ بھاگ گھری ہوئی۔



ام ہانی سالار کے ہمراہ اس گھر میں داخل ہوئی جہاں  
اب اسے زندگی کا نیا سفر شروع کرنا تھا۔ بڑے سے گھر  
کے ماحول میں اسے وہی رعب و دبدبہ محسوس ہو رہا تھا  
جو سالار کی شخصیت کا خاصہ تھا اور پھر دیواروں پہ جا بجا  
مٹی سالار اعظم کی قد آدم تصاویر۔

سالار ام ہانی کے پہلو میں بہت سنجیدہ اور سرد مہر  
تاثرات کے ساتھ کھڑا تھا جس والہانہ گرم جوشی اور



خوشی و سرشاری کی توقع اسے سالار سے تھی اس کا مظاہرہ اماں کی جانب سے ہو رہا تھا وہ صدقے کی نیت سے اس پہ نوٹس داری رہی تھیں۔

”ماشاء اللہ۔ نظر نہ لگے آج سے یہ گھر تمہارا ہے اور میرا بیٹا بھی۔“

ام ہانی مسکرائی، مگر سالار کی رکھائی سے کسی بات نے اس کی مسکراہٹ بند ہم کر ڈالی۔

”آپ اسے مس گائیڈ مت کریں۔ میں اس کا نہیں یہ آج سے میری ہے۔“

ہانی نے پلٹ کے بہت حیرت سے اسے دیکھا تھا، مگر وہ اپنی کہنے کے بعد لے لے ڈگ بھرتا کرے کی جانب جا رہا تھا۔ اماں نے اس کی خشک بات کا ازالہ کرتے ہوئے ہانی کا ہاتھ چوما۔

”اس کے ذائق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آؤ میں تمہیں تمہارے کمرے تک لے چلوں۔“ کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ دیر تک سالار کی عجیب و غریب باتوں کو اماں کے کہنے کے عین مطابق مذاق سمجھ کے ہی خود کو ہلاتی رہی۔

”تم اتنی خوش ہو؟“

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟ آج سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے جس میں آپ میرے ساتھ ہوں گے۔“ وہ لکسا مسکرائی تھی، مگر دل میں گلہ بھی جاگا کہ چہرے پہ بھلے لاتی خوشی کا سبب تو اس نے دیکھ لیا، مگر جس نکھار کے قصیدے سب نے پڑھے اس پہ سالار کی جانب سے ایک تعریفی جملہ تک نہ آیا۔

”مگر میں نے سنا ہے اپنوں کو چھوڑنے کا دکھ لڑکیوں کو کافی عرصے تک رلاتا ہے۔ تمہیں ان سے الگ ہونے کا کوئی غم ہے ایسا بظاہر لگتا تو نہیں رہا۔“

”میں ان سے الگ کب ہوئی ہوں اور نہ ہی چھوڑا ہے یہ تو ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ویسے بھی آپ کے ساتھ نے جو خوشی دی ہے وہ ہر دکھ پر حاوی ہے۔“

”پھر بھی۔“ سالار کے کنبے میں اس کے چہرے پر اس کی نظروں میں ایک شدت سے محسوس کی جانے

والی مایوسی تھی۔ اذان کی آواز پہ ام ہانی چونکی۔

”آج صبح ہو گئی۔ اتنی جلدی۔ میں نماز پڑھ لوں؟“ سالار نے خاموشی سے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے سگار سلگایا۔ اور وہ کچھ جھجک کر پوچھنے لگی۔

”آپ نماز نہیں پڑھتے؟“ اس بار سالار کا سرائکار

میں ہلا۔

”کبھی بھی نہیں پڑھی؟“ وہ تاسف سے کہنے لگی۔

”ایک بار پڑھی تھی۔ اپنے باپ کے مرنے پہ۔“

”آج نماز جنازہ۔“

”نہیں۔ شکرانے کے نفل۔“ سالار نے سگار کا

دھواں اگلتے ہوئے سفاکی سے کہا تو وہ جو اپنا بھاری لہنگا

سنبھال کے وضو کے لیے اٹھ رہی تھی وہیں جم کے رہ گئی۔



صبح ہوتے ہوتے سلمیٰ کے فرار کی خبر حویلی میں عام ہو گئی اور میں نے بہت سہولت سے سب کو مطلع کر دیا کہ یہ عظیم کارنامہ چونکہ میں نے کیا ہے اور میرے کارنامے کسی بھی قسم کی کمی بیشی سے پاک، مکمل محفوظ ہوتے ہیں اس لیے اسے تلاش کرنے کی کوشش بے سود رہے کی احتیاط کی جائے۔ اور اب بڑے دادا کے کمرے میں میری کلاس لگی تھی۔

”بے غیرت۔ کتنے آرام سے کہہ رہا ہے کہ ہاں۔ میں نے بھٹکایا ہے اسے۔ ڈھیٹ کا بچہ۔“

”میں کب ڈھیٹ رہا ہوں دادا جی؟“ ابو بلبلا اٹھے۔

”آپ اسے ڈائریکٹ برا بھلا کہیں مجھے کیوں

درمیان میں لے آتے ہیں ہر بار۔ اس کے کرتوتوں پہ

میں کیوں کچھ سنوں؟“ انہوں نے خشمگیں نظروں

سے مجھے گھورا بھی ہو گا۔ یقیناً ”مگر میں چپ چاپ

نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

”سعد۔ یہ کیا کیا تم نے؟“ اب امی کی باری تھی

یعنی طعن کی۔

”بے شک وہ ملازمہ تھی، مگر ہماری ذمہ داری بھی

تو تھی۔ اب ہم اس کے گھر والوں کو کیا جواب دیں گے



جو آج گاؤں سے اس کی شادی کا سن کر آرہے ہیں۔“  
 ”اور میں اپنے ملازم کے سامنے کتنا شرمندہ ہوں گا  
 جس سے آج اس کا نکاح پڑھانا تھا۔ کیا بے تکا ہوں ہے  
 یہ۔“

ابو کا تو بس نہ چل رہا تھا چپل اتار کے میری تواضع  
 ہی شروع کر دیتے۔ شاید کل میری بیرون ملک روانگی کا  
 خیال انہیں لحاظ کرنے پہ مجبور کر رہا تھا کہ اب جاتے  
 جاتے کیا خاطر کروں؟

”ہن بول۔ منہ سی کے کھلو تا۔“ بڑے دادا  
 نے بیڈ کے ساتھ رکھی چھڑی اٹھا کے تان لی۔

”بڑے دادا۔ بچپن سے دیکھتا آرہا ہوں جب بھی  
 ہم میں سے کوئی لمبے سفر کے لیے نکلتا ہے۔ گھر والے  
 صدقے کی نیت سے پرندے آزاد کرتے ہیں۔ سفر پہ  
 نکلنے والے کی سلامتی کے لیے۔ ہانی بھی ایک نئے سفر  
 پہ نکلی ہے اور میں نے سہلی کو آزاد کر کے ام ہانی کی  
 آنے والی خوشیوں کا صدقہ دیا ہے۔“

میری اس بات پہ کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ سب ایک  
 دوسرے کی جانب دیکھ کے رہ گئے بس۔ اور میں اپنی  
 ادھوری پکینگ مکمل کرنے چلا آیا۔

علی الا صبح میری فلائٹ تھی۔ جانے سے پہلے میں  
 نے فجر کی نماز وہیں پر آیدے میں اس جگہ ادا کی جہاں وہ  
 سالوں سے کرتی آئی تھی اس کے بعد چھت پہ جا کے  
 ایک ایک کر کے سب پرندے بھی آزاد کر دیے۔  
 جاتے ہوئے امی کے گلے لگا تو ان کی آنکھوں میں آنسو  
 دیکھ کے پہلی بار میرے دل کو کچھ نہ ہوا کچھ بھی  
 نہیں۔ یہ آنسو اب کیوں؟ خود ہی تو فیصلہ کیا تھا مجھے  
 بھیجنے کا۔ میں نے ان کے آنسو تک نہ پونچھے اور نکل  
 آیا۔

اس حویلی سے۔ جس کے در و دیوار میں میری  
 محبت نے پہلی بار آنکھ کھولی تھی۔ پہلا سانس لیا تھا۔  
 مگر نہیں۔ وہ تو محبت بھی ہی نہیں شاید۔

شاید۔

ام ہانی کے دل میں ایک خلش سی تھی۔ وہ جارہا

تھا۔  
 بہت دور۔ اور ایک نامعلوم مدت کے لیے۔ پتا  
 نہیں دوبارہ کب ملنا ہو، مگر وہ چاہتے ہوئے بھی سعد کی  
 روانگی کے وقت حویلی نہ جاسکی تھی کہ عین اسی وقت  
 اماں کی بھی امریکا کے لیے فلائٹ تھی۔

”زمانے کے بعد میرے گھر میں اجالا ہوا ہے اور  
 مجھے جانا پڑ رہا ہے۔“ وہ اسے گلے لگا کے بہت سا پیار  
 اور دھیروں دعا میں دے رہی تھیں۔

”آپ جلدی واپس آئیے گا اماں۔“  
 ”ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔ اور تم اپنا اور سالار کا  
 خیال رکھنا۔“

”جی۔“  
 ”بلکی۔ اپنا زیادہ۔“ ان کے لہجے میں ایسی دہلی دہلی  
 تنبیہ تھی کہ وہ الجھ سی گئی۔

”سالار تمہیں چاہتا ہے۔ اس لیے تمہیں اپنی  
 زندگی میں شامل کیا ہے۔ ورنہ۔ مگر تمہیں اسے اور  
 اس کی چاہت کو سمجھنے میں بہت وقت لگے گا۔ بہت  
 وقت۔“

ان کے چہرے پہ خوف دیکھ کے وہ بھی خوف زدہ  
 ہو گئی، مگر اس سے پہلے کہ ان سے کچھ سوال کرتی اپنی  
 الجھن دور کرنے کے لیے۔ گھڑی پہ وقت دیکھتا سالار  
 غلٹ میں وہاں آیا۔

”آپ کی فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے چلیں باہر ڈرائیور  
 انتظار کر رہا ہے۔“

”سالار ہم بھی چلتے ہیں اماں کو ایر پورٹ تک  
 چھوڑنے۔“ اس نے بڑے چاؤ سے کہا، مگر سالار خشک  
 لہجے میں فقط اتنا کہہ کر رہ گیا اور وہ چپ ہو گئی۔  
 ”کیوں۔؟“

\*\*\*

”آپ کیوں رو رہی ہو؟“ رضوان نے نائلہ کو آنسو  
 بہاتے دیکھ کے کہا۔

”یاد تو آئے گا۔“  
 ”یاد کرنے کا فائدہ۔ بھیجنے سے پہلے سوچنا تھا۔“

[[کرن 92 اکتوبر 2015]]



”وہ گھر سے دور گیا ہے۔ اس کا دکھ نہیں۔ مجھ سے ناراض گیا ہے اس کا دکھ ہے۔“

”دو ڈھائی سال کی بات ہے۔ آجائے گا اور ناراضی تو شاید دو تین دن میں ہی ختم ہو جائے گی۔“ انہوں نے تسلی دی اور پھر دانستہ موضوع تبدیل کیا۔

”میں تم سے یہ پوچھنے والا تھا کہ ام ہانی اور اس کے شوہر کو انوائٹ کیا جائے کھانے؟“

”ہاں۔ ضرور۔ میں فون کرتی ہوں اسے۔“

”نہیں زیادہ مناسب یہ رہے گا اگر میں خود جا کے دعوت دوں۔ تم چلو گی ساتھ؟“

”میرا جی ابھی بھاری سا ہو رہا ہے سعد کے جانے سے۔ آپ ہی ہو آئیں۔“

”چلو جیسے تمہاری مرضی۔ کل شام کا کہہ دوں؟“



”سالار! وہ دیکھیں۔ تایا جان اچانک ہی۔“ وہ بہت خوشی خوشی رضوان کی اچانک آمد کو خبر دینے کمرے میں داخل ہوئی تھی مگر جب سالار کو اس کے شغل میں مصروف دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ سالار کے سامنے رکھی بوتل اور اس کے ہاتھ کے گلاس کو دیکھ رہی تھی۔

”دستک دے کر آیا کرو۔“ وہ شاید کلنی دیر سےے نوشی کر رہا تھا آواز بھی بھاری ہو رہی تھی۔

”جی۔“ مرے مرے لہجے میں وہ فقط اتنا کہہ سکی۔ دانستہ نظریں اس زہر سے ہٹائیں۔ دل کٹ سا رہا تھا سالار کی ذات کا یہ رخ سامنے آنے پر۔

”اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“

”تایا جان آئے ہیں۔“ جتنے اشتیاق اور مسرت کے عالم میں وہ یہ بتانے آئی تھی اب وہ ناپید تھا بچے لہجے میں کہہ کر جانے کے لیے پلٹی۔

”میں انہیں کہہ دیتی ہوں کہ آپ سو رہے ہیں۔“

”کیوں؟“

”میں نہیں چاہتی آپ کو اس حالت میں دیکھ کے انہیں دکھ ہو۔“ وہ یہ کہنے کے لیے رکی تو سالار اٹھ کے

گلاس سمیت اس کی جانب آنے لگا۔

”تمہیں نہیں ہوا؟“ وہ جواب میں خاموشی سے سر جھکا کے رہ گئی۔

”یا پھر انہیں دکھ ہو گا۔ اس بات کا زیادہ ملال ہے تمہیں؟“

”ظاہر ہے ملال تو ہو گا۔ میں نہیں چاہتی انہیں نہیں پہنچے۔“ سالار کے ہونٹوں پہ ایک مدھم سی مسکراہٹ آئی۔

”گھر آئے مہمان سے نہ ملنا بدتمیزی ہے۔“ وہ گلاس ایک جانب رکھتا ڈولتے قدموں سے باہر نکلنے لگا۔

”مگر سالار! پلیز۔ یوں نہ جائیے ان کے سامنے۔ سالار۔“ اس نے روکنے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔ رضوان نے اسے آتے دیکھا تو چائے کا کپ رکھ کے بڑے تپاک سے اٹھ۔

”او سالار کیسے ہو بیٹا۔ میں ہانی سے تمہارا ہی۔“

اور پھر سالار کے بے ترتیب قدم ڈمگاتا، ڈولتا، جود اور سرخ ہوئی آنکھیں دیکھ کے ٹھٹھک کے خاموش سے ہونٹے بڑی تعجب بھری نظروں سے غور کرنے لگے۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اور جب وہ بولا تو اس کی زبان میں بھی لگنت واضح تھی۔ اب شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ رضوان نے شریذ حیران سوالیہ نظروں سے سالار کے عقب میں آئی ہانی کے شرمندہ چہرے کو دیکھا جو سر اٹھانے کے قابل نہ سمجھ رہی تھی خود کو۔

”تشریف رکھیے۔“ انہیں بیٹھنے کا کہتے ہوئے سالار خود تقریباً ”صوفے پر گر سا گیا۔ رضوان ایک تاسف بھری نظر ڈال کے خود بھی بیٹھ گئے اور ایک سرو آہ بھری۔ جو سیدھی ام ہانی کے کلبجے میں جا لگی۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کس طرح یا تو سالار کو یہاں سے لے جائے یا رضوان کو واپس بھیج دے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا وہ بات جو لن کے سامنے ظاہر نہیں ہونی چاہیے تھی۔ عیاں تو ہو چکی تھی۔



تا عمر۔ اسی طرح۔ دکھی۔ یا سکھی۔ یہ تمہاری چوائس ہے میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ”ام ہانی دکھ سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر الماری کی جانب پلٹی۔

”آپ پہلے بتا دیجئے تو میں رات سے ہی پیکنگ شروع کر دیتی۔ اب پتا نہیں اتنے کم وقت میں یہ سب کیسے ہو گا۔“ اس کے اتنی جلدی خود کو معمول پہ لے آنے پر سالار جھنجلا سا اٹھا۔ مایوسی اس کے چہرے سے جھلکنے لگی۔

”اندرون سندھ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی ہے میری پوسٹنگ۔ میں آئے روز تمہیں میکے والوں سے ملواتے نہیں لاسکوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ بغور اس کا رد عمل جانچنے لگا، مگر وہ سکون سے الماری سے کپڑے نکال رہی تھی۔

”ظاہر ہے۔ مشکل ہو گا۔“

”اور وہاں وہ سہولیات بھی نہیں ہوں گی جو یہاں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“

اس کے اطمینان نے سالار کو اس حد تک جھنجلا دیا کہ وہ ہاتھ میں پکڑا گلاس زور سے اس کی جانب اچھالنے پر مجبور ہو گیا۔ کانچ کا گلاس ام ہانی کے پیروں سے ٹکرا کے فرش پر گر ا اور چکنا چور ہو گیا۔ تو وہ کانپ کے رد عمل سے اور دہشت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ جواب مسکرا رہا تھا۔



”وہ نشے میں دھت تھانا ملے۔“ رضوان کی نظروں میں دکھ کے ساتھ ساتھ خفگی اور گم گاہ تھا۔

”وہ بھی اپنے گھر کی چار دیواری میں۔ دن کے وقت اور ام ہانی کے چہرے پر اتنا دکھ، افسوس اور شرمندگی تھی کہ میں اس سے نظر تک نہ ملا سکا۔“

”بات تو افسوس کی ہے، مگر شرمندگی سالار کو ہونی چاہئے آپ کو نہیں اور آپ کیوں نظر نہیں ملا پار ہے تھے ام ہانی سے؟ اس میں آپ کا کیا قصور؟ سالار ام ہانی

”آپ دونوں کو کل شام کے کھانے پہ بلانے آیا تھا۔“ اب بات تو کرنی ہی تھی جس مقصد کے لیے وہ آئے تھے سو کہہ دی۔ یہ الگ بات کہ اب نہ انداز میں وہ تپاک تھا نہ لہجے میں وہ مگر مجبوشی۔

”کل ہم ضرور آتے، مگر کل صبح ہی ہمیں روانہ ہونا ہے۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا غالباً“ کہ میری پوسٹنگ سندھ میں ہو گئی ہے۔“ اس پر ام ہانی نے چونک کے حیرت سے اسے دیکھا تھا اس کے لیے بھی یہ انکشاف تھا۔

رضوان کے جانے کے بعد سالار نے دوسرا دور شروع کر دیا۔ وہ جام پہ جام اندیل رہا تھا اور ام ہانی اسے سوالوں کے جواب کے لیے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

”آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ ہم دوسری جگہ جا رہے ہیں۔“

”بتایا تو ہے ابھی۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

”مگر اتنی اچانک کیسے ہو گئی ٹرانزفر؟“

”ہوئی نہیں۔ میں نے خود کر دلی ہے۔“

”مگر کیوں؟“

”میں نہیں چاہتا کہ تمہارے تایا اور دوسرے رشتے داروں کو مجھے ہر بار اس حال میں دیکھ کے دکھ ہو اور انہیں دکھی دیکھ کے تمہیں دکھ ہو گا تو بہتر ہے ہم ان سے دور رہیں۔“

”مگر آپ کو اس حال میں دیکھ کے بھی تو مجھے دکھ ہو گا۔“ وہ آنسو پی گئی۔

”اس کی اجازت ہے تمہیں۔“ سالار نے کمال فراخ دل کا مظاہرہ کیا۔

”میرے لیے دکھی ہونا تمہارا حق بنتا ہے اور فرض بھی۔ مگر تم کسی اور کے لیے دکھی ہو یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

”مگر سالار۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ دھاڑا تھا۔

”تو کیا چاہتی ہو تم؟ میں بھی تم سے دور ہو جاؤں؟“

نہیں ام ہانی۔ نہ میں خود کو بدل سکتا ہوں نہ تمہیں خود سے دور کر سکتا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہو گا



کی ہی پسند تھا۔“

”یہ واحد دھچکا نہیں تھا نائلہ۔ دوسرا دھچکا مجھے تب ملا جب سالار کے گھر سے نکلتے ہی میں نے اس کی والدہ کو فون کیا۔ یہ گلہ کرنے کے لیے کہ انہوں نے سالار کے کردار کا یہ سبب ہم سے کیوں پوشیدہ رکھا۔ تو جانتی ہو انہوں نے کیا انکشاف کیا۔ یہ کہ تم اس بارے میں پہلے سے جانتی تھیں۔“

اب نائلہ کو ان کی خفگی کی وجہ سمجھ آئی وہ گھبرا کے ٹالنے لگیں۔

”میں۔ میں تو۔ دراصل رضوان وہ تو بات ہی۔“

”بس نائلہ۔ کچھ نہ کہنا۔ اتنا دکھ مجھے سالار کو نشے میں دیکھ کے نہیں ہوا جتنا یہ جان کے ہوا۔ سب جانتی تھیں تم تو مجھے پہلے کیوں نہ بتایا یا ہانی کو ہی بتا دیتیں۔“

”بتا دیتی تو کیا کر لیتے آپ؟“

”میں کبھی اپنی بچی کی شادی اس سے نہ کرتا بلکہ مجھے یقین ہے کہ سالار کی اس عادت بلکہ عیب کے بارے میں جاننے کے بعد ام ہانی ہی اپنی پسند سے دستبردار ہو جاتی۔“

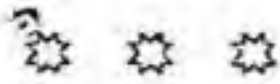
”اسی لیے نہیں بتایا میں نے۔“ وہ پھٹ پڑیں۔

”یہ رشتہ طے ہوتے وقت یہ حقیقت سامنے آتی تو اور بات تھی۔ شادی کے عین وقت آپ فیصلہ بدل کے کیا مہ پارہ کی طرح اسے بھی ساری عمر کے لیے میرے سر پہ بٹھا دیے؟“ رضوان کو اور بھی دکھ ہوا۔

”کتنی خود غرض ہو تم نائلہ۔ میں سوچتا تھا تم نے میری بھائی کی یتیم بچی کی ذمہ داری نبھانے کے لیے بڑا احسان کیا ہے۔ تم نے میرا یہ گمان توڑ دیا۔“

”ہاں۔ ہوں میں خود غرض۔ ممتا خود غرض ہی ہوتی ہے۔ اسے سالار کے ساتھ رخصت نہ کرنی تو سعد۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ سعد کا باپ بن کے سوچیں اس کی بہتری کے لیے۔“

”کاش تم نے بھی ایک بار۔ صرف ایک بار ام ہانی کی ماں بن کے سوچا ہوتا۔ اس کی بہتری کے لیے۔“



سالار کی جیب قصبے سے نکل کے مین روڈ کی جانب گامزن تھی اور جب سالار نے دوا میں جانب کا موڑ کاٹا تو ام ہانی نے حیرت سے ٹوکا۔

”ہمیں کیا جان سے ملتے ہوئے جانا تھا۔ بتایا تو تھا آپ کو۔“

”دیر ہو رہی ہے۔“

”آپ پہلے بتا دیتے ہیں تو انہیں اطلاع کر دیتی کہ ہم نہیں آرہے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔ ٹھیک ہے۔ میں انہیں فون کر کے بتا دیتی ہوں کہ ہمیں دیر۔“

اس نے ابھی فون پہ نمبر ملایا بھی نہیں تھا کہ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے سالار نے دوسرے ہاتھ سے بڑی سرعت کے ساتھ اس سے موبائل فون جھپٹ لیا اور کھلے شیشے سے باہر پھینک دیا۔

”سالار۔؟“

مارے حیرت کے وہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی اور سالار کا دھیان اب اس پر نہیں۔ سامنے خالی سڑک پر تھا۔ وہ گاڑی کی رفتار بڑھا چکا تھا۔

ہانی نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

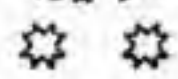
دور خالی سڑک پہ ایک نقطے کی طرح اس کا فون گرا نظر آ رہا تھا۔ اور پھر بے تحاشا اڑتی دھول اور گرد نے اس نقطے کو بھی معدوم کر دیا۔

اور یہ گرد۔ یہ دھول اگلے دو سہ اس کی زندگی کے ہر گوشے پہ پڑی رہی۔

اگلے دو سہ۔

دو طویل سہ۔

(باقی آئندہ شمارے ملاحظہ فرمائیں)







عانیہ پر ان ہی کا تھا، مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حق و یمن کی صورت جتنا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ وہاں موجود دوسرے افراد کی طرح وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ حق تسلیم کرنے کی صورت ایک بہت بڑی ذمہ داری ان پر آ رہی تھی اور جسے نبھانا ان کے لیے بہت مشکل اور دشوار تھا، بلکہ وہاں موجود کوئی بھی دل سے راضی نہ تھا سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ ایسے میں سائرہ بیگم کی بات نے حیرت و مسرت کے ساتھ ساتھ ان سب کے کندھوں سے ایک بہت بڑے بوجھ کو سرکا دیا۔ سب نے ہی بے اختیار اطمینان بھرا پرسکون سانس ہوا میں خارج کیا تھا۔

”کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے میرے اس فیصلے سے؟“ انہوں نے ایک بار پھر سے سب کی طرف دیکھا جن کی گردنیں نفی میں ہلنے میں لگے لگا تھا۔ دہلیز پر کھڑی عانیہ سعید کے دل پر گہری چوٹ پڑی تھی۔ اس نے ڈیڈ بانی آنکھوں سے اپنے چچا اور تایا کو دیکھا، ایسا نہیں تھا کہ اس کے پاس رشتے نہ تھے رشتے تو تھے، مگر ان میں احساس اور اپنائیت شاید ختم ہو چکی تھی جب تک اس کے ممالیہا زندہ تھے، انہوں نے کسی طرح چہروں پر اپنے پن اور محبت و فکر کا نقاب چڑھائے رکھا اور آج جب اسے سب سے زیادہ ان کی ضرورت تھی تو انہوں نے کسی طرح بیگانے پن کا مظاہرہ کرتے منہ پھیر لیا تھا۔

”ممالیہا۔۔۔“ نڈھال سے انداز میں اپنے کمرے میں

سائرہ بیگم کی بات پر سب نے ہی کافی حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا تھا کسی کو بھی اپنی سماعت پر یقین نہیں ہوا تھا۔ انہیں لگا جیسے ان سب کو سننے میں غلطی ہوئی ہو یا پھر سائرہ بیگم نے ہی بغیر سوچے سمجھے یہ فیصلہ لیا ہو، کچھ دیر کے بعد جب سوچ کے درواہوں کے تودہ اپنے کمرے سے مکرانے میں لے گئے کی بھی تاخیر نہیں کریں گی، مگر درحقیقت ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ ایک تو صورت حال بہت نازک تھی، دوسرا ان جیسی بااثر اور دل شخصیت

مکمل ناول

سے ایسی توقع کسی صورت نہ کی جاسکتی تھی۔ وہاں موجود سب لوگ انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے اور بے یقین ہونے کی اصل وجہ بھی شاید یہ ہی تھی، ان کی بات سے انکار یا اختلاف تو کسی ایک کو بھی نہ تھا، مگر اتنا وقت گزرے کہ باوجود بھی سب ابھی تک چپ تھے اور یہ ہی بات سائرہ بیگم کو کھٹک رہی تھی۔

”کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے جو آپ سب اتنے خاموش اور حیران ہو کر مجھے دیکھ رہے ہیں؟“ انہوں نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

”نہیں“ آپ نے کچھ غلط نہیں کہا۔ ہم آپ کے فیصلے کی قدر کرتے ہیں اور آپ کی بات سے متفق ہیں۔“ ان سب میں سے ایک نے جواب دیا جو رشتے میں عانیہ سعید کے سکے لایا تھے اور سب سے پہلا حق







آتے ہی وہ بیڈ پر گر کے تڑپ تڑپ کر رودی ایک ہفتہ پہلے تک تو سب کچھ ٹھیک تھا، مگر یہ ہی ایک ہفتہ تو ان کے بستے بستے گھر کو اجاڑ کر رکھ گیا تھا۔ وہ جتنا روتی کم تھا جتنا تڑپتی کم تھا۔ اس کا نقصان بہت بڑا تھا، جہاں ماں باپ کی دائمی جدائی نے اسے اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا تھا وہیں سگے رشتے داروں کے بدلتے رویوں نے بھی اس کی رہی سہی توانائی کو نچوڑ دیا تھا۔ وہ لاڈوں پٹی محبت کی آغوش میں پروان چڑھنے والی اب یکلاخت ہی تقدیر کی ستم ظریفی اور سنگدلی کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔

”چلو عانیہ اپنا سامان پیک کر لو تمہیں ساڑھے بیگم کے ساتھ جانا ہے۔“ تایا جان اسی وقت اس کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”مگر تایا جان۔“ وہ آنسو پونچھتے ان کے قریب آکھڑی ہوئی۔

”میں ان کے ساتھ کیسے جاسکتی ہوں، میں تو انہیں جانتی تک نہیں۔“ اک موہوم سی امید کے تحت اس نے اپنے تایا کی طرف دیکھا، ہو سکتا تھا کہ وہ اسے روک لیتے فیصلہ بدل لیتے، مگر ہائے ری خوش فہمی۔

”وہ تمہاری ماما کی فرسٹ کزن ہے اس لحاظ سے تمہاری خالہ ہوئی اور وہ تمہاری ذمہ داری لینے کو باخوشی تیار بھی ہے۔“

”اور آپ۔۔۔؟“ اس نے شاکی نظریں اٹھائیں، وہ نظریں چرائے۔ عانیہ کے دل میں میس سی اٹھی اندر کی توڑ پھوڑ بڑھنے لگی۔

”دیکھو عانیہ۔“ انہوں نے جیسے تمہید باندھنی چاہی، عانیہ کا دل چاہ کہ وہ ان سے چیخ چیخ کر کہے کہ اسے ان کی کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

”ہم سب کے حالات تو تمہارے سامنے ہی ہیں میری پہلے ہی چار بیٹیاں ہیں اور ساجد (چچا) کی تین حالات بھی دونوں کے اجازت نہیں دیتے کہ ایک اور بیٹی کا بوجھ اٹھا سکیں۔“ وہ بیٹی کو بوجھ کہہ رہے تھے جبکہ اس کے بیانے تو اس کی پرورش کسی شہزادی کی طرح کی تھی۔ گنتا فرق تھا پاپا میں اور ان میں عانیہ نے دکھ اور تاسف سے سوچا۔

”تنگ دستی ایسی ہے سر تک اٹھانے نہیں دیتی معاشی و مالی دباؤ بھی کچھ ٹم نہیں، بس یوں سمجھ لو کہ فاقوں کی نوبت نہیں آئی، ورنہ حالات تو بہت ہی تنگ گزر رہے ہیں اور رہی ساڑھے بیگم کی بات تو وہ معاشی طور پر کافی مستحکم ہے۔ ابرا کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔ تھوڑی موڈی ہے، مگر اس نے خود تمہیں ساتھ لے جانے کی بات کی ہے۔ ہم سب اسے اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے ہم میں سے کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تمہاں زیادہ خوش رہو گی۔ جب بنا کے تمہاری ہر ضرورت پوری ہوگی تو ہمیں دعائیں دیتی نہ تھکو گی اس لیے اپنے دماغ سے ہر طرح کی فضول سوچوں کو جھٹک کر جانے کی تیاری کر لو۔“

اس نے امید و بیم کی کیفیت میں آخری بار ان کی طرف دیکھا، وہ کسی صورت ساڑھے بیگم کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی، مگر وہ اس کی نظروں کے ہر تاثر کو یکسر نظر انداز کیے باہر چلے گئے۔



ناچاہنے کے باوجود بھی اسے ان کے ساتھ آنا پڑا۔ نارمل تاثرات لیے لیے ان کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر اس نے سیٹ کی بیک سے کمر نکادی۔ وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھی تھی، مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ گاڑی میں تنہا ہو۔ اسے گاڑی کے اندر کا ماحول کچھ سرد سا لگا۔ لمبا سانس ہوا میں خارج کرتے وہ آنکھیں موند گئی۔

اتنے دنوں کی بے خوابی اور ذہنی ٹینشن نے اسے ادھ موا کر چھوڑا تھا۔ بند پلکوں کے پار ممالیہا کے چہرے لہراتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا بلکہ زندگی کو جینے کے لیے نئے راستے تلاش کیے جاتے ہیں۔“ اپنے قریب سے ابھرتی آواز پر اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کی نظریں بے اختیار ہی ساڑھے بیگم کے چہرے کی طرف اٹھیں جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ عانیہ کو اپنی ساعتوں پر شبہ سا گزرا کیا



واقعی انہوں نے اس سے کچھ کہا تھا وہ کافی دیر ان کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرتی رہی مگر پھر باؤس ہوتے پھر سے آنکھیں موند گئی۔ اسے یقیناً ”سننے میں غلطی ہوگی۔ آج کل تو ویسے بھی دلغ نے کام کرنا چھوڑا ہوا تھا۔“

تایا جان کے روپے کے بارے میں ہی سوچتے نبجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی پھر کسی کے مدد ہم انداز میں پکارنے پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی، آنکھیں کھولتے اس نے اپنی دائیں طرف دیکھا ساتھ بیگم وہاں موجود نہ تھیں۔

”میڈم اندر ہیں اور میں آپ کو لینے آئی ہوں۔“  
”اف کیا میں اتنی دیر سوئی رہی۔“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور پھر جیسے دم بخود رہ گئی۔ وہ کوئی گھر نہیں بلکہ کوئی محل تھا۔ لڑکی کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتے وہ مبہوت سی ارد گرد بھی دیکھ رہی تھی۔

”میم یہ آپ کا کمرہ ہے، کسی چیز کی بھی ضرورت ہو تو آپ مجھے انٹرکام پر بلا سکتی ہیں۔“ لڑکی کا لہجہ انتہائی نفیس اور پرکشش تھا۔ شکل سے وہ اسے ملازمہ ٹائپ ہرگز نہیں لگی تھی۔

”آپ اس وقت کیا لینا پسند کریں گی؟ چائے یا کافی۔؟“

”نہیں کچھ نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

”جی بہتر۔“

”سنو۔“ وہ جانے لگی تو اس نے آواز دے کر روک لیا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“

”زینی۔“ وہ مسکرائی تھی۔ عانیہ کو اس کی مسکراہٹ بہت بھلی سی لگی۔

”میرا نام عانیہ ہے عانیہ سعید۔“

”بہت خوب صورت نام ہے آپ کا۔“ عانیہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اسے وہ لڑکی کافی دلچسپ لگی تھی۔ اس لیے اپنائیت سے پوچھا ”اور تم یہاں۔؟“  
”کام کرتی ہوں۔“

”او۔“ اس نے سیٹی کے انداز میں ہونٹوں کو گول کیا۔ تصدیق کے باوجود بھی اسے یقین کرنے میں دشواری ہوئی کہ وہ ملازمہ ہے پڑھی لکھی لگتی ہو۔  
”جی میں نے گریجویشن کیا ہے۔“  
”واش۔؟“ وہ از حد حیران ہوئی۔

”پھر یہاں۔؟“

”بس جی مجبوری انسان سے کیا کچھ کروالے اسے کچھ پتا نہیں چلتا اور ویسے بھی پرکشش تنخواہ کے ساتھ ساتھ اور بھی کافی سہولتیں دستیاب تھیں تو۔“  
”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجبوری انسان کو نبجانے کہاں سے کہاں لے جائے۔“ اس کی بات سے اتفاق کرتے عانیہ کے دل میں دکھ کی لہری اٹھی،  
”دوسرے ہی لمحے خود کو سنبھالتے وہ پوچھنے لگی۔  
”کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ اس گھر میں کون کون رہتا ہے؟“

”جی ضرور۔ میڈم سائرف۔ جن کے ساتھ آپ آئی ہیں۔ مظہر صاحب ان کے ہنرمند اور اشنا میم ان کی صاحب زادی۔“

”بس۔ اتنے بڑے گھر میں صرف تین لوگ ہی رہتے ہیں۔“ وہ ابھی تک حیران تھی۔

”جی بالکل۔“ زینی اس کی سلوکی پر مسکرا دی۔



**دھک زہ محبت**

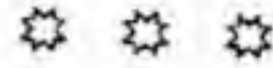
قیمت - 300 روپے

مکملہ 2 ج

کتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021



”کیا اب میں جاؤں۔؟“  
 ”ہاں جاؤ۔؟“ اس کے جانے کے بعد اس نے  
 طائرانہ نظریوں سے کمرے پر ڈالی۔  
 کمرہ کافی کشادہ اور ویل ڈیکوریٹ تھا۔ وہ اپنے بیگ  
 سے کپڑے نکالتے فریش ہونے کے لیے واش روم  
 میں گھس گئی۔



انکل منظر سے اس کی ملاقات ڈنر پر ہوئی تھی۔ اس  
 کے سلام کرنے پر انہوں نے آہستہ سے سر اثبات میں  
 ہلاتے جواب دیا تھا۔ عانیہ کی نظروں نے بے ساختہ ہی  
 اس وسیع و عریض ڈائننگ ہال کو سر لبا تھا۔ ہر چیز  
 امپورٹڈ اور نیو برانڈ تھی۔ اسی پل اشٹاڈائننگ ہال میں  
 داخل ہوئی۔

”ہیلو ماما۔“ بے نیازی سے کہتے وہ سائرہ بیگم کے  
 ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ عانیہ کی آنکھیں اسے  
 دیکھتے حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بہت خوبصورت اور  
 ماڈرن لڑکی تھی عانیہ کو خود سے اقرار کرنا پڑا کہ لیکن  
 اس کے حیران ہونے کی وجہ اس کی خوب صورتی ہرگز  
 نہ تھی بلکہ وہ لباس تھا جو اس نے زیب تن کر رکھا تھا۔  
 انتہائی چست ریڈ ٹراؤزر کے اوپر بلیک سیلویس اسکن  
 ٹائٹ بننے والے اپنے پیپا کے سامنے بالکل نارمل انداز میں  
 بیٹھی تھی۔

عانیہ کو اپنے گھر کا ماحول یاد آگیا کس طرح وہ سر پر  
 دوپٹا اوڑھ کر پیپا کے سامنے جاتی تھی۔ اس نے آنکھیں  
 سے منظر صاحب کی طرف دیکھا کہ شاید وہ اسے کچھ  
 کہیں مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا جیسا وہ سوچ رہی تھی۔  
 انہوں نے نارمل انداز میں کھانا کھایا اور پھر نہ کون سے  
 ہاتھ صاف کرتے ہال سے باہر چلے گئے۔

”اُشنا یہ تمہاری کزن عانیہ ہے اور عانیہ یہ اُشنا ہے  
 میری اکلوتی بیٹی۔“  
 ”سلام علیکم!“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے  
 سلام کیا تھا۔

”ہیلو۔“ جبکہ وہ ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر

دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔  
 ”عانیہ کیا کوالیفیکیشن ہے تمہاری؟“ وہ اُشنا کے  
 بارے میں ہی سوچ رہی تھی جب سائرہ بیگم کے  
 مخاطب کرنے پر ہڑبڑاتے ہوئے ان کی طرف متوجہ  
 ہوئی۔

”جی۔ خالہ جی۔“ وہ ان کی بات ٹھیک سے سن  
 نہیں پائی تھی مگر وہ سری طرف سائرہ بیگم کے خوب  
 صورت چہرے پر لمحوں میں ناگواری تھی۔  
 ”واٹ خالہ۔“ ان کے ماتھے پر سلوٹیں ابھرنے  
 لگیں۔

”لکسن۔ ڈونٹ کال می، آگین خالہ۔“ وہ تو اچھی  
 خاصی برہم دکھائی دے رہی تھیں۔ عانیہ کو بوکھلا کر رہ  
 گئی۔  
 ”تم مجھے آئی کہہ سکتی ہو۔ بٹ خالہ۔ نو۔ نیور  
 آگین۔“

”جی۔“ ان کی جزبز صورت دیکھتے عانیہ تو اس طرح  
 شرمندہ ہونے لگی جیسے اس سے کوئی بہت بڑا گناہ ہو گیا  
 ہو۔

”میں نے تمہاری تعلیم پوچھی ہے۔“  
 ”جی۔ وہ گریجویشن“ اس کے گلے سے پھنسی  
 پھنسی سی آواز نکلی تھی۔  
 ”کرچکی ہو یا۔“

”جی۔ جی۔ کرچکی ہوں۔“ ان کے ابرو اچکا کر  
 پوچھنے پر اس نے جواب دیا۔ ان کے یا کا مطلب وہ  
 اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔  
 ”اوکے۔ کیا آگے بڑھنا چاہتی ہو؟“ ان کے مزید  
 استفسار پر وہ چپ سی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ  
 وہ کیا جواب دے۔

”عانیہ۔ واٹس پر ابلم ودیو۔ بار بار یوں مراقبے میں  
 کیوں چلی جاتی ہو۔“ اس کی مسلسل خاموشی نے سائرہ  
 بیگم کو بھی تپا دیا۔ وہ برہم سی گویا ہوئیں۔

”وہ اب کچھ ویلی آ۔ نئی جی۔ میں پڑھنا تو چاہتی  
 ہوں مگر آپ کا پہلے ہی بہت بڑا احسان ہے مجھ پر۔“

”زینی۔ زینی ہاتھ اٹھا کر اس کی بات درمیان میں ہی



کاتے ہوئے وہ زینہ کو آوازیں دینے لگیں۔  
 ”لیس میڈم“ وہ لمحوں میں حاضر تھی۔ ”کنفرم  
 کرو اگر ایم اے کے ایڈمیشن اوپن ہیں تو اسے لے جاؤ  
 اور اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروادو۔“ لیکن سے  
 ہاتھ صاف کرتے اٹھتے ہوئے انہوں نے حکم صادر  
 کیا۔

”جی میڈم ہو جائے گا۔“

”اس سے پوچھ لیتا یہ کونسا سبجیکٹ لیتا چاہے  
 گی۔“

”جی۔ آپ فکر نہ کریں میں دیکھ لوں گی۔“  
 ”لو۔ کے یو کین گوناؤ۔“ اس کے جاتے ہی انہوں  
 نے اشنا کی طرف دیکھا جو تقریباً ”کھانا کھا چکی تھی۔“  
 ”اشنا آج کہیں جانے کا تمہارا پروگرام ہے؟“  
 ”نومام۔ آج میں فری ہوں اور اس وقت اپنے  
 روم میں جا کر ریسٹ کروں گی۔“

”لو۔ کے سویٹ ہارٹ ایز یوش۔“ انہوں نے  
 محبت سے اس کے گل کو چھوا اور پھر ساڑھی کا پلو  
 سنبھالتی باہر نکل گئیں۔

”میں اس وقت اپنے روم میں جانا چاہتی ہوں اس  
 لیے تم سے زیادہ بات نہ کر پاؤں گی پلیز ڈونٹ مائنڈ۔“  
 وہ اٹھتے ہوئے آہستہ سے بولی تھی جب کہ عانیہ نے سر  
 اثبات میں ہلاتے ”اٹس اوکے“ کہا۔ اس کے جانے  
 کے بعد وہ کتنی دیر وہاں اکیلے بیٹھی رہی پھر اپنے روم  
 میں آگئی۔ نجانے کیوں۔ مگر مہاپا ایک دم یاد آنے  
 لگے تھے۔ ماں بٹی کا پیار دیکھتے دل بھر سا آیا تھا۔ وہ بھی  
 تو اپنے مہاپا کی اگلوٹی بیٹی تھی۔

پاپا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں  
 نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے  
 دی تھی بن کئے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا  
 کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر مہاپا کے سلیقہ مند  
 ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی  
 تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی  
 تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم  
 ہو گیا۔ اس کی کھنکھاتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

پیارے بچوں کے لئے

## پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں  
 پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے  
 آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ ایک ہفت

قیمت 300/- روپے

ڈاک خرچ 50/- روپے

بزرگ ذاک منبوت کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

[[جنرل کورن 100]] اکتوبر 2015



مما پیا کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ اس نے آج تک اپنا ہاتھ کسی کے سامنے نہ پھیلا یا تھا۔

پیا نے تو اس کا ہاتھ کبھی اپنے اور ماما کے سامنے پھیلانے کی بھی نوبت نہ آنے دی تھی۔ مہینے بعد تنخواہ ملتے ہی وہ اک مخصوص رقم اس کے کمرے میں اس کے سرہانے رکھ دیتے جس سے اس کی مہینے بھر کی تمام ضرورتیں با آسانی پوری ہو جایا کرتیں۔ اسے کتابوں سے عشق تھا وہ اپنی پاکٹ منی کا زیادہ تر حصہ اچھی اچھی کتابیں خریدنے میں سرور کیا کرتی تھی۔ اس کے گھر کی چھوٹی سی لائبریری مختلف قسم کی کتابوں سے بھری پڑی تھی۔ وہ قدرے کم گو اور شرمیلی سی لڑکی تھی اسے نجٹ کرنی نہیں آتی تھی بلکہ زیادہ بولنا بھی اسے کبھی کبھی بہت دشوار لگتا۔ بھیلی بھیلی پلکوں کو جھپکتے وہ معصوم سی لڑکی اپنے آنسو اپنے اندر ہی اتارنے لگی۔



اس کا ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ آج یونیورسٹی جاتے اسے تیسرا دن تھا جب ساڑھے بیگم نے اسے اپنے روم میں بلایا۔ تاک کرتے وہ اندر داخل ہو گئی۔

”السلام علیکم آنٹی جی۔ آپ نے بلایا۔“  
”ہاں آؤ بیٹھو۔ میں تمہارا ہی ویٹ کر رہی تھی۔“  
خود پر فہوم اسپرے کرتے انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بر تکلف سے انداز میں ٹک گئی۔  
”کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی ایڈمیشن میں؟“ وہ اب بالوں میں برش کر رہی تھیں۔  
”نہیں۔“ اس نے مختصر کہا۔  
”ایڈجسٹ کر گئی ہو۔“ برش رکھتے وہ دراز کی طرف جھکیں۔

”جی۔“ جواب اب بھی مختصر سا تھا۔  
”یہ لے لو۔“ اس کے قریب آتے انہوں نے کچھ رقم اس کی طرف بڑھائی۔  
”جی۔ یہ۔ میں۔“ وہ پیسے دیکھ کر پہلے حیران ہوئی پھر ہچکچا سی گئی۔  
”ہاں تم یونیورسٹی جاتی ہو ظاہر ہے ضرورت تو

پڑے گی۔“  
”مگر آنٹی میں یہ کیسے لے سکتی ہوں۔“ وہ پیسے لینے میں جھجک رہی تھی۔ ان کے ہاتھ پر سلوٹس ابھرنے لگیں۔

”کیوں۔ تم کیوں نہیں لے سکتی۔ اتنے سارے لوگوں کے سامنے میں نے تمہاری ذمہ داری لی ہے اور اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تمہاری ساری ضرورتیں میری ذمہ داری میں شامل ہیں۔“

اس بار ان کا لہجہ کچھ نرم سا ہو گیا۔  
”مگر آنٹی یہ بہت زیادہ ہیں اور مجھے اتنے سارے پیسوں کی ضرورت نہیں۔“

”ضرورت پڑتے دیر نہیں لگتی۔“ انہوں نے وہ پیسے اس کی گود میں ڈال دیئے۔

”زینبی کے ساتھ جا کر اپنے لیے کچھ نوڈ ریسز بھی لے آنا اور اب جاؤ اپنے کمرے میں۔“ ان کے حتمی انداز میں کہنے پر وہ کچھ جھجی کئے بغیر کمرے سے نکل آئی۔



وہ آج ساری دوپہر سوٹی رہی تھی مگر اس کے باوجود بھی کسبندی اور سستی محسوس کر رہی تھی۔ زینبی کو چائے کا کمرہ کروہ لان میں چلی آئی۔  
شام کے سائے پھیلنے ہی والے تھے۔ بچپن سے ہی اسے اس وقت میں عجیب سی اٹریکشن فیل ہوتی تھی۔ غروب آفتاب سے ذرا پہلے جو ارد گرد لالی چھائی تھی اسے پسند تھی جو اسے یہ احساس دلاتی تھی کہ ہر گرم دن کا اختتام ٹھنڈی شام پر ہوتا ہے اور اس ٹھنڈی شام کی لپیٹ میں آنے والی رات کا اختتام اک نرم اجلی صبح پر ہوتا ہے اور یہ گردش لیل و نہار ہی تو احساس دلاتی ہے زندگی کی حقیقت کا اس کی سچائی کا جس میں مگن انسان وقت کی ڈور سے جڑا زندگی جی لیتا ہے اچھی یا بری یہ تو بعد کی بات ہوتی ہے۔  
”عانیہ میم آپ کی چائے۔“ اسی وقت زینبی کی آمد



سے اس کا تسلسل ٹوٹا۔

”او بیٹھو زینی۔“ اس نے اپنی طرف برہائی جانے والی چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ زینی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”اگر تم مجھے عالی کہو گی تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا یہ میم ویم مجھے کوئی خاص پسند نہیں ہے۔“ چائے کا سب لیتے اس نے ہلکی سی ٹاک چڑھائی، انداز میں بلاگئی معصومیت تھی۔ سرشات میں ہلاتے زینی مسکرا دی۔

”ویسے تم چائے کافی اچھی بناتی ہو۔“

”تھینکس۔ آپ سے ایک بات کہوں عانیہ؟“

”ہاں کہو نا۔“

”آپ بہت اچھی ہیں، دو سروں سے بہت مختلف،

بہت پیاری، بہت معصوم اور بہت سادہ۔“

”ارے بس بس۔ تم نے تو مجھے پتا نہیں کیا سے کیا بنا دیا میں ایک بہت عام سی لڑکی ہوں اس گھر کے دو سرے افراد کی طرح ماڈرن، اسٹائلش اور غیر معمولی خوب صورت نہیں ہوں۔“

”آپ اسٹائلش اور ماڈرن نہیں ہیں۔ آپ خوب صورت نہیں ہیں یہ بات میں نہیں مان سکتی۔ آپ کے چہرے کا پہلا تاثر بہت بھلا، نرم، معصوم اور انوکھا ہوتا ہے۔“

اسی وقت چوکیدار نے مین گیٹ کھولا اور بلیک کٹر کی پراڈو اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے ہی ایک جیپ بھی تھی۔ جس میں سے دو باوردی پاڈی گارڈز ہاتھوں میں اسلحہ تھامے مستعدی سے باہر نکلے پھر ان میں سے ایک نے پھرتی مگر مکمل موڈب انداز سے پراڈو کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر باہر نکلنے والی ہسٹی کو دیکھ کر تو عانیہ سعید جیسے پلک تک جھپکنا بھول گئی۔ بلیک ڈنر سوٹ میں نکھر اٹھا خوشبو میں بکھیرا وہ جو کوئی بھی تھا ۴ انتہا کا پرکشش اور ڈشنگ تھا۔ لان اور پورچ کا فاصلہ کچھ اتنا زیادہ بھی نہ تھا مگر اس کے باوجود اس نے اک سرسری سی نظر بھی لان کی طرف نہ ڈالی۔ پرنیوم اور کلون کی ملی جلی مہک عانیہ سعید کے نتھنوں میں بلا اجازت آکھسی۔ وہ بے نیاز سا شخص اسے کسی ریاست

کا شہزادہ ہی لگا تھا۔ اک شان تمکنت سے وہ راہداری سے گزر کر اندر کی طرف بڑھ گیا، اور پاڈی گارڈز وہیں چوکیدار کے پاس ہی کھڑے رہے۔

عانیہ کو وہ سارا ماحول ایک دم خالی خالی سا لگنے لگا۔ کیا کسی انسان کی شخصیت اتنی زور آور بھی ہو سکتی ہے کہ آئے اور چھا جائے، پلٹے اور تسخیر کرے۔ وہ فقط سوچ کر رہ گئی۔

”زینی پیس۔؟“

”یہ عرشان صاحب ہیں۔ داؤد صاحب کے بیٹے؟“

اور داؤد صاحب مظہر صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔“

”او۔ اچھا۔ مگر یہ۔“ اس کی نظر پاڈی گارڈز کی

طرف اٹھی زینی اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے

بولی۔

”بڑے لوگ ہیں جی، سو طرح کی دشمنیاں ہوتی ہیں

اور ویسے بھی داؤد صاحب کا سیاست سے تعلق ہے

تو۔“

”او۔ اچھا۔“

”میں اندر جا رہی ہوں، ساڑہ میڈم کو میری

ضرورت ہوگی کیا آپ چلیں گی؟“

”نہیں، تم جاؤ میرا ابھی موڈ نہیں ہے۔“

”جی بہتر۔“ اس کے اندر جاتے ہی عانیہ نے اپنا سر

کرسی کی پشت سے نکا دیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا، وہ

کافی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ خوشبو کا جھونکا ایک بار پھر

سے اس کی ٹاک سے ٹکرایا اس نے بے ارادہ ہی پورچ

کی طرف دیکھا تھا۔ پاڈی گارڈ دروازہ کھول رہا تھا اور وہ

شہزادوں کی آن بان، عشان رکھنے والا بھرپور مردانہ

وجاہت کا شاہکار اپنی لشکارے مارتی نئی نکور گاڑی میں

سوار ہو رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ہی گیٹ سے

باہر نکلی تھیں وہ لمبا سانس ہوا میں چھوڑتی اندر جانے

کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔



داؤد صاحب نے ان سب کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اشنا

نے تو طبیعت خرابی کی وجہ سے جانے سے انکار کر دیا۔



سائرہ بیگم نے زینی کے ہاتھ اسے پیغام بھیج دیا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر آنٹی سائرہ کو بھی ناراض ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی اس لیے بے دلی سے اپنے کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔

”یہ تم تیار ہوئی ہو؟“ وہ جیسے ہی لاونچ میں آئی انہوں نے سر سے پیر تک اسے تنقیدی نظروں سے گھورا۔ بلک کھر کے پکین سوٹ میں جس پر شاکنگ پنک پٹیاں لگی تھیں، اپنے وہ انہیں عام دنوں کی طرح ہی لگی۔ میک اپ کے نام پر اس نے اپنی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں کاجل تک نہ ڈالا تھا۔

”مم میں ٹھیک تو ہوں آنٹی۔“ ان کے دیکھنے کے انداز سے اسے عجیب سی سبکی کا احساس ہوا تھا۔

”وہ جو میں نے تمہیں پیسے دیے تھے اس کی تم نے ابھی تک شاپنگ کیوں نہیں کی؟“

”وہ۔۔۔ ابھی مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔“

”ابھی بھی تمہیں ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔“ طنزیہ حیرت بھری نظروں سے انہوں نے ایک بار پھر اسے سر تپا گھورا۔

”اب اگر یہاں آگئی ہو تو ہمارے اسٹیشن کے مطابق خود کو تبدیل بھی کرو۔ تم سے زیادہ اچھے کپڑے تو اس گھر کے ملازم پہنتے ہیں۔ آئندہ اس بات کا خیال رکھنا اور چلو اب۔“ ہتک و خجالت کے شدید ترین احساس سے اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا تھا۔ اپنی ایسی تذلیل پر اس کا معصوم دل کافی دکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے ہونے لگے۔ اپنی بھیگی بھگی پلکیں جھپکتے سر جھکائے ان کے تعاقب میں چل پڑی۔ زینی نے تاسف بھری نظروں سے اس کو جاتے دیکھا تھا۔ اور یہاں آکر تو حقیقتاً اس کے چوہ طبق روشن ہو گئے۔

”کیا واقعی وہ کوئی گھر ہی تھا۔ آنٹی سائرہ کا گھر تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ اک غرور لیے سامنے کھڑی یہ شاندار عمارت کسی صورت بھی کسی محل سے کم نہ تھی۔ عانیہ سعید نے اسے دل ہی دل میں

خوب سراہا تھا۔

ان کی گاڑی جیسے ہی وسیع و عریض پورچ میں آکر رکی ایک ملازم نے مودب انداز میں دروازہ کھولا تھا۔ رانداری کے شروع میں ہی ایک بے انتہا رکش لڑکی گرین کھر کی ساڑھی پہنے ہاتھوں میں بکے پکڑے ان کے انتظار میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”گنڈ ایوننگ میم۔“ اس نے بکے سائرہ بیگم کی طرف برہمایا۔

”صاحب کہاں ہیں تمہارے؟“ سائرہ بیگم کے بکے تھامتے ہی مظہر صاحب نے پوچھا تھا۔

”جی۔۔۔ وہ اندر آپ کا ہی ویٹ کر رہے ہیں، آئیے پلیز۔“ تھوڑا سا سر خم کرتے اس نے ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

”تو کیا یہ بھی ملازم ہے؟“ اتنی حسین۔“ عانیہ کا حیرت کے باعث منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ادائے نزاکت سے اسے اپنے ساتھ چلتی اس لڑکی کو اس نے کنکھیوں سے کئی بار دیکھا تھا۔ انجانے میں وہ جس دنیا کا حصہ بن چکی تھی وہ واقعی اس کی دنیا سے یکسر مختلف تھی۔ کچھ دیر پہلے جو آنٹی کی بات سے اسے اپنی شدید انسٹیل فیل ہوئی تھی، یہاں آکر اسے احساس ہوا کہ انہوں نے ایسا کچھ غلط بھی نہ کہا تھا۔ اس نے خود پر ایک نظر ڈالی اور پھر احساس کمتری میں مبتلا ہونے لگی۔ کیا وہ کبھی ان لوگوں میں ایڈجسٹ کر پائے گی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ ان جیسا نہیں بن سکتی تھی۔ اندر کی بے چینی کو زائل کرنے کے لیے وہ اپنے نیچے والے ہونٹ کو بلاوجہ کھینچنے لگی۔

”ویل کم ٹومائے سوٹ پیکس مظہر۔“ اسی دوران داؤد صاحب بڑے پر جوش انداز میں ان کی طرف بڑھے اور پھر مظہر صاحب کو گلے لگا لیا۔

”یو نو یار آج ہم تین ماہ بعد مل رہے ہیں۔“ وہ خوش دلی سے بولے تھے جب مظہر صاحب مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا گئے۔

”زندگی کی مصروفیات نے کچھ زیادہ ہی بڑی کر ڈالا



ہے ہمیں ابھی ابھی آپ اگر دُور پر نہ بلا تے تو آنا مشکل تھا۔“

”جانتا ہوں اسی لیے یہ اہتمام کیا ہے۔“  
”بی جی کہاں ہیں؟“ مظہر صاحب نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”ملازمہ لینے گئی ہیں انہیں وہ آتی ہی ہوں گی تم بیٹھو تو سہی۔“ اس دوران سائرہ بیگم اور عانیہ بالکل خاموش کھڑی رہیں۔

”اور تم کیسی ہو سائرہ؟“ داؤد صاحب کے لہجے میں بڑے بھائیوں والا لاڈ تھا۔ وہ آہستہ سے سرابٹ میں ہلا گئیں۔ ”میں ٹھیک ہوں بھائی جان۔“

”شناختی نظر نہیں آرہی؟ کیا وہ نہیں آئی؟“  
”جی۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے نہیں آئی۔“

”کیوں کیا ہوا اُسے؟“ وہ ایک دم پریشان ہو گئے۔  
”کچھ خاص نہیں بھائی جان بس سر میں درد تھا میڈیسن لے کر سوئی ہوئی تھی۔“

”او۔ اچھا!“ پھر ان کی نظر اچانک اس پر پڑی۔  
”اور اس پیاری سی بیٹی کا تعارف تو آپ نے کروایا ہی نہیں۔“

”یہ بھانجی ہے میری۔ والدین کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈھٹھ کے بعد اسے میں اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔“

”داؤدیری سسٹ۔“ انہیں حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔  
”السلام علیکم انکل۔“ اس کے سلام پر انہوں نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے سرابٹ میں ہلایا۔ اسی

دوران ملازمہ بی جی کی چیر گھسیٹی ہوئی لے آئی تو سب کی توجہ ان کی جانب ہو گئی۔ سب سے پہلے ان کی طرف بڑھنے والا مظہر صاحب ہی تھے۔

”کیسی ہیں بی جی؟“  
”میں تو ٹھیک ہوں مگر تم نے اس بار بڑی دیر کے بعد چکر لگایا ہے۔“ ان کا ماتھا چومتے انہوں نے جیسے ہلکا سا شکوہ کیا۔

”بس بی جی مصروفیت ہی بہت رہی ہے۔“ پھر سائرہ

بیگم کے سلام کرنے کے بعد بی جی کی نظر کچھ نروس سی انگلیاں چٹکتاتی عانیہ پر پڑی۔

”یہ بھانجی ہے میری بی جی۔“ ان کی نظروں کا مطلب سمجھتے سائرہ بیگم نے تعارف کروایا وہ اک جھجک لیے آگے بڑھی اور پھر انہیں سلام کرتے اپنا سر ان کے سامنے جھکا دیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ان کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے چمکیں۔ آج کے دور میں بڑوں کا ایسا احترام۔ عانیہ سعید کا پہلا ہی تاثر بہت اچھا رہا تھا۔

”عرشان کہاں پہلی جی نظر نہیں آرہا۔“  
”اس کا فون آیا تھا، تھوڑی ہی دیر میں گھر پہنچنے ہی والا ہے۔“ سائرہ بیگم کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ پھر

وہ سب تو باتوں میں مصروف ہو گئے اور عانیہ سعید وہاں بےوجہ ہی بور ہوئی رہی۔

”عانیہ اگر تم بور ہو رہی ہو تو ملازمہ کے ساتھ جا کر گھر دیکھ لو۔“ سائرہ بیگم کو ہی آخر اس کی بوریت کا احساس ہوا تو انہوں نے کہہ دیا۔ عانیہ نے بے ساختہ

تشکر بھرا سانس لیا اور پھر ملازم کی رہنمائی میں لان کی طرف آگئی۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے اس کا پسندیدہ وقت شروع ہو چکا تھا۔ دھیمے سے مسکراتے وہ

پھولوں کی باڑ کے پاس آکھڑی ہوئی۔ سبز گھاس پر چنبیلی کے سفید پھول گرے بہت خوب صورت لگ رہے تھے وہ آہستہ سے جھکی اور پھر انہیں دوپٹے کے پلو میں اکٹھا کرنے لگی۔

”ہیلو کون ہیں آپ؟“ بارعب گبھیر پر کشش مردانہ آواز پر وہ بوکھلاتے ہوئے پلٹی۔

”کون ہو تم۔ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟“ عرشان داؤد نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

عانیہ سعید اسے لمحوں میں پہچان گئی تھی۔ وہ عرشان داؤد تھا، داؤد انکل کا بیٹا، مظہر انکل کا بھتیجا، اور اس گھر کا اکلوتا چشم و چراغ۔ لمحوں میں دلوں کو سنخیر

کرنے والا جاوید گر جبکہ اس کے برعکس عرشان داؤد اسے بھرپور اجنبی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے نہیں جانتا تھا۔ اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا مگر اس



کے باوجود بھی وہ اس چہرے کے پہلے تاثر کو دیکھتے ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا ضرور تھا۔

”کیا پاپا نے کوئی نئی ملازمہ رکھی ہے؟“ اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی اس نے ایک بار پھر سے اسے سر تاپیر گھورا۔

”کیا تم نئی ملازمہ ہو؟“

”جی! عانیہ کی تو جیسے پوری آنکھیں کھل گئیں۔ بے عزتی کے احساس سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ کیا واقعی وہ ملازمہ لگ رہی تھی۔

”کب اپوائنٹ کیا ہے پاپا نے تمہیں؟“ وہ اس کے جی کو اپنے ہی معنی میں لیتے دوبارہ بولا ”شدید تنگ محسوس کرتے اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔

عرشمان داؤد کی آنکھیں ان جھیل کنوئوں پر ٹھہری گئیں۔ لباب پانی سے بھرے کنویرے پھلکنے کو بے تاب عرشمان داؤد کو عجیب سی کشمکش میں مبتلا کرنے لگے۔

”عانیہ میم کھانا لگ گیا ہے سب لوگ آپ کا اندر وٹ کر رہے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ وہ ضبط کھودیتی ملازمہ کے پکارنے پر اندر کی طرف بھاگ گئی۔

”میم؟ انتظار؟“ وہ حیران حیران سا اس کے پیچھے اندر کی طرف بڑھا تھا۔

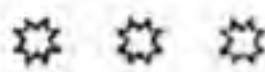
”اسلام علیکم!“ ڈانگ ہال میں داخل ہوتے اس نے سب کو مشترکہ سلام کہا تھا اور پھر عانیہ پر اس کی نظر جیسے ٹھہری گئی جو سر جھکائے آنٹی سارہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ یعنی وہ ملازمہ نہیں تھی۔ تو پھر کون تھی؟

”بھینچ کر کے آجاؤ ہم تمہارا ہی وٹ کر رہے تھے۔“

”جی آپ شروع کیجیے میں بس پانچ منٹ میں آیا۔“ پاپا کے کہنے پر وہ عانیہ کے جھکے سر پر سر سوچ نظر ڈالتا الجھتا ہوا اپنے سرے کی طرف بڑھا۔ وہ کھانے کے ساتھ ساتھ پاپا اور چچا جان سے باتوں میں بھی مصروف تھا۔ نظریں گاہے بگاہے عانیہ کی طرف بھی اٹھ جاتیں جو اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھی۔ اس نے

ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ عرشمان داؤد کو ندامت سے ہونے لگی۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے کی تو اسے تربیت نہ دی گئی تھی، انجانے میں ہی سہی مگر وہ غلطی کر چکا تھا اور اب جبکہ اسے پتا چل چکا تھا کہ وہ آنٹی سارہ کی بھانجی ہے تو گلٹ اور برہہ گیا تھا۔

”لہکسکووزی مس عانیہ۔“ واپسی پر وہ سر جھکائے سب سے پیچھے چلی آ رہی تھی جب اس کے پکارنے پر ناچا پتے ہوئے بھی رک گئی۔ ”سوری“ اگر آپ میری وجہ سے ہرٹ ہوئی ہیں میں نے وہ سب جان بوجھ کر نہیں کہا تھا۔“ عانیہ اس سے کوئی بھی بات کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اسے روہ پواتے ہی وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہونے لگی اور یہ ہی چیز اسے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔



لی جی آج مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔  
”کیوں کیا ہوا؟“ رات وہ لی جی کی گود میں سر رکھے کہہ رہا تھا جب انہوں نے پوچھا۔  
”وہ جو آنٹی سارہ کی بھانجی آئی تھی نا ان کے ساتھ۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“  
”ماشاء اللہ کافی سلجھی ہوئی اور پیاری بچی تھی۔ اس کے انداز و اطوار دیکھتے صاف پتا چلتا ہے کہ بہت اچھے طریقے سے اس کی پرورش کی گئی ہے۔ سلام کرنے کے بعد اس نے بڑے احرام سے سر جھکایا تھا اور نہ آج کل کے بچوں میں تو ایسی اخلاقیات سرے سے ہی نہیں پائی جاتیں۔“

”میری بھی تو سنیے نا۔“ لی جی کی تعریفیں اس کے اندر کے گلٹ کو اور برساتی جا رہی تھیں اس لیے زچ ہوتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہاں کو پتر جی میں سن رہی ہوں۔“  
”وہ اہک جو سکی۔ میں اسے ملازمہ سمجھ بیٹھا تھا۔“  
”کیا۔۔۔؟“ لی جی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔



”عرشان یہ کیا حرکت کی بیٹا آپ نے کیا وہ آپ کو ملازمہ لگی تھی اتنی موہنی اور پیاری صورت تھی اس کی میری تو ابھی تک نظروں میں گھوم رہی ہے۔“ انہیں حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔

”اوہو۔ لی جی کہا تو ہے کہ غلطی ہو گئی۔“ وہ جھنجلا سا گیا یہ اس کی طبیعت کا خاصا تونہ تھا مگر دل کی بے چینی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

”تو بیٹا آپ نے اس سے الیکسکیوز کر لینی تھی۔“ وہ اس کے ماتھے کے بل سمیٹتے ہوئے جھٹ سے بولیں۔

”کی تو تھی۔“

”پھر۔“

”پھر کیا۔ نور پلائی لگتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ ہی مائنڈ کر گئی تھی۔“

”تو بیٹا اسے کرنا بھی چاہیے اب اگر کوئی آپ کو ملازم کہے تو آپ کو کیسا لگے گا۔“

”کیوں۔ کوئی مجھے ملازم کہے گا میری شکل ملازموں جیسی ہے کیا۔“ وہ برہم سا گویا ہوا لی جی مسکرا دیں واقعی اس کی شکل تو شیرازوں جیسی تھی۔ تو کیا اس لڑکی کی صورت ملازموں جیسی تھی۔

”آپ اس سے دوبارہ الیکسکیوز کر لیں مائے سن۔“

”جی کر لوں گا۔“ سر اثبات میں ہلاتے وہ تابعداری سے بولا تھا لی جی تو اس کی اس ادھر اشارہ ہی تو ہو گئیں۔

”انہیں اپنا یہ پوتا حد سے زیادہ عزیز تھا اگر یوں کہا جائے کہ اس کے اندر ان کی جان بستی تھی تو کچھ غلط نہ ہو گا۔“ عمارہ کے جانے کے بعد انہوں نے ہی اس کی پرورش کی تھی اس کی شخصیت کو نکھارنے میں اپنی طرف سے تو انہوں نے کوئی کثر نہ چھوڑی تھی۔ کچھ وہ خود بھی بہت سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا ایک دفعہ

بی جی نے جس بات سے منع کر دیا تو دوبارہ پلٹ کر وہ بات نہ کی عورت ذات کے حوالے سے اس کی سوچیں کچھ منتشر اور مبہم سی تھیں۔ عورت کے لیے وہ اک خاموش سمندر کی مانند تھا جس میں آج تک پہلا پتھر

چھینکنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی تھی۔  
مما جب اسے چھوڑ کر گئی تھیں تو اس کی عمر فقط سات سال کی تھی ذہن کچا تھا اور دل معصوم اگر بی جی کا سہارا نہ ہوتا تو عورت ذات کے لیے اس کے دل میں اب تک شدید نفرت پیدا ہو چکی ہوتی، ممما کا کردار اک آئینے کی طرح اس کے سامنے تھا۔ ممما کے ڈانچ سے پاپا ٹوٹ گئے تھے بکھر گئے تھے عورت ذات سے نفرت کرنے لگے تھے، مگر وہ ایسا نہیں کہ پایا تھا وہ اگر عورت سے نفرت نہیں کرتا تھا تو محبت بھی نہیں کہ پایا تھا۔ وہ لی جی کو ٹوٹ کر چاہتا تھا اور شاید یہ ہی وجہ تھی کہ وہ عورت سے نفرت کرنے میں خود کو کمزور پاتا تھا، مگر اس بار محبت اسے جن چکی تھی اور محبت کا تو کام ہی انسان کو اپنی اسیری میں لے کر بے بس کرنا ہوتا ہے۔



وہ آج خاص طور پر اس سے الیکسکیوز کرنے کے ارادے سے وہاں آیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی اس نے زینی سے عانیہ کو بلانے کے لیے کہا تو زینی نے خاصی حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے عرشان داؤد کا اس طرح سے عانیہ کو بلانا قابل حیرت ہی تو تھا جب زینی نے پیغام عانیہ تک پہنچایا تو وہ بھی کافی حیران ہوئی تھی۔

”وہ فحشہ سے کیوں بلانا چاہتا ہے؟“

”یہ تو مجھے بھی پتا نہیں مگر وہ ڈرائنگ روم میں آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔ آپ جائیے میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ زینی کے جانے کے بعد وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی، گھریلو ساہ سا پرپل اور وائیٹ سوٹ دھلا دھلایا صاف شفاف چہرہ۔

”ہاتھ سے کپڑوں کی سلوٹیں دور کرتے سر پر دوپٹا اوڑھ کر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔“

”السلام علیکم!“ اندر داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا۔

”و علیکم السلام۔“ یہ کھنٹ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”پلیز بی سیٹل۔“



”تھینکس۔“

”زینی بتا رہی تھی کہ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔  
خیریت؟“ اس کے سامنے والے صوفے پر براہمان  
ہوتے اس نے نارٹل سے انداز میں پوچھا، ”ورنہ اسے  
روہ پاتے دل کی حالت غیر ہونے لگتی تھی۔“

”اچھا، وہی اس دن کے حوالے سے میں آپ  
سے معذرت کرنے آیا ہوں۔“ عانیہ نے نظریں  
اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ واقعی تادم نظر آ رہا تھا۔  
”اٹس اوکے۔“ اسی وقت زینی چائے کے ساتھ  
دیگر لوازمات سے بچی ٹرائی کھینٹے اندر داخل ہوئی۔

”ایم سوری میں عانیہ، میں اس وقت کچھ بھی نہیں  
لے پاؤں گا۔ آئی ہو شارٹ ٹائم، بہت اہم میٹنگ  
اینڈ کرنی ہے۔ آئی ہوپ آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔  
میں تو بس آپ سے ایکسکوز کرنے آیا تھا۔“

وہ دھیرے سے مسکراتے اٹھ کھڑا ہوا۔ عانیہ سعید  
کی نظریں اس کی مسکراہٹ پر جم سی گئیں۔ کیا کسی  
مرد کی مسکراہٹ اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے۔  
وہ سوچ کر رہ گئی۔



اشنا کی برتھ ڈے پارٹی کو کافی بڑے پیمانے پر اریج  
کیا گیا تھا۔ وہ تولان کی سجاوٹ دیکھ کر ہی دنگ رہ گئی۔  
ایسے لگتا تھا جیسے کسی کی شادی کے فنکشن کی تیاری  
ہو رہی ہو۔ ساری ڈیکوریشن کو سراہتی ہوئی نظروں  
سے دیکھتے وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہ یہ ہی سوچ  
رہی تھی کہ فنکشن میں کونسا سوٹ پہنے کہ اسی وقت  
ناک کرتے زینی اندر داخل ہوئی۔

”عانیہ آپ کو میڈم سائہ اپنے روم میں بلا رہی  
ہیں۔“ وہ سر ہلاتے سائہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ  
گئی۔

جو اپنے سامنے بیڈ پر وائیٹ کلر کا نہایت خوب  
صورت فرائیڈ پھیلائے سوچوں میں گم تھیں۔

”میں آجاؤں آئی؟“

”ہاں ہاں آجاؤ، میں تمہارا ہی ویٹ کر رہی تھی یہ“

ڈریس کیسا ہے؟“ انہوں نے وہی فرائیڈ اس کے  
سامنے کیا۔ فرائیڈ کے گھیراؤ اور چمک دھمک نے  
حقیقتاً اس کی آنکھیں خیرہ کر دی۔  
”بہت بہت زیروست ہے آئی؟“ اس نے کھلے  
دل سے تعریف کی تھی۔

”یہ میں تمہارے لیے لائی ہوں، آج رات کے  
فنکشن کے لیے۔“

”جی“ حیرت سے اس کی زبان گنگ سی رہ گئی۔  
اسے کسی صورت یقین نہ آیا تھا۔

”مٹا آگین عانیہ، کتنی بار میں تمہیں کہہ چکی  
ہوں کہ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہمارے اسٹینڈس  
کو مد نظر رکھ لیا کرو۔ تم مشرقی لباس پسند کرتی ہو اس  
لیے میں نے تمہارے لیے یہ خریدی ہے جبکہ اشنا  
مغربی لباس پسند کرتی ہے تو اس نے اپنے لیے میکسی  
خریدی ہے۔“

آج پہلی بار تم ہمارے سرکل میں متعارف کروائی  
جاؤ گی اور سب تمہیں سائہ بیگم کی بھانجی کی حیثیت  
سے ہی ملیں گے اور یہ میں کسی صورت برداشت  
نہیں کر پاؤں گی کہ تم کسی سے بھی کم نظر آؤ، یہ لو اور  
اب جاؤ، مہمان آنے ہی والے ہوں گے۔ تیار ہو جاؤ  
جا کر۔“

اس نے ان کے ہاتھ سے فرائیڈ لی اور پھر اپنے  
کمرے میں آگئی۔ ڈریس کی ٹینشن تو ختم ہو گئی تھی مگر  
یہ بھی سچ تھا کہ حیرت کسی صورت ختم نہ ہو رہی تھی۔  
وہ شاید آئی سائہ کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ  
اوپر سے سخت، کرخت، ٹھنڈی نظر آنے والی اندر  
سے بالکل برعکس تھیں۔ وہ ہر چیز پر فیکٹ چاہتی  
تھیں۔ معمولی سی چیز ان سے جڑ کر خاص ہو جاتی  
تھی۔ وہ خود کو نمایاں رکھنے کی عادی تھیں پھر وہ کس  
طرح گوارا کر لیتی تھیں کہ ان کی بھانجی اس فنکشن میں  
معمولی کپڑوں میں نظر آئے۔ وہ ظاہر نہیں کرتی تھیں  
مگر انہیں عانیہ کی پروا تھی مگر ان کا پروا کرنے کا انداز  
ذرا مختلف تھا، اور عانیہ سعید کو یہ بات اب بڑی تفصیل  
سے سمجھ آ چکی تھی۔ وہ ایک اخروٹ کی طرح کی تھیں



سی عانی کتنی دیر خود کو آئینے میں دیکھتی رہی۔  
”یہ سب اس ڈریس اور میک اپ کا کمال ہے ورنہ  
میں تو وہی پرانی سی عانیہ سعید ہوں۔“ اس کے سادگی  
اور معصومیت سے کتنے پر زنی مسکرا دی۔



اشنا کا لباس آج کے دن بھی عانی کو کافی نامناسب  
لگا۔ عانیہ سعید نے سوچا اگر وہ اس وقت مغربی کے  
بجائے مشرقی لباس میں ہوتی تو انتہا کی حسین لگ رہی  
ہوتی مگر ساری بات ہی اپنی اپنی پسند کی ہے۔ تمام  
مہمان آچکے تھے۔ آئی سب سے اس کا برہہ چڑھ کے  
تعارف کروا رہی تھیں۔ ان کی اس قدر محبت و اہمیت  
پر عانیہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔  
اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی کہ وہاں موجود کئی  
لوگوں کی نظر ٹھنکی تھی۔

اس پل عریشان داؤد اندر داخل ہوا تھا۔ عانیہ کی نظر  
جیسے اس پر ٹھہری گئی۔ نیوی بلو سوٹ میں وہ حسب  
معمول اس وقت بھی مردانہ وجاہت کا دلکش شاہکار  
نظر آ رہا تھا بے ساختہ ہی عانیہ کی ہارٹ بیٹ مس  
ہوئی وہ دشمن جاں اسی کی طرف ہی آ رہا تھا عانیہ سعید  
کے پورے وجود میں پھریری سی گھومی چہرے پر پسینے کی  
چھوٹی چھوٹی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔ یہ کیسا  
احساس اس ایک لمحے میں اس پر آشکار ہوا تھا یہ کیسا  
ادراک تھا یہ کیسی آگہی تھی اس کی آنکھوں کے  
کونے نمکین پانی کی لپیٹ میں آنے لگے۔ وہ قریب  
آچکا تھا عانیہ نے آہستہ سے اپنا سر جھکا لیا۔

”السلام علیکم عانیہ کیسی ہیں؟“ عانیہ نے ہولے  
سے سر اٹھایا۔ عریشان داؤد بے اختیار ٹھنکا عانیہ کی  
آنکھوں کا بھیجا بھیجا تاثر اسے وہیں منجمد کر گیا۔ عریشان  
داؤد نے بغور اس چہرے کو دیکھا تھا سرسری اٹھی نظر  
کب گہری ہوتی گئی اسے خود بھی احساس نہ ہوا۔ وہ  
دونوں ہی ارد گرد سے غافل عجب خود فراموشی میں کتنی  
دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ کافی دیر کے  
بعد ہی وہ خود میں لوٹے تھے عریشان داؤد کی آنکھوں

جو بظاہر سخت نظر آتا ہے مگر اندر سے انتہائی نرم ہوتا  
ہے۔ وہ اک رشتے کی دُور سے بندھی اس گھر میں  
موجود تھی اور آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ رشتہ اتنا کچا  
ہرگز نہ تھا۔ عانیہ کے ہونٹوں کو دھیمی سے مسکراہٹ  
نے چھو لیا۔

وہ ڈریس لے کر واش روم میں گھس گئی اور پھر  
جب چینیج کر کے قد آدم آئینے کے سامنے آکر کھڑی  
ہوئی تو خود کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ فرائی کی فننگ  
پر فیکٹ تھی وہ اس میں باری ڈول ہی لگ رہی تھی۔  
کتنی دیر تو پلک جھپکے بغیر وہ خود کو دیکھتی رہی۔ کیا واقعی  
وہ اتنی خوب صورت تھی۔ اس نے تھیرے سوچا  
اسی وقت ٹاک کرتے آئی کمرے کے اندر داخل  
ہوئیں اور یہ ان دو ماہ میں پہلا موقع تھا کہ وہ خود سے  
چل کر اس کے روم میں آئی تھیں۔ اسے دیکھتے ان کی  
آنکھوں میں جو پہلا تاثر ابھرا تھا وہ ستائش و پسندیدگی کا  
تھا۔ عانیہ جھینپ سی گئی۔

”ڈریس لیتے وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ تم پر  
اتنا سوٹ کرے گا۔“ تعریف تھوڑے مختلف انداز  
میں کی گئی تھی مگر عانیہ مسکرا دی۔

”میک اپ کیوں نہیں کیا تم نے؟“  
”وہ۔۔۔ آئی میں نے زندگی میں کبھی میک اپ  
نہیں کیا۔“ انہوں نے انٹرکام پر زنی کو آنے کے لیے  
کہا۔

”زنی اس کا میک اپ کرو چونکہ اس نے زندگی  
میں کبھی میک اپ نہیں کیا تو بہت سو فٹ اور لائٹ ٹیج  
دینا۔“ زنی کو کہیں وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی باہر چلی  
گئیں انہیں خود بھی جا کر تیار ہونا تھا اشنا تو کب سے  
پار لڑ گئی ہوئی تھی۔

زنی نے سائرہ بیگم کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا تھا  
اور پھر جیسے زنی کی نظر اس کے خوبصورت چہرے پر  
ٹھہری گئی۔

”ماشاء اللہ! آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں  
عانیہ اللہ نظرد سے بچائے۔“ اس کے کانوں میں  
لائٹ سے ٹاپس پہناتے زنی نے کہا جبکہ حیران حیران



میں حیرت جبکہ عانیہ سعید کی آنکھوں میں نمی تھی فقط اک لمحہ لگا تھا اور وہ عام چہرہ عثمان داؤد کے لیے خاص بنایا گیا خوب صورتی تو کبھی بھی عثمان داؤد کی طلب نہ تھی تو پھر آخر کیا تھا اس چہرے میں۔

”عانیہ کیسی ہیں آپ؟“ تھوڑی دیر کے بعد عثمان داؤد نے دوبارہ پوچھا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہرگز نہ تھی اس لیے تقریباً ”وڑتے ہوئے وہاں سے پلٹی تھی۔ اشنا کے قریب آکر کھڑے ہوتے وہ کتنی دیر اپنے تیز تیز دھڑکتے دل کی دھڑکنیں سنبھالتی رہی۔

”آریو او کے عانیہ!“ اشنا کے پوچھنے پر وہ آہستہ سے سر اثبات میں ہلا گئی اور پھر وہ پورے فنکشن کے دوران عثمان داؤد کی نظریں خود پر محسوس کرتی رہی۔

”اف کتنی گہری نظریں ہیں اس بندے کی۔“ اس کے گالوں سے اچھی خاصی پیش نکلنے لگی۔ اپنے دونوں گالوں کو تھککتے وہ قدرے کم رش والی جگہ پر ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ آنٹی سائرہ اور اشنا کے ساتھ کھڑا باتوں میں مصروف تھا مگر اس کے باوجود بھی اس کی نظریں کی گرفت میں وہ بار بار آرہی تھی۔

وہ کسی بات پر ہنسا تھا عانیہ کا دل اندر سے دھڑکا تھا، نظر ٹھہری گئی اس کی نظریں کے ارتکاز کو محسوس کرتے عثمان داؤد کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی اس نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ

اٹھنے لگی۔ مگر یہ کیا، کمر کے پیچھے سے اس کی فراق کسی چیز میں بری طرح پھنستے ہوئے الجھ کر رہ گئی۔ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ اس نے اپنی طرف کھینچتے تھوڑا ہی زور لگایا تھا جس کے نتیجے میں فراق پھنسنے کی آواز صاف سنائی دی گھبراتے ہوئے اس نے بے اختیار ہی

ارد گرد دیکھا، کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا، مگر عثمان داؤد اس کے قریب آچکا تھا۔ اس نے اپنی کمر کو کرسی کی بیک سے چپکا لیا، وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی فراق کمر کے کس حصے سے اور کس حد تک پھٹی

تھی۔

”اف اللہ جی یہ کیا ہو گیا۔“ اس کا سر جھک گیا آنکھیں لب لباب پانی سے بھرنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ

اپنی بے بسی پر وہ رو دیتی اسی وقت اس کی آنکھوں کے سامنے کوٹ ٹھامے ایک ہاتھ ابھرا اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں، سامنے عثمان داؤد اپنی زور آور شخصیت کے کوٹ اس کی طرف برصائے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت از حد سنجیدہ تھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ کیا وہ اسے نوٹ کر رہا تھا۔ نیٹ کا باریک دوپٹا تو کسی صورت اس قابل نہ تھا کہ اس سے وہ اپنی پشت ڈھانپ سکتی کچھ بھی کہے بغیر اس نے آہستہ سے عثمان داؤد کے ہاتھ سے کوٹ تھام لیا اور پھر چیسر پر بیٹھے ہی اسے پہن بھی لیا، کھڑے ہوتے اس نے سرعت سے چیسر کی طرف دیکھا تھا وہاں نوک دار باریک کیل نظریں کی گرفت میں آتے ہی اس کی آنکھیں بے اختیار ہی عثمان داؤد کی نظریں سے ٹکرائی تھیں اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا، مگر عثمان نے ایک نظر کے بعد دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”لگتا ہے کہ آپ کو میری نظر لگ گئی ہے، اس ڈریس میں آپ باری بھی تو بہت لگ رہی تھیں۔“ عانیہ نے تحیر سے پلکیں اٹھائیں، مگر وہ پلٹ چکا تھا۔



وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی جب ٹیلی فون کی بیل بجی۔

”ہیلو۔“ ولیم کم کرتے اس نے ریسپونڈ کرنا سے لگایا۔

”کسی کی چیز لے کر واپس کرنے کا رواج نہیں ہے کیا آپ کے ہاں۔“

”جی۔ کیا مطلب؟ اور کون بات کر رہے ہیں آپ؟“ ایریز پیس سے ابھرنے والی مردانہ گھبراہٹ آواز نے کچھوں میں اسے حیران کیا تھا۔

”میں عثمان داؤد بول رہا ہوں۔“

”آپ۔ میں نے کون سی چیز لی ہے آپ کی؟“

”کیوں اتنی جلدی بھول گئیں، اشنا کی برتھ ڈے کو ابھی اتنا عرصہ تو نہیں گزرا۔“ ادھر سے وہ مسکراتے



ہوئے کہہ رہا تھا اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔  
 ”اوہ۔ تو آپ کوٹ کی بات کر رہے ہیں مگر وہ تو میں  
 نے ڈرائیور کے ہاتھ دو سرے دن ہی بیچ دیا تھا۔“  
 ”اچھا۔ مگر مجھے تو نہیں ملا۔“ وہ انجان بنا ورنہ  
 کوٹ تو اس وقت اس کی وارڈروب میں موجود تھا۔  
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے میں ابھی ڈرائیور سے پوچھتی  
 ہوں۔“

”ارے رہنے دیں اس بے چارے ڈرائیور کو کچھ  
 مت کہئے گا، فون تو میں نے آپ کو یہ کہنے کے لیے کیا  
 ہے کہ بی جی آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں۔“  
 ”نہیں۔؟“ وہ خاصی حیران ہوئی۔  
 ”جی آپ۔۔۔ کو۔“

”اچھا۔ کیسی ہیں وہ؟“  
 ”اب طبیعت تو ٹھیک ہے، مگر کمزوری بہت  
 محسوس کر رہی ہیں۔“

”کیوں کیا ہوا تھا انہیں!“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔  
 ”عرشان داؤد کو اس کالی جی کے لیے یوں پریشان ہونا بہت  
 اچھا لگا تھا۔“

”نہ پچھلے کچھ دنوں سے انہیں بخار تھا اسی وجہ سے تو  
 اشنا کی برتھ ڈے پارٹی پر بھی نہیں آسکیں۔ مگر اب اللہ  
 کا شکر ہے کہ ٹھیک ہیں۔“

”کب آرہی ہیں آپ؟“  
 ”کہاں؟“

”ہمارے غریب خانے پر بی جی کی عیادت کو۔“  
 ”ممس۔ میں؟“

”جی آپ۔“  
 ”ویکھتی ہوں۔“ وہ ٹال گئی۔

”کیا دیکھتی ہیں، ایک بیمار کی عیادت کے لیے بھی  
 آپ کو کچھ دیکھنا پڑتا ہے جبکہ بیمار خود آپ سے ملنے کی  
 خواہش کا اظہار کرے۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی  
 تھا۔ کئی دنوں سے وہ عجیب سی بے کلی محسوس کر رہا تھا  
 اور اب اس کی آواز سن کر دل کسی معصوم بچے کی طرح  
 ایک دم بہل سا گیا تھا، جب سے وہ اشنا کی برتھ ڈے  
 سے لوٹ آیا تھا اپنے ساتھ اک بے چینی اور بے

سکونی بھی لے آیا تھا جب کسی پل قرار نہ ملا تو دل کے  
 ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اسے فون کرنے لگا اس سے بات  
 کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تو چاہیے تھا تا پہلے  
 کوٹ اور پھر بی جی کے حوالے سے بات کرنے لگا،  
 ورنہ بی جی تو اللہ کا شکر تھا پہلے سے بہت بہتر تھیں۔  
 کل انہوں نے باتوں باتوں میں عانیہ کا ذکر چھیڑ لیا اور  
 اسی ذکر کو حوالہ بنا کر وہ اسے انوائٹ کرنے لگا۔ عانیہ کی  
 سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ اسی وقت  
 سائرہ بیگم نے لاؤنج میں قدم رکھا۔

”عانیہ کس کا فون ہے؟“ ”بو کھلاتے ہوئے اس نے  
 ریسیور کریڈل پر رکھ دیا“ ”آئی کی آمد سے وہ ایک دم گھبرا  
 سی گئی۔“

”وہ۔۔۔ وہ آئی جی بی جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے،  
 میں ان کی عیادت کو جانا چاہ رہی تھی۔“ ”عرشان کا ذکر وہ  
 دانستہ گول کر گئی۔“

”اوہ۔۔۔“ انہوں نے لباساںس ہوا میں خارج کیا۔  
 ”مگر تم جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔ میں تو اس وقت  
 بہت ضروری کام سے جا رہی ہوں، تم ایسا کرنا میری  
 طرف سے بھی پوچھ لیتا، میں ڈرائیور کو کہہ دیتی ہوں۔“

وہ تمہیں چھوڑ آئے گا، بی جی سے کہنا میں ایک دو دن  
 میں ضرور چکر لگاؤں گی۔“

”جی۔۔۔“ ان کے مصروف سے انداز میں کہنے پر وہ  
 فقط اتنا ہی کہہ سکی۔ یہ بھی سچ تھا کہ وہ وہاں جانا چاہتی  
 تھی۔ کیوں یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔



گاڑی جیسے ہی اس عالیشان محل کے پورچ میں رکی  
 وہ آہستہ سے دروازہ کھولتے باہر نکل آئی، چونکہ وہ بنا  
 بتائے آئی تھی اس لیے راہداری میں ویلم کے لیے  
 کوئی موجود نہ تھا۔ لاؤنج میں قدم رکھتے وہ بے ساختہ  
 جھجک سی گئی۔ گھر کے افراد تو ایک طرف کوئی ملازم بھی  
 نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بی جی کا کمر کون  
 سا ہے اور کسی بھی کمرے میں منہ اٹھا کر وہ گھسنا نہیں  
 چاہتی تھی۔ اسی لیے متذبذب سی انگلیاں مروڑتے



وہیں کھڑی رہی۔ اسی وقت اسے سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس نے گردن موڑتے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔

”آپ؟“ سامنے موجود عرشان داؤد کی آنکھوں میں خوش گوار حیرت ابھری تھی۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔ تک سک سے تیار خوشبو میں بکھیرتا اس کا وجود آج بھی بلا کا دلکش لگ رہا تھا۔ ان لودیتی آنکھوں کی چمک نے تو ایک پل کے لیے عانیہ سعید کی بولتی ہی بند کر دی۔ نظروں کے ساتھ ساتھ اس کی گردن بھی جھکتی چلی گئی۔ کپکپاتی پلوں کی جنبش چہرے پر چھائی سرخی عرشان داؤد کے ہونٹوں پر دھیمی مگر خوب صورت مسکراہٹ بکھیر گئی۔ وہ اس کے کلیوں سے بھی نازک سراپے کو نظروں کی گرفت میں لیتے اس کے رویہ آکھڑا ہوا۔ اک دلفریب مہک عانیہ سعید کے حواسوں پر چھانے لگی۔

”اس ایک پل کے غرض کوئی مجھ سے میری پوری زندگی کی خوشیاں بھی مانگ لے تو میں ہنس کر دے دوں گا۔“ وہ فقط آواز تو نہ تھی وہ تو کوئی سحر تھا جو اس کی سماعتوں پر پھونکا گیا تھا۔ وہ تو کوئی ایسا طلسم تھا جو اس کے چاروں اور جاو بکھیرنے لگا۔ عانیہ سعید کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔

”کیا واقعی وہ بی جی کی عیادت کو ہی آئی تھی۔“ اس نے خود سے سوال کیا تھا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اندر گہم خاموشی کا راج تھا جبکہ اس کے برعکس عرشان داؤد کے دل کی گواہی اتنی واضح اور مضبوط تھی کہ اسے کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

”آئیے پلیز۔“ وہ اسے لیے بی جی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اگر آپ مجھے بتا کر آئیں تو آپ کے استقبال کے لیے میں خاص اہتمام کرتا۔“ راستے میں وہ کہہ رہا تھا۔ عانیہ نے بے اختیار ہی نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا اسی پل عانیہ سعید نے اپنے دل کی ایک ایک دھڑکن اس مسکراہٹ کے نام

کر دی۔ دل واقعی انسان کو بے بس کر چھوڑتا ہے۔ بی جی عانیہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے کھانے پر روک لیا تھا۔ اور وہ رک بھی گئی۔ عرشان داؤد نے ارجنٹ کہیں جانا تھا مگر اس کے وجود کے سامنے تو جیسے وہ ہر چیز بھول گیا۔ رات کھانے پر اس نے ایک ایک چیز اسے اصرار کر کر کے کھلائی تھی اور بی جی جو کب سے عرشان کے اس نئے روپ کو متعجب سی بغور دیکھ رہی تھیں کچھ سمجھتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دیں اس کے چہرے کی چمکتی ہوئی دلکش مسکراہٹ انہیں بہت کچھ سمجھا گئی تھی انہوں نے عانیہ کے جھنجھپے جھنجھپے چہرے کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ لڑکی اس قابل تھی کہ اس سے عرشان داؤد محبت کرتا۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں ان دونوں کی نظراتاری اور پھر اک اطمینان بھرا سانس ہوا میں خارج کرتے انہیں ڈھیروں دباؤوں سے نوازا۔ عانیہ سعید کی زندگی ایک دم بدل گئی تھی۔ عرشان داؤد کو سوچتا اسے چاہتا اسے دیکھنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ ایک خوب صورت دھیمی مسکراہٹ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر بچی رہنے لگی۔ ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہ ہوئے تھے مگر اس کے باوجود ایک تعلق جڑ چکا تھا۔ عرشان داؤد اکثر اسے فون کرنے لگا پٹی سی ایل پر بات کرتے اسے کافی دشواری ہوتی اس لیے اس ماہ آئی نے اسے جیسے ہی پاکٹ منی دی تو پہلی فرصت میں ہی اس نے اپنے لیے سیل خرید لیا۔ عرشان داؤد اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت خواب بن چکا تھا اور جس کی تعبیر کے لیے وہ بے شمار دفعہ اپنے اللہ کے سامنے گڑ گڑاتی تھی۔



”کل کا سارا دن میں تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“  
”کیوں کل کے دن میں ایسی کیا خاص بات ہے۔“  
”مسکرائی۔“  
”ہے نا خاص بات۔“



”کیا مجھے نہیں بتائیں گے؟“ اس کے اندر تجسس ابھرا تھا۔

”کل کون سا دور ہے پتا چل جائے گا۔“ مسکراتے ہوئے اس نے مسسپنس کری ایٹ کرنا چاہا۔

”اور اگر میں آج جانا چاہوں تو۔“ وہ بھند ہوئی۔  
”تو میں بہت پار سے تم سے معذرت کر لوں گا۔“  
”تو ٹھیک ہے پھر میں بھی معذرت کر لوں گی۔“ وہ  
نروٹھے پن سے بولی۔ عرشان داؤد کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”ارے نانا ایسا نہ کرنا کیوں کہ یہ تو طے ہے کہ کل تم سارا دن میرے ساتھ گزارو گی۔“  
”گھنٹے دو گھنٹے کی بات اور ہے مگر سارا دن۔“ وہ ہچکچائی۔

”آئی سارہ کو برا لگے گا۔“ اس نے عذر تراشا۔  
”ان کی تم فکر مت کرو ان سے میں خود بات کر لوں گا۔“ اس کے پاس جیسے اس کے ہر جواز کا حل موجود تھا۔

”مگر عرشان۔“  
”پلیز عانیہ نو اگر مگر اگر تم خود نہیں آنا چاہتی تو صاف بات کرو یوں اگر مگر کے چکروں میں مت الجھاؤ مجھے۔“ وہ یکفخت سنجیدہ ہوا۔ عانیہ کی جان پر بن آئی۔  
اس کی ناراضی تو وہ کسی صورت انورڈ نہیں کر سکتی تھی چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑتا۔

”او کے ٹھیک ہے۔“ وہ ہار گئی اس کے سامنے تو وہ اپنا آپ کب کی ہار چکی تھی وہ ساحر تھا تسخیر کرنا جانتا تھا۔ وہ دو سروں کو تسخیر کرنے کے لیے ہی تو پیدا ہوا تھا۔

”یہ ہوئی نابالت۔“ وہ کھل سا گیا۔  
پھر بولا۔

”بھی تھوڑی دیر کے بعد تم تک میرا ایک گفتہ پہنچے گا“ اسے ریسو کر لیتا۔

”ک۔ کیا مطلب؟“ مگر ادھر سے فون آف ہو چکا تھا۔ کتنی دیر سیل کو پکڑے وہ گفت کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ شام کے قریب جا کر اسے وہ گفت

موصول ہوا تھا۔ اس نے جیسے اسے کھولا حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ نہایت خوب صورت اسٹائش سا وائٹ کلر کا فرائڈ تھا۔ اس نے اشنا کی برتھ ڈے پر جو فرائڈ پہننا تھا یہ اس سے کئی گنا زیادہ زیروست اور نفیس تھا۔ وہ تو اسے ہاتھ میں لیے کتنی دیر دیکھتی رہی۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی سی چٹ تھی۔

”اگر تم اسے کل پہنو گی تو بہت خوشی ہوگی مجھے۔“ عانیہ ہولے سے مسکرا دی۔

کل جب آئی سارہ سے اس نے اجازت مانگی تو انہوں نے بغیر اعتراض کیے اسے اجازت دی دی تھی۔ یقیناً ”عرشان داؤد سے ان کی بات ہو چکی تھی۔ فرائڈ پہن کر تو وہ آسمان سے اترتی کوئی حور ہی لگ رہی تھی۔ زینی نے اس کا ہلکا سا میک اپ بھی کر دیا۔

”ماشاء اللہ! آج تو آپ اشنا میم کی برتھ ڈے کی رات سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی ہیں۔ اللہ پاک ہر طرح کی پری نظر سے بچائے۔“ زینی کی تعریف پر وہ مسکرا دی تھی۔ عرشان داؤد نے بمعہ ڈرائیور گاڑی بھیج دی تھی۔ وہ جیسے ہی گاڑی میں آکر بیٹھی گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ مگر یہ کیا یہ عرشان داؤد کا گھر تو تھا سامنے ہی وہ ہیلی کاپٹر کے قریب گھڑا تھا۔ گاڑی رکتے دیکھ کر وہ اس کے قریب چلا آیا۔ پھر کسی ڈرائیور کی طرح اس کی طرف کا دروازہ کھول کر تھوڑا سا جھکا۔

”ویل کم ٹو میم“ عانیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

اپنے فرائڈ کو سنبھالتے وہ پھینپی پھینپی سی باہر نکلی اور عرشان داؤد اسے دیکھتے تو حقیقتاً ”خود سمیت سب بھول گیا۔“

وہ اس وقت انتہائی خوب صورت لگ رہی تھی۔ محبت کا کمال تھا یا وہ واقعی اتنی پیاری تھی وہ تو دم بخود پاک تک جھپکنا بھول گیا۔ کیا وہ کوئی پری تھی جو پرستان کا راستہ بھولتے یہاں آنکلی تھی۔ اس کا دلکش و دلفریب وجود اس زمین کا تو نہ لگ رہا تھا۔ وہ تو آسمان پر بستے چاند ستاروں سے بھی زیادہ روشنیاں خود میں



سمیٹے ہوئے تھا اور وہ آنکھیں۔ آج تو ان کی جج دھج ہی زالی تھی۔ کیا کسی کی آنکھیں اتنی پاگل کر دینے والی بھی ہو سکتی ہیں۔

محبت، چاہت، دیوانگی، والہانہ پن، بے قراری، بے خودی۔ کیا کچھ نہ سمٹ آیا تھا اس وقت عرشاں داؤد کی آنکھوں میں۔

میری اداس راتوں کو حسین کر دے گا وہ اپنے حسن سے سب دل نشین کر دے گا اڑا لے جائے گا چاہت کے پرستانوں میں وہ کوہ قاف کا مجھ کو مکین کر دے گا وہ میری خامیاں چن چن کے ختم کر دے گا وہ میری عادتوں کو بہترین کرنے کا کسی کے دل میں تو آخر اسے ٹھہرتا ہے میرے گمان کو پکا یقین کر دے گا از خود دار فتلی کے عالم میں اس نے مدہوش کن بھرپور سرگوشی اس کی سماعتوں میں اندلی تھی۔ عانیہ سعید کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ لرزتی پلکیں انار کی طرح دھکتے عارضوں پر سایہ قلم ہونے میں لمحہ ہی لگا تھا۔ ہر محبوب کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے وجود پر جب اس کے محبوب کی نظر اٹھے تو ٹھہری جائے۔ پھر عانیہ سعید کو عرشاں داؤد کی نظریں کیسے بری لگ سکتی تھیں بلکہ ان نظروں کے دیکھنے کے انداز نے اسے تھوڑا مغرور کر دیا۔ دل فغیر بھرے احساس میں گھرنے لگا۔

”چلیں۔!“ کافی دیر کے بعد عرشاں کے ہونٹوں سے نکلا۔ ورنہ تشنگی ایسی تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔

”کہاں۔؟“ لرزتی پلکیں فقط ایک پل کے لیے اٹھی تھیں۔

”جہاں میں لے چلوں۔“ وہ اس وقت محبت کے بحر میں کھل طور پر آچکا تھا۔ وہ اس وقت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی مٹھی میں بند کر لیتا چاہتا تھا امر کر لیتا چاہتا تھا۔ عانیہ کی توجہ یکلخت ہیلی کاپٹر کی طرف ہوئی۔ وہ تھوڑا کنفیوژ سی ہو گئی۔

”کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ہے۔“ اس کی گھبراہٹ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہو رہی تھی۔ کشمکش میں جھلا تاثرات لمحوں میں اس کی گرفت میں آئے تھے۔ اور پھر عرشاں داؤد کی طرف دیکھتے لمحے کے ہزاروں حصے میں عانیہ نے اپنے یقین پر پختگی کی مہر ثبت کی۔

”آپ بری تو بھروسہ ہے عرشاں!“

”تو پھر چلیں۔“ اس کے براعتاوانداز نے عرشاں داؤد کو محترسا کر دیا۔ اس نے اس کے سامنے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلائی تو عانیہ نے ہچکچاتے ہوئے اپنا نازک ہاتھ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ اسے لیے کسی شہزادے کی طرح ہیلی کاپٹر میں سوار ہوا تھا۔

”آف عرشاں۔ کیا آپ ہیلی کاپٹر چلانا جانتے ہیں۔“ عانیہ نے حیرت سے استفسار کیا عرشاں داؤد کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”بھی آپ نے ہمیں جانا ہی کب ہے جناب۔ اب آہستہ آہستہ ہی ہمارے جوہر ٹھٹھکیں گے نا۔“ ٹھیک ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ دونوں ایک نہایت خوب صورت مقام پر موجود تھے۔ عانیہ سعید تو جیسے ستر زہ سی رہ گئی۔

”یہ میرا فارم ہاؤس ہے جب میں تنہائی محسوس کرتا ہوں تو یہاں چلا آتا ہوں۔“

وہ فارم ہاؤس تو نہ تھا بلکہ وہ کوئی طلسم کدہ تھا۔ ارد گرد چھالی ہریالی، سبزہ، پھول، پودے اور پھر بڑی سی جھیل۔ عانیہ تو اس منظر کو دیکھتے مہسوت سی رہ گئی۔ وہ یہاں بہت انجوائے کرتی اگر عرشاں داؤد کے ساتھ یہاں تنہا ہونے کا احساس نہ ہوتا۔ کس دھڑلے سے اس نے کہا تھا کہ وہ اس پر بھروسہ کرتی ہے اور یہ سچ بھی تھا وہ اس پر بھروسہ کرتی تھی مگر اس کے باوجود بھی اس کے ساتھ یہاں تنہا ہونا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی شرمندگی میں جھلا کر رہا تھا۔

وہ اس سے محبت کرتی تھی اس پر بھروسہ کرتی تھی مگر پھر بھی اندر بے چینی سی تھی اس نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا تھا پھر کیوں دل و دماغ اسے مبہم سی سوچوں کی



طرف دھکیل رہے تھے۔ اس کے اندر ندامت ابھرنے لگی تھی۔ کیا محبت واقعی اتنی اندھی ہوتی ہے کہ محبوب کے کہنے پر اتنی دور تنہا چلی آئے بغیر کسی ڈر بغیر کسی خوف کے۔

”اندر چلیں۔“ وہ ایک دم گم صمم سی ہو گئی۔ خالی خالی نظروں سے کتنی دیر عرشان داؤد کی طرف دیکھتی رہی۔ ضمیر کی ملامت بڑھنے لگی۔ اس دوران اس کے چہرے کا ایک ایک اتار چڑھاؤ عرشان کی نظموں کی گرفت میں رہا۔ وہ ابھی اسی ادھیڑ بن میں الجھ رہی تھی کہ اس کے ساتھ اندر جائے یا نہ جائے جب عرشان نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اندر لے آیا مگر یہ کیا؟ اندر کے مین دروازے پر بی جی کو اپنے استقبال میں دیکھ کر اس نے پر مسرت حیرت سے عرشان کی طرف دیکھا۔ اس نے دھیرے سے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔ نجانے کیوں مگر اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ سے گئے۔ ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ دوڑتے ہوئے بی جی کی کھلی پانسوں میں سمائی تھی۔

”آپ کو یہاں دیکھ کر یقین کریں مجھے بہت خوشی ہوئی ہے بی جی۔“ چمکتی ہوئی آواز میں وہ بولی تھی۔ عرشان داؤد اس کے خوشی سے چمکتے چہرے کو دیکھتے مسکراتے ہوئے ٹیرس کی طرف بڑھ گیا۔ آج اسے مکمل یقین ہو چکا تھا کہ وہ عانیہ سعید کو بہت اچھی طرح سے جان چکا ہے۔

”تھینک یو سوچ عرشان۔“ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔ ممنوں نظموں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”جانتی ہو عانیہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی تمہارے چہرے کی خوشی نے مجھے ایک غرور آگ دکھا کر میں مبتلا کر دیا تھا۔“ مجھے اپنی محبت اپنی پسند پر فخر سا ہوا تھا۔

”تم میرے ساتھ یہاں تنہا آنے پر باخوشی راضی ہوئیں میرے لیے یہ باعث خوشی نہ تھا تمہاری جھجک، کشمکش، گھبراہٹ میرے لیے وہ انمول تھی۔

اس دوران میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ تم مجھے کتنا چاہتی ہو اور یہ بھی جان چکا ہوں کہ اپنی نیچر کے خلاف

جا کر تم میرے ساتھ ایک پل بھی خوشی کا نہیں گزار سکتیں، میں نے تم سے محبت ہی نہیں بلکہ تمہارا احترام بھی کیا ہے۔

جہاں بغیر کسی مضبوط رشتے کے ایک مرد اور عورت میں تنہائی ہو وہاں شیطان ضرور ہوتا ہے۔ سمجھ دار اور طاقت ور انسان وہ نہیں جو یہ سوچتا ہے کہ شیطان اس پر کبھی ہاوی نہیں ہو سکتا۔ سمجھ دار اور طاقت ور انسان وہ ہے جو ایسے مواقع ہی پیدا نہ ہونے دے۔ ہم دلی نہیں ہیں پھر باتیں کیوں و لٹوں جیسی کریں، ہم فرشتے بھی نہیں ہیں، ہم صرف انسان ہیں اور ہمیں انہیں حدود و قیود کے زمرے میں رہ کر سوچنا چاہیے کہ یہ حدیں اللہ کی مقرر کردہ ہیں، میں کوئی بہت مذہبی انسان نہیں ہوں، مگر یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آج تک کبھی بھی کسی بھی عورت کے ساتھ چند پل بھی تنہا نہیں گزارے۔

محبت ایک بے اختیاری اور مقدس جذبہ ہے اور ہر مقدس چیز کا احترام تو لازمی ہے نا پھر میں کیا اور میری اوقات کیا۔ تم دنیا کی پہلی عورت ہو جس کے سامنے عرشان داؤد نے خود کو جھکتے ہوئے پایا ہے۔ تمہارے چہرے پر چھائی شرم و حیا، آنکھوں میں پچھی جھجک، تمہیں نایاب کرتی ہے عانیہ اور تمہارا یہ ہی نایاب پن تمہیں دوسری عورتوں سے منفرد کرتا ہے اور منفرد پن عام انسانوں میں نہیں بلکہ خاص انسانوں میں ہوتا ہے۔“ عانیہ کو احساس بھی نہ ہوا اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ کیا وہ اس قابل تھی کہ اسے اتنی اچھی سوچ کا مالک مرد ملتا جبکہ وہ نرمی سے اس کے آنسو صاف کرتے کہہ رہا تھا۔

”میں اس محبت کو نہیں مانتا جو بغیر کسی رشتے کے تنہائی کی متلاشی ہو۔ اس فارم ہاؤس میں میں اور تم تنہا ہوتے یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہاں تمہیں یہاں لانا میرے دل کی بہت بڑی خواہش تھی اور جس کے آگے میں بے بس ہو گیا تھا۔“ عانیہ سعید دھندلائی آنکھوں سے کتنی دیر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی تو اس کی آواز بھی جھجکی ہوئی تھی۔



”آپ بہت اچھے ہیں عرشان بہت اچھے“

”نہیں عانیہ میں بہت اچھا نہیں ہوں مجھ میں بھی خامیاں ہیں جس میں سب سے بڑی خامی باقاعدگی سے نماز نہ پڑھنا ہے میں جانتا ہوں کہ تم باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہو اور مجھے یقین ہے جب تم میری زندگی میں آؤ گی تو میری تمام خامیاں ایک ایک کر کے ختم کر دو گی۔ کر دو گی نا۔“ اس کے پوچھنے پر عانیہ نے بھیگے چہرے کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر وہ در خلاؤں میں گھورتے دکھ بھرے انداز میں بولا۔

”محبت کو محبت ہی رہنا چاہیے عانیہ اسی میں اس کا تقدس اس کی خوب صورتی ہے مگر ہمارے اسٹیٹس میں محبت اور ہوس میں کوئی فرق نہیں رہا۔ میرے اپنے جاننے والے دوست احباب اپنی فیائیسی اور گرل فرینڈز کے ساتھ تنہائی میں بہت سادقت پاس کرتے ہیں۔ میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ مجھے شیطان کے سامنے نفس نہیں ہارنا یہ سودا بہت منگاہے بہت منگا۔“ وہ اک جذب سے کہہ رہا تھا اور عانیہ سجد فخر سے اپنے ہم سفر کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ہتا نہیں کس نیکی کے عوض اللہ پاک نے اتنا اچھا انسان اسے عطا کیا تھا۔ وہ جتنا باہر سے شاندار تھا وہ اس سے بڑھ کر اندر سے شاندار تھا۔ عرشان داؤد دھیرے سے پلٹا۔

”آج عرشان داؤد نے اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دیا ہے۔ اس کی اک اک سانس پر صرف تمہارا حق ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن پر صرف عانیہ سعید کا اختیار ہے۔ وہ جیسے گا تو عانیہ سعید کے لیے اور مرے گا تو اس کی جدائی میں۔“

”عرشان۔۔۔“ خوف زدہ ہو کر اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھا۔

”پلیز یوں دل کو دکھانے والی بات تو نہ کریں۔“ سرخ ڈورے لیے قاتل آنکھوں کو دیکھتے اس کے دل نے چاہا کہ وہ ان میں ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے۔

”عانیہ کیا محبت سب کو ہی دیوانہ کر دیتی ہے؟“ وہ جب بولا تو اس کی آواز کو جذبول کی شدت نے بو جھل

سا کر دیا تھا۔ عانیہ کے نمکین ہونٹ مسکرا دیے۔ وہ آہستہ سے سر نفی میں ہلا گئی۔

سب کو نہیں دیکھیں میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“ معصوم سی شرارت سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کا یوں معصوم سے انداز میں چھیڑنا عرشان کو بہت بھلا لگا۔ آنکھوں میں حدت سی آگئی۔

”مگر میں ٹھیک نہیں ہوں عانیہ تم نے سودائی کر چھوڑا ہے مجھے پاگل، مجنوں، دیوانہ، عاشق کوئی بھی معقول لفظ میرے لیے نہیں بچا۔ مجھے کبھی مت چھوڑنا ورنہ۔“ وہ خاموش ہو گیا مگر اس کے چہرے پر چھائی وحشت و آرزو دیکھتے وہ کانپ کر رہ گئی۔ کچھ تو تھا اس چہرے پر اک ایسی اذیت بھری پر چھائی جسے دیکھتے وہ بری طرح ٹھٹکی تھی۔

”میری ممانجھے چھوڑ گئیں کیوں کہ شادی کے آٹھ سال بعد انہیں احساس ہوا کہ انہیں تو پایا سے محبت ہی نہیں تھی۔ وہ کسی اور کو چاہنے لگی تھیں۔ پایا نے انہیں آزاد کر دیا۔ ایک پل کے لیے بھی اس سات سال کے بچے کے بارے میں نہ سوچا جسے ماں کی بہت ضرورت تھی۔ پایا عورت ذات سے نفرت کرنے لگے، ایسے بد وزن ہوئے کہ پھر شادی ہی نہ کی، مگر میں پایا کی طرح کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا، میں عورت پر یقین کرنا چاہتا ہوں، بھروسہ کرنا چاہتا ہوں، میں اس کے وجود کی دلکشی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میرے بھروسے کو کبھی مت توڑنا عانیہ ورنہ میں ختم ہو جاؤں گا۔“ وہ اک کرب سے بولا تھا اس کی آنکھیں انتہا کی سرخ ہو چکی تھیں۔ جیسے وہ ضبط و برداشت کی کڑی منزل سے گزر رہا ہو۔ عانیہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس شاندار مرد کی طرف دیکھا جو بظاہر کتنا مکمل، مگر اندر سے کتنا ادھورا تھا، کتنا ٹوٹا بکھرا تھا۔

”عانیہ سعید خود تو مٹ جائے گی، مگر کبھی بھی آپ کے بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دے گی۔“ لکھوں میں عرشان نے خود کو کپڑ کیا تھا اور پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔

”مجھے تم پر یقین ہے عانیہ میں اب بہت جلد



تمہیں اپنے نام کروالینا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں اعتراض ہے؟“ یہ کلمت اس کا موڈ پہنچ ہوا تھا۔ عانیہ تو بولا کر رہ گئی۔ چہرہ ایک دم سرخ ٹماثر ہو گیا۔ نظریں جھک سی گئیں۔ قوس قزح کے سارے رنگ سمیٹے اس پیارے چہرے کو عرشان داؤد نے کافی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

”میں نے ایک ریکورسٹ کی ہے عانیہ، پلیز جواب تو دو۔“ اس نے اپنے برحمت ہاتھوں میں اس کے ٹھنڈے کپکپاتے ہاتھ تھام لیے۔

”پلیز آجاؤ میری زندگی میں، دیکھو میرے اندر جھانک کر کتنا تنہا ہوں میں۔“ سمجھو آج کے دن یہ تمہاری طرف سے میرے لیے تحفہ ہے۔“

”تحفہ۔“ عانیہ نے پلکوں کی چلمن اٹھالی۔

”ہاں تحفہ۔ آج میری برتھ ڈے ہے اور میں تم سے اپنی پسند کا تحفہ لینا چاہتا ہوں۔“

”آپ کی برتھ ڈے۔“ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نظروں کے سامنے اشنا کی برتھ ڈے گھوم گئی۔ کتنے بڑے پیمانے پر اس کی گئی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ عرشان داؤد کی برتھ ڈے اس سے بھی بڑے پیمانے پر سیلبریٹ کی جاتی ہوگی، مگر اس کا یقین غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ ہستیاں اس کی زندگی میں بہت اہم تھیں اور آج کے خاص دن وہ دونوں ہستیاں اس کے ساتھ موجود تھیں۔ عرشان داؤد کی زندگی میں اپنی اہمیت کا اندازہ اسے اچھی طرح ہو گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گی۔ آج کے اہم دن اس کی پسند کا تحفہ ضرور دے گی اسی لیے آہستہ سے سراباٹ میں ہلا گئی۔

”او عانیہ۔“ عرشان داؤد کی خوشی کی تو جیسے کوئی انتہا نہ رہی۔

”تمہیں تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی کہ اس وقت تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔“ وہ اک جوش سے بولا۔

”آئی ایم سوہی یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے جو مجھے تم سے ملی ہے اور یہ میری زندگی کا

سب سے قیمتی تحفہ ہے جو تم نے مجھے دیا ہے۔ میں جلد ہی بی بی جی اور پاپا کو آٹی سائڈ کی طرف بھیجتا ہوں۔ اب تو اک پل کی دوری بھی برداشت نہیں ہوگی۔“

جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھاری سی ہو گئی۔ اس کی بے قراری و بے تابی دیکھتے تو وہ نازاں ہونے لگی۔ کیا کوئی اتنی شدت سے بھی کسی کو چاہ سکتا ہے وہ فقط سوچ کر رہ گئی۔ پھر وہ سارا دن بی بی جی اور عانیہ نے عرشان کے ساتھ ہی گزارا۔ عانیہ نے اپنے ہاتھوں سے کوکنگ کی تھی۔ بی بی جی اور عرشان کو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا بہت پسند آیا تھا۔ آنکھوں میں ڈھیروں پیار سموئے سارا وقت عرشان داؤد اس کے ارد گرد ہی منڈلاتا رہا۔ اس کی دیوانگی دیکھتے عانیہ کا چہرہ پل پل رنگ بدلتا رہا۔

یہ دن ان دونوں بلکہ تینوں کے لیے اک یادگار دن بن گیا۔ واپسی سے کچھ دیر پہلے ہی عرشان نے ٹیک کاٹا تھا۔ پہلے بی بی جی پھر عانیہ کے منہ میں ڈالا۔ ان دونوں کو اتنا خوش دیکھ کر بی بی جی نے ان کے حوالے سے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔



صبح میسج کی رنگ سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ مونڈی مونڈی آنکھوں سے اس نے تکیے کے نیچے سے سیل پکڑا تھا۔ نماز پڑھتے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ سوئی تھی۔ عرشان داؤد کا ”گڈ مارننگ“ کا بہت ہی خوب صورت میسج تھا۔ اس کے ہونٹ مسکرا دیے۔ اس نے بھی ”گڈ مارننگ“ کا میسج سینڈ کر دیا۔

”صبح ہو گئی؟“ دوسری طرف سے فوری دو سرا میسج موصول ہوا۔

”جی۔ اور آپ کی؟“

”میرا کیا پوچھتی ہو یا ر ساری رات ایک پل کے لیے بھی نہ سکا۔“

”کیوں۔ خیریت؟“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

”ساری رات تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہا۔“



”تو پھر یوں کہو کہ عرشان مجھ سے اتنی محبت نہ کرو اور مر جاؤ۔“

”عرشان۔“ خوف کی شدت سے اس کی آواز کانپ سی گئی۔

”تو اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی آپ نے۔“ اس کے رونے میں اور شدت آگئی۔

”رو کیوں رہی ہو، تمہیں تو فخر کرنا چاہیے کہ کسی کو تمہاری چاہ نے اتنا سودا لیا کر چھوڑا ہے کہ وہ آرد گرد حتیٰ کے خود کو بھی بھول بیٹھا ہے۔“

”مجھے ایسا عرشان نہیں چاہیے۔ مجھے وہی عرشان چاہیے جو زمین پر قدم رکھتا تھا تو زمین خود پر ناز کرنے لگتی۔ جس کی گردن — کے احساس سے کھڑی رہتی جو مغرور تو نہیں تھا، مگر ایک پارعب شخصیت کا حامل تھا۔“ وہ مدھم آواز میں بولی تھی، ”عرشان داؤد مسکرا دیا۔“

”میں ویسا ہی عرشان داؤد ہوں، مگر دوسروں کے لیے تمہارے لیے میں ویسا بالکل نہیں بن پاؤں گا۔ تمہیں تو اسی طرح کے مجنوں سے عرشان سے گزارا کرنا پڑے گا۔“ اور اگر اس وقت عرشان داؤد اسے دیکھ لیتا تو یقیناً ”دیوانہ ہو جاتا۔ وہ اس وقت لگ ہی اتنی حسین رہی تھی جبکہ وہ بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔“

”یہیں ہوں، آپ کے پاس۔ مجھے بھلا اب کہاں جانا ہے، میرے تو تمام راستے ہی اب آپ کی طرف آتے ہیں۔“ وہ آنکھیں موندے ہی گویا ہوئی۔

”اور میں تمہیں کہیں جانے بھی نہیں دوں گا۔“ ”جانتی ہوں۔“

”کیا جانتی ہو؟“ ”نجانے وہ کیا سننا چاہتا تھا۔ شرارت سے بولا۔ اور وہ بھی نجانے کس دھن میں تھکی کہہ گئی۔“

”یہی کہ جیسے ایک جن کی جان کسی توڑتے میں ہوتی ہے اسی طرح عرشان داؤد کی جان عانیہ سعید میں قید ہو چکی ہے۔“ عرشان داؤد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اپنے فوجیوں کی پلاننگ کرتا رہا۔“ ”کیا تم ٹھیک سے سوتی رہیں۔“ ”سچ پوچھیں تو ایک عرصے کے بعد کل رات میں پر سکون اور گہری نیند سوئی تھی۔“ اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

”لو جی۔ وہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ ہماری ایک بل کے لیے آنکھ نہیں لگی اور ادھر محترمہ گہری نیند کی آغوش میں گم رہیں۔“

”تو آپ کو کس نے کہا تھا جاننے کو، آپ بھی سو جاتے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ٹائپ کیا۔

”وہ رات سونے کے لیے نہیں تھی۔ وہ رات میری زندگی کی سب سے خوب صورت اور خاص رات تھی، میں اسے سو کر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ ”اتنی محبت۔؟“ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

ادھر سے جواب آنے کی بجائے اس کی کل آگئی۔ اس نے اوکے کرتے سیل کان سے لگایا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں عانیہ، میں خود بھی نہیں جانتا کہ میری محبت کی انتہا کہاں تک ہے بس اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے چہرے پر میری پوری دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ تمہیں سوچنا ہوں تو اپنا آپ بہت خاص بہت بہت معتبر لگنے لگتا ہے، تمہارا وجود میرے اللہ کی طرف سے میرے لیے ایک گراں بہا تحفہ ہے۔ میں عورت ذات پر بے اعتباری تو نہیں کرتا تھا، مگر سچ یہ بھی تھا کہ اعتبار چھی نہیں کرتا تھا، مگر پھر تمہیں دیکھا تو دل جھک گیا جیسے کسی ریاست کی شہزادی کے سامنے کسی غلام کا سر جھک جاتا ہے اور تم بھی تو عرشان داؤد کے دل کی سلطنت کی ملکہ ہو۔ میں نے رات لی جی سے بات کر لی ہے۔ ہماری طرح وہ بھی بہت خوش ہوئی تھیں۔ پچاس ایک ماہ کے لیے ملک سے باہر گئے ہیں ان کے واپس آتے ہی سائل اپنا کاسہ تھاٹے تمہارے در پر حاضر ہو جائے گا۔“

”عرشان پلیز مجھے اتنی محبت نہ دیں، مجھے ڈر لگتا ہے۔“ وہ یلکھت رو پڑی۔



”آئی لو یو عانیہ، رینگی لو یو سوچ۔“ عانیہ نے پٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔ عریشان کے ہونٹوں سے من کر یہ جملہ ایک دم بہت اہم، بہت خاص اور خوب صورت ہو گیا تھا۔ وہ جیسے محبت کی بارش میں بھیگ سی گئی۔ دھڑکنیں اپنے ہی تال پر محور رقص ہونے لگیں۔



”وہ ایک اہم میننگ اینڈ کر کے ابھی اپنے کیبن میں آکر بیٹھا ہی تھا جب عانیہ کی کل آگئی۔ مسکراتے ہوئے اس نے کل ریسو کی تھی۔“

”زے نصیب، آج کس طرح یاد کر لیا جناب نے۔“ ریلیکس انداز میں چیر پر بیٹھتے اس نے کہا۔

”آپ نے کھانا کھالیا؟“ خالص بیویوں والا جملہ تھا۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”نہیں۔“

”کیوں ٹائم دیکھا ہے آپ نے۔“ اس کے نظریہ پر عریشان کو ٹوٹ کر ہار آیا۔

”آج اتنی مہربانی کس لیے دیکھ کر بندہ جان سے ہی نہ ہار جائے۔“ اس کا موڈ یکلخت خوش گوار ہو گیا۔

تھوڑی دیر پہلے کی تھکن بھاگنے میں لمحہ لگا۔

”بہت فضول بولتے ہیں آپ، جی نے مجھے بتایا ہے کہ آج صبح آپ نے ناشتا نہیں کیا صرف جوس کا ایک گلاس پیا ہے۔“

”او۔ اچھا۔ میں بھی حیران تھا کہ جناب کو میرے کھانے کی اتنی فکر کیوں ستانے لگی۔“

”یہ تو اچھی بات نہیں ہے عریشان آج آپ نے تقریباً سارا دن بھوکے رہ کر گزار دیا۔“ اس کی فکر ہنوز پر قرار تھی اور جو عریشان داؤد کا سیروں خون بڑھا رہی تھی۔

”کر لیتا ہوں یار۔“

”نہیں۔ بس آپ ایسا کریں گھر آجائیں ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔“

”کیا مطلب۔“ وہ یکلخت چوڑکا۔

”میں اس وقت آپ کے گھر میں، آپ کے کچن میں کھڑی، آپ کے لیے بریانی بنا رہی ہوں۔ میں اور بی بی کھانے پر آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔“ اوھر سے سیل بند ہو چکا تھا، وہ سرعت بھرے انداز میں اپنے کیبن سے نکلا تھا اور واقعی اس کے پہنچنے تک میل پر کھانا لگ چکا تھا۔ پنک سوٹ میں گلابی گلابی سی عانیہ سعید کو عریشان داؤد نے نظر بھر کر دل میں اتارا تھا۔ وہ اس کی گہری نظروں کے ارتکاز سے سرخ ہو گئی۔

”آپ فریش ہو کر آجائیں میں بی بی جی کو لے کر آتی ہوں۔“

”اگر یہ سربراہ ہے تو میری زندگی کا سب سے خوب صورت سربراہ ہے۔“ اس کا لہجہ آنچ دینے لگا۔ وہ اندر جانے کا راستہ بھول گیا تھا۔



ایک زوردار چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کا پورا جسم ہلکے ہلکے کانپتے پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ خوف و ہراس کے زیر اثر بے اختیار اس نے ارد گرد دیکھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ یعنی ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے خواب دیکھا تھا۔ اتنا دل دہلا دینے والا خواب۔ آخر اس خواب کا مطلب کیا تھا۔؟ ایسا خواب مجھے کیوں آیا؟ مجھے نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کرنی چاہیے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اسے جب کسی مل سکون نہ ملا تو وہ وضو کرنے کی نیت سے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر وہ کتنے ہی دن اس خواب کی وجہ سے ڈسٹرب رہی۔ عریشان داؤد سے اس نے اس خواب کا ذکر نہیں کیا تھا وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی ہاں یہ ہوا تھا کہ عشاء کی نماز اس کی مزید طویل ہو گئی۔ اس وقت بھی عشاء کی نماز پڑھ کر وہ فارغ ہی ہوئی تھی جب زینی ٹاک کرتے اندر داخل ہوئی۔

”عانیہ آپ کو میڈم ساتھ اپنے روم میں بلا رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم چلو میں آتی ہوں۔“ زینی کے جانے



کے بعد وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نجانے کیوں مگر کچھ دنوں سے اس کے اندر عجیب سی افسردگی چھائی ہوئی تھی اور آج تو دل کافی بوجھل سا ہو رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ اسی بچھے دل کے ساتھ وہ ان کے روم میں داخل ہوئی تھی۔

”آجاؤ عانیہ۔“ وہ اندر داخل ہوئی۔

”او ادر جیٹھو میرے پاس۔“ انہوں نے اپنے قریب ہی اسے بٹھالیا۔

”جانتی ہو آج میں بہت خوش ہوں اور میری اس خوشی کا تعلق تم سے جڑا ہے۔ اشنا میری بہت پیاری بیٹی ہے مگر میں اسے جیسا دیکھنا چاہتی تھی وہ ویسی نہ بن سکی میرے اندر اپنی بیٹی کے حوالے سے اک تشنگی سی رہی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کے حوالے سے میرے خواب اس کی ہٹ دھرمی اور ضدی طبیعت دیکھتے جیسے میری آنکھوں میں ہی قید ہو کر گئے۔ پھر تم آئیں میری زندگی میں۔ تم بالکل ویسی تھی جیسی میں اپنی بیٹی کو سوچا کرتی تھی۔ اسے دیکھنے کی مسمی تھی۔ لاشعوری طور پر میں تمہارے قریب آنے لگی۔ میں تم میں اشنا کو دیکھنے لگی اور پھر مجھے خود بھی احساس نہ ہوا اور تم مجھے عزیز ہوتی گئیں۔ میری خواہشوں، میرے خوابوں کا دار و مدار تمہارے ارد گرد گھومنے لگا۔

تم مجھے عزیز ہو چکی ہو۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔“ ان کی آواز بے یگ سی گئی۔ انہوں نے بہت آہستہ سے حیران حیران سی عانیہ کو اپنے ساتھ لگالیا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔

”کیا ایک ماں کو اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق ہے عانیہ؟“

”ایک ماں کو اپنی اولاد کے لیے ہر طرح کا فیصلہ لینے کا حق ہے آنٹی۔“ عانیہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کہنے جا رہی ہیں اس لیے سادگی سے بولی۔

”مجھے تم سے یہ ہی امید تھی۔ تمہاری فرما برداری و تابعداری پر مجھے کبھی کوئی شک نہیں رہا۔ اسی لیے جب منصور صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا تو میں انکار نہ کر سکی۔“ کوئی بم تھا جو

عانیہ سعید کی سماعت پر پھٹا تھا۔ وہ تیزی سے ان سے الگ ہوئی آنکھیں جیسے پھٹنے کے قریب تر ہو گئیں۔ ہونٹ ادھ کھلے رہ گئے۔ دماغ میں سائیں سا میں ہونے لگی جبکہ سائرہ بیگم خود میں کم کہہ رہی تھیں۔

”خرم کو میں نے ہمیشہ اشنا کے حوالے سے سوچا تھا۔ اسٹیلٹس میں وہ کسی صورت بھی ہم سے کم نہیں ہے مگر پھر جب خرم نے تمہارا نام لیا تو پہلے تو میں حیران ہوئی پھر سوچا ایک بیٹی نہ سہی دو سہی ہی سہی۔ اس نے تمہیں اشنا کی برکت ڈے رو دیکھا تھا تم اس کو بہت پسند آئی ہو۔ بہت خوش رکھے گا تمہیں۔“ اور عانیہ کو تو ایسے لگ رہا تھا جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو کر رہ گئی ہو۔

”مگر آنٹی۔“ اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے اسے کافی محنت کرنی پڑی تھی قوت گویائی تو لگتا تھا جیسے جواب دے گئی ہو۔ حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔

”یہ۔ یہ آپ نے۔“ اس کے تمام آنسو اس کی حلق میں ہی پھنس گئے۔ اسی وقت منظر صاحب نے اندر قدم رکھا تھا۔ عانیہ نے لمحوں میں چہرہ دو سہی طرف موڑتے خود کو چھپانے کی کوشش کی ورنہ کچھ ہی دیر میں اس کی حالت کافی ابتر ہو گئی تھی۔

”آپ آج جلدی آگئے۔؟“ ان کی غیر متوقع آمد پر سائرہ بیگم نے پوچھا۔

”ہاں طبیعت، کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ٹالنے کی ناک ڈھیلی کرتے بولے۔

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ ایک دم فکر مند ہو گئیں۔ اسی دوران عانیہ سعید اپنا ریزہ ریزہ وجود بمشکل گھسیٹے ان کے درمیان سے نکل آئی۔ اپنے کمرے میں آنے تک وہ اچھی خاصی تڑھال ہو چکی تھی۔ عرمان داؤد کے بغیر تو زندگی جینے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔

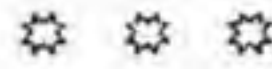
”نہیں۔ میں نہیں رہ پاؤں گی عرمان داؤد کے بغیر۔“ بیڈ پر گرتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آپ میں کیا کروں۔ آنٹی کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا انہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔“ ساری



رات وہ لمحے کے لیے بھی نہ سو سکی تھی۔ آنٹی کا وہاں بھرا لہجہ، وہ بھروسا، وہ یقین وہ اس کی محنت تھیں۔ انہوں نے اس کا تب ساتھ دیا جب انہوں نے بھی نظریں پھیر لیں اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ ایک طرف اگر آنٹی تھی تو دوسری طرف اس کی محبت تھی۔ دل کسی صورت بھی محبت سے دست برداری کے لیے تیار نہ تھا۔ دل غ بالکل خاموش تھا اور وہ خود تو ساری رات رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی۔ صبح تک جب اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو فجر کی نماز کے بعد سجدے میں گرتے تڑپ تڑپ کر رو دی۔

”مجھے عرشان سے جد امت کرنا میرے مولا۔ میں نہیں رہاؤں گی اس کے بغیر۔“



وہ یہ تو جانتی تھی کہ مہمان آرہے ہیں مگر شام کو منصور صاحب کو بمعہ فیملی دیکھ کر وہ کچھ تھوڑے لمحے ساکت سی رہ گئی۔

”ارے۔ آؤ آؤ نا عانیہ۔“ اسے ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی بت بنے دیکھ کر مسز منصور نے اندر بلایا تھا۔ اس کی نظر ان کے ساتھ بیٹھی آنٹی کی طرف اٹھی جنہوں نے مسکرا کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ناچاہنے کے باوجود بھی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اسے دیکھتے خرم منصور کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ نظریں اس کے نازک سراپے پر ٹھہری گئیں جو اک جھجک لیے مسز منصور کے قریب پہنچ گئی۔

”ہمیں آپ کی بھانجی بہت پسند ہے مسز مظہر۔ میرا بیٹا بہت چوڑی ہے اور عانیہ کو دیکھ کر تو مجھے اپنے بیٹے کی پسند دل سے پسند آئی ہے۔ واقعی بہت خوب صورت اور معصوم صورت پائی ہے عانیہ نے۔“ انہوں نے ستائش سے دیکھتے اس کا دایاں ہاتھ تھاما جو ٹھنڈا رخ ہو چکا تھا۔ اس دوران خرم کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی اس کے وجود سے نہ ہٹی تھیں۔

”آئی اچھی صورتیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں ماشاء اللہ!۔“ پھر انہوں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر

اس کی انگلی میں ڈال دی۔ یہ سب اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ عانیہ تو عانیہ، آنٹی ساڑھ بھی ورطہ حیرت سے بت بن گئیں۔ عانیہ تو ایسے ہو گئی جیسے کالو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ ساکت، جامد، ششدر۔

”پہلی بار اس نے کوئی لڑکی پسند کی ہے۔ بہت دھوم دھام سے شادی کروں گی۔ کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی۔ اپنے بیٹے سے زیادہ تو میں خود بے چین ہو گئی ہوں اس چاند کو اپنے آنگن میں اتارنے کو۔“ مسکراتے ہوئے وہ دھیرے سے جھکیں اور پھر پتھر کی صورت بنی عانیہ کی پیشانی چوم لی۔

”اب یہ آپ کے پاس میرے خرم کی امانت ہے۔“ مسز منصور نے خرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو مسکراتی ہوئی نظروں سے مسلسل عانیہ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ساڑھ بیگم کے پاس جیسے کہنے کو کچھ بھی نہ رہا۔ انہوں نے عانیہ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ چکا تھا۔ وہ کچھ پریشان ہو گئیں۔ کیا عانیہ اس منگنی سے خوش نہیں ہے؟ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ عانیہ کے کمرے میں آگئیں جو بیڈ پر الٹی لیٹی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

”عانیہ۔“ عانیہ سر اٹھاتے شکایتی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ روز کو چہرہ سوچ چکا تھا۔

”کیا تم اس منگنی سے خوش نہیں ہو؟“

”آئی میرے تو سب خواب آپ نے ریزہ ریزہ کر دیے۔“ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ چپ رہ کر اپنی محبت کسی صورت قربان نہیں کرے گی۔ اسے اس محاذ پر لڑنا تھا اور وہ لڑنے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔

”کیا مطلب خواب۔؟“ کافی دیر کے بعد انہوں نے الجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

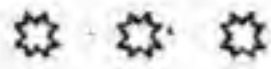
”مم۔ میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔“

”ک۔ کیا۔؟“ آنٹی ساڑھ پر تو جیسے حیرتوں کے ہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیل سی گئیں۔

”یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ



”مجھے معاف کر دینا عانیہ میں یہاں تھوڑی خود غرض ہو گئی ہوں۔ یہ زبان کٹ تو سکتی ہے مگر اپنے کئے سے پھر نہیں سکتی۔ اسے تم کچھ بھی کہہ لو، مگر مجھے معاف کر دینا۔“



اس کے ہاں کرتے ہی اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عرشیہ کام کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے آؤٹ آف شہر گیا تھا۔ وہ بار بار اسے فون کر رہا تھا، مگر ہر بار اس کا فون بند ملتا۔ وہ از حد پریشان ہو گیا جب کسی پل چین نہ ملا تو وہ کام ادھورا چھوڑ کر آگیا۔ پہلے بھلا کب ایسا ہوا تھا کہ اتنے دن ان کی بات نہ ہو سکے۔ وہ سیدھا آٹھ سائے کی طرف ہی آیا تھا۔ زینی کے ہاتھ عانیہ کو پیغام بھیج کر وہ بے چینی سے ڈرائنگ روم میں ٹہلتے اس کا انتظار کرنے لگا۔ نجانے کیوں، مگر دل کچھ مضطرب سا تھا۔

تو وہ لہو آگیا عانیہ سعید جس لمحے سے تم اتنے دنوں سے بچ رہیں تھی۔ کیا کر پاؤ گی اس کا سامنا؟ کس منہ سے جاؤ گی اس کے سامنے اور کیا کہو گی؟ اور اسے اتنے دنوں بعد رو رو دیکھتے کیا خود پر کنٹرول رکھ پاؤ گی؟

نہیں۔ میں اس سے نہیں ملوں گی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ بھلی پلکوں سے اس نے زینی کی طرف دیکھا۔

”اسے کہو میں گھر پر نہیں ہوں۔“

”کیوں کہاں گئی ہے؟“ زینی کا جواب اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔

”میدم سائے کے ساتھ ہی گئی ہیں۔“

”اس کا سبیل کیوں آف ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے یا؟“ اس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ زینی نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلادیا۔

”وہ ٹھیک ہیں۔“

”پھر دن کیل بند ہے اس کا۔“ وہ کسی صورت مطمئن نہ ہو رہا تھا۔ بے قراری تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

گئیں۔ ”پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے مجھے۔“ وہ انتہائی حد تک سنجیدہ سی گویا ہو میں۔

”میں نے اسی وقت بتانا چاہا تھا، مگر پھر انکل مظہر آگئے۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گئیں بہت زیادہ پریشان۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ عانیہ نے انہیں اتنا پریشان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”جانتی ہو انہوں نے جب تمہارا نام لیا تو میں کتنی مطمئن ہو گئی تھی۔ اک ماں لیے میں نے ہاں کی تھی، مگر تم بھی اشنا کی طرح ہی نکلیں۔ بیٹیاں کبھی ماں کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ٹھیک ہے جسے تم نے مجھ پر فوقیت دی ہے اپنا ذرا اسے میں تمہارے معاملے میں کبھی انٹرفیو نہیں کروں گی، بس اب دوبارہ میرے سامنے کبھی مت آنا۔“ وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہتی دروازے کی طرف بڑھیں جب عانیہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے آپ سے محبت ہے، مگر۔“ اس کے آنسو ایک پل کے لیے بھی نہ رکے تھے۔

”مگر اتنی بڑی قربانی۔“ انہوں نے زخمی شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

”میں اپنی انا خوداری پر ایک حرف نہ آنے دوں گی۔ میں نے بہت غلط کیا تم پر بھروسہ کر کے۔ اب اس کی سزا تو مجھے ملنی ہی چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ زبان سے پھر جانے کا طعنہ میری زندگی سے بھی زیادہ بڑا اور موت سے زیادہ ازیت ناک ہوگا، مگر مجھے یہ طعنہ اب سننا ہی ہو گا کیوں کہ تم ایسا چاہتی ہو۔“ اور پھر ان کی بو جھل آواز نے عانیہ کو ہرا دیا۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”ایسا نہیں ہو گا آٹھ! یہ آپ کی دوسری بیٹی کا وعدہ ہے۔ آپ کا سر کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکے گا۔“ وہ تڑپ تڑپ کر رو دی تھی جب سائے بیگم نے اسے قدموں سے اٹھاتے اس کے ہلکتے وجود کو بانسوں میں بھر لیا۔



”ان کا سیل خراب ہو گیا ہے۔“ اسے بروقت بہانہ سوجھ ہی گیا۔

”اے“ اسے عرشان داؤد کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔

”میں ایسے ہی اتنے دن ڈسٹرب رہا۔ ویسے تمہاری میم نے میری جان نکالنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی کوئی۔“

وہ جب بھی گھر آئے اسے میرا میسج دے دینا کہ مجھے فون کرے۔ ”ہلکا پھلکا ہو کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ راہداری سے گزرتے عرشان داؤد کی پشت کو عانیہ سعید نے بہتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر زینی کے گلے لگتی ہچکیوں سے رو دی۔

”مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا زینی یہ دکھ بہت بڑا ہے۔ یہ مجھے اندر ہی اندر حتم کر رہا ہے۔ میں ایک بیٹی بن گئی تھی نے اپنی محبت کو جیتے جی مار دیا اور اور جب عرشان کو پتا چلا تو۔“ ایک دم وہ ہراساں سی ہو گئی۔

”نجانے اس کا کیا رد عمل ہو وہ مجھے معاف بھی کر سکے گا یا نہیں۔“

”وہ بہت پیار کرتے ہیں عانیہ آپ سے مجھے نہیں لگتا کہ وہ خاموش بیٹھیں گے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آپ کے لیے محبت کا ایک جہان آباد دیکھا ہے۔“ زینی نے اسے نئی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ کیا واقعی عرشان داؤد خاموشی سے پیچھے ہٹ جائے گا یا۔



”عانیہ کہاں ہے؟“

”جی وہ۔“

”میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا صحیح جواب دو زینی اور اس بار کوئی بہانہ نہیں۔“

”سر وہ عانیہ میم تو ابھی ابھی باہر۔“

”زینی۔“ وہ غصے سے دباڑا۔

”اپنے روم میں گئی ہیں۔ مہ۔ میں ابھی بتاتی

ہوں۔“ وہ سوچا سمجھا بہانہ حسب معمول دہرانے لگی تھی مگر پھر اس کے تیور دیکھتے اپنی گھبراہٹ میں سچ بتا گئی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی۔“ اس نے غصے اور طنز سے اس کی طرف دیکھا اور پھر عانیہ کے روم کی طرف بڑھ گیا جبکہ زینی کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”نجانے اب کیا ہو۔“ وہ فقط سوچ کر رہ گئی۔

”وائس پر ابلم و دیو عانیہ کیوں میرے ساتھ اس طرح کر رہی ہو؟“ دروازہ کھولتے وہ سرعت بھرے انداز میں اندر داخل ہوا تھا۔ اس کی غیر متوقع آمد پر عانیہ بوکھلاتے ہوئے بیڈ سے اٹھی۔

”آپ۔؟“ اسے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اس طرح اس کے بیڈ روم میں چلا آئے گا۔

”ہاں میں۔“ وہ اس کے رو رو آکھڑا ہوا پھر اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر سنجیدہ سی نظر ڈالتے بولا۔

”کیوں مجھے او ایڈ کر رہی ہو پر ابلم کیا ہے؟“

”مہ۔ میں کب او ایڈ کر رہی ہوں آپ کو؟“

”تو پھر یہ سب کیا ہے تمہارا سیل بند ہے گھر کے نمبر پر کل کرو تو تم آتی نہیں ہو ملنے آؤ تو ایک ہی بہانہ سننے کو ملتا ہے کہ میم گھر پر نہیں ہیں تو پھر ان سب کا مقصد کیا ہے؟ کیوں ایسا ایٹی ٹیوڈ اپنا رہی ہو میرے ساتھ۔“

”مجھے سچ بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟“ وہ اس کے دونوں کندھے تقریباً ”جھنجھوڑتے ہوئے بولا اور عانیہ جوابات کرنے کے لیے اپنے دماغ میں لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی ایک دم جیسے ڈھے سی گئی وہیں کارپٹ پر بیٹھے رو دی۔

”عرشان کو اس کے آنسوؤں سے ہی اپنے تہجے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ لہذا سانس ہوا میں خارج کرتے اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کا یوں ہلکا ہلکا کر رونا اس کی جان نکالنے لگا۔

”کیوں میری جان کے درپہ ہو بتاتی کیوں نہیں ہوا کیا ہے؟ پلیز سیر کر مجھ سے۔“ اس نے اس کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے عانیہ نے بھیگی



پلیس اٹھائیں۔ عرشان داؤد کو اپنا آپ ان میں ڈوٹا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور پھر نرمی سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

”اؤ کے آئی ایم سوری مجھے واقعی تم سے اتنی سختی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن پارلیمنٹ کرو اس ایک ہفتے میں مجھے ایسے لگا جیسے میں بالکل ہو جاؤں گا اور اس ہفتے کی ساری فرسٹریشن مانا چاہتے ہوئے بھی تم پر نکل گئی۔“

تمہاری بے رخی میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا عانیہ، تمہاری وجہ سے ہی میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس آیا ہوں اور ادھر ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ سننے کو ملتا، میں اتنا بے بس آج تک کبھی نہیں ہوا جتنا میں نے گزرے اس ہفتے میں خود کو محسوس کیا ہے۔ اٹھو تم یہاں سے۔“ پھر اسے اٹھاتے اس نے بیڈ پر بٹھایا اور خود اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”عانیہ کیا ہمارا تعلق ایسا نہیں ہے کہ تم اپنی پرابلم میرے ساتھ شیئر کر سکو۔“ پریشانی، فکر، پروا، تشویش کیا کچھ نہ تھا اس وقت عرشان داؤد کی آنکھوں اور لہجے میں عانیہ سعید خود کو ملامت کرنے لگی۔ اپنے لیے فکر مند ہوتے اس بے حد عزیز اور پیارے شخص کو دیکھتے اس کے دل میں ٹہسوں سی اٹھنے لگیں۔ وہ کتنا اچھا تھا کتنا مہیاں اور کتنا مخلص اور عانیہ سعید کو اس اتنے اچھے اور خالص بندے کے دل کو توڑنا تھا۔ اس سے دور جانا تھا اسے چھوڑنا تھا، دل ہانے یا نہ مانے۔

”آپ کو یوں میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ خود کو سمیٹ چکی تھی۔ دل کے ماتم سے بچائی دونوں کانوں کو مسدود کر چکی تھی۔ اس کے لہجے کی تبدیلی عرشان کو کسی انہونی کی طرف اشارہ کرتی محسوس ہوئی۔ اسے کچھ کھٹکا مگر کیا۔ بس یہی آکر وہ الجھ گیا۔

”میں اس وقت کسی کے گھر میں پناہ لیے ہوئے ہوں۔ وہ اس طرح آپ کو میرے کمرے سے نکلتا ہوا دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ آپ کو خیال کرنا چاہیے تھا۔“ کھڑے ہوتے وہ نا محسوس انداز میں اس کی طرف سے پیٹھ موڑ گئی۔ کیوں کہ اب جو وہ کہنے جا رہی تھی وہ کسی

صورت ان لفظوں کے بعد اس دلربا شخص کے چہرے پر کھرتے درد اور آنکھوں سے اٹھتی حیرت و بے یقینی کو دیکھنے کی خود میں ہمت نہیں پاتی تھی جبکہ اس کے رویے کو دیکھتے عرشان داؤد کی ابجھن مزید بڑھ گئی۔ ان کا تعلق جس اسٹینس سے تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے کمرے سے نکلنے دیکھ کر کوئی کچھ بھی نہ سوچتا پھر وہ اس طرح کیوں کہہ رہی تھی۔

”میری انگلی جمنٹ ہو چکی ہے، بہت جلد شادی ہونے والی ہے اور آپ کا اس طرح یوں میرے روم میں آنا۔“ آگے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی یا پھر مزید کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ رہی تھی۔ اس کے آنسو بننے لگے۔ کتنی دیر گزر گئی، مگر ان دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ وہ اپنے دھک دھک کرتے دل کی دھڑکنوں کو گنتے اس کے رد عمل کا انتظار ہی کرتی رہی، مگر اتنی دیر گزرنے کے باوجود ان کے درمیان موجود خاموشی نہ ٹوٹی۔ اتنی زیادہ خاموشی کی توقع وہ ہرگز نہ کر رہی تھی۔ وہ آہستہ سے پٹی اور پھر جیسے ساکت رہ گئی۔

اسے عرشان داؤد کے وجود پر کسی بت کسی پتھر کا گمان گزرا خود کو ہلکی سی بھی جنبش دیے بغیر یہاں تک کہ اپنی پلکوں کو جھپکے بغیر وہ یک ٹک اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا کہا تم نے، میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔“ اس کے پلٹنے پر اس نے پوچھا تھا۔ عانیہ کی ساری ہمتیں جواب دے گئیں۔ اسے لگا کہ اب وہ کچھ نہ کہہ پائے گی وہ نہ حال سی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے رو پڑی۔

”رونے سے کبھی کوئی پرابلم حل نہیں ہوتی، ڈسکس کرو مجھ سے، اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کس طرح کہہ دی تم نے۔ بتاؤ مجھے،“ درشتی سے کہتے اس نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹانے چاہے جب اس کی انگلی میں جھمگائی رنگ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ پہلی بار ٹھٹکا ہاتھ ہوا میں ہی معلق ہو کر رہ گیا۔ تو کیا وہ سچ کہہ رہی تھی؟



”عانیہ۔۔۔ رنگ والے ہاتھ کو تھامتے اس کی آواز میں گہری بے چینی تھی۔

”کیا یہ سچ ہے؟“ عانیہ کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔ اس کی نادم سی خاموشی نے عریشان داؤد کو جیسے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا۔

”کیوں عانیہ۔۔۔ کیوں۔۔۔؟“ اسے دونوں کندھوں سے جھنجھوڑتے صدے کی شدت سے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ عانیہ کے آنسوؤں میں اور تیزی آگئی۔

”ایک ہفتہ پہلے تک تو سب ٹھیک تھا پھر ایک دم ایسا کیا ہو گیا۔“ وہ جیسے تڑپ اٹھا پھر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر جماتے متغیری حالت لیے مسکراتے ہوئے بولا۔

”مم۔۔۔ میں جانتا ہوں تم۔۔۔ تم مذاق کر رہی ہو مجھ سے! بے نایہ ہی بات۔۔۔ بے نایہ سب جھوٹ ہے تا؟“ اس کی حالت دیکھتے عانیہ کا دل ٹکٹنے لگا۔

”یہ۔۔۔ یہ سچ ہے عریشان۔“ اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی لگی۔ اس دوران پہلی بار عریشان کا چہرہ شدید اشتعال کی گرفت میں آیا۔ اس کا پارہ ہائی ہونے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے سنسنے کے باوجود جیسی اس نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ اس کا دل کسی صورت مان ہی نہیں رہا تھا کہ عانیہ اس کے ساتھ اس طرح کر سکتی ہے، مگر وہ اس کے ساتھ اس طرح کر چکی تھی۔ اس کے چہرے کا تناؤ بڑھنے لگا عضلات اک دماغ کچھاؤ کی لپیٹ میں آنے لگے۔

”میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کیا بکواس کی ہے۔“

”پلیز عریشان۔۔۔ ایک بار کہہ چکی ہوں کہ میری منگنی ہو چکی ہے پھر کیوں یقین نہیں کر لیتے آپ۔ ثبوت کے طور پر انگوٹھی بھی آپ دیکھ چکے ہیں۔“

لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی بلکہ اس کے چہرے پر بھی نظر نہ ڈال سکی۔

”بچھلے تین ماہ سے پھر جو ہمارے درمیان چل رہا تھا پھر وہ کیا تھا۔“ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں ٹپکنے لگیں عجب انتہائی تلخ اور سرد ہو گیا۔ دل چاہ رہا تھا اسے

جھنجھوڑ کر رکھ دے جو ایک گھنٹے سے مسلسل اس کے ضبط و برداشت کو آزمایا رہی تھی اس کے جذبات کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

”میں نہیں جانتی کہ وہ سب کیا تھا، میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”منگنی۔۔۔ زخمی لہو لہو آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے وہ اذیت و تکلیف کی نجانے کس اسٹیج پر جا پہنچا تھا پھر اس کے کندھوں کو چھوڑتے درد سے چور لہجے میں بولا۔

”کتنی ظالم ہو تم، تمہیں ذرا احساس نہیں کہ تمہارے یہ الفاظ کسی بشر کی طرح میرے دل کو گھائل کر رہے ہیں، میں اس وقت کتنی تکلیف سے گزر رہا ہوں۔ کیوں اتنی سنگدل ہو گئی ہو کہ محبت بھرے دل کو اتنی بے رحمی اور سفاکی سے توڑ رہی ہو۔ جانتی ہونا کہ نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر پھر کیوں میری تکلیف کا مزا لے رہی ہو یا کہ مجھے آزما رہی ہو۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے بتاؤ، مگر اتنی بڑی سزا نہیں عانیہ۔۔۔ میں نہیں سہ پاؤں گا۔“ اک بے قراری سے اس نے اس کا ہاتھ تھاما عانیہ کو اس کی آواز بھیگی سی لگی۔ اس کا دل عجیب سی توڑ پھوڑ کر شکار ہونے لگا۔ عریشان کے لفظوں میں اتنی سچائی اور لہجے میں اتنا درد تھا کہ اس کا دل تڑپنے لگا۔ اسے خود کو سنبھالنا مشکل لگنے لگا۔ وہ مارنے لگی اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جب وہ کمزور پڑ سکتی تھی، مگر اسے کمزور نہیں پڑنا تھا، کسی صورت نہیں پڑنا تھا۔ آئی سارہ کے احسانوں کا بوجھ اتارنے کے لیے ان کی عزت پر اپنی محبت قربان کرنی ہی تھی۔ اس کے لیے چاہے وہ خود اندر سے ہمیشہ کے لیے مرجاتی، مگر اسے ایسا کرنا ہی تھا۔

”ایک بار آپ سے کہہ چکی ہوں کیوں سمجھ میں نہیں آتا آپ کی۔ کچھ دنوں میں شادی ہے میری اس لیے پلیز یہاں بار بار آکر میرا اور اپنا ٹائم ضائع مت کریں۔ میں نے کبھی بھی کسی بھی قسم کے عہد و پیمان نہیں باندھے آپ سے، چند دن آپ کے ساتھ ہنس



بول کر کیا گزار لیے آپ تو پیچھے ہی پڑ گئے اور پلیز اس طرح مجھے تنگ کر کے یہ سوچنے پر مجبور نہ کریں کہ جو وقت آپ کے ساتھ گزارا وہ میری زندگی کا برا ترین وقت تھا۔ بہت ہمت کرنی پڑی اسے یہ سب کہنے کے لیے جبکہ عرشان داؤد تو پتھر کا مجسمہ بنانا قابل یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اسے کسی صورت یقین نہ آیا کہ یہ سب عانیہ سعید نے کہا ہے۔ اس کی عانیہ سعید نے جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا اور جس کے اندر اس کی جان بستی تھی جس کے بیٹھے نرم لہجے میں اس کی زندگی دھڑکتی تھی۔ کتنے سنگین الفاظ تھے اس کے اور کس قدر بے رحمی سے ادا کیے گئے تھے جبکہ عانیہ اسے وہیں ساکت بے یقین چھوڑ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

”میں نے بہت برا کیا ہے اس کے ساتھ زہنی بہت برا بڑی بے دردی سے اس کا دل توڑا ہے میں نے وہ جو عورت پر یقین کرنے سے ڈرتا تھا میں نے اس کے ڈر کو سچا ثابت کر دیا ہے۔ وہ اب کبھی کسی عورت پر یقین نہیں کر پائے گا۔ اب وہ شاید کبھی کسی پر بھروسا نہ کر پائے اگر قسمت نے ہمیں ملانا ہی نہیں تھا تو پھر ایک دوسرے کے قریب ہی کیوں لانی بہت ظالمانہ کھیل کھیلا ہے تقدیر نے ہم دونوں کے ساتھ بہت ظالمانہ۔“ وہ زہنی کے گلے لگتی پھوٹ پھوٹ کر رودی اس کی اس قدر تکلیف پر زہنی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس ٹوٹی پھوٹی لڑکی کی جھولی خوشیوں سے بھر دے۔

گھر آنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر بے یقین ہی رہا۔ اسے لگا جیسے وہ سب ایک برا خواب ہو وہ آنکھیں کھولے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیوں کیوں اس کا دل یقین نہیں کر پاتا تھا۔ آخر کیوں نہیں۔ اس کا اتنا سنگدلانہ رویہ دیکھنے کے باوجود بھی یہ دل کیوں اسی کے لیے تڑپ رہا تھا اسی کے بارے میں مسلسل سوچے جا رہا تھا اسی سے محبت کر رہا تھا۔ عانیہ سعید اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی اور جسے اس نے دل کی تمام تر گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہا تھا۔

عورت ذات پر اعتبار کرنے لگا اور اب۔ اسے لگا جیسے اس کے دامن میں کچھ نہ بچا ہو۔ اس کے نزدیک اس کے بغیر جینے کا تصور ہی نہ تھا اور اب کیا وہ اس کے بغیر جی پائے گا ہر گزرتا لمحہ اس کے لیے بھاری سے بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل لان میں ٹھل رہا تھا پریشانی ایسی تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی سکون نہ تھا۔ اپنی پوری زندگی میں وہ کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا تھا جتنا ان گزرے کچھ گھنٹوں میں ہوا تھا۔ وہ جتنا سوچتا جا رہا تھا اتنا ہی مزید الجھتا جا رہا تھا دونوں ہاتھوں میں سر تھا مے وہ وہیں سکی بیچ پر بیٹھ گیا۔



وہ یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی اس کی گاڑی ابھی تھوڑی دور ہی چلی تھی جب ڈرائیور کو بریک لگانی پڑی سانسے عرشان داؤد اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے گھڑا تھا گاڑی رکتی دیکھ کر وہ ڈرائیور کی طرف بڑھا پھر کھڑکی کی طرف جھکتے بولا۔

”تم گھر جاؤ عانیہ کو میں یونیورسٹی چھوڑ دوں گا۔“ ڈرائیور کی اتنی مجال نہ تھی کہ وہ اس سے کسی قسم کا کوئی سوال جواب کرتا اسی لیے دھیرے سے سر اشارت میں ہلائے تے باہر نکل آیا جبکہ اسے گاڑی میں بیٹھے دیکھ وہ گھبرا گئی۔

”آپ۔؟ آپ یہ کہاں لے جا رہے ہیں مجھے؟“ روٹ تبدیل ہوتا دیکھ کر وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔ ”ڈونٹ وری تنہیں اغوا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے کسی بھی پر سکون جگہ پر جا کر گاڑی روک دوں گا تاکہ تم سے نکل کر بات کر سکوں۔“ بیک ویو مرر سے اس کی ڈری سہمی صورت دیکھتے وہ نارمل سے انداز میں بولا۔

”کیسی بات۔؟“

”کیوں پریشان ہوتی ہو اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے اور میرے درمیان صرف ایک ہی ٹاپک پر بات ہو سکتی ہے۔“ پھر وہ کم رش والی جگہ پر گاڑی روکتے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”متم



آگے آنا پسند کرو گی یا پھر میں پیچھے آؤں؟

”عرشمان پلیزیہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں نمی چھانے لگی۔

”لگتا ہے مجھے ہی پیچھے آنا پڑے گا۔“ پھر اس کے آگے سے پیچھے آکر بیٹھنے تک عانیہ دھڑ دھڑ کرتے دل کی دھڑکنیں ہی سنبھالتی رہی، ہاتھ ایک دم ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ انگلیاں چٹکتاتے وہ اپنی گھبراہٹ کو کسی صورت کم نہ کر پائی تھی۔

”ہوں۔ اب بتاؤ کیا سمجھ کر تم اتنا عرصہ مجھے بے وقوف بناتی رہیں۔ میرے جذبات سے کھیلتی رہیں۔“ اس کے قریب بیٹھتے وہ بہت ریلیکس انداز میں بولا تھا اور یہی انداز تو عانیہ کو کھٹک رہا تھا اس کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔

”مم۔ میں نے کوئی کھیل نہیں کھیلا آپ کے ساتھ۔“

”گڈ، تو اس کا مطلب ہے تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے۔“ زچ ہوتے اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ وہ کیوں بار بار اسے اسی موڑ پر لا کھڑا کرتا تھا جس سے وہ بچنا چاہ رہی تھی۔

”دیکھیں عرشمان بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“  
”بات کو ہی تو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کئی دنوں سے اور بات ہی تو سمجھ میں نہیں آرہی۔“ وہ اس کی بات کا نئے تیز لہجے میں بولا تب وہ بھی سچ پڑی۔  
”میں آپ کو نہیں چاہتی، کتنی بار بتاؤں آپ کو۔“  
”پھر مجھے یقین کیوں نہیں آرہا۔“  
”یہ آپ کا مسئلہ ہے۔“

”میرے اور تمہارے مسئلے کب سے الگ الگ ہو گئے عانیہ؟“ اس کی آواز گہر ہو گئی۔

”ویسے تم نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ اتنی کہ آج تک کسی نے نہیں پہنچائی، مگر چونکہ تم دل کی ملکہ ہو تو تمہاری ہزار خطا میں بھی معاف۔“ وہ اس کی طرف جھکتے اس کے چہرے پر لہراتی اگلی لٹ کو نرمی سے چھوتے ہوئے بولا۔ لہجے کی گہر تپ اور پیش عانیہ کے حواسوں پر چھانے لگی۔ دلفریب کلون کی

مہک ارد گرد حصار باندھتے اسے بے بس کرنی لگی۔  
”عرشمان پلیزیہ۔ آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں تنگ کر رہے ہیں مجھے جب سب ختم ہو چکا ہے تو۔“ وہ تقریباً کھڑکی کے ساتھ چپک سی گئی۔

”تو اس کا مطلب ہے ہمارے درمیان ”کچھ“ تھا جس کا تم نے خود ابھی اعتراف کیا ہے۔“ وہ اس کی بات پکڑتے لکھت سمجیدہ ہوا تھا۔ ”اور وہ کچھ کیا تھا عانیہ، وہ صرف محبت تھی جو ہم ایک دوسرے سے کرتے تھے کرتے ہیں، کیوں بھاگ رہی ہو اس محبت سے؟ کیوں میری زندگی میں خوشیوں سے کھیل رہی ہو، ایسا کیا ہو گیا ہے جو تمہیں مجھ سے دور جانے پر مجبور کر رہا ہے اور تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اتنی آسانی سے تم سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ تم میری واحد خوشی ہو اور میں تمہیں کسی صورت اپنی خوشی چھیننے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیسی منگنی اور کونسی منگنی میں نہیں ماننا اس منگنی کو۔“

اس کی بھاری ہوتی آواز، لہجے میں چھپی حسرت و محبت، لفظوں سے جھلکنا سچ عانیہ سعید کو اندر سے کمزور کرنے لگا۔ آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔ کیا اس دلربا سے شخص کو کھو کر وہ جی پائے گی؟ کتنی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ اس سے اتنی بد تمیزی اتنی سختی سے بات کرے گی کہ وہ بد زن ہو کر خود ہی اس سے نفرت کرنے لگے گا مگر پھر اس کے سامنے آتے وہ ہر چیز ہی بھول جاتی سوائے اپنی بے بسی کے۔ وہ لاکھ چاہنے کے باوجود بھی اس سے سخت لہجے میں بات نہ کر پائی تھی کیونکہ عرشمان داؤد اس کے لیے اس کی پوری زندگی تھا۔ قسمت نے اسے اس موڑ پر ضرور لا کھڑا کیا تھا مگر یہ ہی قسمت عانیہ سعید کے دل سے عرشمان داؤد کی محبت ایک انچ بھی کم نہ کر پائی تھی بلکہ جب سے احساس ہوا تھا کہ وہ اس کا نہیں دل اور دیوانہ ہوئے لگا تھا۔ وہ سر جھکا گئی اتنا کہ اس کے آنسو عرشمان داؤد کی گہری نظروں سے بھی چھب گئے۔

”اب سرگیوں جھکا رہی ہو بات کر لو مجھ سے۔ کہو کہ وہ سب ایک مذاق تھا گھٹیا مذاق، مت آناؤ میرے

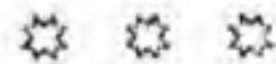


پیار کو نہیں جی سکتا میں تمہارے بغیر۔“ اس نے ہاتھ سے اس کا چہرہ اونچا کرنا چاہا جب اس کا ہاتھ جھٹکتے وہ جیسے پھٹ پڑی دل دماغ کی اس لڑائی میں وہ نیم پاگل ہو کر رہ گئی تھی۔

”کیا چاہتے ہیں آپ؟ مرحاؤں میں خود کشی کر لوں؟ تو ٹھیک ہے میں یہ بھی کر گزروں گی پھر آپ خوش ہو جائیے گا۔“ اپنے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑتے وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی جبکہ عرشمان داؤد کا منہ کچھ کہنے کے لیے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اتنا شدید رد عمل۔

”عانیہ۔“ وہ فقط اتنا ہی کہہ پایا۔

”جان چھوڑ دیں میری اللہ کے واسطے ورنہ میں واقعی خود کشی کر لوں گی، ختم کر دوں گی خود کو موت آمیں بار بار میرے سامنے، تکلیف ہوتی ہے آپ کو دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔ رحم کھائیں مجھ پر۔“ وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ضبط کی آخری سیڑھی پر جا پہنچی تھی۔ عرشمان داؤد حیران پریشان اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا جب وہ دروازہ کھولتے تیزی سے باہر نکلی اور پھر فٹ پاتھ پر بھاگنے لگی اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتا وہ قریب سے گزرتے رکشے کو روک کر اس میں سوار ہو گئی۔



اس ملاقات کے بعد اس نے بہت کوشش کی عانیہ سے ملنے کی مگر اس نے تو جیسے گھر سے باہر نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی تھی ہر وقت اپنے کمرے میں ہی بند رہتی۔

عرشمان داؤد جیسے شخص کو کھو کر جینا موت سے بھی بدتر تھا وہ بہت بار کمزور پڑی تھی مگر پھر اسے خود کو خود ہی دلائل دیتے سمجھانا پڑا۔ خرم نے ایک دو بار اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر وہ سختی سے انکار کر گئی یہاں اسے آنٹی سائرہ بھی فورس نہ کیا میں۔ وہ اسے شاپنگ پر لے جانا چاہتی تھیں مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ ادھر جب اس کی شادی کا کارڈ عرشمان داؤد

تک پہنچا تو صحیح معنوں میں اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ساری دنیا کو آگ لگا دے۔

لی جی کی گود میں سر رکھے وہ درد کی نجانے کونسی حد پر تھا۔ اسے اتنا ٹوٹا بکھرا دیکھ کر لی جی کے کلبجے پر بھی ہاتھ پڑا تھا۔ وہ کتنی دیر بے یقینی سے کارڈ کو دیکھتی رہیں پھر آہستہ سے برہنہ میں ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ انہیں جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو انہوں نے سائرہ بیگم سے عرشمان اور عانیہ کے رشتے کی بات کی تھی تب تو انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اور عرشمان داؤد تو ایسے تھا جیسے پوری دنیا سے ناراض ہو چکا ہو۔ کتنے دن گزر گئے اسے اپنے کمرے میں بند۔ کھانا، پینا، سونا، جیسے وہ سب بھول گیا وہ خود سمیت ساری دنیا کو بھول گیا، ہو سکتا تھا کہ اس فرسٹریشن میں وہ خود کو ختم کر لیتا کہ اس دن آنٹی سائرہ چلی آئیں۔ وہ کمرے میں مکمل اندھیرا کیے پڑا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئیں اور پھر آہستہ سے لائٹ جلادی عرشمان نے کافی ناگواری سے اس عمل کو دیکھا تھا۔ اندھیرے میں رہنے کی تو جیسے اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ روشنیوں سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اسے لگا کوئی ملازم ہو گا مگر پھر آنٹی سائرہ کو دیکھ کر وہ خاصا حیران ہوا تھا۔

”آپ!؟“

جبکہ وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتے ایک ادائے نزاکت سے چلتی گردن اکڑائے اس کے قریب چلی آئیں۔

”ہاں میں؟“ پھر اس کی بڑھی ہوئی شیو، ملکتے شکن آلود لباس، آنکھوں کے گرد پڑے بالوں اور کئی دنوں کی رت جگموں کے احساس سے سرخ دوڑے لیے دیران بنجر آنکھوں کو دیکھ کر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ ”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی؟ تم تو پہچانے ہی نہیں جا رہے پورے مجنوں بنے ہوئے ہو۔ اس بے وفائے کی وجہ سے اس طرح جوگ لینا سوٹ نہیں کرتا تم پر۔ تم داؤد اندسٹریز کے اکلوتے مالک، کروڑوں نہیں بلکہ عربوں کے تہاوارث ہو۔“ عرشمان داؤد کی آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی۔ ہزار چاہنے کے باوجود وہ ان کی آمد

[[بندہ کرن 129]] اکتوبر 2015



کا مقصد نہیں جان پایا تھا جبکہ وہ کہہ رہی تھیں۔  
 ”تو مائے سن نو عرشان داؤد کو یہ زہب نہیں دیتا کہ وہ  
 دو ٹکے کی لڑکی کی خاطر خود کو برباد کرے۔ دیکھو تو کتنی  
 تھکن ہو رہی ہے تمہارے روم میں۔ زندگی کی ذرا سی  
 رمت کا بھی احساس نہیں ہو رہا ہے۔ ہر چیز سے اداسی  
 ٹپک رہی ہے خیر تم اپنے کمرے میں کس طرح رہتے  
 ہو یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے میں تو تم سے صرف اتنا  
 پوچھنے آئی ہوں کہ جب ایک انسان کا دل ٹوٹتا ہے تو  
 اسے کیسا محسوس ہوتا ہے۔“ عرشان داؤد کی آنکھوں  
 میں الجھن چھانے لگی آخر وہ کہنا کیا چاہ رہی تھیں وہ  
 سمجھنے سے قاصر تھا جبکہ وہ استہزائیہ مسکراہٹ ہونٹوں  
 پر لاتے ہوئے بولیں۔

”کبھی اتنی ہی بے دردی سے تم نے بھی کسی کا دل  
 توڑا تھا۔“ وہ اس دوران پہلی بار چونکا۔ یعنی جیسا وہ  
 سوچ رہا تھا ویسا کچھ بھی نہ تھا معاملہ کچھ اور تھا۔ آنٹی  
 سائرہ اس کے زخموں پر مرہم نہیں بلکہ نمک چھڑکنے  
 آئی تھیں۔ ”کیوں آئی ہیں آپ یہاں؟“ وہ از حد  
 سنجیدہ سا گویا ہوا۔ جب مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے  
 انہوں نے کہا۔

”کتنی کمزور یادداشت ہے تمہاری ابھی بتایا تو ہے۔  
 ویسے ایک بات ہے تمہیں اس طرح دیکھ کر میرے دل  
 کو بہت سکون مل رہا ہے جیسے کرنی دہی بھنی۔“  
 ”آ۔ آپ۔“

”ہاں میں۔“ لڑکھائے سے چیخیں۔ ”آج سے ایک  
 سال پہلے اپنے زعم میں جس معصوم کا تم نے بڑی بے  
 دردی سے دل توڑا تھا وہ کوئی اور نہیں میری اپنی بیٹی تھی  
 جو اس دن کے بعد سے مسکراتا تک بھول چکی ہے  
 زندگی کو ایک بوجھ کی طرح گزار رہی ہے۔ اسی دن میں  
 نے تم سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی اور پھر خوش  
 قسمتی سے میری ملاقات عانیہ سے ہو گئی۔ واہ کیا  
 صورت پائی تھی اس نے اور کیا معصومیت تھی چہرے  
 پر۔ اگر میری انھی نظر ٹھٹک سکتی تھی تو پھر تمہاری  
 کیوں نہیں۔ چارے کے طور پر تمہارے سامنے پیش  
 کیا تھا میں نے اسے بڑا سجا سنوار کر پیسے تک کی پروا

نہ کی اور تم“ وہ سنیں بڑی عجیب سی ہنسی تھی۔ ”تم تو  
 چارہ کھانے کے لیے ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی  
 اناولے ہو گئے حسن بھی کیا چیز ہوتا ہے انسان کی  
 سدھ بدھ ہی کھو جاتا ہے۔ وہ سب ایک پری پلان تھا  
 ڈیڑ۔“ اور عرشان داؤد کا چہرہ حیرت سے بتدین گیا جبکہ  
 آنکھیں بے یقینی کے احساس سے قدرے پھیل سی  
 گئیں۔ اسے کسی صورت یقین نہیں ہو رہا تھا کہ آنٹی  
 سائرہ اس کے ساتھ اس طرح بھی کر سکتی ہیں۔ ہاں  
 اسے اب بھی اچھی طرح یاد تھا ایک سال پہلے اشنا کے  
 اظہار محبت پر وہ پہلے تو کتنی دیر بے یقین اور حیران رہا  
 مگر پھر بہت نرمی اور رسلان سے مسکھے ہوئے لہجے میں  
 اسے سمجھایا کہ اس کا جذبہ یک طرفہ ہے وہ اس کے  
 بارے میں اس طرح نہیں سوچتا۔ تب اشنا بہت روئی  
 تھی اسے اپنی محبت کے واسطے بھی دیے تھے مگر عرشان  
 داؤد جیسے اپنے دل کے آگے مجبور تھا جو اس کے بارے  
 میں اس طرح سوچنے کو کسی صورت تیار نہ تھا۔ عرشان  
 نے بہت ندامت محسوس کرتے اس سے معذرت کی  
 تھی اسے حقیقتاً بہت دکھ ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے  
 اشنا کا دل ٹوٹا تھا تب آنٹی سائرہ وہاں موجود نہیں تھیں تو  
 اس کا مطلب ہے یہ سب کیا دھڑا اشنا کا تھا اس نے اپنی  
 ماما کو ان دونوں کے درمیان ہوئیں ساری باتیں بتائی  
 ہوں گی۔

عرشان داؤد نے سلگتی ہوئی نظریں اٹھائیں سامنے  
 کھڑی شاطرانہ انداز میں مسکراتی عورت اس کی سگی  
 چاچی تھیں وہ چاہتا تو انہیں ذلیل کر سکتا تھا انہیں بہت  
 کچھ سنا سکتا تھا مگر وہ بولا تو فٹا اٹتا۔

”کیا عانیہ بھی آپ کے اس پلان میں شامل تھی؟“  
 سائرہ بیگم اک ادا سے مسکرائیں جیسے وہ اس سے اسی  
 سوال کی توقع کر رہی تھیں۔ اس کی موجودہ حالت ان  
 کے دل کو سکون فراہم کر رہی تھی۔ پھر وہ کیوں نہ خوش  
 ہوتیں۔ ان کا دل چاہا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائیں۔  
 جس طرح اس شخص نے ان کی بیٹی کو رلایا تھا یہ خود بھی  
 اسی طرح رونے والا تھا۔ وہ بازی جیت چکی تھیں  
 انہوں نے جیسا چاہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا تھا پھر وہ اس کی



طرف طنز یہ دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ہاں وہ تمہاری ہیروین بھی اس پلان میں شامل تھی ٹل کلاس کی لڑکیوں میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے کہ وہ پیسے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ میں نے کسی امیر لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کروانے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے بدلے میں اسے تمہارے جذبات کے ساتھ کھیلتا تھا، تمہارا دل توڑنا تھا اور اب جبکہ وہ ایسا کر چکی ہے تو وعدے کے مطابق اس کی شادی میں تمہارے جتنے ہی امیر لڑکے سے کروا رہی ہوں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اسے، تمہارا ہی بزنس پارٹنر خرم منصور تمہارے ہم پلا ہی ہے۔ تمہیں تو شاید خبر بھی نہ ہوگی خود کو کمر بند کیے پورے مجنوں بنے بیٹھے ہو۔ میں تو تمہیں خاص بلاوا دینے آئی تھی کہ کل اس کی باراست پر ضرور آنا۔ انتظار رہے گا تمہارا۔“

وہ اتنے فراٹے سے جھوٹ بول رہی تھیں کہ کسی کو بھی ان کے جھوٹ پر یقین آ جاتا جبکہ عرشان داؤد کا پورا چہرہ ضبط سے سرخ انگارہ ہو گیا آنکھیں خون چھلکانے لگیں ہاتھوں کی مٹھیاں شدید اشتعال سے جھنجھکی سی گئیں۔ وہ جو عانیہ کے رویے سے ابھی تک الجھا ہوا تھا سب سمجھ گیا۔ اس کا اعتماد بھروسا یقین بڑی بری طرح کرچی کرچی کیا گیا تھا۔ وہ لڑکی جس کا چہرہ تو معصوم تھا مگر دل غ انتہائی شاطر اور اس کی جھوٹی محبت کی خاطر کتنے دن وہ خود کے ساتھ ظلم کرتا رہا تھا لڑتا رہا تھا اپنا قصور تلاشتا رہا تھا۔ جینا تک بھول گیا تھا۔ محبت نے اسے بڑی بے دردی سے رسوا کیا تھا بہت کڑی سزا دی تھی۔ اس کا بھروسا اسی طرح توڑا تھا کہ اب ساری زندگی وہ کسی پر بھروسہ نہ کر پاتا فقط کچھ لمحے لگے تھے خود کو سمیٹنے میں خود کو جوڑنے اور سنبھالنے میں اس نے اپنی ذات کی بہت رسوائی دیکھ لی بہت عانیہ اور آنٹی سارہ جیسے لوگوں کو تسکین فراہم کر دی اب نہیں بالکل نہیں۔ ایک لمحہ لگا تھا بس اور پھر اس کا چہرہ ہر احساس ہر تاثر سے عاری ہو گیا۔ وہ آنٹی سارہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔

آنٹی سارہ نے بے حد حیرانی سے اس کی نا سمجھ میں آنے والی مسکراہٹ کو دیکھا۔

”عرشان داؤد ناقابل تسخیر ہے آپ کی وہ زر خرید لوٹدی اس میں اتنی طاقت کہاں کہ وہ مجھے زیر کر سکے۔ محبت۔ ہا ہا کیسی محبت اور کونسی محبت اس کی اتنی اوقات ہے کہ وہ عرشان داؤد کے دل کی ساتھ کھیل سکے۔“ سارہ بیگم کا چہرہ محوں میں متغیر ہوا تھا جبکہ وہ ان کا ساکت انداز دیکھتے مضبوط چال چلتا ان کے رویہ آکھڑا ہوا۔

”عرشان کا مطلب تو آپ خوب جانتی ہوں گی عرش کا شہزادہ اور شہزادوں کو بھلا پاندیوں کی کیا کمی بس عانیہ سعید بھی ایک پاندی ہی تھی جس کے ساتھ عرشان داؤد نے کچھ دن گزارے، عیش کیا اور پھر چھوڑ دیا۔“ سارہ بیگم کا چہرہ محوں میں شدید اشتعال کی گرفت میں آیا تھا۔ آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ وہ تو اس کی ہار کا مزا لینے آئی تھیں مگر اس وقت وہ استہزائیہ نظروں سے تنکنا زہر خند مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ان کی شکست کا مزا لے رہا تھا۔ کسی زہریلی ناگن کی طرح ان کے اندر زہر پھیلا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے لیے اور تیز ناخنوں کے وار سے اس کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے نوج ڈالتیں جو ان کو کسی صورت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ عرشان داؤد نے آج دو سری بار انہیں شدید تکلیف سے دوچار کیا تھا انہیں چوٹ لگائی تھی، مات دی تھی وہ برداشت کرتی بھی تو کس طرح تنفر بھری سرخ نظروں سے اسے گھورتے وہ ایک دم پلٹی تھیں جب اس کے پکارنے پر انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

”یہ جو آپ میری حالت دیکھ رہی ہیں نا وہ ج ہے مگر وہ عانیہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ایک جن سے عزیز دوست کی ڈیبتھ کی وجہ سے ہے۔“ وہ مزید وہاں رک کر اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتی تھیں سو ایک جھٹکے سے مڑیں اور تن فن کر لی کمر اچھوڑ گئیں جبکہ ان کے جاتے ہی عرشان داؤد وہیں گھنٹوں کے بل زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اتنا بڑا دھوکا محبت کا یہ فریب ناقابل برداشت



ہے کیونکہ وہ میری بیوی کی حیثیت سے اس وقت میرے بیڈ روم میں ہے اور اگر آپ دلہا کا انتظار کر رہی ہیں تو وہ بھی بے فائدہ ہی ہے کہ بارات اب کبھی نہیں آئے گی۔“

”واٹ! کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ کئی لمحے تو سناٹوں کی زد میں رہ کچھ بول ہی نہ پائی تھیں مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولی نہیں بلکہ پھنکاری تھیں۔ عرشان کی آواز کو وہ لمحوں میں پہچان گئی تھیں ان کے غصے اور اشتعال کے گراف کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے بکواس کرنے کی نہ تو آپ کا ڈرائیور ہی آپ کے پاس ہے اور نہ ہی زینی۔ وہ دونوں بھی باحفاظت میرے پاس ہی ہیں۔ آپ تو انہیں اب کبھی نوکری پر نہیں رکھیں گی تو ظاہر ہے ان کا خیال بھی تو مجھے ہی رکھنا پڑے گا نا اور رہا سوال دو لمبے کا تو یہاں آپ سے تھوڑی سی غلطی ہو گئی۔ کم از کم دو لمبے کی حیثیت سے آپ کو میرے فریڈ کو تو کسی صورت چننا نہیں چاہیے تھا اب وہ اپنے دوست کا دل تو نہیں توڑ سکتا تھا جیسا میں نے اسے کہنا تھا اس نے ویسا ہی کرنا تھا۔“

”عرشان۔۔۔“ وہ حلق کے بل چیخی تھیں۔ آواز کی تیزی گلے کو چیرتی ہوئی گزری تھی۔ رہی سہی امید بھی اسی بل دم توڑ چکی تھی۔ باہر موجود مہمانوں کے سامنے کاڈرا نہیں اندر تک حواس باختہ کر چکا تھا۔

”آہستہ آنٹی جان آہستہ۔ میں سہرہ نہیں ہوں اور ویسے بھی آج تو میری سہاگ رات ہے اس لیے آپ سے زیادہ بحث نہیں کر پاؤں گا۔ اس بحث کو ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں“ ابھی تو میری پیاری بیوی میرا ویٹ کر رہی ہوگی سو گڈ بائے اب باہر موجود مہمانوں سے آپ نے کیا کہنا ہے یہ آپ جانیں اور آپ کا کام میری طرف سے ٹو گڈ نائٹ۔“

”یو باسٹریڈ۔ ایڈیٹ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارے ساتھی۔“ ادھر سے سیل آف ہونے کے باوجود بھی وہ گالیوں اور کوسنوں کی صورت دل کی بھڑاس نکالتی

رہیں۔ شاید اسے ہی مکافات عمل کہتے ہیں۔ انہوں نے جو اس کے ساتھ کیا سو کیا، مگر آج ان کے ساتھ وہ انتہائی برا کر چکا تھا ان کی بازی ان ہی پر الٹ چکی تھی۔ آج کی رات کے بعد یقیناً وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ان کا ٹھمنڈا ان کا غرور لمحوں میں چمکا چور ہوا تھا۔ عانیہ، عرشان اور خرم کو بد دعا میں دیتے وہ وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئیں۔



رو کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا جو عرشان داؤد اس کے ساتھ کر چکا تھا۔ وہ اسے برا بھلا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ دل کی سلطنت کا ابھی تک وہ تہما مالک تھا۔ نہ جانے آنٹی پر کیا گزری ہوگی وہ اس وقت کس حال میں ہوں گی۔ اسے نہ پا کر بارات یقیناً ”واپس لوٹ چکی ہوگی“ آنٹی کی کتنی انسلٹ ہوگی۔ عرشان نے تو ان کی عزت کا بھی ذرا خیال نہ کیا۔

”اف میرے اللہ یہ سب کیا ہو گیا۔“ وہ گھٹنوں میں سر دیے ایک بار پھر سے رو پڑی۔ اسی وقت دروازہ کھولتے عرشان داؤد اندر داخل ہوا۔ عانیہ نے گردن اٹھاتے اسے خائف نظروں سے دیکھا جو اس کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ تھا۔ اس نے کوٹ اور ٹائی کو بڑی بے دردی سے صوفے پر اچھالا تھا اور پھر کف لنکس اوپر کرنا از حد سنجیدہ سا اس کے روبرو آکر بیٹھ گیا پھر کتنی دیر وہ اس کے روئے روئے سرخ چہرے کو پر سوچ نظروں سے گھورتا رہا۔ سامنے بیٹھی اس لڑکی میں کبھی اس کی جان بستی تھی سو اسے اپنانے کے خواب دیکھا کرتا تھا مگر آج جب وہ اس کی ہو گئی تھی تو اس کے سر و تاثرات میں جذلوں نے ذرا اپچل نہ مچائی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے سب احساسات پر برف کی جم گئی ہو نہ دھڑکنوں نے ادھم مچایا نہ دل نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار کیا۔ اس وقت اس کے دل میں جتنی آگ لگی تھی وہ ساری آگ اس پر اندیل دینا چاہتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا اب کب اسے کسی کی پروا رہی تھی۔



”عرش کا مطلب تو تم جانتی ہی ہوگی، میں نے خود ہی تو بتایا تھا تمہیں۔“ لکھت ہی اس کی آنکھیں کسی پرانی یاد کے زیر اثر سرخ ہوئی تھیں۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنے دماغ کو جھٹکا تھا۔ وہ اب کبھی بھی پرانی یادوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”عرش کا شہزادہ اور شہزادوں کو تو باندیاں رکھنے کی عادت ہوئی ہی ہے۔ تم بھی اس گھر میں ایک باندی کی ہی حیثیت سے رہو گی۔ تم سے نکاح کرنا میری خواہش نہیں، بلکہ ضرورت تھی۔ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی تحویل میں رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا ورنہ تمہاری وہ خالہ کہاں تک کر بیٹھنے والی تھیں۔“ اس کا لب و لہجہ انتہائی تھوڑا نکلاں یہاں تک کے دیکھنے کا انداز بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ عانیہ کا پورا وجود سن ہونے لگا۔ وہ تو اس بالکل اجنبی اور برلے ہوئے عرشان داؤد کو دیکھ کر حیرت و دکھ سے مجسمہ سی بن گئی۔ آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود بھی اسے لگا جیسے سامنے بیٹھا شخص عرشان نہیں بلکہ اس کا بہروپ ہو جس کا چہرے کے سوا اور کچھ بھی عرشان سے نہ ملتا ہو۔ نہ اخلاق نہ دیکھنے کا انداز اور نہ آواز کی لطافت، وہ اس ایک ہی وقت میں بہت سی کیفیات کا شکار ہوئی تھی۔ بے یقینی، حیرت، صدمہ، دکھ، تاسف، خوف و ہراس ان تمام چیزوں نے مل کر اسے مختلف الجھاس سا کر دیا، جب وہ اس کی طرف جھٹکا اور پھر بڑی بے دردی سے اس کا چہرہ پکڑتے غرایا۔

”کسی امیر و کبیر شخص سے شادی کی ہی خواہش تھی نا تمہاری، تو آج پوری ہو گئی۔ چہرہ چپ۔“ پھر افسوس سے سرٹنی میں ہلاتے اس نے ایک جھٹکے سے اس کا چہرہ اچھوڑا۔

”مگر افسوس اس کے پاس تم پر ڈالنے کے لیے محبت کی ایک نگاہ بھی نہیں ہے۔“

”تم۔“ پھر وہ ایک دم طیش میں آ کے بولا۔

”تم ہر رات میری سجاو کی مگر محبوبہ یا بیوی بن کر نہیں بلکہ باندی بن کے۔“ نا تم نے۔“ اپنی لہو ہوئی، تنفر بھری نظریں اس کے زرد پڑتے چہرے پر گاڑھتے

وہ بلند آواز میں چیخا، کتنی نفرت و حقارت تھی، اس وقت اس کی آنکھوں اور چہرے پر، عانیہ کا پورا جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔ تذلیل کے احساس سے وہ کانوں کی لہروں تک سرخ ہو گئی۔ اس نے دھندلائی آنکھوں سے صدمے سے چور ہوتے اس کی طرف دیکھا۔ کانوں کو کسی صورت یقین نہ آیا کہ وہ اتنی گری ہوئی بات بھی کر سکتا ہے۔ اگر وہ اس کے انکار سے ہرٹ ہو کر یہ سب کر رہا تھا تو یہ سب بہت زیادہ تھا۔ عانیہ کی توقع سے تو اور بھی زیادہ۔ اسے اس کی شعلے برساتی، سلکتی آنکھوں اور نفرت و اشتعال لیے سرخ پتھر لیے، سرد چہرے سے ایک دم خوف محسوس ہوا۔ وہ سر اٹھا کر بے ساختہ پیچھے کی طرف سر کی۔ عرشان داؤد مسخرانہ انداز میں مسکرایا اور پھر اس کے لہنگے پر اپنا ہاتھ جماتے اس کی کوشش کو ناکام کر دیا۔ عانیہ کسی ہنسی کی طرح سہم گئی۔

”عرشان۔۔۔“ پلیز چھوڑیں مجھے، آپ ہوش میں نہیں ہیں۔“ وہ رو پڑی تھی۔

”اب ہی تو ہوش میں آیا ہوں، سیٹ ہارٹ۔“

بہت عجیب سے انداز میں وہ ہنسا تھا۔ جب بے بسی لاچاری کی نہ جانے کون سی حد کو چھوتے وہ سسک سسک کر رو دی تھی اور اس کا یوں ہچکیوں سے تڑپ تڑپ کر دونا کچھ لمحوں کے لیے سہی، مگر پرانے عرشان کو جگا گیا تھا۔ اسے تکلیف ہوئی تھی، آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی، مگر پھر اگلے ہی لمحے وہ اپنا ہر جذبہ، ہر احساس اپنے اندر ہی دبا گیا، جو کسی کے سچے جذبات کی ناقدری کرے، کسی کے خلوص ساتھ کیلے۔ کسی کو محبت میں دھوکا دے اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنا عرشان کی ڈکٹری میں بالکل جائز اور درست تھا۔ وہ اسے معاف کر دیتا، بخش دیتا، اگر ایک مل کے لیے سہی، مگر اس نے اسے چاہا ہوتا اس کی تمنا کی ہوتی، مگر اب وہ کسی صورت رعایت دینے کے حق میں نہ تھا۔ اسی لیے اگر یہ رات ایک وجود نے روتے، تڑپتے، بلکتے، گزاری تو دوسرے وجود نے حاکمیت کے نشے میں چور کسی بے بس انسان کی بے بسی کو اپنے قدموں تلے



روندتے ہوئے گزاری۔



اگلی صبح عانیہ سعید کے لیے بالکل مختلف تھی۔ اس کے اندر کی لڑکی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ راحت عثمان کے سلوک نے اسے اچھی طرح باور کروادیا تھا کہ اس کی نظر میں اس کی اوقات صرف ایک زر خرید باندی کے جیسی ہے۔ وہ ہار گئی تھی۔ وہ ٹوٹ چکی تھی۔ بڑی بے رحمی سے اس کے بھروسے کو توڑا گیا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ توڑنے والا کوئی غیر نہیں اس کے دل کا مکین اس کا شوہر تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھی تھی رو رو کر اس کی آنکھیں سوچ چکی تھیں۔ عثمان داؤد قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا بالوں کو برش کر رہا تھا۔ عانیہ کی تھکی تھکی نظریں کتنی دیر سے یک ٹک اسی کو ہی دیکھنے جا رہی تھیں مگر اس بے نیاز شخص نے پلٹ کر ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ اسے ذرا احساس نہ تھا کہ رات اس نے اس معصوم سی لڑکی کے خوابوں کو کس طرح ریزہ ریزہ کیا تھا۔ برش کرنے کے بعد اس نے خود پر پرفوم اسپرے کیا اور پھر اک نگاہ غلط بھی اس پر ڈالے بغیر مضبوط چال چلتا کمر اچھوڑ گیا۔ عانیہ نے سر صوفے کی پشت سے نکلتے آنکھیں موند لیں، اتنی بے بسی، لا تعلقی، بیگانہ پن، اس کی بند آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور پھر وہ ایک ہفتے بعد دوبارہ لوٹا تھا۔ یہ پورا ایک ہفتہ اس نے ڈر ڈر کر گزرا تھا۔ سوائے چوکیدار کے اور کوئی نہ تھا۔

وہ دوسرے میں آیا تھا اور پھر شام ہوتے ہی جس خاموشی سے آیا اسی خاموشی سے لوٹ بھی گیا۔ نہ اس نے اس کا حال پوچھا اور نہ اس نے بتایا کہ کوئی اور کسی بھی قسم کی بات ہوئی۔ وہ صرف اس کی باندی تھی اور باندیوں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ حاکموں کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ اس کے جاتے ہی وہ تکیے میں سر دیے رو دی تھی۔ عثمان داؤد کا رویہ اس کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔ اس کی لاپرواہی، بیگانگی، لا تعلقی حقیقتاً

اسے اندر سے ختم کر رہے تھے مگر یہ بھی سچ تھا کہ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اس سے نفرت نہیں کر پا رہی تھی۔ دل ابھی بھی اسی کھٹور کے نام پر دھڑکتا تھا اور پھر بند رہ دن گزر گئے، مگر اس نے دوبارہ پلٹ کر اس لڑکی بکھری لڑکی کی طرف نہ دیکھا۔ اس کی نمازوں میں سجدے طویل ہو گئے۔ وہ اپنا ہر دکھ اپنی ہر اذیت اپنے اللہ سے کہنے لگی۔ نماز تو وہ پہلے بھی نہیں چھوڑتی مگر ان دنوں وہ اللہ کے اور قریب ہو گئی تھی۔ اسے اب ہی احساس ہوا کہ اللہ سب سے اچھا سامع ہے۔ وہ اس کے سامنے روتی، تڑپتی، بلکتی اپنے اندر کی ساری ٹھن، سارے غم، آنسوؤں کے ذریعے بہا دیتی اور پھر جیسے اسے سکون ملنے لگتا، دل ٹھہرنے لگتا۔

وہ نماز پڑھ کر ابھی اٹھی ہی تھی جب اسے زور کا چکر آیا گرنے سے بچنے کے لیے اس نے ادھر ادھر ہاتھ مارتے کسی چیز کا سہارا لینا چاہا، مگر وہ سرے ہی لمحے لہراتی ہوئی نیچے آگری۔ قریب بڑی چھوٹی ٹیبل سے اس کا سرری طرح ٹکرایا اور پھر خون کا فوارہ سا چھوٹ گیا۔ اللہ جی۔ اس کی حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ مدھل سے انداز میں وہ اپنے ماتھے پر اپنا ہاتھ جما گئی۔ رات کے اس پہر چوکیدار کے علاوہ اس اتنے بڑے گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ آخر وہ بلاتی بھی تو کس کو بلاتی۔ اس نے لٹھنے کی کمزور سی کوشش کی، مگر پھر جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ یہاں تڑپ تڑپ کر مر بھی جائے تو کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی۔ ایسی بے بسی اور لا چاری پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے دل کی شدت سے اپنے رب کو رکارا تھا۔ اب تو تکلیف برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اسی وقت گاڑی کا ہارن بجا اور چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ عثمان داؤد نے جس وقت کمرے میں قدم رکھا۔ وہ درد کی شدت برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش ہو چکی تھی۔

عانیہ۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا تھا جو دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھے دنیا مافیہا سے بے خبر زمین پر بے ہوش پڑی تھی۔ اسے بانہوں میں بھرتے وہ



اپنے منتشر حواسوں کے ساتھ تیزی سے باہر بھاگا تھا۔  
گرنے سے چوٹ تو گہری آئی ہے، مگر بروقت لانے  
کی وجہ سے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ ہسپتال ہے تو  
خطرے سے باہر، مگر خون کی بہت کمی ہے۔ ایک تو ان  
کی حالت ایسی ہے اور اوپر سے خون بھی ضائع ہو گیا۔  
وہ جو اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ریلیکس ہونے لگا  
تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کی اگلی بات پر بری طرح چونکا، کیسی  
حالت۔ اس کی لاعلمی پر لیڈی ڈاکٹر پیشہ ورانہ  
مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے بولی۔

”آپ کی وائف ماں بننے والی ہیں، چونکہ ابھی  
بہت کم عرصہ گزرا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ وہ خود بھی  
انجان ہی ہوں گی۔“

”کیا۔۔۔“ اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔ منہ  
کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جی۔۔۔ یہ میں کچھ میڈیسن لکھ کے  
دے رہی ہوں، برابر دیتے رہے گا اور منتہلی چیک  
اپ تو لازمی ہے، چونکہ یہ کافی ویک ہیں اور اوپر سے  
خون کی بھی کافی کمی ہے، تو ان کی ڈائٹ کا خاص خیال  
رکھیے گا۔ میں آپ کو ڈائٹ چارٹ دے دیتی ہوں،  
اسی کے مطابق ہی خوراک دیجیے گا۔“ وہ ہدایات دینے  
کے ساتھ ساتھ کانڈر میڈیسن بھی لکھ رہی تھی، جبکہ  
وہ بے یقین اور حیران سا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اسے سمجھ  
میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح کاری ایکٹ کرے،  
اگر سب کچھ نارمل حالات میں ہوا ہوتا اور عانیہ سعید  
ایک دھوکے باز لڑکی نہ ہوتی تو اس وقت وہ پھولے مانسا  
رہا ہوتا، مگر اب۔۔۔ اس کے اندر گہرا سکوت سا چھا گیا۔  
وہ عانیہ سعید کے وجود سے تو کبھی کبھی کسی بھی قسم کی  
خوشی نہ لینا چاہتا تھا، کبھی بھی نہیں۔

واپسی پر وہ انتہائی حد تک سنجیدہ تھا اور عانیہ  
خاموش، اس کے سپاٹ تاثرات عانیہ کے اندر عجیب  
سی دکھن پیدا کر رہے تھے۔ یعنی اتنی بڑی خوشی بھی اس  
پر مثبت اثرات نہ ڈال رہی تھی۔

”میں یہ بچہ نہیں چاہتا۔“ گھر آکر اس نے دھماکا کیا  
تھا۔ عانیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر  
رہ گئی۔

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اسے اپنی آواز گہری  
کھائی سے آتی ہوئی لگی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پر شبہ  
گزرا۔ آخر وہ کس طرح اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے  
کہہ سکتا تھا۔ اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی  
لگی سوہ بے اختیار ہی بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔ تم جیسی دھوکے باز لالچی  
مکار عورت میری اولاد کو جنم دے، میں یہ کسی صورت  
برداشت نہیں کروں گا۔“ غصے کی شدت سے اس کی  
آواز قدرے بلند ہو گئی، جبکہ اتنے شدید اور سنگین  
الفاظات پر عانیہ ہکا بکا رہ گئی۔

”کیسا دھوکا۔ کون سا فریب، مم۔۔۔ میں نے آپ  
کو کوئی دھوکا نہیں دیا۔ عریشان اور بھلا میں آپ کو کیوں  
دھوکا دوں گی۔ میں مجبور ہو گئی تھی۔ میں مانتی ہوں کہ  
میں نے آپ کو ہرٹ کیا، مگر میں بے وفا نہیں ہوں۔ یہ  
سب میں نے آنٹی کی محبت میں ان کی عزت کی خاطر  
کیا۔ میں نے اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں  
دفن کر دیا، کیونکہ میں آنٹی کے احسانوں کا بوجھ اتارنا  
چاہتی تھی۔“

اب وہ کسی حال میں بھی اس پر یقین نہیں کرنا چاہتا  
تھا۔ ”میرا بھروسہ اٹھ چکا ہے تم پر سے، تم کچھ بھی کراؤ،  
یہ بھروسہ تمہاری ذات پر دوبارہ بحال نہیں ہو سکتا۔  
تمہاری کوئی اوقات، کوئی حیثیت نہیں ہے میری نظر  
میں، تم صرف ایک باندی ہو اور باندیوں سے وارث  
پیدا نہیں جاتے۔ یہ بچہ تو اس دنیا میں کبھی نہیں آئے  
گا۔“

”اگر آپ مجھے باندی سمجھتے ہیں تو ہاں ہوں میں  
باندی۔“ وہ بھی جیسے پھٹ پڑی۔ بات اس کی اولاد تک  
آچکی تھی۔ پھر وہ کس طرح برداشت کرتی۔ صبر کرتی  
بھی تو کیسے۔

”آپ نے میرے ساتھ جس طرح کا چالاک سلوک  
کیا۔ میں کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لائی، مگر آج  
معاہدہ میری اولاد کا ہے اور کوئی ماں اپنی اولاد پر اتنا بڑا  
ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ابھی تو وہ دنیا میں بھی نہیں  
آئی اور آپ اسے ختم کرنے کی بات کر رہے ہیں۔“



اس کی آواز زندہ سی گئی، مگر وہ چپ نہ ہوئی۔

”میں نے آپ کے ساتھ جو کیا وہ آپ کو حرف بہ حرف یاد ہے، مگر جو آپ نے میرے ساتھ کیا، کیا وہ ٹھیک تھا؟ ٹھیک شادی کے وقت آپ مجھے زیر دستی یہاں لے آئے اور زیر دستی ہی مجھے اپنے نکاح میں لیا۔ میرے بارے میں نہ سوچتے، مگر اپنی سگی چاچی کے بارے میں ہی سوچ لیتے، کتنی ذلت اٹھانی پڑی ہوگی انہیں، مگر آپ۔“

”شٹ اپ۔ آئی سے شٹ اپور ماؤتھ۔“ وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی تھی۔ جب وہ غصے سے دھاڑا۔ اشتعال کے شدید احساس سے اس کے ماتھے کی رکیں تک ابھر آئیں۔ سارا غصہ سگی چاچی کہنے پر تھا۔ کیسی دیدہ دلیری تھی۔ وہ اب بھی ان ہی کی وکالت میں بول رہی تھی۔

”شکر کرو کہ میں نے اتنے میں چھوڑ دیا تم دونوں کو، ورنہ عرشان داؤد کو دھوکا دینے والوں کا انجام اس سے بھی بدتر ہوتا۔ نفرت ہے مجھے تم سے اور تمہاری اس آئی سے۔“ وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ گلے میں خراشیں پڑ گئیں۔ اس کے غصے کی شدت سے سرخ انگارہ ہوتے چہرے کو عانیہ نے دہل کر دیکھا۔ اتنے غصے میں تو وہ تب بھی نہیں آیا تھا، جب عانیہ نے اس سے سب تعلق توڑ دیے تھے۔ جب اس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی شعلے برساتی آنکھیں، آگ اگلتی زبان، ضبط گریہ سے آتش فشاں بنا لہجہ اور سب ہنس نہس کر دینے والا انداز۔ عانیہ بے اختیار سہم کر دو قدم پیچھے سرکی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ عانیہ سمیت ساری دنیا کو آگ لگا دینا چاہتا تھا اسے لگا اگر اب اس نے مزید ایک لفظ بھی کہا تو وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ سراسیمہ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں، بہت واضح نظر آرہی تھیں، جبکہ عرشان داؤد غصے بھری کاٹ دار گہری نظر ڈال کر قہیب پڑی میز کو زوردار ٹھوکر رسید کرتے باہر نکل گیا۔ وہ وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ اس واقعہ کے بعد دو ہفتے گزرنے کے باوجود بھی وہ نہ آیا تھا۔ ہاں اتنا ہوا کہ ایک کل وقتی

ملازمہ کا بندوبست ہو چکا تھا اور وہ ملازمہ کوئی اور نہیں، بلکہ زینبی تھی۔ وہ کتنی دیر اس کے گلے لگ کے روتی رہی اور زینبی بھی روتے ہوئے اس کے بندھال وجود کو سنبھالتی رہی۔

”وہ اتنا کھٹور تو کبھی نہیں تھا زینبی، اتنا ظالم، اتنا سنگ دل میں، میں اس کا ہر ظلم سہ جالی، کبھی اف تک نہ کرتی، جانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ وہ سخت بدگمان ہے مجھ سے، ہونا بھی چاہیے کہ میں نے اس کا محبت بھرا دل توڑا ہے۔ انہیں تکلیف پہنچانی ہے، مگر اس میں اس بچے کا کیا قصور ہے۔ وہ کیوں اپنی ہی اولاد کو دنیا میں آنے سے پہلے ختم کر دینا چاہتا ہے۔“ آج کتنے دنوں بعد وہ آیا تھا، مگر پھر عانیہ کی بھیگی آواز سننے وہیں دروازے پر ہی رک گیا۔ آنکھوں کے گوشے سرخی کی لپیٹ میں آنے لگے، کیا واقعی اسے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اپنے کیے پر پشیمانی ہے اور کیا وہ اتنے بڑے دل کا مالک ہے کہ سب بھول کر اس کی خطائیں معاف کر سکے، مگر پھر عانیہ کے اگلے جملے نے تو جیسے اسے ششدر سا کر دیا۔

”تم جانتی ہو وہ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے۔ دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چلا ہے میں نے اسے، اس کے اتنے ظلموں کے باوجود بھی یہ دل اس سے نفرت نہیں کر پا رہا، میری بے بسی دیکھو زینبی وہ جب سامنے آتا ہے تو میں سب بھول جاتی ہوں، کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس اتنی بڑی دنیا میں میرا اس کے سوا اور کون رہا ہے۔ آئی سائرہ کے ساتھ انجانے میں ہی سہی، مگر میں بہت برا کر چکی ہوں۔ وہ تو اب میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہیں گی۔ میری وجہ سے بہت رسوا ہوئی ہوں گی وہ۔ بیٹیوں کی طرح چاہا تھا انہوں نے مجھے۔ تب میرا ساتھ دیا جب سب اپنوں نے بھی منہ پھیر لیا تھا۔ ان کی عزت کی لاج رکھنے کے لیے میں نے ناچا سہتے ہوئے بھی اتنا بڑا قدم اٹھایا اور اب میں ہی ان کی رسوائی کا سبب بن گئی ہوں۔ وہ کبھی مجھے معاف نہیں کریں گی، کبھی بھی نہیں۔“ وہ رو دی تھی۔ عرشان داؤد کے ماتھے پر پر سوچ لکیریں ابھرنے لگیں۔



دلغہ الجھنے لگا۔ آخر وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی۔ اس کے پرورد الفاظ، لہجے کا سوز تو کوئی اور ہی کہانی سنار ہے تھے۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔



”یہ۔۔۔ یہ کیا کیا ماما آپ نے؟“ ان کے منہ سے پوری بات سن کر اشنا نے حیرت سے پوچھا اب سے کسی صورت یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کی ماما عریشان اور عانیہ کے ساتھ اس طرح بھی کر سکتی ہے۔ وہ بے یقینی سے ان کی طرف دیکھنے لگی جو کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھیں۔ چہرے پر غصے کی سرخی تھی۔

”ٹھیک کیا تھا میں نے کچھ غلط نہیں۔ مگر افسوس جس طرح چاہا تھا ویسا نہیں ہوا۔“

”ماما اس میں عریشان کا کیا قصور، میرا جذبہ یک طرفہ تھا۔ مجھے اس سے محبت ہوئی تھی اسے مجھ سے نہیں جب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تو پھر آپ نے اتنا بڑا قدم کس طرح اٹھالیا، بلکہ آپ اتنی انتہا تک بھی جاسکتی ہیں میں کبھی سوچ نہیں سکتی تھی اور اس بے چاری عانیہ کا کیا قصور تھا جسے آپ نے اتنی بڑی سزا دی۔ وہ بے سہارا یتیم لڑکی جو آپ کے آسرے پر تھی، کتنا برا کر چکی ہیں آپ اس کے ساتھ۔ کیا کل کو آپ سے پوچھ نہ ہوگی اس کے بارے میں۔“ اشنا نے انہیں آئینہ دکھانا چاہا۔ جب انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”یہ سب میں نے تمہاری خاطر، تمہاری وجہ سے کیا۔“

”مگر افسوس کے آپ نے غلط کیا۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”مجھ سے تمہاری خاموشی، تمہارا دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔“

”مگر اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا کہ آپ انتقام پر اتر آئیں۔ عریشان نے مجھے کوئی دھوکا نہیں دیا، وہ تو اتنا نائس انسان ہے کہ سب جاننے کے باوجود بہت نرمی

اور سلجھے ہوئے انداز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر مجھے ہی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، اس کی محبت میں اندھی ہو چکی تھی۔ دیوانی بن چکی تھی، مگر اس سب کے باوجود میں نے کبھی اس سے انتقام لینے کے بارے میں نہ سوچا۔ میں خاموش ہو گئی اور پھر مجھے صبر آنا گیا اور میرے اسی صبر کی وجہ سے اللہ پاک نے رحمان احمد کو انعام کے طور پر میری قسمت میں لکھ دیا۔ رحمان احمد کی محبت کو جیسے جیسے میں جانتی گئی مجھے خود پر ناز ہونے لگا، کوئی اتنی شدت سے بھی کسی کو چاہ سکتا ہے اور چاہے جانے کا احساس کتنا دلفریب ہونا ہے یہ میں نے اب محسوس کیا ہے۔ میں اپنے ماضی کو بھول چکی ہوں۔ مجھے بس رحمان احمد یاد ہے۔ میں بہت جلد آپ سے اور پیپا سے اس کے حوالے سے بات کرنے والی تھی۔

مما تقدیر سے کبھی لڑا نہیں جاسکتا، کیونکہ تقدیر سے لڑنے کا مطلب اللہ سے لڑنے کا ہے۔ وہی تو تقدیر میں بناتا ہے۔ میری تقدیر میں رحمان احمد ہی تھا اور جسے میں قبول کر چکی ہوں۔ عریشان کی تقدیر میں عانیہ ہی تھی جسے آپ نے لاکھ اس سے جدا کرنا چاہا، مگر کرنے پائیں۔ ہوا وہی نا جو اللہ چاہتا تھا، اگر آپ بہت سے لوگوں کے سامنے رسوا ہو چکی ہیں تو اس میں کسی اور کا کوئی قصور نہیں، غلطی آپ کی ہے۔ انتقام کی آگ میں جتنا جلیں گی وہ آپ کو اتنا ہی اندھا کر تی جائے گی۔ پلیز پلٹ آئیے واپس۔ اپنے لیے نہ سہی، میرے لیے پیپا کے لیے۔“ اشنا نے روتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”ہر بچہ اپنی ماما کو بہت اچھا دیکھنا چاہتا ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں۔ مجھے کسی کی بددعاؤں سے بہت ڈر لگتا ہے ماما بہت مشکل سے خوشیاں تلاش کر پائی ہوں، یہ نہ ہو کہ ان خوشیوں کو کسی یتیم کی آہ لگ جائے۔ پلیز ممالوٹ آئیے ان اندھیروں سے۔ میری خاطر ہی آپ نے یہ سب کیا ہے نا تو اب میری خاطر ہی اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیجئے آپ کو میری محبت کا واسطہ۔“

”اشنا! لن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ پھر اشنا کو



گلے لگاتے وہ رو پڑی تھیں۔ جبکہ اشنا آہستہ آہستہ ان کی کمر سہلانے لگی۔



وہ کچھ ضروری سامان لینے مارکیٹ آیا تھا، جب اس کی ملاقات اشنا سے ہوئی۔ وہ اسے ایک سر نظر انداز کرتے سنجیدہ سا قریب سے گزر جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے پکارنے پر مجبوراً اسے رکن پڑا۔

”کیا بات ہے عرشان قریب سے یوں گزر رہے تھے جیسے جانتے ہی نہ ہو۔“ اپنا یوں سر راہ نظر انداز کیا جانا اشنا کو عجیب سی تکلیف میں مبتلا کر گیا، جب وہ از حد سنجیدہ سا گویا ہوا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے دھوکے باز لوگوں سے کتنی نفرت ہے اور تم بھی ان میں سے ہی ایک ہو۔“ اس کے لہجے کی تلخی کو پیتے اشنا کے دل میں چھین سی اتری تھی۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں بات کرنے کی ضرورت ہے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ ہمیں کبھی بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ سردانہ از میں کہہ کر آگے بڑھ گیا، جبکہ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچی۔ ”پلیز عرشان، میری بات تو سنیں، جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں، آپ کو شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے، جو کچھ ممانے آپ کے ساتھ کیا اس میں شامل ہونا تو دور کی بات مجھے تو علم ہی کچھ دن پہلے ہوا ہے، پلیز بلیو می۔“ اس کے چہرے پر نہ جانے ایسا کیا تھا کہ وہ رک گیا۔

”سامنے ہی کفے ٹیرا ہے، بس کچھ دیر بیٹھ کر میری بات سن لیں۔ پلیز۔“ اس کی پہنچی صورت دیکھتے وہ خاموشی سے اس کے تعاقب میں چل پڑا۔

”ممانے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ نہایت غلط تھا، مگر میرا یقین کریں عانیہ کی طرح میں بھی بالکل لاعلم تھی۔“

”کیا مطلب عانیہ۔“ وہ جو بے توجہی سے اس کی

بات سن رہا تھا عانیہ کے ذکر پر بے ساختہ ٹھٹکا۔

”عانیہ کے والدین کی فلتھ کے بعد ممانے عانیہ کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ میرے لیے یہ قابلِ تعجب بات نہ تھی، حیرت تو مجھے عانیہ کو اس قدر پروٹوکول دینے پر ہوئی تھی، مگر میں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا، مگر کچھ دن پہلے جب ممانے مجھے اپنے منہ سے بتایا کہ وہ سب ایک پلان تھا۔ ایسی چال جس میں تم سب کو ٹریپ کرنے کے لیے عانیہ سعید ان کا سب سے خاص مہو تھی۔“ اور پھر کس طرح انہوں نے اس معصوم مہرے کو اپنی انگلیوں پر نچاتے بادشاہ کو مات دی اور پھر وہ آہستہ آہستہ وہ سب کچھ گنتی گئی جو سارہ بیگم نے خود اپنے منہ سے اسے بتایا تھا۔ اس کی باتیں سننے عرشان داؤد کا چہرہ ایک ایک پل میں کئی کئی رنگ بدلتا رہا تھا۔

”میں مانتی ہوں عرشان کہ ممانے بہت غلط کیا ہے، مگر پلیز آپ اور عانیہ انہیں معاف کر دینا۔ یہ سب انہوں نے میری محبت میں کیا۔ مجھے بددعاؤں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ عانیہ سے کہنا کہ وہ ہمیں بددعائیں نہ دے۔ وہ بہت اچھی اور معصوم لڑکی ہے، وہ ہمیں ضرور معاف کر دے گی۔ تم۔ تم پلیز اسے بہت سی خوشیاں دینا، کیونکہ وہ ڈیزرڈ کرنی ہے۔“ لکھت ہی اس کی آواز بھینگ گئی، جبکہ عرشان داؤد تو اک شاکل کی کیفیت میں گم صم ساکت جاہد شدہ سا کسی بت کی مانند بیٹھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اشنا اور کیا کہہ رہی تھی وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ اس کی عانیہ بے قصور ہے۔ اس کی عانیہ دھوکے باز نہیں ہے۔ یہ احساس اتنا آسودہ تھا کہ ایک عرصے کے بعد جیسے اس نے کھل کر سانس لیا تھا، مگر دوسرے ہی لمحے جب اپنا سلوک، ظلم اور زیادتی یاد آئی تو اس کا سر جھٹکا چلا گیا۔

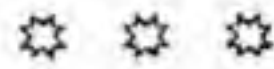
اشنا نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ ”آتم سوری عرشان۔“ عرشان نے سرخ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے بہت غلط کیا ہے، اشنا اس معصوم لڑکی کے ساتھ اس نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی اور میں



نے اسے اتنی ہی تکلیف دی۔

”مجھے اندازہ تھا عرشان تمہاری شدت پسند طبیعت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اسی لیے تو تمہیں سچائی سے آگاہ کیا ہے۔ میری محبت میں مجبور ہو کر انہیں ذرا احساس نہ ہوا کہ وہ ایک یتیم بے سہارا لڑکی کے ساتھ کتنا غلط کر رہی ہیں۔“ اور غلط تو عرشان داؤد نے بھی کچھ کم نہ کیا تھا اس کے ساتھ۔ اسے لگا جیسے وہ ساری زندگی اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکے گا۔ پچھتاوے ایسے تھے کہ کسی زہریلے ناگ کی طرح اسے ایک ایک پل میں ہزار ہزار بار ڈس رہے تھے۔



وہ پردے برابر کرنے کے ارادے سے ابھی کھڑکی کی طرف بڑھی ہی تھی جب اسے لان میں کوئی ہیولا سا نظر آیا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ ڈر سی گئی۔ رات کے اس پہر آخر وہاں کون ہو سکتا ہے۔ اس نے انٹرکام پر چوکیدار کو مطلع کرنا چاہا تھا، مگر پھر جو کچھ چوکیدار نے کہا وہ اسے حیران کر گیا۔ عرشان بے اس وقت یہ کب آئے۔ دل میں سوچتے اس کی نظر بڑی تیزی سے وال کلاک کی طرف اٹھی تھی جو رات کے گیارہ بج رہا تھا۔ وہ لان میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے ٹہل رہا تھا کہ پھر تھک کر وہاں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کتنی دیر تو شش و پنج میں مبتلا وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی، مگر جب دل کو کسی صورت سکون نہ ملا تو لان میں چلی آئی۔

”عرشان۔“ قریب پہنچ کر اس نے دھیرے سے پکارا تھا جب آنکھیں موندے کرسی کی بیک سے سر نکائے عرشان داؤد نے سرعت سے آنکھیں کھولیں اور پھر یک ٹک کتنی دیر اس کے معصوم صبح چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

”عرشان چلیں اندر۔“ اس کے گم صم بے اختیار انداز نے عانیہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”عانیہ۔“ اس نے زیر لب پکارا، مگر آواز اتنی آہستہ تھی کہ عانیہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کی آنکھوں

کے سرخ کوئے غیر محسوس سی نمی کی لپیٹ میں آنے لگے۔ اس نے گزرے چار مہینوں میں اتنی اس سے محبت نہ کی تھی جتنی ان تین مہینوں میں اس سے نفرت کی تھی جو صرف محبت کے قابل تھی۔ ملال، دکھ، تکلیف، بدمامت کا احساس تھا کہ برہستا ہی جا رہا تھا۔

”چلیں اندر چلتے ہیں۔“ اس کا ہاتھ پکڑے ہی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ عرشان داؤد نے اپنا ہاتھ کھینچنے کی ذرا کوشش نہ کی۔ کمرے میں آتے اس نے اسے بیڈ پر بٹھایا، مگر پھر جیسے ہی اس کے چہرے پر اس کی نظر پڑی تو وہ پریشان ہو گئی اور بولی۔

”اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دیں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں اگر ایک کپ کافی مل جائے تو۔“ عانیہ سعید حیران حیران سی کمرے سے باہر نکلی تھی اور پھر کافی بناتے ہوئے بھی اس کی حیرت کم نہ ہوئی تھی۔ وہ کافی بنا کر جیسے ہی کمرے میں آئی عرشان داؤد گہری نیند میں جا چکا تھا۔ اتنے کم وقت میں اتنی گہری نیند، وہ حیرت سے سوچ کر رہ گئی، پھر کافی کا ٹک سائیڈ ٹیبل پر رکھتے وہ ٹکیہ اٹھا کر صوفے پر آکر لیٹ گئی۔ عرشان داؤد کی کمرے میں موجودگی اسے عجیب سا سکون اور تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ وہ آج ہر طرح کے ڈر، خوف کو پس پشت ڈالتے بہت سکون کی نیند سوئی تھی۔

صبح حسب معمول فجر کی اذان کے وقت ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ ابھی اٹھ کر بیٹھی ہی تھی جب دائیں طرف عرشان کو جائے نماز پر بیٹھے اور ہاتھ دعا کی صورت اٹھائے دیکھ کر حیران ہوئی، مگر پھر اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر وہ بے ساختہ ٹھکی۔ وہ کیا مانگ رہا تھا، وہ نہیں جانتی تھی، مگر وہ جو بھی مانگ رہا تھا بڑی لگن اور شدت سے مانگ رہا تھا۔

”یا اللہ تیرا بندہ جو بھی مانگ رہا ہے اسے دے دے۔ میں اسے اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی اور پھر وہ پٹا لوڑھتی وضو کی نیت سے داش روم میں کھس گئی۔ وضو کر کے جب وہ باہر آئی تو عرشان داؤد اسے کہیں نظر نہ آیا، ہاں جاو



نماز کو یہ نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی وہ جانتا تھا کہ اس نے بھی نماز ادا کرنی ہے۔ وہ جاء نماز پر آکر کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد اس کی تمام تر دعاؤں کا دار و مدار عرشین داؤد کے ہی ارد گرد گھومتا رہا۔ دعا کے بعد اس نے قرآن پاک کی تلاوت کی۔ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی مگر پھر دھیان جیسے ہی عرشین داؤد کی طرف گیا تو وہ کچھ بے چین سی ہو گئی۔ باہر آگئی مگر پورے گھر میں اس کا کوئی پتا نہ تھا۔ انٹرکام پر جو کیدار سے پوچھنے رہی معلوم ہوا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ وہ افسردہ اور بو جھل سے دل کے ساتھ کمرے میں لوٹی نہ جانے اب وہ دوبارہ کب آئے۔ وہ بیڑ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب سائیڈ ٹیبل پر پڑے کانٹنر پر اس کی نظر پڑی۔ وہ ہینڈ رائٹنگ عرشین داؤد کی محسوس لوریہ ہی وجہ تھی کہ وہ اسے تھام گئی۔

اگر تم جان جاؤ تو

محبت تم ہی ہو میری

میرے دل پر

میرے دل میں

جو پہلا عکس ابھرا تھا

وہ تیرا چاند چہرہ تھا

محبت تم ہی ہو میری

کہ چاہت تم ہی ہو میری

اس کی آنکھیں تیزی سے بھیگی تھیں۔ بھیگی بھیگی پلکوں سے وہ کتنی دیر ان لفظوں کو دیکھتی رہی پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا سمانی کہ دراز سے قلم نکل کر لکھنے لگی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

بھکاری بن بھی جائے من

محبت پھر نہیں ملتی

اندھیری رات میں اکثر

جھپک کر بھیگی پلکوں کو

وہ پہروں چاند کو تکنا

وہ جامد چپ سے دائروں میں

تمہارا ذکر رکھ لیتا

تمہاری فکر رکھ لیتا  
تمہیں کیسے بتاؤں میں  
تمہارا نام ہونٹوں پر  
ہنسی بن کر مہکتا ہے  
تمہارا ذکر راتوں میں  
خوشی بن کر جھکتا ہے  
دھڑکتے دل کی

ہر دھڑکن

تمہارا نام لیتی ہے

تمہارا اور کرتی ہے

محبت روشنی بن کر

میری آنکھوں میں رہتی ہے

اس نے وہ صفحہ دوبارہ اسی ٹیبل پر رکھ دیا اور خود آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسے اپنے اعصاب کچھ کھکھکے سے لگے، آنکھیں موند کر اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی اور پھر کب اس کی آنکھ لگی اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ پھر تقریباً "نوبے کے قریب جا کر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اتنی بھر پور نیند نے اس کی طبیعت کو ایک دم ہشاش بشاش کر دیا۔ دوپٹا اوڑھتے وہ بیڈ سے نیچے اترنے لگی تھی جب اس کی نظر صوفے پر بیٹھے عرشین داؤد کے وجود سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ میں وہی صفحہ تھا وہ گھبرا سی گئی۔ ان بدلتے موسموں سے وہ ابھی تک اچھی طرح آگاہ نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کے رد عمل کے حوالے سے کسی بھی قسم کا اندازہ ٹھیک سے نہیں لگا سکتی تھی۔

وہ اٹھا۔ عانیہ کا دل بے ساختہ دھڑکا۔ نہ جانے

اب کیا کہہ دے۔ وہ بیڈ پر اس کے قریب ہی آ بیٹھا۔

"تھینکس۔" عانیہ نے نظریں اٹھائیں۔ وہ

تھینکس کی وجہ نہ سمجھ پائی تھی۔ "میری فیلنگز کو

کمپلٹ کرنے کے لیے۔" وہ مسکرایا، آج کتنے

عرصے کے بعد اس نے ان ہونٹوں کو مسکراتے ہوئے

دیکھا تھا، نظر جیسے نکھری گئی۔ "یہ لکھ نہیں یہ ہماری

فیلنگز ہیں۔ اس میں ہم دونوں کے احساسات و

جذبات چھپے ہیں۔ یہ میرے لیے بہت انمول ہے۔



کسی قیمتی خزانے کی طرح سنبھال کر رکھوں گا میں اسے۔ نہیں، بلکہ ایسا کروں گا اس کا بہت خوب صورت فریم بنا کر اپنے بیڈ روم میں لگا دوں گا، تاکہ یہ ہر پل ہم دونوں کی نظموں کی گرفت کے سامنے رہے۔“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے کہہ رہا تھا اور عانیہ کی سماعتوں پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ یہ انداز، یہ لب و لہجہ عرصہ گزرا جیسے اس کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔

”عانیہ۔“ اس نے دھیرے سے پکارا تھا۔

”مگر صبح کا بھولا لوٹ آئے تو۔ کیا تم اسے معاف کر دو گی۔“ اس نے عانیہ کا کپکپاتا ہاتھ تھاما جو ابھی تک بے یقین نظموں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”انسان تو خطا کا پتلا ہے نا غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور غلط فہمیاں بھی۔“ عانیہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ چہرہ جھکا گئی۔

”آئی آم سوری عانیہ! رینڈا ویری سوری۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا ہے، مگر میرا یقین کرو ان دنوں میں ایسی کیفیت کے زیر اثر تھا کہ پوری دنیا کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔“

اس کی حالت دیکھتے عانیہ کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ آنکھوں کے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ہونٹوں سے ہلکا سا شکوہ بھی پھسل آیا۔ ”اتنی سنگ دلی عریشان“

”جانتا ہوں میں نے بہت ظلم کئے ہیں تم پر۔ میں معافی کے قابل تو نہیں ہوں، لیکن اگر تم معاف کر دو تو۔ میں دنیا بھر کی خوشیاں لا کر تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا، تمہیں اپنے پیار، اپنی محبت کی بارش میں اس طرح سے بھگو دوں گا کہ تمہارے تمام دکھوں کا مداوا ہو جائے۔ جانتی ہو اگر ابھی مجھے سچائی کا پتا نہ چلتا تو یہ جنون، یہ وحشت مجھے نہ جانے اور کہاں تک لے جاتی۔“

”سچائی۔ کیسی سچائی۔“ عانیہ نے کم فہمی سے اس کی طرف دیکھا۔ جب وہ اشنا سے ملاقات کی ساری باتیں آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ عانیہ کے

چہرے نے ایک ایک پل میں کئی کئی رنگ بدلے تھے۔ اسے جیسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ حیران پریشان چہرے اور بے یقینی کے احساس سے پھیلی آنکھوں سے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

آئی ساہ جسے اس نے اپنی ماں کا درجہ دیا تھا، ان کا اتنا بھیاں تک روپ وہ کسی صورت برداشت نہ کر پائی تھی۔ عریشان داؤد نے اس کے ہچکولے کھاتے وجود کو بہت نرمی سے اپنے ساتھ لگالیا۔ اس کی اندرونی کیفیت کو وہ بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

”میں اشنا کی اس اتنی بڑی نیکی کی خاطر ہی اس کی ماں کو معاف کرتی ہوں، میرا اللہ بھی انہیں معاف کرے۔“ اور عریشان داؤد تو جیسے متحیر سا رہ گیا۔ آخر کیا تھی وہ جس کی وجہ سے اسے اتنی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اسے اس نے پل میں معاف کر دیا تھا۔ اس کے دل میں اس کے لیے محبت کے ساتھ ساتھ قنفذ بھی بلند ہوا۔ ایک دم کچھ یاد آنے پر وہ بولی۔ ”آپ اتنی صبح کماں گئے تھے اور وہ بھی بارش میں؟“ وہ کچھ بھی کہے بغیر اٹھا اور پھر الماری کے نیچے جانے والے خالے سے بڑا سا پیکٹ نکالتے دوبارہ اس کے قریب چلا آیا۔ ”یہ لینے۔“

”یہ کیا ہے؟“ اتنے بڑے بوری نما پیکٹ کو دیکھتے وہ حیرانی سے بولی۔

”خود ہی دیکھ لو۔“ اس نے سارا پیکٹ بیڈ پر الٹ دیا۔ عانیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بہت خوب صورت ڈریس، جوٹا، جیولری، چوڑیاں، پرفیوم، میک اپ اور بھی نہ جانے کیا کچھ نکلا تھا اس پیکٹ سے۔

”یہ ساری شاپنگ میں نے کل کی تھی تمہارے لیے، یہ سب ادھر والے گھر میں تھا، آج صبح یہ ہی لینے گیا تھا۔“

”عریشان۔“ عانیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”ہو ہو گیا اسے ایک بھیاں تک خواب سمجھ کر بھول جاؤ عانیہ، آگے تمہاری راہوں میں پھول ہی پھول ہوں گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ کبھی بھول سے بھی



بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیراٹل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- بے ہال آگاتا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 120/- روپے

سوہنی ہیراٹل 12 جلی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری

کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ قہوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں

یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک

بوتل کی قیمت صرف - 120/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے مٹی آڈر بھیج

کردہ جسر پارسل سے منگوالیں، رجسٹری سے منگوانے والے مٹی آڈر اس

حساب سے بھجائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 400/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔

منی آڈر بھجئے گئے لئے ہمارا ہند:

بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر 4، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیراٹل ان جگہوں

سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53۔ اورنگزیب مارکیٹ، سیکٹر 4، ایم اے جناح روڈ، کراچی

مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

کسی دکھ کو تمہارے قریب نہیں آنے دوں گا اور اب پلیر جلدی سے تیار ہو جاؤ، کیونکہ تمہارے اصل گھر میں تمہارے اپنے تمہارا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔

”بی جی اور انکل کیا وہ سب جانتے ہیں، کیا وہ مجھے ایکسیپٹ کر لیں گے؟“ اس نے نامعلوم سے کسی ڈر کے زیر اثر پوچھا۔

”بی جی سے تو آج صبح ہی خاصی ڈانٹ کھا کر آیا ہوں، بہت مشکلوں سے منایا ہے انہیں، اس وعدے کے ساتھ کہ آج تم ان کے روبرو ہوگی۔ خاصی بے چینی سے ویٹ کر رہی ہوں گی تمہارا اور پیپا کے ساتھ تو نکاح سے اگلی صبح ہی کافی جھڑپ ہوئی تھی میری۔ آئی نے کافی نمک مرچ لگا کر پیپا کے میرے خلاف کلن بھرے تھے۔“

”اور اب کیا وہ مجھے قبول کر لیں گے؟“ وہی خدشہ۔

”پاگل۔ ایک ہفتے بعد ہی انہوں نے مجھے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں گھر لے آؤں، کیونکہ وہ ولیمہ کی دعوت کرنا چاہتے تھے، مگر پھر میری خود سری اور ضد کے آگے وہ کافی مایوس اور ناراض ہوئے تھے۔ میں تو انتقام کی آگ میں ایسا اندھا ہو چکا تھا کہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ پیپا نے مجھے کافی سمجھایا تھا، مگر پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور اس وقت بی جی اور پیپا دونوں ہی بڑے بے چینی سے تمہارا ویٹ کر رہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تم انہیں ان کا ولی عہد دینے والی ہو۔“

”کیا۔ آپ نے انہیں یہ بھی بتا دیا۔“ اس کا چہرہ شرم سے ایک دم سرخ پڑ گیا۔

”اور اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ وہ اس کی منہمی سی ناک دباتے مسکراتے ہوئے بولا۔ جھینپتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ وہ آہستہ سے سرانبات میں ہلا گئی۔

ریڈ کلر کی میٹ کی فراک پہنے ساتھ میچنگ جیولری، جوتی پہنے اور ہلکا ہلکا میک اپ کیسہ اس وقت

ماہنامہ کرن 145 اکتوبر 2015



انتہائی خوب صورت لگ رہی تھی۔ ڈورنگ روم سے وہ جیسے ہی باہر آئی عرشمان داؤد کی نظر واپس پلٹتا بھول گئی۔

”ایسے لگتا ہے جیسے آج چاند زمین پر اتر آیا ہو۔“ اس کی طرف بڑھتے ہوئے خود سا بڑھاپا تھا۔ عانیہ سعید کی دھڑکنیں اٹھل پھل ہونے لگیں۔ رخساروں پر لالی چھانے لگی۔ عرشمان داؤد کے دیکھنے کا انداز آنکھوں سے پھوٹی روٹیاں ہاتھوں سے لپکتے استحقاق کے جگنو ہونٹوں پر مچلتی بے تاب حسرتیں عانیہ سعید کو سر سے لے کر پاؤں تک محبت کی بارش میں بھگوئی چلی گئیں۔ لالچ کے مارے اس کی آنکھیں بند ہونے کے قریب تر ہو گئیں۔ اس نے بھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ عرشمان داؤد زندگی کے کسی موڑ پر اس پر اس طرح بن بادل برسات کی طرح برس کر اسے اندر تک معتبر کر دے گا۔ وہ معصوم سی لڑکی اپنی بے ربط دھڑکنوں کو سنبھالتے خود پر جھکے اپنے سائبین تلے جیسے مکمل طور پر چھپی جا رہی تھی۔ فقط کچھ ہی لمحے سر کے تھے مگر ان لمحوں نے عانیہ سعید کو انمول کر دیا تھا۔

”چلیں۔ اس حسن و رعنائی کے پیکر کو دیکھتے عرشمان داؤد نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ آنکھیں تھیں کہ سیر ہی نہ ہو رہی تھیں۔ عانیہ سعید نے جھکی جھکی پلکوں سے اپنا ٹھنڈا کپکپاتا ہاتھ اس کی مضبوط مردانہ ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی کمرے سے نکلے تھے۔ سامنے ہی زینی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی۔ عرشمان داؤد کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالتے وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے قریب گئی اور پھر بڑی شدت سے اس کے گلے لگی تھی۔

”تم مجھے بہت عزیز ہو زینی، کیونکہ تم میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہو، میری سکھی ہو۔“

”میں جانتی ہوں، مگر کیا آپ یہ جانتی ہیں کہ یہ عرشمان صاحب بھی جانتے ہیں، اسی لیے تو وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں، صرف اور صرف آپ کے لیے، آپ کی خوشی کی خاطر۔“

”کیا۔ واقعی۔“ عانیہ کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی، اسی لیے تیزی سے پلٹ کر اس نے عرشمان داؤد سے پوچھا جس نے مسکراتے ہوئے تائیدی انداز میں سر اثبات میں ہلا دیا اور عانیہ سعید کے اندر تک اطمینان پھیلنا چلا گیا۔

”تھینک یو عرشمان! تھینک یو سوچو۔ یہ بہت اچھا تحفہ ہے میرے لیے۔“ اس کے قریب آتے عانیہ نے سرشاری سے مسکراتے ہوئے کہا، عرشمان داؤد کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

عانیہ سعید کا استقبال اس انداز میں ہوا کہ کیا ہی کبھی کسی نے کسی کا کیا ہو۔ ان کی گاڑی کو گیٹ سے باہر ہی روک دیا گیا تھا۔ پورا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر کا سارا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ عانیہ تو گاڑی سے نکلتے جیسے دم بخود سی رہ گئی۔ گھر تو بہت خوب صورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ پوری روش سرخ گلابوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دائیں طرف بہت سے لوگ ہاتھوں میں مختلف قسم کے قیمتی کپڑے اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے، جبکہ بائیں جانب ایک میوزیکل گروپ اپنی دلکش آواز کے جاو جگاتا اسے دل کم کہہ رہا تھا۔ گھیردار سرخ نیٹ کی بے تحاشا قیمتی فراک دونوں ہاتھوں سے تھامے عرشمان داؤد کے قدموں سے قدیم ملا کر چلتی وہ کسی ریاست کی شہزادی ہی لگ رہی تھی۔ اس کے ایک قدم پیچھے چلتی زینی تمام بکے تمام کر ساتھ چلتے ملازموں کو پکڑاتے جا رہی تھی۔ روش کے سرے پر ہی بی بی جی اپنی یا نہیں کھولے بھٹی پلکوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ بھاگی اور پھر ان کی کھلی بانہوں میں آسپائی۔ وہ جیسے ہی بی بی جی کے گلے لگی بہت تالیوں کی گونج میں بہت سے پھولوں کی برسات ان پر ہوئی تھی۔

”میری دھی۔“ انہوں نے فرط مسرت سے اس کی مسکتی پیشانی چوم لی۔ عانیہ سعید کے اندر تک ٹھنڈک اترنے لگی۔ آنکھوں کے گوشے بھگنے لگے۔ ان سے مل کر وہ آہستہ سے چلتے داؤد انکل کی طرف بڑھی۔ جنہوں نے اک خوب صورت سی مسکراہٹ



میری محبت

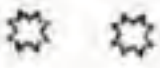
میری وفا

میرا یقین

میرا جنون

میری دیوانگی ہو

تمہارے لیے تو میں جتنا بھی کروں کم ہے۔ میں  
تمہارا اسیر ہوں اور اس اسیری میں تمام عمر قید رہنا  
چاہوں۔ اسی میں میری اور میرے دل کی خوشی ہے۔  
دونوں کی آنکھیں محبت کے معتبر احساس سے  
چمک رہی تھیں اور محبت بہت شاداں و فرحاں ان کے  
درمیان موجود دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھی، محبت نے  
ہارٹا کیپ سیکھا ہے اور یہاں بھی جیت آخر محبت کی ہی  
ہوئی تھی۔



خواتین ڈائجسٹ

پاکستان کے لیے ایک نیا دور

دستِ کوثر

فوزیہ یاسمین



قیمت: 750 روپے

32735021

کتبہ و فن ڈائجسٹ 37 - لاہور، پاکستان - فون: 32735021

کے ساتھ دستِ شفقت اس کے سر پر رکھ۔

”ویل کم ٹومائے پیلے مائے سوٹ ڈائر۔ آپ ہم  
سب کے لیے بہت اہم ہو عانیہ، جو ہو گیا اسے بھول کر  
اب اس حقیقت کو اہک سیٹ کر لیں کہ آپ اسی گھر کا  
ایک حصہ ہیں۔ میں اکثر بیٹی کی بہت کمی محسوس کرتا  
تھا، مگر اب آپ کے آنے سے وہ کمی دور ہو گئی ہے۔“  
داؤد صاحب کے کہنے پر بڑی تیزی سے اس کے آنسو  
چمکے تھے۔

”نہ نہ۔ رونا نہیں بچے۔ اب آپ کے خوشی  
کے دن شروع ہو چکے ہیں اور زندگی کی آخری سانس  
تک ہم سب آپ کو خوش ہی دیکھنا چاہیں گے۔“ داؤد  
صاحب نے اس کے سر کو سہلایا۔

اتنی محبت، اتنی چاہت۔ اس کی نظر بے اختیار  
دائیں طرف کھڑے عرشان داؤد کے چمکتے چہرے پر ٹھہر  
سی گئیں۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ اے میرے دل  
کے میچا۔ واقعی تم نے اپنا کھانچ ثابت کر دیا ہے۔  
میرے تمام دکھوں کا مداوا ہو گیا ہے۔ میرا دل اندر تک  
پر سکون ہو گیا ہے۔ ان خوب صورت لمحوں کے عوض  
تو میں اپنے تمام دکھ بھول چکی ہوں۔ تم نے میری  
زندگی کو مسرتوں سے بھر دیا ہے۔“ دھیمی مسکراہٹ  
سجائے ہوئیوں اور نمکین ہیلی پلوں سے اس کی طرف  
دیکھتے عانیہ سید نے آنکھوں کے رستے اسے پیغام  
پہنچایا تھا۔ اس خاموش پیغام کو عرشان داؤد نے بڑی  
تفصیل سے بڑھتے اسی تفصیل سے جواب دیا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے اے میری زندگی میں جب  
تک جیوں گا میری سوچوں کے دائرے میں تمہاری فکر،  
تمہارا ذکر اور تم سے وابستہ ہر خوشی کا خیال ہو گا۔ تم  
نے مجھے معاف کر کے میری زندگی میں لوٹ کر جو مجھ پر  
احسان کیا ہے میں زندگی کی آخری سانس تک اس کا  
قرض ہی اتارتا رہوں گا۔ تمہارے دامن میں اتنی  
خوشیاں ڈالوں گا کہ وہ کم پڑ جائیں گی، مگر خوشیاں کم نہ  
ہوں گی۔ تم میری زندگی ہو، میرا دل ہو، میرے سب  
سے خوب صورت اور قیمتی خواب کی تعبیر ہو۔

میری چاہت

جہانم کرن 147 اکتوبر 2015





”لے لیا تو ہی دس بھلا ملک ہو راں کے جانور ہوئے تے سمجھو ہمارے ہی ہوئے نا۔ ان کا چار اپانی اور مثل سیوہ تے سب میں نے ہی کرنی ہے نا۔“

طفیفے نے ابے کو مخاطب کر کے گویا اماں کی شکایت لگائی۔

”ہاں مفت کانو کر جو ہتھ آجاتا ہے اونہاں دے۔“

اماں نے سر جھٹکا۔

”اماں! ایسی باتیں نہ کریا کر۔ کیا ہوا جو اللہ نے ہمیں قربانی کی توفیق نہیں دی تو وہ ہر سال ہمیں قربانی کے جانوروں کی خدمت کرن کا موقع تو دیتا ہے نا اور تجھے پتا ہے جو قربانی کے جانوروں کی خدمت کرتا ہے نا اللہ اوس سے بھی خوش ہوتا ہے۔ چلو اتنا خوش نہیں ہوتا ہو گا جنہاں قربانی کرنے والوں سے ہوتا ہے پر خوش ہوتا ضرور ہے۔“ طفیفے نے اماں کا گھٹنا دیا۔

”چل ہٹ دے پاگلاں تیریاں گلاں دی دکھریاں ای ہونعیاں نے۔ نا مجھے بتا تجھے ملک صاحب ہو راں کے جانوروں کے پیچھے اپنی جان مارنے کا کیا فیدہ ہوتا ہے۔ ڈھنگ کی دو بوٹیاں تک تو تجھے دیتے نہیں وہ لوگ۔“ اماں نے اس کا ہاتھ اپنے گھٹنے سے ہٹایا۔

”ابا دیکھ یہ اماں دی نہ ایویں بولتی رہتی ہے۔ ہر سال دو بکروں کے کھڑوڑے اور سریاں ملک ہو راں مینوں ہی دپتے ہیں۔ ساتھ میں گوشت الگ اور پنج سو روپے وی۔ فیروی اماں کہہ رہی ہے کہ مجھے دیتے ہی کیا ہیں؟“ طفیفہ برا مان گیا۔

”ہاں یہ دونوں چیزیں ان کے گھروچ کوئی کھاتا

”اماں! اماں! وڈے ملک صاحب قربانی لنی دو گاواں تے پانچ تین بکرے لے آئے ہیں۔“ طفیفے نے سائیکل چھوٹے سے صحن کی مغربی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور سبزی بناتی اماں کے پاس بیٹھ گیا۔

طفیفے کا ابا بھی آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دونوں باپ بیٹا قصبے کے قریب ٹیکسٹائل مل میں دھاڑی وار ملازم تھے۔ دونوں صبح اکٹھے جاتے اور شام کو اکٹھے واپس آجاتے۔

طفیفے کے فیکٹری جانے سے ابے کو ایک فائدہ ہو گیا تھا کہ صبح شام سائیکل چلانے کی مشقت سے جان چھوٹ گئی تھی۔ طفیفہ انہیں پیچھے بٹھا کر لاتا لے جاتا تھا۔

دونوں باپ بیٹا ابھی ابھی فیکٹری سے واپس آئے تھے اور آتے ہوئے گلی میں ملک صاحب کے گھر کے سامنے لگے شامیانے میں بندھے جانور دیکھ آئے تھے۔ ہر سال قصبے میں سب سے پہلے قربانی کے جانور ملک صاحب کے ہاں ہی آتے تھے اور بقول طفیفے کے ”رج کے سوہنے اور ستھرے جانور“ تو ملک صاحب ہی خریدتے تھے۔

”اماں تجھے بتا رہا ہوں۔ پر تو میری بات کا کوئی نوٹس ہی نہیں لے رہی۔“ طفیفے کی بات سن کر اماں بغیر کوئی جواب دیے سبزی بنانے میں مصروف رہی تو طفیفہ برا مان گیا۔

”ہاں تو تو کیوں باولا ہو رہا ہے۔ قربانی کے جانور ملک ہو راں نے خریدے ہیں تیرے ابے نے نہیں۔“ اماں نے جل کر جواب دیا۔



”چل پتر! جا کے ٹھنڈا پانی لے آگیاں فیر کر لیتا۔“  
 ایسے نے دونوں کی بحث ختم کی۔  
 ”اچھا ابّا“ طلیفّا ٹھنڈے پانی کے کولر کی طرف گیا،  
 جس میں محلے کے فریج والے گھروں سے برف مانگ  
 کر ڈالی جاتی تھی۔ ابھی یہ بھی شکر تھا کہ اس محلے کے

جو ننیں، تو وہ تمہیں چکا دیتے ہیں اور وہ آدھا کلو  
 گوشت جس میں ڈیرھ پاؤ تو چربی ہی ہوتی ہے۔ اور بیچ  
 سو روپے دس دنوں کی محنت کے حساب سے کچھ وی  
 ننیں۔“ اماں نے منٹوں میں حساب کر دیا۔ ابّا دونوں  
 ماں بیٹے کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔





لوگ اس حوالے سے ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے، ورنہ اس منگائی کے دور میں جو برف خرید کر پانی ٹھنڈا کرنا پڑتا تو طیفی کے خاندان جیسے لوگ اس سے بھی محروم ہوتے۔

طیفی اور اس کے اے کی گوڈ شیڈنگ کی وجہ سے کبھی دھاڑی لگ جاتی اور کبھی نہیں۔ گھر کا وال دلیا مشکل سے ہی سہی پر چل رہا تھا۔ اس کی وجہ طیفی کی محنتی فطرت تھی۔ جن دنوں فیکٹری میں دھاڑی نہ لگتی طیفی کو جو کام مل جاتا کر لیتا۔ کبھی ٹھیکیدار کے ساتھ مزدور کی حیثیت سے کام کر لیتا، کبھی فرنیچر بنانے والوں کے ساتھ فرنیچر کی پالش وغیرہ کروا دیتا اس طرح اسے اتنے پیسے مل جاتے تھے کہ دو وقت کی روٹی پوری ہو جاتی تھی۔ طیفی کی ایک ہی بہن تھی جو کسی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ اس دو کمروں کے کچے گھر میں تینوں ماں بیٹا رہتے تھے۔ اماں نے دو تین بکریاں پال رکھی تھیں جن کے دودھ سے چائے وغیرہ بن جاتی تھی۔ طیفی اور اس کا باپ درویش منس لوگ تھے جو ہر حال میں خوش رہتے تھے۔ اماں بھی کوئی لالچی عورت نہیں تھی، بربک کئی روز مل میں دھاڑی نہ لگتی اور خرچے منہ کھولے کھڑے ہوتے تو وہ جز جزئی ہو جاتی تھی۔



ملک صاحب کے گھر جانور آتے تو سمجھو طیفی کی عید ہو جاتی۔ وہ دن رات کی تمیز بھلائے ان کی دیکھ رکھ میں مصروف رہتا۔ ملک صاحب بھی طیفی کی وجہ سے جانوروں کی طرف سے بے فکر رہتے تھے۔

”او طیفی پتر! جانوروں کی دیکھ بھال وچ کوئی کمی نہیں رہنی چاہی دی۔“ شام کو ملک صاحب شامیائے میں کرسی ڈالے بیٹھے تھے اور طیفی جانوروں کو چار اڈال رہا تھا۔

”اور ملک صاحب تسی بے فکر رہو۔ میں سب کچھ صحیح سے کر لوں گا۔“ طیفی نے اپنا پنکا جھاڑ کر ملک صاحب کی تسلی کروائی۔

”ہاں شاواں بھی شاواں۔“ ملک صاحب نے اس کو شاباش دی۔

طیفی صبح فجر کی اذان کے بعد سے فیکٹری جانے تک اور فیکٹری سے آنے کے بعد رات گئے تک کا سارا وقت ملک صاحب کے گزار رہا تھا۔ وہ جانوروں کی حفاظت اس کے مالکوں سے بھی برہ کر کرتا۔ محلے کے لوگ اکثر اس کا مذاق اڑاتے۔

”او طیفی صاحب کے جانور دیکھو، کتنے ٹکڑے ہیں۔“ طیفی مسکرا کر یوں جانوروں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتا جیسے واقعی ان کا مالک ہو۔



عید کے روز نماز کے بعد طیفی کپڑے بدل کر ملک صاحب کے گھر چلا گیا۔ اب اسے قربانی کی تیاری سے لے کر آخر میں ساری صاف صفائی کرنے تک وہیں رہنا تھا۔

ملک صاحب کی قربانی بھی زیادہ تر لوگوں کی طرح معاشرتی تعلقات بنانے کا ذریعہ تھی۔ ان کے قربانی کے جانوروں کا اچھا اچھا گوشت یا تو ان کے ہم پلہ دوستوں اور رشتہ داروں کو جاتا تھا یا ان کے گھر کے دو ٹیپ فریزرز میں۔ غریبوں کے حصے میں تین حصے چربی اور ایک حصہ گوشت ملا جلا کر محلے کے چند غریب گھروں کو دے کر ہاتھ جھاڑ لیے جاتے۔ باقی شام تک آنے والے فقیروں کو جھاڑ پلا کر رخصت کر دیا جاتا۔ جس سے اصل ضرورت مند محروم رہ جاتے اور سارا سال پیٹ بھر کر گوشت کھانے والوں کے ہاں ڈھیر لگ جاتے۔

آج بھی اس ساری کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد طیفی کی محنت کے صلے میں اس کو دو بکروں کے پائے، سریاں اور ایک کلو کے قریب چربی ملا گوشت دیا گیا۔ ساتھ میں پانچ سو روپے الگ کہ جتنا کام طیفی اکیلا کرتا تھا اس کے لیے دو مزدور بھی کم ہی تھے۔

طیفی اپنی محنت کا صلہ لے کر خوشی خوشی گھر جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی گلی کی ٹکڑ مڑا۔ وہاں پر ایک ہتھسار



بیچنے والا کمزور سا بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ وہ آواز لگاتے لگانے طیفی کے ہاتھ میں پکڑے شاپروں کو دیکھنے لگا۔ طیفی اپنی دھن میں آگے بڑھ گیا۔ پھر کچھ قدم چل کر رکا اور واپس مڑا۔ وہ آدمی اپنے میلے سے پٹکے سے اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا۔

”چاچا! کیا بات ہے آج عید کا دن ہمارا ہے اور تو رو رہا ہے۔“ طیفی نے سارے کھیلے نیچے زمین پر رکھ دیے۔

”پتر! عید بھی پیسے والوں کی ہوتی ہے۔ ہم غریبوں کی بھلا کیا عید ہونی ہے۔“ بوڑھے کے لہجے میں اداسی تھی۔

”نا چاچا! ایسے نہیں کہی دا۔“ طیفی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”فیر کی کراں پتر۔ آج کا دن جب اللہ سوہنے کی راہ میں لکھاں جانور قربان ہوتے ہیں ہم غریبوں کے لیے دو بوٹیاں دی نہیں ہوتیں۔ صبح سے ہر اس گلی میں ہتھسایہ بیچنے کے لیے آواز لگا رہا ہوں جہاں قربانی ہوئی ہے مگر کسی نے ایک بوٹی دی مجھے دینا گوارا نہیں کیا۔ پتر کیا میری شکل سے پتا نہیں چل رہا کہ میں وی ضرورت مند ہوں۔ قربانی کے گوشت وچ ضرورت مندوں کا حصہ وی ہوتا ہے پر مجھے ابھی تک یہ حصہ نہیں ملیا پتر۔ ہتھ میں پھیلا نہیں سکدا۔ اے سوچ کے رونا آگیا سی کہ شام کو خالی ہاتھ گھر جاواں گاتے میرے یتیم پوتے پوتیاں جو آج بوٹی کھانے کی آس لگا کر بیٹھے ہیں ان کی آس ٹٹ جائے گی۔“ بوڑھے کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

”او چاچا! لے پھریا رے چار کھڑوڑے تے اے گوشت تو لے جا۔ چار کھڑوڑے تے اے سریاں میں لے جاتا ہوں۔ چل لے یہ سب اور گھر جا کے پکا کر سب مل کر کھاؤ۔“ طیفی نے دو شاپر اس کی طرف بڑھا دیے۔ بوڑھا دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔



”لے اماں! پکڑ سب کچھ۔“ اماں خوشی خوشی آگے

بڑھی مگر شاپر کھولتے ہی طیفی کے پاس واپس آئی جو اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر پانی پی رہا تھا۔

”وے طیفی! یہ کیا صرف چار کھڑوڑے تے دو سریاں“ اماں نے غصے سے پوچھا۔ وہ تو گوشت کے لیے مسالا بھی چڑھا چکی تھی اور یہاں گوشت سرے سے تھا ہی نہیں سو اس کا غصہ بجاتا تھا۔

”اماں! وہ نہ راستے میں ایک غریب آدمی ملا تو چار کھڑوڑے اور گوشت اس کو دے دیا۔“ اس نے مسکرا کر اماں کو جواب دیا۔

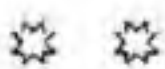
”ہاں وہ غریب تھا اور تو کسے نواب دی اولاد ہے جو سخاوت کر دی۔“ اماں کو پٹنگے لگ گئے۔

”اماں! کوئی گل نہیں ہم تو ہر سال ہی بڑی عید پر گوشت کھاتے ہیں اس دفعہ نہیں کھائیں گے تو کیا ہوا۔ کسی اور کا بھلا ہو جائے گا۔“ طیفی نے ابا کی طرف مدد کے لیے دیکھا۔

”چل بھلے لو کے جا جو کچھ ہے وہی پکا لے۔ اللہ مالک ہے۔“ ابا کی بات سن کر اماں بڑبڑاتے ہوئے چلی گئی۔

”ابا! میں ٹھیک کہتا ہے نا۔“ طیفی نے ابا کو دیکھا۔

”بالکل پتر آج اللہ نے تجھے وی قربانی کرنے کی توفیق دی ہے۔ بس فرق صرف ایسا ہے کہ لوگ آج اللہ کی راہ میں جانوروں کی قربانی کر رہے ہیں اور تو نے آج اپنی ضرورت کی قربانی کر کے اللہ کو خوش کر دیتا ہے۔ تجھے پتا ہے اپنی ضرورت چھڑ کے کسی دوسرے کی ضرورت پوری کرنا وہی قربانی ہوندی ہے اور آج تو نے وہ وہی قربانی دی ہے۔ شاباش میرا پتر! جا جا کے نماز دھو کے کپڑے بدل فیروٹی کھانے آں۔“ ابا نے اس کے کندھے پر کھچی دی تو طیفی مطمئن دل سے اٹھ کھڑا ہوا۔







آسمان پر چھائے بادلوں کی اوٹ سے سورج سرخی  
مائل گو لے کی مانند دھک رہا تھا۔ اس نے نشو سے ماتھے  
پر آنے والا پسینہ پونچھا۔ گاڑی ذرا آہستہ ہوئی، وہ کلج  
کی بڑی سی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گیا، بے  
چینی سے کئی بار بڑے سے سیاہ گیٹ کی جانب دیکھا،  
دوسری لڑکیاں ہنستی مسکراتی باتیں کرتی ٹولیوں کی شکل  
میں باہر آ رہی تھیں، مگر شہوار کا کوئی اتارنا نہیں تھا۔  
گاڑی کا اے سی کل ہی خراب ہوا تھا، آج ٹھیک  
کروانے کا ارادہ تھا، جس اور گرمی سے اس کا برا حال  
ہونے لگا۔

”اب تو بس گھر جا کر لمبی تن کر سوتا ہے۔ آفس  
سے چھٹی کا کچھ تو فائدہ ہونا چاہیے۔“ عکرمہ منظور  
نے سوچا اور طویل انگڑائی لیتا چاہی، مگر ہاتھ چھت سے  
جا ٹکرائے وہ ہنس دیا۔ ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد  
ایک بار پھر نگاہ اٹھا کر کلج کے گیٹ کی طرف دیکھا تو  
ایسا لگا جیسے زمین و آسمان کی گردش تھم سی گئی ہو، سہل  
بدل گیا۔ وہ سحرزہ سا ہونے لگا، شہوار کے ساتھ باہر  
آنے والی وہ لڑکی تھی یا حسن و نزاکت کا مجسمہ۔ نکھری  
نکھری موی رنگت، چہرے سے چھلکتی شادابی، بڑی  
بڑی بھوری آنکھیں، جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبی  
ہوئی ہوں، وہ ایک ٹکدو بھٹا رہ گیا۔

”بھائی۔ کیا ہوا چلیں۔؟“ شہوار نے کب گاڑی  
کا دروازہ کھولا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر زور سے  
چٹکی بجائی، اسے پتا ہی نہیں چلا۔

”وہ۔ لڑکی۔ جو ابھی تم سے باتیں کر رہی تھی۔  
کون ہے؟“ عکرمہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سوال  
کیا اور گلاسز آنکھوں پر چڑھائے۔

”وہ۔ میری بیسٹ فرینڈ ہے، مگر آپ۔ کیوں  
پوچھ رہے ہیں؟“ شہوار نے ابھی نگاہوں سے بڑے  
بھائی کی جانب دیکھا۔

”واقف۔ تھی۔ ان۔ امیزنگ۔“ عکرمہ نے مسکرا  
کر تعریف کی، وہ ابھی تک سحرزہ سا تھا، اس کا حسن اتنا  
مکمل اور معصوم تھا کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی نقص  
نہیں مل پایا۔

”اے بھائی۔ پلیز۔ اس معاملے میں کوئی مذاق  
نہیں۔ چلے گا۔ ویسے بھی ہشتم۔ آپ کے مزاج کی لڑکی  
نہیں۔ بہت معصوم ہے۔ لڑکوں سے سو فٹ دور بھاگتی  
ہے۔“ شہوار نے زور زور سے انکار میں سر ہلاتے  
ہوئے اس پر بڑی صفائی سے چوٹ کی۔

”مذاق۔ کیا مطلب ہے؟ میں۔ مذاق۔ نہیں  
اس کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں۔“ وہ چکا۔ تو  
شہوار بے ہوش ہوتے ہوتے پچی۔

”اور۔ سنو۔ یہ۔ میرے مزاج کو کیا ہوا؟“  
عکرمہ نے مصنوعی غصے سے کہا اور بہن کا حیرت سے  
کھلا ہوا منہ بند کر دیا۔

”بھائی۔ پلیز۔“ شہوار اس کی ضد سے واقف  
تھی، دو سرے لمحے ہی سر تھام کر بیٹھ گئی۔

”پہاری بہنا پریشان نہ ہو۔ میں اس معاملے میں  
واقعی سنجیدہ ہوں۔ تم یقین کرو، مجھے ہشتم کی شکل  
میں۔ آج وہ گوبرنایاب مل گیا، جس کی مجھے کب سے  
تلاش تھی۔ اب تو بس وادی جان کو جا کر خوش خبری  
سنائی ہے۔“ عکرمہ کی تیز رفتاری سے چلتی زبان پر  
شہوار ہول اٹھی۔

”بھائی۔ پہلے ماما سے تو بات کر لیں۔ ایسی جلدی



جاسکیں۔ محبت کی گاڑی کو بعد میں دھکا لکوا دیجیے گا۔“  
شہوار نے جل کر دانت پیسے اور اسٹیمرنگ پر ہاتھ رکھا۔  
”ہونہ۔“ مگر وہ نے گاڑی اشارت کرنے کی  
کوشش کی، مگر وہ گھبر۔ گھر کی آواز نکل کر بند  
ہو گئی۔

”کیا ہوا۔؟“ شہوار نے گرمی سے پریشان ہو کر  
ہاتھ سے خود کو پنکھا جھلتے ہوئے پوچھا۔

نہ چائیں۔ پتا ہے نہ دادی نے گھر میں آپ کی شادی  
کے لیے بقرعید تنک کا الٹی میٹم دیا ہوا ہے۔ وہ توڑ  
جائیں گی۔“ شہوار نے رسائیت سے سمجھایا۔  
”میری محبت کی گاڑی کو تمہیں ہی دھکا لگا کر  
اشارت کروانا ہے۔“ وہ سن کھل رہا تھا بس اپنی ہی  
کے جا رہا تھا۔ جان جان کر اسے چھیڑ رہا تھا۔  
”فی الحال۔۔ یہ والی گاڑی کو اشارت کریں تاکہ گھر





”یہ تو جھلی ہے“ سمعہ نے اپنی پیاری سی کزن کو چھیڑا، مگر ادھر سے کوئی جوانی کارروائی نہ ہوئی جس کا صاف مطلب تھا کہ ہشعہ کا موڈ واقعی بہت خراب ہے۔

”اوہو۔ ابھی تو۔ بقرعید میں دیر ہے پھر یہ بلا وجہ کی بحث و تکرار کیوں ہو رہی ہے؟“ حمیرا کی برداشت ختم ہونے لگی تو چڑ کر پوچھا، مگر سب نے انہیں انکسور کیا۔ ”میری جان۔ ایک نظر دیکھو تو صبح۔“ تاب دار نے محبت سے بیٹی کو پکارا اور بیٹی احتیاط سے عتلیٰ سبز رنگ کے ہتار سی اور شہفون کے امتزاج سے بنائے گئے انار کلی سوٹ کو ہنجر میں لٹکایا۔

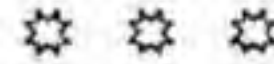
”ہائے ہشعہ تم واقعی ناشکری ہو۔ صبح میں مل میں بالکل اسی اسٹائل اور کامبینیشن کا سوٹ دیکھا تھا، ممی سے لینے کی منہ بھی کی، مگر برائے ٹیک دیکھتے ہی جان نکل گئی مجبوراً“ دد سرا سوٹ خریدا۔ ”سمعہ نے ایک بار پھر لچائی ہوئی ڈھبوں سے فراک کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھایا۔

”ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، یہ ڈریس بھی مشہور ڈیزائنر کی کاپی ہے، میں ان لوگوں کے کپڑے سینے سے پہلے کسی بھی مشہور بوتھک میں جا کر ڈیزائن دیکھ کر ذرا غ میں بٹھاتی ہوں اگر موقع مل جائے تو سیل فون سے اس کی تصویر بھی لے لیتی ہوں، پھر ویسائی کپڑا اور لیس وغیرہ بازار سے خرید کر سلائی شروع کرتی ہوں۔ اسی وجہ سے وہ سو ڈیزائن بنانے میں آسانی رہتی ہے۔“ تاب دار نے نزدیکی بیٹی کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے سادہ سے انداز میں تفصیل بتائی۔

”امی۔ پلیز۔ میں بقرعید پر کوئی اچھا سا ڈیزائن سوٹ پہنوں گی، میری فرینڈز کا پارٹی کیو پارٹی کرنے کا ارادہ ہے، میں وہاں پر یہ سوٹ پہن کر ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ ہشعہ مل سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ تاب دار کو بیٹی پر حیرت ہوئی، وہ ایسی ضدی تو نہیں تھی انہیں اس کا انداز برا بھی لگا مگر سب کی موجودگی میں کچھ کہنے سے گریز کیا۔ حمیرا کے ہونٹوں پر طنز مسکراہٹ چھا گئی جبکہ سمعہ نے حیرت سے

”یہ گاڑی بھی لگتا ہے تم سے دھکا لگوا کر اشارت ہوگی۔“ عکرمہ نے برابر میں بیٹھی بہن کو دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ ”کیا۔ نہیں۔“ وہ بھائی کے مضبوط شانوں پر مکا مارتے ہوئے چیختی۔

”ہا۔ ہا۔ ہا۔“ عکرمہ نے گاڑی اشارت کی اور ہنس رہا۔ شہوار بھائی کی شرارت پر جل بھن گئی، مگر سفر شروع ہونے پر شکر ادا کیا۔ عکرمہ بہن کو نئی فکر میں مبتلا کر کے بے فکری سے سیٹی پر ایک پیاری سی دھن بجاتے ہوئے ہشعہ کے خیالوں میں گم ہو گیا۔ شہوار اس وقت کو کوٹنے لگی جب اس نے عکرمہ کو کل کر کے کلج سے پک کرنے کے لیے کہا، اصل میں آج ڈرائیور نے طبیعت خرابی کی وجہ سے اچانک چھٹی کر لی اور عکرمہ بہن کو مستعدی سے لینے پہنچ گیا۔ شہوار بھی خوش اور اسی بہانے پیاری پیاری لڑکیوں کا دیدار بھی ہو جاتا، اپنے طور پر ایک تیر سے دو شکار کرنے لگا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود کیپڈ کے تیر کا ہدف بن گیا۔



”بیس عید پر یہ سوٹ نہیں پہنوں گی۔ بس۔ آپ کسی کو بھی گفت کر دیں۔“ ہشعہ نے بے رخی سے کہا تاب دار ابھی بیٹی کو کوئی کرار سا جواب دینے والی تھیں کہ چھوٹی نند اور اس کی بیٹی کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر چپ رہ گئیں۔

”ہائے کتنا زبردست لگ رہا ہے۔ مملی۔ آپ واقعی میں بہت آرٹسٹک مائنڈ ہیں۔“ سمعہ نے کھلے دل سے تاب دار کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی انار کلی فراک کی تعریف کی تو حمیرا نے برا سامنے بنا کر بیٹی کو گھورا۔

”شکر ہے۔ تمہیں تو پسند آیا۔ اب ذرا اپنی دوست کو بھی سمجھاؤ جس نے صبح سے رونا دھونا مچایا ہوا ہے کہ یہ سوٹ نہیں پہنتا۔“ تاب دار نے مسکرا کر کہا اور ان لوگوں کو کمرے میں بٹھایا۔





”پھوپھو۔ یہ ڈرنک لیں۔ اتنی گرمی سے آئی ہیں۔“ تاب دار کی منجھلی بیٹی وشمہ کو بچن کے کاموں سے بہت لگاؤ تھا وہ مسمانوں کی تواضع کے لیے فوراً گلاسوں میں ڈرنک اور پلیٹ میں نمکو نکل کر لے آئی۔

”شعلع بیٹا۔ فریزر سے چکن کا پیکٹ نکل کر سنک میں رکھنا میں آئی ہوں۔“ تاب دار جانتی تھیں کہ ننداب رات کا کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جلنے والی۔

”میں تو ہشتمہ کو لے کر آتی ہوں۔ بلاوجہ ایک سوٹ کو لے کر اپنا موڈ خراب کر رہی ہے۔“ سمعہ نے مسکرا کر کہا اور اندر چلی گئی۔

”افوہ۔ بھابھی کیا ہو گیا جو بیٹی سے اتنی ضد باندھ لی۔ جب بازار میں اتنی اچھی چیزیں بنی بتائی مل رہی ہیں تو پھر ایسے جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟“ حمیرا نے عادت کے مطابق ہنستے ہوئے طنز کیا اور ڈرنک کا سب لیا۔

”حمیرا۔ میں کسی کو مجبور تو نہیں کر رہی ہوں جس کو جیسا مناسب لگے وہ ویسا ہی کرے، مگر جب میں بچیوں کے ایک سے ایک کپڑے سی سکتی ہوں تو کیا ضرورت ہے کہ بلاوجہ ہار کیٹ جا کر ہزاروں روپے ایک وقت کی شاپنگ میں پھونک آؤں۔“ تاب دار نے شیفون کے عتالی دوپٹے پر سلور ڈوری پائپنگ لگاتے ہوئے پل بھر مشین روگ کر رک کر انہیں جواب دیا۔

”ممی۔ ڈیزائننگ۔ بھی ایک آرٹ ہے اور ممانی اس میں ماہر ہیں۔ اسی وجہ سے تو ان کا سلائی کٹائی کا سینٹر بھی دن بہ دن ترقی کر رہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں چھٹیوں میں یہاں آکر سلائی سیکھوں۔“ سمعہ کو ماں کا انداز برا لگا تو دل رکھنے کے لیے حمایت میں بولی، حالانکہ اسے سوئی پکڑنے سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہ

ابھی واپس لوٹی تھی اور ہشتمہ کا ہاتھ پکڑ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ممی۔ تم بڑوں کے بیچ میں نہ بولو۔ ویسے بھی اس دور میں کسی کو شوق نہیں جو اپنی آنکھیں پھوڑے، آج کی لڑکیوں کے پاس نہ تو اتنا وقت ہے نہ ہی جان کر۔“ حمیرا نے دال موٹھ پھانکتے ہوئے بھلونج کا مذاق اڑایا۔ سمعہ نے منہ بنا کر ہل کو دیکھا۔

”حمیرا۔ مکمل ہے۔ تم بیٹی کی اچھی بات کی حوصلہ افزائی کرنے کی جگہ مذاق اڑا رہی ہو۔“ تاب دار نے بھنویں اچکا کر نند کو گھورا۔ وشمہ اور شعلع نے بھی پھوپھو کو ناگواری سے دیکھا وہ جب بھی آئیں کوئی چھوٹی سی بات نکل کر ان کی ہل کے پیچھے پڑ جاتیں۔

”میری لڑکی کی تو رہنے ہی دیں۔ ایسے ہی ہر چیز پر جان دینے لگتی ہے، مگر آپ تو سمجھ دار ہیں۔ آج کل مقابلے بازی کا دور ہے۔ لڑکیاں تو ایک سے بڑھ کر ایک نمٹنے ڈیزائن سوٹ پہنتی ہیں۔ آپ جو کپڑوں کو جوڑ توڑ کر کے اپنی سلیقہ مندی کا ڈنکا پیٹنے کے لیے بچیوں کو ایسے کپڑے پہننے پر مجبور کرتی ہیں تو یہ بات کچھ جھجھتی نہیں۔“ حمیرا بھی سینہ ٹھوک کر میدان میں اتر آئیں۔

”حمیرا۔ میں کفایت شعاری کو برا نہیں سمجھتی نہ ہی تمہارے فلسفے کو مانتی ہوں۔“ تاب دار نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”لو۔ ان کی سنو۔ بسن۔ یہ شو۔ شا کا دور ہے۔ پیٹ میں کیا ہے، لوگ نہیں دیکھتے، مگر تن پر کیا ہے وہ سب کی نگاہوں میں چلتا ہے۔ اب بھلا۔ اتنی سادگی دیکھ کر کون ان لڑکیوں کے لیے رشتے بیچے گا۔“ حمیرا نے جلے دل کے پھوپھو لے پھوڑے۔

”لڑکیوں کو ہر حال میں گزارا کرنا چاہیے، اللہ میری بچیوں کی قسمت اچھی کرے۔ وقت آنے پر ساری آرزوئیں پوری ہو جائیں گی اور جہاں تک رشتے کی بات ہے تو وہ نصیب سے جڑتے ہیں۔ چیزوں سے نہیں۔ بس نیت اچھی ہو تو سارے کام اپنے وقت پر صحیح طریقے سے ہوتے چلے جاتے ہیں۔“ تاب دار کو



مند کی بات بہت بری لگی۔ منہ بنا کر جواب دیا۔

”اللہ۔۔۔ تو۔۔۔ بھابھی۔ میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو آپ بھڑک اٹھیں، انسان کما تا کس کے لیے ہے، اولاد کے لیے، اب اگر وہ ہی خوش نہیں تو کیا فائدہ، بھائی اتنی اچھی پوسٹ پر کام کرتے ہیں۔ اب ایسا بھی نہیں کہ ہشتمہ عید پر ایک ڈھنگ کا جوڑا نہ خرید سکے، مگر آپ کی منطق ہی نرالی ہوتی ہیں اور یہ سمجھی جو مسسینی بنی ممانی کی حمایت میں ماں سے لڑ رہی ہے نا، اس نے خود اپنے پیار سے منہ کر کے بقرعید کے لیے پورے دس ہزار کا سوٹ خریدا ہے۔“ تمیرا کے تو جیسے آگ لگ گئی، ہاتھ نچا نچا کر بولیں، ہشتمہ نے ماں کو بڑی جراتی زباں سے دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔ سب کی اپنی مرضی ہے، مگر میں تو وہ ہی کروں گی جو مجھے مناسب لگے گا۔ ویسے بھی ابھی میٹھی عید پر ان کے پیار کو بونس ملا تو تینوں کی پسند کے سوٹ دلائے تھے اس بار سب سے اہم قربانی کا فریضہ ہوتا ہے۔“ تاب دار نے سلائی مشین کو کور کرتے ہوئے اتنے فیصلہ کن انداز میں اپنی بات دہرائی کہ سب کی بولتی بند ہو گئی۔ تاہم ہشتمہ کو ماں کی کتنی ایک آنکھ نہیں بھائی۔



”ہماری بیٹی کا چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے؟“ رمیض احمد دفتر سے لوٹے تو خلاف معمول پشتہ کو چپ چپ صوفے پر بیٹھا دیکھ کر سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔ بس اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ تاب دار نے بات بتائی، ان کی عادت تھی کہ وہ شوہر سے گھر کے مسائل حتی الامکان چھپائے رکھتیں، رمیض لباس تبدیل کرنے اندر کی جانب ہرچہ گئے۔

”میں جانتی ہوں کہ پیسہ کمانا آسان نہیں، تمہارے پیارے بھائی سے کتنی مشکلوں کو جھیل کر گھر لوٹتے ہیں، اگر یہاں بھی جیج لگی رہے تو ان کا سکون برباد ہو جائے گا کہ نہیں؟“ انہوں نے بظاہر دشمہ سے کہا، مگر مخاطب بڑی بیٹی تھی۔ وہ فریش ہو کر لوٹے تو

موضوع گفتگو بدل دیا گیا۔

”دشمہ میرا پیارا سا بچہ۔ ذرا ادھر تو آؤ۔“ رمیض نے منجھلی بیٹی کو لاڈ سے بلایا اور کرسی پر بیٹھ کر پاؤں پھیلا لیے۔

”جی پاپا۔ کیا ہوا؟“ دشمنہ کے ساتھ چھوٹی شعلع بھی چلی آئی۔

”یہ لو چاٹ۔ اسے پلیٹ میں نکل کر لاؤ، چائے کے ساتھ سب مل کر کھا لیں گے۔“ رمیض نے بیٹی کو شاہرہ تھمایا۔ وہ خوش خوش کچن کی طرف چل دی۔ تاب دار ان کے برابر میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

”اوپر والے پورشن کا کتنا کام رہ گیا ہے؟“ انہوں نے شوہر کو ریلیکس دیکھا تو فکر مندی سے پوچھا۔

”ارشاد ٹھیکیدار، دن بہ دن نئے نئے کام نکالتا ہے، میں نے تو اس کام کے لیے جتنا بجٹ رکھا تھا وہ بھی ختم ہو گیا، مگر کام ہے کہ ختم ہی نہیں ہو پارہا۔“ رمیض نے اوپر والی منزل کو غور دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

”جی۔ میں بھی یہ ہی سوچ رہی تھی، بقرعید سر پر ہے، اس پر گھر کا پھیلاؤ ہے کہ سٹ ہی نہیں رہا۔ ارشاد بھائی سے کہیں بس ایک ہفتے میں اپنا سارا کام ختم کر دیں۔ ہم تو ان کو ٹھیکہ دے کر پھنس گئے ہیں۔“ تاب دار نے جذباتی پن کا مظاہرہ کیا تو رمیض ہنس کر اٹھیں۔

”پاپا۔ یہ آپ کی گرما گرم چائے اور یہ سب کے لیے مزے دار چاٹ۔“ دشمنہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھ کر چٹکارا بھرا، شعلع بھی چمچہ پیالہ ہاتھ میں تھامے اس کے پیچھے وہیں آگئی، مگر دشمہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”ہشتمہ آجاؤ۔ بیٹی۔ میں نے تمہاری پسند کی پارٹی الگ سے ڈلوائی ہے۔“ انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد بڑی کو آواز لگائی، اس کی مسلسل خاموشی اب رمیض کو پریشان کر رہی تھی۔

”پاپا۔ بعد میں کھاؤں گی۔ ابھی موڈ نہیں۔“ ہشتمہ نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں وہیں سے جواب دیا۔

”تاب۔ ہوا کیا ہے؟“ رمیض نے چونک کر



بیوی کو دکھا، وہ بیٹی کے مزاج آشنا تھے، سمجھ گئے کہ کوئی بات ہوئی ہے۔

”اف۔ کچھ نہیں۔ بس بیگم صاحبہ کا دلغ خراب ہو گیا ہے۔“ انہوں نے ہشمد کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔

”پاپا۔ ممانے ہم تینوں کے لیے بہت بیماری اتار کلی فراک سی ہیں، مگر آپ کو اپنا سوٹ پسند نہیں آ رہا، وہ بقرعید میں سمجھ بلی کی طرح کاسوٹ لینا چاہ رہی ہیں۔“ شعل نے ماں کی آنکھیں دکھانے کے باوجود پول کھول دی۔

”اچھل۔ تو تاب۔ اگر۔ بچی کا دل نہیں تو اسے بازار سے دلا دو۔“ رمیض نے ہشمد کو محبت سے دیکھ کر بیوی سے سفارش کر دی۔

”کہاں سے دلا دوں۔؟ ہزار۔ پانچ سو کی بات نہیں ہے۔“ تاب دار نے دانت ڈیس کر کہا۔

”اس۔ کیوں بھی۔ کتنے کاسوٹ ہے؟“ رمیض نے آنکھیں سکیڑیں اور پوچھا، انہیں خواتین کے کپڑوں کی قیمتوں کا بھلا کیا اندازہ۔

”پورے دس ہزار کا۔ آج ہی تو پھوپھو اور سمجھ آئی آئے تھے تو بتا رہے تھے۔“ وشمہ نے ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں کھڑی کر دیں۔

”اف۔ حمیرا آئی تھی۔ چلی گئی کیا۔؟“ رمیض نے پوچھا۔

”جی۔ وہ اچانک رفاقت بھائی کا فون آ گیا۔ ان لوگوں کو کہیں اور جانا تھا۔ اس لیے وہ جلدی چلی گئی۔“ تاب دار نے وشمہ کو گھورتے ہوئے شوہر کو جواب دیا جس نے سارا بھانڈا پھوڑا۔

”بیٹا۔ اداس نہ ہو۔ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔“ رمیض سے بیٹی کی اداس صورت دیکھی نہ گئی اس وقت تو ہاتھ ویسے ہی بہت تنگ تھا۔ ورنہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتے۔ مجبوراً چائے چھوڑ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”بس۔ خوش ہو گئیں۔ باپ بے چارہ باہر سے کما کر تھکا ہارا آیا، مگر تم لوگوں کو کیا فکر اپنے دکھڑے

سننے بیٹھ گئیں۔“ تاب دار جو جوش میں شروع ہوئیں تو انہیں چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ ہشمد کو بھی اپنے رویے پر افسوس ہونے لگا۔

رمیض نے سیدھی سڑک پر چلتے ہوئے بچیوں کے بارے میں سوچا اور لن کے اچھے نصیب کے لیے اوپر والے سے دل سے دعا مانگی۔ رمیض جانتے تھے کہ چھوٹی بہن حمیرا کے شوہر رفاقت علی کا اچھا خاصا چلتا ہوا بزنس تھا لن کے لیے دس بیس ہزار معمولی رقم تھی، اسی لیے سمجھ کی ہر فرمائش پوری ہو جاتی جبکہ وہ خود نوکری پیشہ آدمی تھے۔ بڑھتی ہوئی منگائی نے کمر توڑ کر رکھ دی۔ ایک تنخواہ میں گزارا مشکل ہونے لگا تھا۔ اس پر تین لڑکیاں کو پانچ کی فکر الگ، یہ تو تاب دار کی سلیقہ مندی تھی جو اس نے گھر بیٹھے سلائی کڑھائی کا چھوٹا سا اسکول کھول لیا۔ وہاں سے ملنے والے پیسوں سے کیمٹیاں ڈال کر اوپر والا پورشن بنوانا شروع کیا تاکہ کرائے پر دے کر مزید آمدنی کی سبیل کی جاسکے۔ تاب دار کی وجہ سے ہی آج تک پوری برادری میں ان کا بھرم قائم تھا۔



عکرمہ نے آہستہ سے گاڑی چلاتے ہوئے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا، آج اس نے دانستہ طور پر وہ ہی راستہ اختیار کیا، جہاں اسے اپنی منزل کا نشان ملا تھا، مگر مہاپاس سے بات کرنے سے پہلے وہ ایک بار خود پر یقین کرنا چاہتا تھا۔

”بس۔ اس معاملے میں کچھ نہیں کروں گی۔“ شہوار نے جل کر آج کلج کی چھٹی کی۔ بھائی کی متکون مزاحی سے باخوبی واقف تھی، اسی لیے ہشمد والے معاملے میں ہری جھنڈی دکھا دی۔ وہ بھی اپنی مدد آپ کے تحت چھٹی کے ٹائم پر کلج جا پہنچا۔

ہشمد نے سیاہ گیٹ سے نکل کر ادائے بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھے بتا بس اسٹاپ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ چاند سے چہرے پر اداسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے، اسے اپنی ضد پر افسوس ہونے لگا جس کی



وجہ سے باپ کو فکر میں مبتلا رکھا۔  
 ”میں۔ امی کا سیاہا سوٹ پہن کر بی بی کی پارٹی  
 میں چلی جاؤں گی۔“ ہشیمہ نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا  
 اور مسکرا دی۔ گرمی کی حدت سے چہرے پر چھائی لالی  
 وہ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ عکرمہ نے  
 اسے ایک ٹکد بکھا۔

”تمہارا۔ تو۔ ہر روپ بے مثل ہے۔“ عکرمہ  
 نے پیار سے سراہا، مگر ہشیمہ نے گاڑی کے پاس سے  
 گزرتے ہوئے بھی اس پر اچھتی سی نگاہ نہ ڈالی۔ وہ  
 ایک لمحے کے لیے شاک رہ گیا۔

”سمجھ میں نہیں آیا۔ تم سے۔ ایسے ایک دم سے  
 کیوں کر دل لگا بیٹھا؟ واقعی۔ تم میں کچھ تو ہے جو من  
 کی انتہا گہرائیوں تک بغیر رکے اترتی چلی گئیں۔“  
 عکرمہ نے سر جھٹک کر اس کی بے اعتنائی کا لطف اٹھایا  
 وہ اپنے سارے پس پوائنٹ کو بے کار جاتے دیکھ کر بھی  
 بے مزا نہیں ہوا، ورنہ چمکتی گاڑی، منگا لباس،  
 زبردست پرمینٹھی، لڑکیوں کو فوراً ہی اپنی جانب  
 کھینچ لیتی تھی۔

”تمہیں جلد از جلد اپنا ہٹانا پڑے گا، کیوں کہ میں  
 نہیں چاہتا کہ دن رات تمہیں پانے، کھونے، تم سے  
 ملنے یا پھرنے کے اندیشوں میں مبتلا رہ کر خود کو تباہ  
 کروں۔“ عکرمہ نے ہشیمہ کو دیکھتے سنجیدگی سے عہد  
 کیا اور گھر روانہ ہو گیا۔



سمیرا اور شہوار کے کئی دفعہ لگائے جانے والے  
 پھیروں اور تقاضوں کا یہ اثر ہوا کہ ہشیمہ کے گھر میں  
 عکرمہ کے رشتے کے لیے سنجیدگی سے بات چیت  
 شروع ہو گئی، ورنہ وہ معاشی مشکلات کی وجہ سے ابھی  
 بیٹی کا رشتہ طے کرنا نہیں چاہتے تھے، دونوں میاں بیوی  
 میں یہ طے پایا کہ لڑکے والوں سے تیاری کے لیے دو  
 سال کا وقت لیا جائے۔ تاب دار کے کہنے پر ہشیمہ  
 نے عکرمہ کے آفس جا کر ایک ملاقات بھی کر لی، وہاں  
 سے وہ کافی مطمئن ہو کر لوٹے اور اس بات پر اللہ کا شکر

ادا کیا کہ شہر کا اتنا معزز گھرانہ بیٹی کا مطلب گارنٹا ہوا ہے۔  
 ہر طرف سے مثبت اشارے ملنے پر ان لوگوں نے ہاں  
 کرنے کا سوچا۔ کیوں کہ وہ فوری طور پر ہشیمہ کی شادی  
 کے متحمل نہ تھے اس لیے شادی کے لیے وقت مانگ  
 لیا۔

”اف۔ دو سال۔ میری ساس تو پورے گھر کا جینا  
 حرام کر دیں گی۔“ سمیرا نے دو سال کا سنا تو ہول  
 انھیں سینے پر ہاتھ رکھ کر درد بھری آواز نکالی۔  
 ”مسزہ محض۔ ہم تو بقر عید کے دو سرے ہفتے میں  
 شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ سمیرا نے انہیں فون پر اپنی  
 بے تابی سنائی۔

”نہ۔ بات۔ تو مشکل ہو جائے گی۔“ تاب دار  
 نے صاف لہجے میں انہیں حتمی اور فون رکھ دیا۔  
 ”اب کیا کروں۔ اتنی مشکل سے تو کوئی لڑکی پسند  
 آئی ہے۔“ سمیرا سوچ میں پڑ گئیں۔ دراصل ان کی  
 ساس متاب خانم کا آج کل بس نہیں چل رہا تھا کہ  
 پوتے کو سہرا باندھ کر بارات لے کر ہشیمہ کے گھر  
 جا پہنچیں، صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی، اس لیے  
 چاہتی تھیں کہ زندگی میں ہی عکرمہ کو اپنے گھر میں شادی  
 آباد دیکھ لیں۔

”آئے۔ لڑکی تو بہت ہی پیاری ہے۔“ انہوں نے  
 چشمہ لگا کر جیسے ہی ہشیمہ کی تصویر دیکھی واری  
 سدے جانے لگیں۔

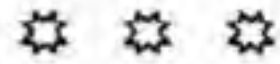
”سمیرا۔ آپ جا کر بات پکی کر لیں۔ تاکہ شادی  
 کے انتظامات شروع کے جا سکیں۔“ منظور علی نے بھی  
 ماں کی طبیعت کی وجہ سے بیٹے کی جلد شادی پر زور دیا،  
 وہ نہیں چاہتے کہ ان کے دل میں کوئی خلش رہ  
 جائے۔ سمیرا کم سم بیٹھی رہ گئیں۔

”آئے۔ دلہن۔ پہلے تو عکرمہ کو کوئی لڑکی پسند  
 نہیں آتی تھی، اب جو وہ شہوار کی سہیلی سے شادی پر  
 تیار ہوا ہے تو تم لوگ دیر لگا رہے ہو۔“ انہوں نے  
 آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا بنا کر بہو کو گھورتے ہوئے  
 تاکید کی۔ ستر سالہ متاب خانم آج کل بچوں کی طرح  
 ہر بات پر ٹھکنے لگتی ہیں۔



”اچھا! اہل جی۔ ان لوگوں سے دوبارہ بات کرتی ہوں۔“ سمیرا نے انہیں تسلی دی۔

”صرف بات نہیں کرنی۔ کی بات کرنی ہے۔ کیوں عکرمہ؟“ متاب خانم نے مسکرا کر پوچھے منہ سے ہوتے کو دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا تو وہ نذر نذر سے سر ہلا کر تائید کرنے لگی۔ سمیرا گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔



دوسرے دن شام کو وہ ہشامہ کے گھر جا کر بات کرنے کا سوچ رہی تھیں کہ وہاں سے تاب دار کا معذرت بھرا فون آگیا۔

”ہم نے بہت سوچا مگر کوئی راستہ نہ پا کر مجبوراً اس بات کو یہیں ختم کر رہے ہیں۔“ تاب دار نے دلی زبان میں افسردگی سے کہا۔ انہیں عکرمہ اور اس کی فیملی دل سے پسند آگئی تھی مگر اتنی جلدی شادی جیسا بڑا کام کرنا ناممکن تھا۔

”مسز رمیض۔ ایسی بھی کیا بات ہو گئی ہماری فیملی پسند نہیں آئی؟“ سمیرا نے لجاجت سے پوچھا انکار کا سنتے ہی ان کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

”ارے۔ نہیں۔ آپ کا خاندان تو واقعی بہت اچھا ہے۔ میری بیٹی کی خوش قسمتی ہوتی اگر اتنے قدردان لوگوں کا ساتھ مل جاتا۔ مگر ہر انسان کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔“ تاب دار نے ٹھنڈی آہ بھر کر دکھی لہجے میں بتایا۔

”مجھے اپنا سمجھ کر ساری پریشانی کہہ ڈالیں۔ سمجھیں بات صرف ہم دونوں تک ہی محدود رہے گی۔“ سمیرا نے بے حد پر خلوص انداز میں ان پر دباؤ ڈالا۔

”دیکھیں۔ ہم اتنی جلدی شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ پھر۔ گھر بٹانے کی وجہ سے قرضے کی لپیٹ میں بھی آگئے ہیں۔“ تاب دار نے دبے لفظوں میں اپنا بھرم رکھتے ہوئے مختصر آیتا اور مزید بحث سے بچنے کے لیے عجلت میں فون رکھ دیا۔

شہوار جو وہیں بیٹھی تھی یہ سب سن کر رونے بیٹھ گئی۔

”بالکل چپ۔ منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالنا۔ گھر میں کسی کو انکار والی بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ ورنہ عکرمہ سے پہلے اہل جی نے سوگ ڈال دیتا ہے۔“

سمیرا نے اسے سختی سے چپ کرایا۔

”ڈرائیور سے گاڑی نکلاؤ، ہم ابھی مسز رمیض کے گھر جائیں گے۔“ انہوں نے کچھ دیر سوچا اور فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں شہوار میں کامنہ دیکھتی رہ گئی۔



”تنی جاری۔ میرا مطلب ہے۔ سب کچھ اچانک کیسے ہو گا؟“ سمیرا کی بات پر تاب دار کے دماغ میں ایک فکر لاحق ہو گئی، عکرمہ کے گھر والے تو ہاتھ پاؤں پھلانے میں ماہر دکھائی دے رہے تھے۔

”آپ لوگ کن باتوں میں پڑ گئے ہیں۔ اگر جینز کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تو بے کار ہے۔ یہ مسئلہ نہ بھی ہوگا۔ تب بھی میں اس قسم کے لین دین کے حق میں نہیں ہوں۔ ویسے بھی۔ میرا عکرمہ بہت چوڑی ہے۔ اس نے ابھی اپنے روم کو نئے سرے سے فرنشڈ کروایا ہے۔ آپ کا جینز میں دیا ہوا سارا سامان بلا وجہ بیس منٹ میں خراب ہوتا رہے گا۔“ سمیرا ان کی مشکل سمجھتی تھیں اسی لیے ہلکے پھلکے انداز میں سمجھانے لگیں۔

”آپ۔ کیوں نہیں سمجھ رہی۔ ایسا کہاں ہوتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟“ تاب دار بڑی تنذیب میں پڑ گئیں۔

”وام۔ بھئی۔ رشتہ ہم دو خاندانوں کے بیچ میں ہو رہا ہے۔ یہاں دنیا کہاں سے آگئی؟“ سمیرا ایک دم کھٹکھٹا گئیں۔

”نہ تو ٹھیک ہے مگر۔ بہن۔“ کمرے میں موجود رمیض نے بھی منہ کھولا، مگر سمیرا نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا۔

”بس۔ جب بہن۔ بول دیا۔ تو مجھ پر اٹھو بھی



کر س۔ یہ روایتی باتیں نہیں۔ حقیقتاً۔ ہمیں ہشتم  
تین گھنٹوں میں قتل ہے۔“ سمیرا نے قطعیت سے  
بات ختم کی اور چائے کلب لیا۔

”اچھا۔ مگر۔ ایسے خلی ہاتھ کیسے؟“ تاب دار کی  
سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں گھبرا کر شوہر کو  
دیکھا۔

”خلی ہاتھ تو نہیں جائیں گے۔ ہم اس گھر کی سب  
سے مہنگی اور قیمتی چیز لے کر جانے والے ہیں۔ آپ۔  
ہشتم کا موازنہ بے جان چیزوں سے کیوں کر رہی  
ہیں۔“ انہوں نے سوار کے ساتھ اندر داخل ہوئی  
ہشتم کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔ سوچنے تو دیں۔“ تاب دار نے گھبرا کر  
کہا۔

”سنو ریمو۔ جتنا چاہے سوچ لیں۔ مگر۔ اس  
رشتے کے لیے ہماری بس ایک شرط پوری کر دیں۔“  
سمیرا منظور نے اچانک سنجیدہ اور رت ہٹا کر کہا۔

”جی۔ وہ کیا۔؟“ تاب دار نے حیرانی سے پہلے  
انہیں پھر برابر میں بیٹھے شوہر کی جانب دیکھا۔

”اگلے ہفتے میں نکاح کی تقریب سادگی سے ادا کی  
جائے گی اور بقرعید کے بعد رخصتی۔“ تاب دار کی  
سائنس بھل ہوئی، ورنہ وہ تو سوچ رہی تھی کہ اتنا بڑا  
گھرانہ ہے، جانے سمہن چیز لینے سے منع کرنے  
کے بعد کون سی فرمائش کرنے والی ہیں۔ مگر دسری فکر  
پڑ گئی۔

”اگلے ہفتے نکاح؟“ دونوں میاں بیوی چونک کر  
بولے۔

”جی ہاں۔“ سمیرا تو جیسے ہتھالی پر سرسوں حملے پر  
تلی بیٹھی تھیں۔ ماں کے کہنے پر سوار نے دوست کو  
چٹکی کٹی۔ ہشتم کے ہونٹوں پر شرمیلیں مسکراہٹ چھا  
گئی۔

”آپ پریشان مت ہوں۔ نکاح بہت آسانی سے  
ہو جائے گا، ہماری طرف سے میرے اور منظور صاحب  
کے بہن بھائی۔ سمجھیں کل ملا کر پچیس لوگ ہوں  
گے۔ آپ بھی اپنی سہولت سے قریبی عزیزوں کو مدعو

کر لیے گا، باقی دھوم دھڑکا ہم رخصتی پر کر لیں گے۔“  
سمیرا نے ان کے چہرے کی اڑتی رنگت دیکھی اور گھر  
کے بنے ہوئے گرم گرم سموسوں پر ہاتھ صاف کرتے  
ہوئے مزے سے صلاں جڑی۔

”یہ تو ہاں کروا کر ہی دم لیں گی۔“ تاب دار نے  
ٹھنڈی سائنس بھر کر شوہر سے سرگوشی میں کہا۔

”ایسے اچھے رشتے کو لوٹانا کفرانِ نعمت ہو گا۔“  
رمیض نے سوچا اور بیوی کو اشارے سے رضامندی  
دے دی، تاب دار نے بھی مسکرا کر ہاں کر دی۔

”بھائی۔ آپ کی محبت کی گاڑی چل پڑی ہے۔“  
شہوار نے بھائی کو فوراً ہی ٹیکسٹ کیا تو اس کا دل خوشی  
سے جھوم اٹھا۔ وہ ادوی کو خوش خبری سنائے بھاگا۔



”آئی لو پو ممہ۔“ شہوار ہشتم کے گھر سے واپسی پر  
ماں سے چمٹ گئی۔

”اچھا ہوا بتا دیا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔“ سمیرا نے  
تکلف سے اس کے بل سنوارتے ہوئے کہا۔

”سیرسلی ممہ۔ آپ تو چھا گئیں“ شہوار نے ہاتھ  
اٹھا کر داد دی۔

”وہ کیوں بھئی۔“ سمیرا نے اسے نہ سمجھ میں آنے  
والی نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ کی۔ ہشتم کو سادگی سے بہو بنانے والی بات  
نے انکل آنٹی کی کتنی بڑی پریشانی دور کر دی تھ۔“ شہوار  
خوشی سے چٹکی۔ اسے بہر حال عکرمہ سے بہت محبت  
تھی، بھائی کی دل کی مراد بر آئی تو وہ کیوں کر خوش نہ  
ہوتی۔

”وہ تو میں نے ایک پرانا قرض لوٹایا ہے۔“ سمیرا  
کے مسکراتے چہرے پر اداسی کا رنگ غالب ہوا۔  
”کیا مطلب۔ میں سمجھی نہیں؟“ شہوار نے ماں  
کو مڑ کر دیکھا۔

”بس بیٹا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری اور  
تمہارے پاپا کی منگنی کے بعد بابا جی کا اچانک انتقال  
ہو گیا، میں اور ماں ایک بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے،



تمہاری دو خالوں اور تین ماموں کی اس وقت تک شادی ہو چکی تھی۔ میں ہی چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے باقی بچی تھی، ابا جی کا جو بھی فنڈ وغیرہ ملا، ابا نے اس میں سے بڑا حصہ میری شادی کے لیے مختص کرنا چاہا، مگر اس وقت تمہارے تینوں ماموں اس بات پر اڑ گئے کہ وہ پیسہ فی الحال ان میں بانٹ دیا جائے اور جب سمیرا کی شادی ہوگی تو ہم بھائی مل کر یہ کام کریں گے، کیوں کہ وہ سب اچھی نوکریوں پر لگے ہوئے تھے تو ابا نے ان پر یقین کر کے سارا پیسہ فیاض بھائی کے حوالے کر دیا، جو باجی کے بعد گھر کے سربراہ بن گئے تھے، انہوں نے سارا پیسہ پانی کی طرح بہا کر تین الگ الگ پورشن بنوائے ایک دو کمروں کا چھوٹا پورشن میرا اور ابا کا بھی بتا دیا گیا، اس کے بعد سب الگ الگ شفٹ ہو گئے۔ ”سمیرا کی آنکھیں ماضی کو یاد کر کے نم ہوئیں۔

”وہ تو تانی کا گھر پہلے ایک تھا۔“ مشہوار نے پوچھا۔  
 ”ہونہ۔ اس کے بعد سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے، وقت گزرتا چلا گیا، مگر میری کسی کو فکر ہی نہیں۔ ابا جب بھی ان تینوں کو بٹھا کر میری شادی کی بات کرتے، وہ سب بہانے بناتے۔ اتنی جلدی کیا ہے؟ کون سی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اپنے مسئلے مسائل کا رونا روتے ہوئے وہاں سے اٹھ جاتے، ادھر تمہاری دادی کو بھی اب فکر لگ گئی، وہ ابا کو فون کر کے شادی کا کہتیں۔ ابا مجبور ہو کر کہتے ہیں۔ تمہاری خالائیں اپنے سرالوں میں بڑی تھیں، بھائیوں کو فون کر کے سناتیں۔ میری شادی کا بوتلیں مگر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ تین سال اسی کشمکش میں گزر گئے، ابا ان کو کوئی مثبت جواب ہی نہیں دے پا رہے تھے۔ ہر دفعہ ایک نیا بہانا۔ ان لوگوں کی آمدورفت گھٹنے لگی۔ فون بھی آنا کم ہو گئے۔ تمہاری مٹی کو فکروں نے بیمار کر ڈال دیا۔ مگر بھائی اپنی بیویوں کے کہنے میں آکر ہمیں فراموش کرتے چلے گئے۔“ سمیرا نے دکھ بھری سانس لی مشہوار بڑی توجہ سے اس کی داستان سننے میں مگن تھی۔  
 ”پھر کیا ہوا۔ میرا مطلب۔ پاپا کچھ نہیں بولتے

تھے؟“ مشہوار نے بے چینی سے سوال کیا۔  
 ”تمہاری دادی نے مایوس ہو کر ان کے لیے دو سری لڑکی تلاش کرنا شروع کر دی۔ آخر پوری برادری میں یہ خبر پھیل گئی کہ منظور کے لیے دو سرا رشتہ ڈھونڈا جا رہا ہے۔ ابا کے کانوں تک بھی یہ باتیں پہنچیں۔ انہوں نے بیٹوں کو بلا کر فاسٹل بات کی مگر وہ ایک بار پھر ٹل گئے۔“ سمیرا نے پھکی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔

”او، مائی گاڈ۔ پھر؟“ مشہوار نے پوچھا۔  
 ”ایک دن اچانک تمہارے پاپا۔ ابا سے ملنے آ گئے۔ اور بڑی رسائی سے شادی نہ کرنے کی وجہ معلوم کرنے لگے، میری ماں کی وضع داری منہ سے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، مگر انہوں نے ابا کے چہرے پر رقم کرب اور مجبوری کی داستان پڑھ لی۔ بس واپس گھر جاتے ہی تمہاری دادی سے جانے کس انداز میں بات کی کہ وہ مجھے ایک ہفتے میں سادگی سے رخصت کر اکر اس گھر میں لے آئیں، بھائیوں کو بعد میں شرم محسوس ہوئی تو میرے اکاؤنٹ میں کچھ پیسے ٹرانسفر کر دے۔ مگر میں تمہارے پاپا کی آج تک شکر گزار ہوں جنہوں نے ایک بیوہ اور مجبور عورت کا بھرم رکھا۔“ وہ افسردہ ہو کر بولتی رہیں۔

”وہ پھر کیا ہوا؟“ مشہوار کے دل میں ماں کا درد اترنے لگا۔

”میرے سرال میں قدم رکھنے کے بعد جیسے قسمت کی دیوی اس فیملی پر مہربان ہوتی چلی گئی، یوں ہن برسنے لگا کہ سنبھالے نہیں سمجھتا۔ اس بات کا کریڈٹ آج تک تمہارے پاپا اور دادی مجھے دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ تو اوپر والے کی دین ہے۔“ سمیرا نے سگڑوں سے آنکھیں موندیں۔

”واہ یعنی میری دادی بالکل بھی رونا جی ساس نہیں بنیں۔“ مشہوار کی آنکھیں چمک اٹھیں، دل میں مہتاب خانم کے لیے موجود محبت میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔

”نہیں یہ بات سچ ہے کہ ابا جی۔ بہت نیک روح



ہیں۔ میں ان کی اچھائی کبھی نہیں بھول سکتی۔ اسی لیے تم نے وہ کھا ہو گا۔ گھر میں ان کی ہر بات کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عکرمہ کی شادی بقرعید کے بعد ہوگی تو میں نے اس بات کو ممکن بنانے کے لیے اپنا سارا زور لگا دیا۔ ”میرا نے مسکرا کر کہا۔

”واؤ۔ مملا یہ بات تو ہے۔“ شہسوار ہنس دی۔

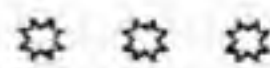
”اچھا ہوا۔ آپ نے جذبات میں آکر مجھے اپنی اور پایا کی محبت کی داستان سنا دی۔ ورنہ میں تو ان باتوں سے محروم ہی رہ جاتی۔“ شہسوار نے شوخی دکھائی تو میرا نے ایک دھپ لگائی۔

”کون سی محبت کی داستان۔ میں تو ان سے اس وقت بات بھی نہیں کرتی تھی، اصل میں منظور نے سوچا کہ ایک لڑکی جو اتنے سالوں سے ان کے نام پر بیٹھی ہے۔ یہ رشتہ ختم ہو جانے کے بعد اس کی کتنی بدنامی ہوگی۔ وہ ایک خاندانی آدمی نکلے اور مجھے تین کپڑوں میں خوشی خوشی رخصت کرا کر لے گئے، بس میں نے اسی دن دل میں عہد کیا کہ عکرمہ کی شادی کروں گی تو بیٹی والوں کو زیر بار نہیں کروں گی، تابدار کی ہچکچاہٹ دیکھ کر میرے سامنے تمہاری مٹی کا چہرہ آگیا اور میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔“ میرا نے بات ختم کی تو شہسوار نے ماں پر فخریہ نگاہ ڈالی۔

”آپ نے یہ بات تو بہت اچھی کی مگر پاپا والی بات میں پھر بھی جھول رہ گیا۔“ شہسوار نے شرارت سے نچلا لب دیا۔

”جھول۔ کیا مطلب کون سا جھول؟“ میرا نے حیرت سے پوچھا۔

”میری مملا۔ اتنی پیاری ہیں۔ وہ کیسے اتنی حسین لڑکی کو ہاتھ سے جانے دیتے۔ رشتہ ختم ہونے کا تو بہانہ بنایا۔ ورنہ شادی تو انہوں نے آپ سے ہی کرنی تھی۔“ شہسوار نے ماں کو یوں چھیڑا کہ ان کی ہنسی چھوٹ گئی۔



دام۔ بھائی۔ بھابھی تو غیر سسی، سکے بھائی کا بھی خون

سفید ہو گیا۔ وہ دونوں حمیرا کے ڈرائنگ روم میں سر جھکائے بیٹھے، ان کی بری بھلی سن رہے تھے۔ ”حمیرا۔ یقین کرو۔ سب کچھ بہت جلدی میں طے ہوا، جیسے ہی ہاں کی سب سے پہلے تمہارے پاس آیا ہوں۔“ رمیض نے بہن کے برابر میں جا کر بیٹھتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

”بس۔ بس۔ یہ کہانیاں کسی اور کو سنائیے گا۔ وہاں نکاح کی ڈیٹ تک لکھیں ہو گئی، کسی کو مجھ غریب کا خیال نہیں آیا کہ ایک فون کر کے بلا لیتے۔“ حمیرا نے باکس سے نشوونکھ کر بلا دجہ آنکھیں پونچھیں۔ تابدار مند کو دیکھ کر ان کے دل پر گزرنے والی کیفیت کا اندازہ کر رہی تھیں، وہ جو ہمیشہ ان کی بیٹیوں کو حقیر سمجھتی آئیں، اتنی اچھی جگہ رشتہ طے ہو جانے کی خبر ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”اب تم جو بھی سمجھو۔ مگر میں نے پوری بات سچائی سے بیان کر دی ہے، بقرعید کے بعد رخصتی ہے، اگر تمہیں سچ سچ میری اولاد سے محبت ہوگی تو چلی آنا ورنہ تمہاری مرضی۔“ رمیض نے زندگی میں پہلی بار بہن کی ناجائز بات کے آگے مزاحمت کی، تابدار منہ کھول کر شوہر کو دیکھنے لگیں۔ حمیرا تو ایسی ہو گئیں جیسے کانو تو بدن میں لہو نہیں۔

”تاب۔ چلو۔ اور جگہ بھی بلاوا دینے جانا ہے۔“ رمیض جھٹکے سے کھڑے ہوئے تو وہ بھی ہوش میں آئیں اور میاں کے پیچھے سر جھکائے باہر نکل گئیں۔ حمیرا نے ہمیشہ سے بھائی کے گھر پر اپنا تسلط قائم رکھا، چھوٹی ہو کر بھی بڑے بھائی کو دیا۔ رمیض نے بھی بہن کے من مان میں کوئی کمی آنے نہ دی، مگر شاید آج ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ حمیرا اپنی جگہ بیٹھی سوچتی رہ گئیں۔

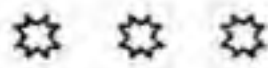


”بس ٹھیک ہے۔ تو سب طے پا گیا۔ اب آپ لوگ ہشمد کو بھول جائیں۔“ میرا نے چچے سے پلاؤ پر راستہ ڈالتے ہوئے مزے سے کہا۔ وہ آج یہاں رنج



ٹائم میں پہنچی تو تاب دار نے جلدی جلدی تھوڑا اہتمام کروا لیا۔

کنیں۔



”تم یہاں بیٹھو۔ میں آدھے گھنٹے میں آ رہی ہوں۔“ شہسوار ہشمد کا ہاتھ تھاڑے ایک بڑے آئس کریم پارلر میں داخل ہوئی اور عکرمہ کے سامنے والی چیر پر بٹھا کر خود نو دو گیارہ ہو گئی۔ ہشمد اس صورتحال پر حیران رہ گئی۔

”پلیز۔ میں نے ہی شہسوار کو کہا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ کچھ باتیں سن لو پھر چلی جانا۔“ وہ غصے میں واپس جانے کے لیے مڑی تو عکرمہ کی بھاری آواز نے رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اس کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”ہشمد، میری چاہت پر ہمیشہ بھروسہ رکھنا۔ عکرمہ منظور اس دن سے صرف آپ کا ہو گیا جس دن پہلی بار دیکھا اور ہمیشہ آپ کا ہی رہے گا۔“ وہ اسے اپنی محبتوں کا ملن دیتے ہوئے وفا کا یقین دلانے لگا۔

”آپ۔ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ہشمد ایک دم ششدر رہ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ رشتہ شہسوار کے بجائے عکرمہ کی پسند پر طے پایا ہے۔

”ہاں۔ میں نے جب آپ پر پہلی نگاہ ڈالی تو اسی وقت دل نے گواہی دی کہ بس یہ وہ لڑکی ہو جسے میری زندگی میں شامل ہونا ہے۔“ عکرمہ نے مسکرا کر اقرار کیا۔ جھکی جھکی پلکوں سمیت وہ سامنے بیٹھی دل میں اتاری جا رہی تھی۔

”اچھا۔ مجھے تو ان باتوں کی کچھ خبر نہیں۔“ ہشمد نے دھیرے سے لب کھولے۔

”ہاں۔ مجھے آپ کی عزت کا بہت پاس تھا اس لیے میں نے ہی یہ بات کسی کو نہیں بتائی اور شہسوار کو بھی دس کلوز کرنے سے منع کر دیا کیوں کہ آپ کا ساتھ تا عمر کے لیے پانا تھا۔ اس لیے کورٹ شپ چلانے کی جگہ سچا اور سہارا راستہ اپنایا۔“ اس کا شرارتی لہجہ اندر کی سچائی کا مکمل ساتھ دے رہا تھا۔

”سامنے بیٹھا یہ شخص کتنا خالص ہے جس نے میری معمولی سی ذات کو ایک دم سے اتنا معتبر کر دیا۔“

”کس۔ کیا۔ مطلب؟“ تاب دار نے حیرت سے پوچھا اس بات پر ان کے چھکے چھوٹ گئے۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج سے ہشمد ہماری ذمہ داری ہے۔ اب آپ لوگ اسے بھول کر باقی دو بیٹیوں کی فکر کریں یہ تو میری بیٹی بن گئی ہے۔“ سمیرا نے اتنے خلوص سے ہشمد کو ساتھ لگا کر کہا کہ ان دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں پاس بیٹھی شہسوار نے بھی دوست کو خود سے لپٹا لیا۔

”لو کے ہشمد تم۔ جا کر تیار ہو جاؤ۔“ انہوں نے ہاتھ دھونے کے بعد لیمن لی پیٹے ہوئے لمحہ بھر ٹھہر کر کہا۔

”کیوں۔ کہاں جانا ہے؟“ تاب دار نے چونک کر پوچھا ہشمد نے بھی شہسوار کو دیکھا۔ اتنی جلدی بیٹی کا رشتہ ہو جانے کے بعد سے وہ منظور فیملی کی اپنائیت کے مظاہروں پر یا تو حیران یا پریشان ہوا ٹھہرتی۔

”اومائی گاڈ۔ منظور صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ میں واقعی بوڑھی ہو گئی ہوں۔ مسز رمبھن میں بتانا بھول گئی۔ ہمارا آج شاپنگ کا پروگرام ہے۔ شہسوار اور ہشمد کو نکاح کے ڈرہسز اور جیولری وغیرہ دلانی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی بہو کو بقرعید کا اچھا سا سوٹ بھی تو دلانا ہے۔“ سمیرا نے سر پر ہاتھ بار کر ہنستے ہوئے کہا تو تاب دار انہیں دیکھتی چلی گئیں ان کے چہرے پر خاص قسم کی ملاحظہ تھی شاید ان کی اچھائیوں کی وجہ سے ایسا تھا۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ تاب دار نے بیٹی کی سوالیہ نگاہوں پر اثبات میں سر ہلایا۔

”میڈم جلدی کرو۔ بھائی کی فرمائش ہے کہ ہشمد کے سارے ڈرہسز شہر کے سب سے مشہور ڈیزائنرز سے بنوائے جائیں۔ ممانے اسی لیے آج کا ٹائم لیا ہوا ہے۔ اب ہمیں وہاں پہنچنا ہے۔“ شہسوار نے ہشمد کو بے تکلفی سے بتاتے ہوئے اس کے روم کی جانب دھکیلا تو تاب دار اوپر والے کی عنایتوں پر حیران رہ



ہشتمے گہرائی میں جا کر سوچا اور اس کا دل اپنے رب کے حضور سر بہ سجود ہونے کے لیے بے قرار ہونے لگا۔

”آپ۔ کبھی بھی میرا ساتھ نہ چھوڑیے گا۔“ عکرمہ نے اسے سوجھوں میں گم دکھا تو خوف زدہ ہو کر یقین دہانی چاہی۔

”میں کبھی آپ سے دور نہیں جاؤں گی۔“ ہشتمہ نے اس کے اصرار پر سر ہلا کر یقین دہانی کروائی۔

”میں بہت خوش قسمت ہوں۔ جو آپ جیسی پیاری اور معصوم سی لڑکی میری شریک حیات بننے جا رہی ہے۔“ اس کے چہرے کو تکتے ہوئے عکرمہ کی آنکھیں لودھنے لگی۔ وہ شرمانے لگی۔

”ہشتمہ! کبھی مجھ سے جدا نہ ہونا۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو،“ آپ سے ہچکڑ کر عکرمہ کے لیے جینا مشکل ہو جائے گا۔“ گہیر لہجے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا عکرمہ اس کے ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہا تھا۔

”جی۔ کبھی۔ نہیں۔“ ہشتمہ نے بڑی فرمانبرداری سے اقرار کیا۔ عکرمہ کو لگا گویا سکون کی ایک لہر اس کی روح کے اندر تک سرایت کر گئی ہو۔ عکرمہ کی بڑی خواہش تھی کہ نکاح سے پہلے ایک بار ہشتمہ سے مل کر اپنے دل کا حال بیان کرے اس نے بہن کی اتنی منت سماجت کی کہ وہ پگھل ہی گئی۔ یہاں آنے سے پہلے ہشتمہ کو بالکل نہیں پتا تھا کہ ایسی چھوٹن سے لاپڑے گا۔ وہ تو شہوار کے کہنے پر شاپنگ کے لیے گھر سے نکلی۔ جس نے اچانک گاڑی کا رخ اس طرف موڑ دیا۔



عید الاضحیٰ کا چاند دکھائی دے گیا اور علاقے بھر میں جانوروں کی بولیاں سنائی دینے لگی۔ شعلے کے سارے فریڈ روزانہ رات کو اپنے جانوروں کو لے کر واک پر نکلتے تو اس کا دل بھی چل چل جاتا۔ بکروں کو زیور وغیرہ پہنا کر تیار کیا جاتا پھر ان کا بیوی کو نشٹ ہوتا، جیتنے والے جانور کو انعام میں اسٹیشنل قسم کا چارہ کھانے کو دیا جاتا۔ شعلے یہ سب دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتی کہ

ابھی تک ان کا بکرا کیوں نہیں آیا۔

”پی۔ ہمارا جانور کب آئے گا؟ وہ بڑی آس لے کر مل کے پاس پہنچی، جو تخت پوش سینے میں منہ مٹھیں۔

”بیٹا۔ آپ کی نکاح کی تقریب اچانک کھڑی ہو گئی ہے۔ خرچے اتنے بڑھ گئے ہیں۔ اس بار تو لگتا ہے

مسجد میں گلے کا حصہ ڈالنا بھی مشکل ہو گا۔ بکرا خریدنے کی تو سکت ہی نہیں رہی۔“ تاب دار نے چھولی بیٹی کے بل سنوارتے ہوئے رسائیت سے سمجھایا۔ وہ صابر بنی تھی ضد کیے بنا چپ چاپ

سر جھکائے کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ تاب دار کے دل کو دھچکا پہنچا، مگر وہ اس معاملے میں کیا کر سکتی تھیں۔

”بہن۔ بہن۔“ تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں بکرے کی صداؤں پر چونکے، جو گھر کے دروازے کے باہر سے آرہی تھیں۔ اتنے میں کسی نے بار بار اطلاع کھنٹی بجائی۔ شعلے نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور حیران رہ گئی۔

”تاب۔ یہ بکرا۔ کہاں بزر ہوا نا ہے؟“ رمیض نے گھر میں ٹھتے ہی پوچھا، تاب دار نے حیرت سے شوہر کے پیچھے جھانکا تو سفید رنگ کا بڑا بکرا دکھائی دیا۔

”یہ۔ کیا۔ میرا مطلب ہے۔ بکرا۔ کیوں؟“ تاب دار کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

”ہاں۔ یہ بکرا ہے۔ مگر آپ کا نہیں۔ میری شعلے کا ہے۔“ رمیض کی شگفتگی عروج پر تھی انہوں نے جانور کو اذر لاکر رسی چھولی کے ہاتھ میں پکڑائی۔ وہ ضمن میں کٹرے ہو کر بہنوں کو جوش سے آوازیں دینے لگی۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ابھی آگے کتنے خرچے پڑے ہیں۔“ وہ جھجک کر بولیں۔

”یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔“ رمیض نے بڑی شوخ نگاہوں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

”سمیرا بہن نے جو کہا وہ ان کی بڑائی ہے مگر ہم بیٹی کو یوں خالی ہاتھ گھر سے وداع نہیں کر سکتے، میں چاہتی ہوں کہ ہشتمہ کی شادی میں کوئی کمی نہ ہو کے بعد میں سسرال میں میری بیٹی کا کسی مقام پر بھی سر جھکے۔“



تاب دار نے خود پر ان دیکھا بوجھ محسوس کیا تو آزر دگی سے دل کا حال سنایا۔

”اس کی فکر مت کرو سب ہو جائے گا۔ ادھر آؤ۔ آج میں تم سے ایک بڑی اہم بات شیئر کرنا چاہتا ہوں۔“ رمیض تاب دار کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئے اور اپنے قریب بٹھاتے ہوئے تسلی دی۔

”جی کیا بات ہے؟“ تاب دار نے شوہر کو کلنی پر سکون پایا تو پوچھا۔

”کلنی عرصے قبل آفس میں پلاٹ کی ایک اسکیم آئی تھی، قیمت بہت کم تھی میں نے فارم بھردیا۔ اتفاق سے قرعہ اندازی میں میرا نام نکل آیا، میں نے خرید لیا۔ پلاٹ جس جگہ واقع ہے وہ کلنی غیر آباد علاقہ تھا، میں نے فائل اٹھا کر ایک جانب رکھ دی اور بھول گیا۔ اور جب کہ تم ہشمد کی شادی کے انتظامات کے لیے پریشان ہو رہی تھیں تو میں نے اس علاقے کے بروکر سے پلاٹ کی قیمت کا تخمینہ لگایا، تم سن کر حیران رہ جاؤ گی کہ اب اس جگہ کی قیمت تین گنا بڑھ گئی ہے۔“ رمیض کا چہرہ خوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

”او۔ میرے اللہ۔ یہ تو بہت بڑی خوش خبری ہے۔“ تاب دار اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔

”ہمیں اب اس کے اتنے اچھے دام مل رہے ہیں کہ نہ صرف ہشمد کی شادی بہت اچھے طریقے سے ہو جائے گی۔ بلکہ سارا قرضہ بھی اتر جائے گا۔“ رمیض نے بیوی کو پکڑ کر بٹھایا اور کاندھے کے گرد ہاتھوں کا گھیرا بناتے ہوئے اپنی خوشی بانٹی۔

”کیا۔۔۔ سچ۔ شکر ہے۔ میرے مالک۔ تو نے ہماری لاج رکھ لی۔ مگر قیمت اچانک کیسے بڑھ گئی؟“ تاب دار نے پہلے تو ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کیا، پھر تجسس سے پوچھا۔

”اس کے نزدیکی علاقے میں۔ کلنی سارے کیلیکس بنادیئے گئے۔ لوگ وہاں آکر بس گئے۔ آبادی میں دکانیں بھی کھل گئیں۔ دو سال کے اندر اندر وہ علاقہ اتنا کمرشل ہو گیا کہ آس پاس کی زمینوں کی قیمت ایک دم اوپر چلی گئیں۔“ رمیض نے بستر پر دراز

ہوتے ہوئے بتایا۔

”پہلو۔ ایک بڑی فکر سر سے اتری۔“ تاب دار نے اندر داخل ہوتی بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

”بس۔ اوپر والا تو نیت دیکھتا ہے۔ اس نے ہماری عزت رکھنی تھی تو یہ طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ آج پلاٹ کا بیعانہ ملا تو میں نے سب سے پہلے قربانی کے لیے بکرا خریدا۔“ رمیض نے ہشمد کے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھامے ہوئے بتایا۔

”آپ نے یہ تو سب سے اچھا کام کیا۔“ تاب دار نے صحن میں بکرے کے پاس گھڑی شعلع کو دیکھتے ہوئے کہا جو بکرے کو چارہ کھلانے میں مصروف تھی۔ اس کی ساری فریڈز صحن میں جمع ہو چکی تھیں۔

### ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ٹاؤلز

300/-	ساری بھول ہماری تھی	راحت جبین
300/-	اوبے پرواجن	راحت جبین
350/-	ایک میں اور ایک تم	تنزیلہ ریاض
350/-	بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی
300/-	دیمک زدہ محبت	صائمہ اکرم چوہدری
350/-	کسی راستے کی تلاش میں	میونہ خورشید علی
300/-	ہستی کا آہنگ	شرہ بخاری
300/-	دل موم کا دیا	سائرہ رضا
300/-	ساڈا چڑیا دا چنبا	نفیسہ سعید
500/-	ستارہ شام	آمنہ ریاض
300/-	مصحف	نمرہ احمد
750/-	دست کوزہ گر	نوزیہ یاسمین
300/-	محبت من محرم	سمیرا حمید

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکاتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

]] 165 کرون 165]] اکتوبر 2015



تاب دار کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود بیٹی کو نم آنکھوں سے بار بار دیکھ رہی تھیں۔

ڈنر کا انتظام ان کے گھر کے لان میں کیا گیا تھا، طعام کھل گیا تو مہمان وہاں جا کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہائی میں بات چیت کا موقع میسر آیا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟ آج ہی رخصتی لے لوں؟“ عکرمہ نے دھیرے سے ہشمتہ کو چھیڑا جو ٹھہر ٹھہر کر اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ وہ شرمائی۔

”جانے آج موسم نے آپ سے رنگ ادھار لیے ہیں یا آپ پر موسم کی خوب صورتی کا اثر ہو چلا ہے۔“ عکرمہ نے قدرے جھک کر کہا تو وہ مزید سمٹ گئی۔ دونوں کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب سنبھل گئے۔

”سب کہہ رہے تھے کہ مجھ پر یہ کرنا بالکل سوٹ نہیں کر رہا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“ عکرمہ نے تھوڑی دیر بعد پریشانی سے کہا تو ہشمتہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا پہلی بار دونوں کی نگاہوں کا ٹکراؤ ہوا، وہ اس کی شرارت سمجھ گئی، ورنہ براؤن کڑھائی والے کرتے میں عکرمہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا، ہشمتہ کی محویت پر عکرمہ کے بھرے بھرے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر لوگوں کی موجودگی کے خیال سے ہشمتہ نے جلدی سے آنکھیں جھکا لیں، وہ اپنی پھوپھی حمیرا کو باتیں بنانے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھی، جو بیٹی کی اتنی بڑی جگہ رشتہ ہونے پر بڑی مایوس دکھائی دے رہی تھیں، مگر ہشمتہ کو آج اپنی ماں کی تمام باتوں پر یقین آیا۔

”جن کی نیت صاف ہو، جیت ان کا ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔“ وہ سچ کہتی تھیں۔ بند دروازوں کے آگے کھڑے ہو کر مایوسی سے عمر گزارنے کے بجائے کھلے درجوں سے آئی روشنی کی جانب رخ پھیرنے کا مثبت ہنر سیکھنے والوں کو ہی جیت نصیب ہوتی ہے۔

✽ ✽

نکاح کے بعد ہشمتہ کی بہنیں اور کزنز اسے دونوں طرف سے تھامے، چھیڑ چھاڑ کرتی، اپنے جلو میں لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ جہاں مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ عکرمہ کی پیاسی نگاہیں اپنی دلہن پر رک گئیں۔ چہرے پر گویا خوشیوں کے عکس جھللا اٹھے۔ وہ جب بھی ہشمتہ کو دیکھتا، ہر بار وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت دکھائی دیتی مگر آج تو جیسے اگلی پچھلی ساری کسر نکل گئی۔ پرپل، سلور ماتھا پٹی والے دپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ بڑی لودے رہا تھا، ہلکا سا میک اپ، ایک سائیڈ پر بنا بالوں کا اسٹائل جس کو گلاب اور موتیے کے پھولوں سے سجایا گیا۔ ہندی کے نقش و نگار سے سجائے گئے جگمگاتی انگوٹھیوں والے نرم ہاتھ۔ ستواں ناک پر بھی سونے کی بالی جس میں ہیرا جڑا تھا۔ عکرمہ نے ایک سانس بھری۔ وہ مزید جھک گئی۔ اب چہرہ صحیح سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”آپ کے وجود سے اٹھنے والی ہلکے گلابوں کو ناشاد کیے دے رہی ہے۔“ ہشمتہ کو پہلو میں بیٹھا دیکھ کر عکرمہ کے دل سے خود بخود صدا نکلی۔ خوشیوں کا عکس جیسے اس کے ماتھے پر سجے ٹیکے میں جھللا لانے لگا، عجیب سحر انگیز کیفیت تھی۔ عکرمہ نے سب کی پروا کیے بغیر بڑے استحقاق سے جھک کر اپنی منکوحہ کا بغور جائزہ لیا، تو اس کے کزنز نے میٹھل اور تلیاں بجا بجا کر دلہا میاں کا ریکارڈ لگانا شروع کر دیا، ہشمتہ پر لجا ہٹ سوار ہوئی، اس کے مومی ہاتھ کپکپانے لگے۔

عکرمہ اس کے حیا کے رنگوں میں کھو کر، پلکیں جھپکاتا ہی بھول گیا۔ سب نے دل کھول کر تعریف کی، حمیرا کا خوشی سے برا حال تھا، شہسوارانگ بھائی بھانج کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔

مہتاب خانم نے لرزتے ہوئے کھڑے ہو کر کئی بار دلہا دلہن کے پاس جانے کی فرمائش کی مگر نرم خدو خصل والے، کالی شیر والی سوٹ میں ملبوس منظور احمد ماں کو پکڑ کر آرام نہ کر سی پر بٹھانے لگ جاتے۔ رمبھڑ اور تاب دار مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے،



عابدہ احمد

# سنگ و سیریس





چند لمحے وہ یونہی ایک دوسرے کو تکتے رہے اور جب اس کا درد (محبت) غصے میں ڈھلنے لگا تو وہ اک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پاؤں پٹختے ہوئے اندر کو جاتی روش مضبوط قدموں سے پار کر گئی۔ چھت پہ کھڑے وجود نے بہت ضبط سے یہ منظر دیکھا تھا اس کا خیال تھا روٹھنا غصہ کرنا صرف اسی کا حق ہے، لیکن اس محبت سے گندھی لڑکی کا ایسا ری ایکشن دینا اسے نئے سرے سے تاؤ دل رہا تھا۔



وہ چلی گئی تھی اور وہ یونہی چھت پہ جما کھڑا کتنی دیر تک اس جگہ کو تکتا رہا جہاں سے وہ اندر غائب ہوئی تھی۔ وہ جو اسے کئی دنوں سے انور کر رہا تھا۔ اسے خود کو روکیے جانا ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ ”وہ سارے وعدے کیا ہوئے؟ دعوے۔ بیان۔ چاہت۔ سوچوں کا تعفن اس کے دماغ میں پھیلنے لگا۔

”بس ایک خواہش تو تم پوری نہ کر سکیں۔ پوری زندگی کیا خاک ساتھ نبھاؤ گی؟“ اپنے اندر عدالت لگائے مصطفیٰ کے منصب پہ فائز سارے گناہ ہی اس کے کھاتے میں ڈال کر وہ خود بری الزمہ تھا۔

”چلو پھر بی بیوں تو یوں ہی سی۔“ پتا نہیں کیا سوچ کے کیا سوچنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس نے۔ سینے میں عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر یونہی ادھر سے ادھر چکرانا چھت پہ پڑے پتھروں کو ٹھوکروں سے اڑاتا رہا۔ پھر بھی بے قراری میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا۔ یکایک اس کے سر میں شدید درد اٹھا تھا۔ چائے کی طلب نے اسے زیادہ دیر چھت پہ ٹھلنے نہ دیا۔ سر کو دبانا دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترتا وہ نالکھ (چھوٹی بہن) کے کمرے کی طرف آگیا۔ اس کا دروازہ دھکیل کر کھولنے کو اٹھا ہاتھ اندر سے آنے والی آوازوں نے روک دیا۔

”تو پھر اب کیا کرو گی۔“ یہ صائمہ (سائہ کی چھوٹی بہن جو کہ نالکھ کی ہم عمر ہی تھی) کی آواز تھی۔ وہ چہرے پہ ناگجھی کے تاثرات لیے دروازے سے

سرخ صاف شفاف اینٹوں کا فرش آوارہ ہوا کے گولوں سے چکراتے قدموں میں بکھرتے سوکھے پتوں سے بھرچکا تھا۔ کئی پتے اس کے قدموں کے نیچے آکر چر مرا گئے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کا نرم و نازک دل کسی بے درد کے ہاتھوں میں آکر چر مرا گیا تھا۔ وہ مزید اداس ہوئی اسے اپنی قسمت بھی بالکل ایسے ہی محسوس ہوئی۔ ٹوٹے پتوں کی طرح ڈولتی۔ بکھرتی۔ وہ بے قرار ہو کر یہاں سے وہاں چکراتی اپنے الٹے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی انگوٹھی گھمانے لگی۔ کبھی اتارتی چڑھاتی، کتنے خیالات اس کے ذہن کی چوکھٹ پار کر کے اس کے دماغ میں ادھم مچانے لگے۔ اس کا سر دھم دھم بچنے لگا۔ اسے لگا وہ گر جائے گی۔ صحن میں نیچے کو جاتی بنی چار سیڑھیوں میں سے دوسری پہ وہ تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

”شاید آندھی آنے والی ہے۔“ سر اٹھا کر گدلے سے آسمان کو دیکھا کچھ دیر یونہی گردن پیچھے گرائے آسمان کو تکتی رہی۔ ذہن میں جانے کیا چل رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ سوچ کیا رہی ہے؟ وہ تھک چکی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کے اندر جاری جنگ نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اسے کسی بل قرار نہیں آیا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کسے راز داں بنائے کسے وحشتوں کا سا بھی۔ وہ جو زندگی بھر کا ساتھی تھا اسی کی تو دان کی ہوئی یہ سوغات تھی۔ بے چینی کی سوئیاں بھی تو اسی نے جسم میں چھوئی تھیں جن کی اذیت وہ روح تک میں محسوس کر رہی تھی۔ وہ کیسے یہ سوئیاں بدن سے نکالتا۔ اک آہ سی اس کے لبوں سے بے آواز نکلی تھی۔ اچانک اس کی نظر گھر کی چھت کی طرف اٹھی تھی۔ گھر کے چاروں طرف گولائی میں بنی چھت پہ وہ دونوں بازو نکائے اس نظر میں جمائے جانے کب سے کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اس کے دل میں درد کا ایک نیا طوفان سر اٹھانے لگا۔

”محبت جب درد بن جائے تو بہت اذیت دیتی ہے۔“ اس کی تو روح تک میں اذیت گھس آئی تھی۔



بالکل لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھی تو انتہائی زنانہ اور غیر اخلاقی حرکت لیکن اسے جانے کیوں صائمہ کی آواز میں ایک غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا اس لیے وہ متحسّس ہو گیا تھا جاننے کے لیے۔

”تم جانتی ہو کہ میں ناصر کی یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتی۔“ نائلہ کی بھرائی آواز سے اس کے کان مزید کھڑے ہوئے۔ یہ کس بارے میں بات کر رہی ہے؟ الجھن کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔ ناصر اس کے ماموں کا بیٹا اور نائلہ کا بچپن کا منگیتہ تھا؟ چھا خاصا سمجھ دار لڑکا تھا اس کی نظر میں۔

”اگر وہ ناراض ہو گیا تو۔“ صائمہ کی آواز میں ایک رازدار سیلی کی سی فکر مندی تھی۔

”ناراض تو وہ ہو گیا۔“ اس کی آواز میں پھیکا پن تھا۔

”مطلب وہ ناراض ہے اور تم یونہی بیٹھی آنسو بہاتی رہو گی بجائے اس کے کہ اسے مناؤ۔“ اب شاید صائمہ اس کی بیوقوفی پر جھنجھلائی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں نے نہیں منایا اسے۔ اتنی منتیں کیں۔ سمجھایا مگر نہیں وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ مجھ سے ملو۔ عید پہ کوئی بہانہ کر کے گھر سے نکلو۔ دماغ کی دہی کر دی اس ناصر کے بچے نے۔“ اب کہ نائلہ نے اصل بات انتہائی جزے ہوئے انداز میں اگلی جو کہ باہر دروازے سے لگے کھڑے توقیر کے گلے میں ہڈی بن کر پھنس گئی اسے ایک دم سے اپنے کزن ناصر پر ڈھیر سارا غصہ آیا۔

”فشل گنتی شریفوں والی ہے اور کرتوت۔“ اس کا دماغ کھولنے لگا۔

کیا سوچ کر اس نے میری بہن کو یوں درغلانے کی کوشش کی۔ جب گھر میں آنے جانے کی کوئی روک ٹوک نہیں تو پھر اکیلے میں ملنے؟ اسے تو میں پوچھتا ہوں۔“ روایتی بھائی کی غیرت بھرپور انگڑائی کے کر بے دار ہوئی تھی۔ اندر جانے وہ دونوں اور کیا باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دروازہ زور سے دھکیل کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ بیڈ پر ایک دوسرے

کے قریب بیٹھی باتیں کرتی وہ دونوں چونکی تھیں۔ ”بھائی آپ“ دونوں نے اس کے غصیل چہرے پہ چسپاں عبارت کو جیسے پڑھ لیا تھا۔ اس کے تیور انہیں ڈرانے کو کافی تھوڑے ہی اس گھر کا اکلوتا لڑکا ہونے کی وجہ سے ساری نئی پود اس کے رعب تلے دبی رہتی تھی۔ اپنی دو بہنیں اور چچا (سائرہ کے ابو) کی سائرہ سمیت تین بیٹیاں سب اس سے چھوٹی اور ڈرنے والوں میں سے تھیں۔ نائلہ کے سہمے چہرے میں اسے کسی کی مانوس سی جھلک دکھائی دی۔ کس کی جھلک تھی یہ؟ اسے یاد آیا ابھی کچھ دن پہلے بالکل یہی سراسیمگی سائرہ کے چہرے پہ بھی ابھری تھی۔ جب اس نے۔۔۔ ہاں تو کیا فرق ہوا؟ مجھ میں اور ناصر میں۔۔۔ اندر کوئی ایک دم سے آئینہ لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے اپنا چہرہ اس آئینے میں دیکھا نہ گیا۔ وہ نظریں چرانے لگا۔ سارا غصہ شرمندگی میں ڈھل چکا تھا۔

”بھائی۔“ نائلہ کی کانپتی آواز میں بھائی کی پکار نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کا دل ایک دم موم ہوا تھا۔ ورنہ تو وہ نائلہ سے سخت باز پرس کے ارادے سے ہی اندر داخل ہوا تھا۔

”ہاں! وہ میں۔۔۔ میں“ اسے مناسب الفاظ نہ سوجھے یوں دندنا تے بہن کے کمرے میں گھس آنے کے لیے۔ بھائی کو تذبذب میں پا کر نائلہ نے ”شاید بھائی نے نہ سنا ہو۔“ کی امید کا سرا تھا۔

”کچھ چاہیے تھا بھائی۔“ ہچکچاتے ہوئے اس کے الفاظ نے توقیر کی مشکل آسان کر دی۔

”ہاں نا! سر میں درد تھا اگر میری گڑیا چائے بنا دے تو۔“ دو قدم چل کر بیڈ کی طرف آیا اور اس کے بال بکھیر ڈالے۔ دونوں کی انگی سانسیں بحال ہوئی تھیں اس کا بحال ہوتا موڈ دیکھ کر۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلادیا تھا اور بیڈ پر سے اترنے لگی کہ اس نے روک دیا۔

”چلو چھوڑو! یوں کرو یہ رکھو۔“ اس نے کچھ سوچ کر اپنی جینز کی پاکٹ سے والٹ نکال کر ہزار کے دو نوٹ نکال کر نائلہ اور صائمہ کی ہتھیلی پر رکھے۔ دونوں



کی آنکھیں بھائی کی کمال سخاوت پہ چمک اٹھیں۔  
”تھینک یو بھائی“ کوئی کام ہے ہم سے۔ ”صائمہ“  
آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے شوخ ہوئی۔

”انڈر اسٹڈی بات ہے کہ اس دنیا میں کچھ بھی  
فری نہیں۔ اب جیسے کہ اس نوٹ کی قیمت آپ  
دونوں تاروں کو ابھی کے ابھی چکانی ہے۔“ وہ بھی اسی  
کے انداز میں شوخی سے بولا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس  
پڑیں۔

”آپ بے فکر ہو کر چھت پر چلے جائیں۔ آپ کا  
چاند وہاں طلوع ہو چکا ہے۔“ نائلہ اس رشوت کا کارن  
سمجھ گئی تھی اس لیے اس کی طرف جھک کر رازداری  
سے بولی تو اس نے مصنوعی گھوری ڈالتے ہوئے اس  
کے سر پر چپت لگادی۔ اب کی بار وہ تینوں ہنس دیے  
تھے۔

”اور ہاں! ناصر کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔  
تمہارا بھائی اسے سمجھالے گا۔“ وہ جاتے جاتے مڑا  
تھا۔ ایک بل کو نائلہ کی سانسیں رکی تھیں۔ لیکن پھر  
جیسے بھائی کے الفاظ نے اس کامنوں بوجھ اتارا تھا۔ وہ  
گیلی آنکھوں سے ہلا گئی۔



کچھ ماہ پہلے ہی محلے میں آنے والی صداقت راؤ کی  
فیملی سے یونی سرسری سی ہونے والی ہیلو پائے کچھ ہی  
دنوں میں اچھی خاصی دوستی میں بدل چکی تھی۔ تو قیر  
اور سمیع راؤ اب تقریباً ”ہمہ وقت ساتھ ہی پائے  
جاتے۔ بڑا فرزندنی اور ہنس مکھ بندہ تھا یہ سمیع راؤ۔  
ہمیشہ گھسیٹ کر تو قیر کو اپنے گھر اور یار دوستوں کی محفل  
میں لے جاتا۔ حتیٰ کہ اپنی منگیتر سے بھی اسے زبردستی  
ملوا کر اور دوستی کروا چکا تھا۔ اس کی منگیتر کہاں کسی سے  
پیچھے تھی جب سمیع کی لائن بڑی ہوتی تو اسے فون  
کردیتی اور گھنٹوں اس کا سر کھاتی رہتی۔ اس کی بے  
وقت کالز کی وجہ سے تو اسے گھر میں بھی کافی پریشانی کا  
سامنا کرنا پڑا تھا۔ امی (تو قیر کی امی) کو تو یقین ہو گیا تھا کہ  
لڑکا کسی دوسری کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ وہ تو اس کے سر

ہو گئیں۔

”کیوں اپنے باپ اور پورے خاندان سے ماں کی  
تربیت کے بارے میں گوہر افشائیاں کروانی ہیں۔ جو  
بھی چڑیل ہے سچ سچ بتادے مجھے۔“

سو اس نے بڑی مشکل سے سمیع سے بات کر کے  
اس کی منگیتر کی بے وقت کالز کا سلسلہ بند کروایا تھا۔  
ابھی تو صرف اماں کو شک ہوا تھا۔ ایک ہی گھر ہونے کی  
وجہ سے اس کی سرال چھوڑا اگر اس کی منکوحہ سائرہ  
کے دماغ میں بھی اگر شک کا کیرا گھس جاتا تو اس کی  
ناک میں دم آ جاتا۔

سائرہ جو اس کے اکلوتے چچا کی دو بیٹیوں میں سب  
سے بڑی تھی۔ اس کی پہلی محبت کزن اور منکوحہ  
تھی۔ جانے کب بچپن میں ہی دونوں کا نکاح کر دیا گیا  
تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے ماں باپ کی پہلی اولادیں۔  
سارے چاؤ ان ہی پہ پورے کیے گئے حتیٰ کہ نکاح کا  
ارمان بھی ان کے بچپن میں ہی نکال لیا گیا تھا اور اب  
ان کے بڑے ہونے پہ سب ٹھنڈے ہو کے بیٹھے  
ہوئے تھے۔ ایک ہی راگ ملہا سائرہ سمیت دونوں  
کے والدین کے منہ پہ چڑھا رہتا ”پہلے تعلیم پھر شادی  
کی بین“ وہ بہت تاؤ دکھاتا تھا کہ جب ہوش نہیں تھا  
اس وقت پکڑ کر نکاح کروادیا اور اب جب وہ روندو سی  
لڑکی ایک ہی گھر میں ہمہ وقت سامنے رہتے ہوئے  
ہوش اڑائے رکھتی تھی اس کی کسی کو پروا نہیں تھی۔  
یہ نہیں تھا کہ ملنے بات کرنے پہ پابندی تھی۔ لیکن  
وہی آزادی بھی نہیں تھی جو اس نے سمیع کے قریب  
رہ کر اس کے اور اس کی منگیتر کے مابین محسوس کی  
تھی۔ جہاں وہ جسمانی طور پر بڑا ہوا تھا وہیں  
”خواہشوں“ کا آتش بھی تو اس کے ساتھ مل کر جوان  
ہوا تھا وہ کیا کرتا۔ سب یار دوست اپنی اپنی گرلز فرینڈز  
اور منگیتروں کو کسی اعزاز کی طرح ساتھ لیے گھومتے  
اور وہ ایسی کسی بھی گید رنگ میں غلو بن کے رہ جاتا۔  
شروع شروع میں تو اس نے اتنا خیال نہیں کیا۔ اس  
کے گھر کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ لحاظ تمام رشتوں میں  
موجود تھا اب چاہے وہ اس کی منکوحہ کیوں نہ ہو؟ کھلی



چھوٹ آزادی کا کوئی تصور نہ تھا۔ گھر کے چیدہ چیدہ معاملات کی دیکھ رکھ اور کلی فیصلوں کا اختیار اس کے ابو اور چچا جان کے پاس تھا۔ خواتین سے صلاح مشورہ ضرور کیا جاتا لیکن آخری حرف ان دونوں بھائیوں کا ہی ہوتا تھا۔

وہ اسے بالکل نارملی ایک کزن کے طور پر ہی لیتی تھی۔ وہ شروع دن کی ہچکچاہٹ، شرماہٹ تو کب کی قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ کیا خوب احساس تھا۔ جب بڑے ہونے پہ پتا چلا تھا کہ وہ اس کے نام لکھی جا چکی تھی۔ ان دنوں اسے اپنا آپ معتبر اور منفرد سالک تھا۔ سا بھی لڑکوں میں ایک فخر سا اس کا سینہ پھیلائے رکھتا۔ اور وہ بھی تو لجائی سی سارے میں پھرا کرتی تھی۔ جانے پھر کیا ہوا کون سا انقلاب آیا کہ وہ چھوٹی موٹی سے کیکر کا درخت بن گئی۔ اول تو کوئی ذمہ داری بات کرنے کی نوبت ہی نہ آتی اور اگر کبھی قسمت سے یہ موقع مل بھی جاتا تو وہ ایسی ہو جاتی جیسے کہ شجر تالاق شاگرد کے ٹاپک سے ان ریلیٹڈ سوال پوچھے جانے پہ گھورتا ہے۔ بڑی مصیبت تھی وہ اپنے جذبات اپنے محسوسات اس تک پہنچانا چاہتا تھا، لیکن وہ چکنی مٹی کا گھڑابی رہتی نہ پلوں کی لرزش نہ گالوں کی لالی نہ چٹختی انگلیاں بالکل کوری تھی وہ یا پھر ظاہر ایسے کرتی تھی۔ اسے تو اب یہ شک بھی ہو چلا تھا کہ اسے اس سے ویسی والمانہ محبت نہیں ہے جیسی کہ اس کی خواہش تھی، ورنہ لڑکیاں کیا کیا نہیں کر گزرتیں اپنے منگیتر کو خوش کرنے کے لیے اور یہاں تو معاملہ منگیتر سے بھی ایک درجہ اوپر کا تھا یعنی کہ شوہر کا۔ اسے بھی اب ضد ہو چلی تھی کہ ایک بار تو اس سے اپنی منوائی ہے۔ یہ کیا؟ ہمیشہ وہی بیسے شوہر کی ایکٹنگ کرتا رہے کبھی تو بی بی بھی نکلے نا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سے۔ قربت کے کتنے مواقع صرف سائرہ کے ٹھس پنے سے وہ گنوا چکا تھا۔

”وہ مجھ سے دور کیوں ہے۔“ یہ سوال اس کا بلند پرہیزگار دیرتا اور اس کا گھسا پٹا جواب

”کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی تمہیں صرف اپنی

تعلیم پہ توجہ دینی چاہیے۔“ لیکن اس کی تشفی ہونے کی بجائے مزید غصہ عود کر آیا۔

”تو اس کا مطلب کیا ہوا تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں یا میں ہی تمہیں پسند نہیں۔“ الفاظ اس نے اپنے دانتوں تلے چبا ڈالے۔

”تمہارا آخر مسئلہ کیا ہے؟ کیوں ہر دوسرے دن یہ بے تکیے سوالات پوچھ کر میرا دماغ چاٹ جاتے ہو۔“ وہ تو شاید پہلے ہی کسی بات پہ جلی بیٹھی تھی اس لیے ایک دم ہی چڑی تھی۔

”مسئلہ میرا نہیں تمہارا ہے اور یہی میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم میری ہر بات کی نفی کیوں کرتی ہو۔“ اپنے غصے کو فی الوقت کنٹرول کرتے ہوئے اس نے بالاخر پوچھ ہی لیا۔

”میں تمہاری ہر بات کی نفی نہیں کرتی صرف بے تکی باتوں کی۔“ اس کا جواب اسے جھلسا گیا۔

”کون سی بے تکی بات کر کے میں نے جنابہ کی شان میں گستاخی کر ڈالی؟“

”تمہیں پتا ہے میں کیا بات کر رہی ہوں۔ شادی سے پہلے میں تمہاری کوئی فرمائش پوری نہیں کروں گی۔ یہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے پھر بھی۔“ اس کا لہجہ دو ٹوک اور ہموار تھا اس نے بڑے ضبط سے اپنی مردانگی (اس کے خیال میں) کی نفی برداشت کی تھی۔

”میرے کچھ دوستوں نے عید کی رات کو کھلڑ کی گیٹ ٹو گید رارینج کی ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں اس بار۔ گھر میں کیا بہانہ کرنا ہے اب یہ تم پر ہے۔“ سرد تر حتمی لہجے میں اس نے کہا۔

گو کہ یہ سچ تھا کہ سمیع لوگوں نے اس بار بھی عید کی رات کو میوزیکل شو کا پروگرام بنایا تھا اور اسے بھی اپنی منگیتر کے ہمراہ آنے کی دعوت دی تھی۔ ہریار کی طرح اس نے ایسی کسی بھی محفل میں شمولیت سے معذرت کر لی تھی، لیکن جانے کیا سوچ کر اس نے یہ بات کر دی تھی اور جواب بھی وہ جانتا تھا، لیکن پھر بھی۔ کبھی کبھی ہم دوسروں سے زیادہ خود کا امتحان لینے کے لیے کچھ ایسی مانگیں کر بیٹھتے ہیں جو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ



پوری نہ ہوں گی۔ وہ اس سے زیادہ خود کا ضبط آزار ہاتھا کہ کہاں جا کے یہ طنائیں ٹوٹتی ہیں۔ ”ہرگز نہیں۔“

تین حریفی جواب کو دینے میں اسے کئی سووڑیاں کے گوشوارے کھنگالنے پڑے تھے۔ اس کا جواب سن کر اس کا چہرہ کسی ربڑ کی طرح کھینچ گیا۔

”شرطوں پہ محبت نہیں تجارت ہوتی ہے۔ تم چاہے جتنے بھی ناراض ہو جاؤ میں ایسا کام کبھی بھی نہیں کروں گی جس کی وجہ سے ہمارے گھر والوں کی سبکی ہو۔“ انگلی اٹھا کر خود کو گھورتے تو قیر کی آنکھوں کے آگے لہرائی۔

”اچھا! اپنے شوہر سے زیادہ تمہیں سب کی فکر ہے۔ میری عزت کی کوئی پروا نہیں؟ میری کتنی انسلٹ ہوئی دوستوں میں۔“ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا لیا تھا۔

”بہت خوب! تمہاری عزت بنانے کے لیے میں اپنی عزت تمہارے ہاتھوں گروی رکھ دوں؟“ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اس نے انتہائی دکھ سے کہا تھا۔

”کیوں اپنے ماتھے پر ذلت کی مر لگوالوں۔ کیوں؟ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیسے اس شخص کے دماغ میں سوراخ کر کے وہ سب کچھ انڈیل دے جس کے خدشے اسے لرزاتے تھے۔ وہ جو خود پہ بے نیازی کا خول چڑھائے رکھتی تھی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ راتوں کو سنے جانے والے اس کے سپنوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ گھر میں چلتے پھرتے اس کی ایک جھلک اس کے اندر طمانیت پھیلا دیتی تھی۔ وہ تو آنے والوں کی آہٹ اور دستک تک میں سے اس کا مخصوص انداز پہچان جاتی تھی۔ وہ نجانے کیوں ایک دم سے تنہائی میں ملنے۔ قربت کی چاہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ تو اس کے سامنے رہتی تھی۔ سارا دن۔ پھر کیا تھا؟

”اونہ! ذلت۔ پتا بھی ہے یہ ذلت ہے کیا بلا؟ بس رسالوں سے دوچار لفظ پڑھ کر خود کو استائی جی ثابت کرنے پر تلی رہی ہو۔“ استہزائیہ لب و لہجہ وہ لب

بھینچے اسے دیکھتی رہی۔

”ذلت تو میری ہوگی یا دوستوں میں۔ تمہارا کیا جائے گا۔ گھر اور کلج کے علاوہ تمہاری دنیا میں اور ہے کیا؟“

”نڑکیوں سے زیادہ ذلت کا مفہوم اور کون جانتا ہوگا۔ یہ ایک ایسی بلا ہے جس پہ کوئی دم درود اثر نہیں کرتا۔ یہ جس پہ سوار ہو جائے وہ ساری عمر اس لاشہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ دفنانے کو دو گز زمین بھی نہیں ملتی۔“ اس کی بات اور لہجہ بہت گہرائی لیے ہوئے تھا۔ سمجھنے والا سمجھ جاتا، لیکن وہ ایسی سمجھ پہ ہزار لعنت بھیجتا تھا جو اسے دل کی کرنے سے روکے۔

”رسالے ذرا کم پڑھا کرو بالکل میری ماں کی کاربن کاپی لگ رہی ہو ذلت پہ لیکچر دیتے ہوئے۔“ وہ بے مزا ہوا تھا۔

”بہر حال عید آنے میں ابھی کچھ دن ہیں۔ سوچنا ضرور اس بارے میں جب تمہارا جذباتی پن کا دورہ ختم ہو جائے۔“ اسے آگ لگا کر وہ بر سکون ہو گیا تھا۔

”بڑا بے نیازی کا گلشیر بنتی تھیں۔ اب پکھلو۔“ کھینچی سی سوچ اس کے ذہن میں آئی تھی۔

”ابھی بیوی نہیں بنی ہوں۔ منکوحہ ہوں صرف منکوحہ۔“ وہ چبا چبا کر منکوحہ پر زور دے کر بولی تھی۔

”میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہاری ہاں کا منتظر رہوں گا۔ ورنہ رات کو نو بجے کے بعد صرف پانچ سو میں بیوی مل جاتی ہے ایک رات کے لیے۔“ یہ تو کہنے کا اس کا بالکل ارادہ نہیں تھا، لیکن منہ سے نکل گیا تو وہ خود کو از حد پر سکون ظاہر کرتا اس کا سارا سکون غارت کر کے چلتا بنا۔ پیچھے وہ کھلے منہ اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی پیٹھ تکتی اس کی آخری بات کا وزن ہی کرتی رہ گئی۔

وہ سوچ کے در پر پہروں بیٹھی رہتی، لیکن کوئی حل نظر نہ آیا۔ کلج میں بھی غائب دماغی سے لیکچر سنتی رہتی پوچھو چاہنے کی کہتی مصر کی۔ گھر آتی تو بھی گپ چپ سی کتابیں پھیلائے بیٹھی رہتی۔ وہ تو شکر تھا کہ سارے میں آج کل بقر عید کا غلغلہ اٹھا ہوا تھا اس لیے مرد



حضرات تو دکان کے بعد بکروں کے پیچھے بکرا منڈی میں ہی زیادہ وقت بتاتے اور گھر کی خواتین یوز مروہ کے دھندوں میں الجھی رہتیں۔ وہ وہی بہنیں تھیں صائمہ اور وہ۔ بھائی کوئی تھا نہیں، سو اس طرف سے تو اسے سکون تھا ورنہ کسی کا بھی دھیان اس کے بجھے چہرے پہ پڑ جاتا تو سوالات نے اسے ناک تک عاجز کر دیتا تھا۔



زیادہ پرانی بات نہیں تھی جب ان دونوں کی اپنے درمیان موجود رشتے سے آشنائی ہوئی تھی۔ سنتے تو بچپن سے آئے تھے سمجھا اب تھا۔ محسوس اب ہوا تھا۔ ان دیدہ سی کشش دونوں کو ایک دوسرے سے تھوڑا قریب لے آئی تھی۔ لڑکپن کا شمار، کچھ وعدے، یہاں ہم دیکھی جذبات کی زنجیریں ان کے پاؤں سے اٹپٹی تھیں۔ وہ مرد تھا رقص بھی کرتا تو ان زنجیروں کا شور اس کی اپنی ذات کے اندر ہی گنبدوں میں گونجتا رہتا۔ پر وہ لڑکی تھی ایک پاؤں بھی ذرا زور سے اٹھاتی تو چھٹا چھٹن سارے جہان کو سنائی دیتی اور سب سے پہلے سننے والوں میں سے اس کی تائی ہی تھیں گو کہ وہ کوئی روایتی کردار نہیں تھیں، لیکن کبھی کبھی روایتی پن ان کے لہجے میں جھلک ہی پڑتا۔

اس دن بھی تائی معمول کی طرح ان کے پورشن میں بیٹھی امی کے ساتھ پالک تڑوا رہی تھیں تو قیر کرکٹ میچ کھیلنے کے بعد ان کو ڈھونڈتا وہیں چلا آیا۔ امی نے فوراً ہی آواز لگا کر اسے اسکول کے کام سے اٹھا کر تو قیر کے لیے مینگو شیک بنانے کو کہا۔ اندر کمرے میں پڑھتی سائرہ تو قیر کے نام کی پکار سنتے ہی چھلانگ لگا کر اٹھی تھی اور آنکھ کے سامنے جا کھڑی ہو گئی جلدی جلدی درازیں کھنگالیں۔ میک اپ کے نام پہ صرف ایک کاجل ہی مل سکا کہ امی اسکول مکالج جانے والی لڑکیوں کے میک اپ کی اشیاء تک رسد کے مکمل خلاف تھیں اسی کو غنیمت جانتے ہوئے جلدی جلدی گہرا کاجل لگا اور چوٹی میں بندھے بالوں کے اوپر سے ہی برش پھیر کے باہر کو بھاگی کہ آوازوں پر آوازیں

پڑ رہی تھیں جیسے ہی وہ لیونگ روم میں بیٹھی تائی کے پاس سے گزری تو انہوں نے بغور اس کی کاجل سے اور اپنے فرزند کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر در آنے والی چمک کو دیکھا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر میں مینگو شیک کا ایک بڑا سا ٹھنڈا ٹھار گلاس لیے چلی آئی قبل اس کے کہ وہ گلاس تو قیر کو پکڑا تو اس کے ساتھ بیٹھی تائی نے گلاس اچک لیا۔ تو قیر کا برہا ہوا، امی کا پالک کے پتے توڑتا ہاتھ بیک وقت ساکت ہوا تھا۔

”چل تو گھر۔ کتابیں کھول کے بیٹھ اپنی سارا دن آوارہ گردیاں ہی ختم نہیں ہوتیں تیری۔“ ملک شیک کی ٹھنڈک ان کے سبجے میں بھی اتر آئی تھی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ماں کا موڈ سمجھ گیا تھا اس لیے بلا حیل و حجت اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ لے جا۔“ اسے قدم بڑھاتے دیکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلاس اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ بس ”جی“ ہی کہہ سکا۔ امی حیرانگی سے آیا کابلتا موڈ اور لہجہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ”یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا آپا کو“ وہ حیرت میں گھری سوچ کر رہ گئیں۔

”سائرہ بیٹا! لڑکی کی آنکھ میں حیا کی سرخی سے زیادہ کوئی کاجل، سرمہ نہیں چھتا۔ جا کے منہ دھو اور ساتھ ہی ایسا کوئی خیال بھی اس تالاق کے لیے سجنے، لہانے کا نہ لا۔ ابھی رخصتی میں بڑا ٹائم ہے۔ اتنا اچھی نہ لگ اسے کہ جب تمہارا ٹائم آئے اسے تم میں کچھ پسند نہ آئے۔“

زن۔ زن۔ زن۔ اس کے اوپر سے ریل گزر گئی تھی۔ وہ شرمندگی کے دریا میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ امی کی کٹیلی نگاہیں سمہن کی خطرناک حد تک ہاں میں ہاں ملانے والی تھیں تائی تو کہہ کر پھر سے پالک چننے لگی تھیں اور وہ بولنے سے بھی قاصر تھی۔ بس اس دن سے وہ رک گئی تھی۔ وہیں اور وہ اندھا دھند بھاگتا بہت آگے نکل گیا تھا۔



مز فطری طور پر حاکمیت پسند اور جارح ہوتا ہے اور



بیوی سے بڑھ کر اس مشق ستم کا بہتر مددگار اور کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک مرد ہی تھا۔ عام مرد۔ خاص مرد بھی عام ہی بن جاتا ہے بیوی کے معاملے میں۔ خصوصیت صرف پسندیدہ بیوی کے حصے میں ہی آتی ہے وہ اسے بہت پسند تھی۔ دل بھاتی دل ربانی کے گر سے نا آشنا۔ پہلے پہل وہ اس کے نفس جذبات سے عاری چہرے کو پھر بھی کسی طور برداشت کر لیتا تھا، لیکن جب سے سب کی سنگت ملی تھی وہ اس سے جانے کیسی کیسی امیدیں لگا بیٹھا تھا۔ کسی بھی خواہش کے جواب میں اس کے پاس ایک لمبا چوڑا اخلاقیات اور اس معاشرے کے اصولوں سے سمجھوتہ کرنے والا لیکچر موجود ہوتا تھا جو اس کا حلق تک کڑوا کر دیتا اور کہتے ہی دن وہ منہ پھلنڈے پھرتا رہتا، لیکن وہاں پروا کسے تھی؟ یہ اس کا محض خیال تھا وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی، لیکن لڑکی تھی یوں شتر بے مہار کی طرح ”محبت“ جیسے اڑیل گھوڑے کو نہیں چھوڑ سکتی تھی وہ ڈرتی تھی معمولی لغزش سے پاؤں کہیں گندگی میں نہ جا پڑے۔ چھینٹے تو اسی پہ بڑے تھے اور وہ ان لوگوں میں سے تھی جو جسمانی صفائی اور روحانی بالیدگی پہ یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے کنھور پنے کی سرحدوں پہ جا کھڑی ہوئی اور اس باؤنڈری لائن کے اس پار کھڑے تو قیر کے دماغ سے عقل نامی شے بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہونے لگتی اور پیچھے بس غصہ۔ بہت غصہ، بے تحاشا غصہ رہ جاتا۔ اور اسی غصے میں اب کی بار وہ اسے آزمانے کو یہ چیلنج دے گیا تھا۔

ابھی تو اسے اور ستانے رلانے کا پروگرام تھا اس کا کہ یونہی اچانک بے دھیانی میں نائلہ اور صائمہ کی باتیں سن لیں۔ نائلہ کے منگیتر کا اکیلے میں ملنے کا مطالبہ اور اس کی پریشانی جان کر اس کی برادرانہ غیرت کا سویا ہوا شیر ایک دھاڑ سے بے دار ہوا تھا۔ وہیں اس کے اندر آئینوں کا جیسے شیش محل اگ آیا تھا اسے خود یہ ندامت محسوس ہوئی تھی۔ شرمندگی۔ بچھتاوا۔ نائلہ کی آواز کا دکھ اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ وہ بھی تو کتنے دن سے ڈسٹرب بھی روئی روئی آنکھیں اور سرخ

ناک لیے سارے میں پھرا کرتی، لیکن اس کے اندر خواہشات کی جلتی لکڑیوں پہ ایک دم سے ڈھیر سارا پانی آگرا تھا۔ یہی تو۔ یہی بے چینی۔ کسک۔ تکلیف۔ دھیمی دھیمی سلگتی آج اس تک بھی پہنچ ہی گئی تھی وہ پکھل رہی تھی۔ بس۔ اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ خواہش پوری ہوئی۔ مردانگی کا زعم برہا تھا، لیکن ابھی وہ صبح سے اس کی یہ پل پل بدلتی کیفیات سے لطف اندوز بھی نہیں ہو پایا تھا کہ کسی کا ویسا ہی مطالبہ اپنی بہن کے لیے اس سے برداشت نہ ہوا۔ وہ اپنی خواہشوں کے اڑن کھٹولے میں اونچا اڑتا کیسے فوراً ہی نیچے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ دماغ کی گریں بھی کھل گئی تھیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے منانا ہے۔ ہاں اس سے غلطی ہوئی تھی، لیکن اسے اپنی محبت پہ یقین تھا کہ وہ اس کی سنے نہ سنے محبت کی لاج ضرور رکھے گی۔ وہ بڑے شگفتہ موڈ میں چھت کو جاتی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ جہاں پہ باوثوق ذرائع (نائیلہ اور صائمہ) سے کنفرم اس کی موجودگی کی اطلاع تھی۔

باہر کا موسم کتنا خوش گوار ہو چلا تھا آندھی آنے کے بعد بارش کی ہلکی پھوار سے گرد بیٹھ چکی تھی۔ ”کاش کہ انسانی جذبول اور ذہنوں پہ بھی جی گردیوں صاف ہو جائے۔“ ایک خاموش خود کلامی اس کے اندر ابھری تھی۔ وہ اک گہرا سانس بھرتے ہوئے یونہی چلتی گولائی میں بنی منڈیر سے نیچے جھانکنے لگی۔ اس کھلے سے بڑے صحن کے ایک طرف بنے باغیچے میں اس وقت اک رونق کا سماں تھا۔ ابو اور نایا مٹولے تازے بکروں کو گھیرے کھڑے تھے۔ گھر کے جملہ افراد خانہ بھی چروں پہ خوشی لیے بکروں کی سیوا کرنے میں مصروف تھے۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جس نے اس کے ہونٹوں سے ہنسی نوچ لی تھی۔ ایک بار پھر اسے سوچتے اس کا دل دکھ سے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے منڈیر سے پیچھے ہٹتے ہوئے کسی سے ٹکرائی۔ وہ فوراً ”مڑی تھی۔ آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں کے



سامنے جو منظر تھا اسے دیکھ کر اس کے لب بھیج گئے۔  
اس سے پہلے کہ وہ اس کے پہلو سے نکل جاتی اس نے  
دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روکا تھا۔

”پلیز میری بات سن لو۔“ اس نے جیسے التجا کی۔  
رکنے کا نہ موقع تھا نہ موڑ۔ نیچے سب جمع تھے کسی کی  
بھی توجہ اس کی غیر موجودگی کی طرف جاتی تو اسی وقت  
ہر کارے دوڑا دیے جاتے وہ کسی بن بانی بدنامی کا حصہ  
نہیں بننا چاہتی تھی اور اب اسے کیا بات کرنی تھی؟  
اس دن تو ساری باتیں ختم کر کے گیا تھا۔ سارے تیر  
چلا کر۔ اب کیا زخم شمار کرنے تھے یا مزید آزار  
برہانے تھے اسے گھورتے جانے کیا کیا سوچے گئی۔  
انتاہی تو زور درج ہو رہی تھی وہ اس دن سے۔ آنکھوں  
کے آگے تنی دھند کی چادر دو آنسوؤں کے قطرے  
چھلک جانے سے صاف ہو گئی تھی۔

”یار! سوری۔ تمہیں ہرٹ کیا نا۔“ اس کے  
چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے ہوئے وہ جلدی سے بولا۔  
مبادا وہ اسے دکھیل کر چلتی ہے۔

”کس بات کی سوری تو قیر! مجھے بے وقیر کرنے کا  
یا۔“ وہ تراخ سے بولی دونوں ہاتھ کمر پہ جمائے نظروں  
سے ہی اسے جھسم کر دینے والا انداز۔

”مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں نے ناحق تم سے  
زیادتی کی۔ تم اپنے نظریات میں بالکل درست ہو بس  
مجھے ہی ضد سوار ہو گئی تھی۔ تمہیں ستانے کی۔“ نرم  
لہجے میں اسے پیار سے تکتے وہ ایک ہی سانس میں بولتا  
گیا۔

”ستانے کی یا جھکانے کی۔“ وہ تن کر کھڑی اس کے  
معذرتی الفاظ کا پوسٹ مارٹم کرتی اس کے دل میں  
کھینچنے لگی۔

”ہاں شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ تمہیں جھکانا ہی میرا  
مقصد تھا۔ اٹھے سروالی عورت کسی مرد کو اچھی نہیں  
لگتی۔ میں بھی روایتی مرد بن گیا تھا، لیکن آج ایک دم  
سے کسی میرے ہی جیسے مرد نے میرے مردانگی کے  
غبارے میں بھری ہوا نکال دی تو تمہارے کرب کا  
احساس مجھے بھنور گیا۔“

پچھتاوا اس کے ہر لفظ سے چھلک رہا تھا۔ بہت  
غور سے اس کی باتیں سنتی سائرہ کا اندر دھلنے لگا اسے لگا  
کہ وہ سرخرو ہو گئی تھی اپنی ہی نظروں میں۔

”مجھے فخر ہے کہ تمہاری فراست کی چادریں میں  
آکر میری لغزشیں چھپ جایا کریں گی۔ میری حماقتوں  
کو تمہاری نصیحتوں کا سہارا رہے گا۔ مجھے تمہاری  
ضرورت۔ تمہاری چاہت ہمیشہ چاہیے۔ ہر قدم  
پہ۔“ وہ سارا ہی کھل کے اس کے سامنے آگیا۔ کیا  
بچا تھا مزید سنانے کو۔ وہ سچ بول رہا تھا۔ یہ اس کا من  
جپ رہا تھا۔ وہ من گئی۔ مان گئی۔ سچی محبت کی  
طاقت کو خالص جذباتوں کا بھار بڑا بھاری ہوتا ہے۔ اور  
یہ بھار دونوں فریقین اٹھائیں تب ہی مڑا ہے ورنہ فریق  
واحد اس کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے، مطلع صاف  
ہو گیا تھا وہ ہلکی پھلکی ہو کر مسکرا دی اور ہاں میں سر ہلا  
دیا۔

محبت معتبر ٹھہری تھی۔ ایک بار پھر سے آسمان  
سے پھوار برسنے لگی تھی۔ دونوں نے سر اٹھا کر ایک  
ساتھ اوپر اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور ہنس  
دیے۔

ہستی پلاٹنگ



شہرہ بخاری

قیمت - 300/- روپے

کتب، عمران، انجسٹ: 37 - اردو بازار، گرامی - فون نمبر 32735021



# گنگا نالہ قتل کیس

## آٹھویں قسط

”ذیان میری خالہ کی بیٹی ہے میری منگیتر ہے۔ آخر مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کیوں مجھے ملنے سے روکا جا رہا ہے۔“ نوارہ جو کہ وہاب کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جھنجھلا سا گیا۔

”خدا بخش گیٹ کھولو میں خود ان کو اندر لے جاتی ہوں۔“ وہ یکدم اضطرابی انداز میں بولی۔  
”لیکن ملک صاحب ناراض تو نہیں ہوں گے۔“ گارڈ ابھی تک تذبذب میں تھا۔

”نہیں ناراض ہوتے میں خود اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔“ نہیلہ نے وہاب کی طرف اشارہ کیا تھا، ناچار اس نے گیٹ کھول کر وہاب کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہاب ادھر ادھر دیکھتا دل ہی دل میں خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔ ملک محل کی شان و شوکت کا رعب اس پہ طاری ہو چکا تھا۔

”ذیان کی تو شادی ہو چکی ہے ملک ایک کے ساتھ اس حویلی کے مالک کے ساتھ۔“ نہیلہ نے انکشاف کرتے ہوئے بغور اس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھے۔ وہ ایک دم یوں اچھلا جیسے بچہ نے ڈنک مارا ہو۔  
”یہ کیسے ممکن ہے ہو ہی نہیں سکتا میں اور ذیان ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں وہ بھلا کسی اور سے کیسے شادی کر سکتی ہے۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس دوران وہ دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ نہیلہ اسے بٹھانے کے بعد عنیدہ بیگم کو اطلاع کرنے چلی گئی۔

نہیلہ خراماں خراماں چلتی گیٹ سے باہر نکلے۔ آج اس کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی تھی۔ اچھی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت تک تو وہ سلائی کڑھائی کے مرکز کے آئس میں بیٹھی ہوتی تھی ناشتا کیے بغیر وہ تیار ہوتی۔ گیٹ سے باہر گارڈ ایک نوجوان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

”مجھے فوری طور پہ ذیان سے ملنا ہے۔ آپ مجھے اندر جانے دیں۔“ نوجوان کا انداز بے حد لجبخت بھرا اور التجائیہ تھا۔ نہیلہ کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ غور سے نوارہ کو دیکھنے لگی۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ نوجوان خاصا معقول اور مہذب نظر آ رہا تھا، لیکن نہیلہ نے پہلے اسے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ گارڈ اسے اندر لے جانے میں متاثر نظر آ رہا تھا۔ ملک ارسلان کی طرف سے کسی اجنبی کے لیے ملک محل کا گیٹ کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے گارڈ پس و پیش کر رہا تھا پر وہ نوجوان بار بار بے تکلفی سے ذیان کا نام لے رہا تھا یہ بات نہیلہ کو چونکا نے کا باعث بن رہی تھی۔

ملک ایک تو صبح سویرے ہی شہر کے لیے نکل چکا تھا، ورنہ وہ اس نوارہ کو ملک ایک سے ملنے کا مشورہ دیتی، ذیان کا شوہر اس کے جملہ حقوق کا مالک تھا ایک اجنبی نوجوان کے منہ سے ذیان کا نام سن کر جانے وہ کیا محسوس کرتا۔

”ملک صاحب کی طرف سے کسی اجنبی کو حویلی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔“ گارڈ کا لہجہ بدستور سخت تھا۔



کے پیچھے کھڑی باری باری ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔  
 ”کون ہو تم اور کس لیے یہاں آئے ہو؟“ ان کی  
 شخصیت کی طرح آواز میں بھی عجیب سا وقار اور نرمی  
 تھی۔ ”میرا نام وہاب ہے ڈیان سے ملنے آیا ہوں۔“  
 وہاب نے اعتماد کی کمزور پڑتی ٹوڑ کو مضبوطی سے تھامنے  
 کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ عنبرہ کے ماتھے پر  
 ناگواری کی شکنیں ظاہر ہوئیں جیسے انہیں اس کے  
 منہ سے ڈیان کا نام سننا اچھا نہ لگا ہو۔

وہاب ڈرائنگ روم میں بچے قیمتی فرنیچر کا جائزہ لینے  
 میں مصروف تھا جب عنبرہ اندر داخل ہوئیں۔  
 وہاب انہیں دیکھتے ہی بے اختیار اپنی جگہ سے کھڑا  
 ہو گیا۔ موسم کے لحاظ سے اس کے کمرے کے سوتی کپڑوں  
 میں ملبوس چادر لیے وہ بے انتہا بارعب اور خوب  
 صورت نظر آرہی تھیں۔ ان کے نقوش میں نمایاں  
 طور پر ڈیان کی جھلک موجود تھی۔ انہوں نے ہاتھ کے  
 اشارے سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نہیں صوفے





نہیں کے لیے بہت مفید تھیں۔



گھر لوٹتے ہی ملک ارسلان کو کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ کیونکہ عنیزہ کے چہرے پہ بے پناہ پریشانی چھائی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہوئی ہے میرے بچھے۔ میں تمہیں اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا صبح۔“

”واقعی میں بے حد پریشان ہوں آج وہاب آیا تھا زیان سے ملنے۔“ وہ دونوں ہاتھ مسل رہی تھیں۔

”کون وہاب؟“ فوری طور پہ ملک ارسلان کو یادداشت کا خانہ کھنگالنے کے باوجود بھی وہاب نامی شخص یاد نہ آسکا۔

”آپ کو سب بتایا تھا تو میں نے جب زیان کو آپ خود جا کر لائے تھے۔ بوارحمت نے مجھے وہاں کے سب حالات بتائے تھے صغریٰ اور نواز آکر ہم سے ملے تھے آپ کو یاد نہیں ہے؟“ وہ اچھے سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ارسلان کو فوری طور پہ سب یاد آگیا۔

”میری بیٹی پہلے ہی ان کے ہاتھوں زد تھی۔ اب وہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ جہانگیر بھائی اور ایک کو زیان کے گزشتہ معاملات پتا نہیں ہیں اس لیے مجھے عجیب سا ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے وہاب کو فوراً یہاں سے چلا کیا ہے اگر اس کی ملاقات میری جگہ جہانگیر بھائی، افشاں بھابی یا ایک سے ہو جاتی تو کیا ہوتا!! وہ کیا سوچتے زیان کے بارے میں۔ کیونکہ وہ اس کے ماضی سے آگاہ نہیں ہیں اس کی مشکلات کا انہیں اندازہ نہیں ہے جو اپنے سکے باپ کے پاس رہتے ہوئے اس نے برواشت کی ہیں۔ میں پہلے ہی کرائیسس میں ہوں ملک صاحب۔ زیان کا علاج کر رہے ہیں جلالی ہال۔ اس مرحلے پہ وہاب والی بات کھلتی ہے تو سوچیں کیا ہوگا۔“ عنیزہ رو دینے کو تھیں۔

”سب سے پہلے تم یہ غلط فہمی دور کر لو کہ زیان صرف تمہاری بیٹی ہے۔ وہ اب ہماری بیٹی ہے۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے خود کو مجھ سے الگ مت کیا کرو نہ سمجھا

”تم ہو کون کیا رشتہ ہے تمہارا زیان سے؟“

”زیان میری خالہ زرنہ امیر علی کی بیٹی ہے میری منگیتر ہے پچھلے چند ماہ سے میں زیان کو پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہوں۔ خالہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں اور زیان بھی۔ اس لیے مجھے بتائے بغیر یہاں آپ کے پاس چلی آئی ہے۔ آپ مجھے اس سے ملوادیں میں بہت پریشان ہوں۔“ وہاب کے لہجہ میں پریشانی اور اعتماد تھا۔ عنیزہ اب بھی نگاہوں سے اسے تکتے لگیں۔

بوارحمت نے ہی صغریٰ اور نواز کی معرفت ان سے رابطہ کیا تھا۔ پھر عنیزہ کی خود بوارحمت سے بات ہوئی انہوں نے امیر علی کے انتقال اور زیان کی مشکلات کے حوالے سے کھل کر بات کی تھی۔ زیان کو فوراً یہاں سے لے جانے کی درخواست کی تھی اور اب یہ وہاب جانے کیوں اس کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچانے آیا تھا۔ عنیزہ کی سوچ تیزی سے کام کر رہی تھی۔

اس دوران انہیں نہیں کی یہاں موجودگی کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تجسس آمیز دلچسپی سے وہاب کی سب باتیں سن رہی تھی۔

”زیان کی شادی ہو گئی ہے اور بوا مجھے سب حالات سے آگاہ کر چکی ہیں۔ میں بہت نرمی سے بات کر رہی ہوں۔ عزت سے واپس چلے جاؤ اور آئندہ تمہاری زبان پہ میری بیٹی کا نام نہیں آنا چاہیے۔“

”یہ کہتے ہی عنیزہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ صد شکر اس وقت حویلی میں ملک جہانگیر، ملک ارسلان یا ملک ایک میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں تھا۔

عنیزہ دروازے کی طرف مڑیں نہیں کو وہاں دیکھ کر انہیں پہلی بار اس پہ غصہ آیا مگر وہ ”مصلحتاً“ پی گئیں۔

”میں نہیں باہر کا راستہ دکھاؤ۔“ وہ تحکم آمیز لہجے میں بولتیں ڈرائنگ روم میں سے باہر نکل گئیں۔

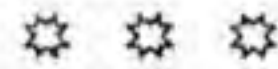
نہیں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس میں اور وہاب میں بہت سی معلومات کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ خاص طور پہ یہ معلومات



کرو۔ ہمارے دکھ سکھ ایک ہیں خوشیاں سانبھی ہیں۔ رہی بات زیان کی تو میں اس کا بل بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے اپنی بیٹی پہ تم پہ پورا یقین ہے۔“

”زیان بوار رحمت سے بہت الیچ ہے اور دل ہی دل میں کلنی پریشان بھی ہے وہ شادی میں بھی تو شریک نہیں ہوئی ہیں۔ آپ بوار رحمت کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ یہ آپ کا میری ذات پہ ایک اور احسان ہو گا۔ کیونکہ بوائے مجھ پہ بہت احسانات ہیں۔ میں ان احسانات کا بدلہ چکانا چاہتی ہوں۔“ وہ لجاجت سے گویا ہوئیں۔

”بیگم صاحبہ جو آپ کا حکم بندہ انکار کی جرات نہیں کر سکتا۔“ وہ انہیں ٹینشن سے نکالنے کے لیے قصداً ”ملکے پھلکے انداز میں بولے۔ وہ اس میں کامیاب رہے۔ کیونکہ عزیزہ مسکرا رہی تھیں۔



وہاب ٹہنل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ٹہنل انڈسٹریل ہوم میں تھی۔ ”ملک محل“ میں تو وہاب سے ملاقات کرنا مشکل تھا۔ اس لیے اس نے وہاب کو یہاں بلوایا تھا۔ وہ جس طرح مایوس و ناکام ہو کر ملک محل سے نکلا تھا اس کے بعد ٹہنل سے ملاقات اس کے لیے امیدوں کا مرکز ثابت ہوئی تھی۔ ٹہنل اسے کرید کرید کر ”زیان“ امیر علی زرینہ بیگم اور اس کے بارے میں سوال کر رہی تھی۔ وہاب نے بڑی تفصیل سے زیان کی گزشتہ زندگی کے ابواب ایک ایک کر کے اس کے سامنے کھولے تھے۔ ٹہنل کو زیان کے بارے میں کار آمد معلومات حاصل ہوئی تھی۔ وہاب سے ملاقات خاصی سودمند ثابت ہوئی تھی۔

”زیان اور میں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ میری خالہ نے ہمارے بیچ غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی کی ہے۔ ایک سازش کے تحت خالہ نے زیان کو یہاں بھیجا ہے اس کے بعد بوار رحمت کے ساتھ خود بھی روپوش ہو گئی ہیں۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔ زیان کو جب یہاں بھیجا گیا تو تب ہماری

شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہ انصاف نہیں ہے میری محنت کی شادی زبردستی میرے علم میں لائے بغیر کی گئی۔ میں آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ امیر خالو کی مرضی سے سب کچھ ہوا تھا۔ دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی ہم دونوں کی۔“ وہاب نے پوری طرح ٹہنل کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔

”میں تمہاری پوری پوری مدد کروں گی۔ پر اس کے لیے تمہیں میری ہدایات پہ عمل کرنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ زیان کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ وہ جوش سے بولا۔ ”اب تم جاؤ کل اس وقت ہم یہاں سے شہر کے لیے روانہ ہوں گے۔ ہم دونوں بہتر طور پہ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔ تمہیں زیان اور میرا ایک مجھے مل جائے گا۔“ آخری جملہ ٹہنل نے دل میں کہا۔

وہاب نے تو اس کی ساری پراہیز ہی حل کر دی تھیں۔ ورنہ ایک کا حصول اسے دنیا کا ناممکن ترین کام لگ رہا تھا۔ اندرونی بیجان اور اضطراب سے اس کی رنجت سرخ ہو رہی تھی۔ جانے سے پہلے اسے ایک کو کال کرنی تھی۔ آخر کو اسے وہاب کی آمد کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس کے بعد ملک محل میں رکنا بے کار تھا۔ اسے اب ایک نئے نام اور نئے چہرے کے ساتھ ملک ایک سے ملنا تھا۔ ٹہنل نامی شخصیت کے ساتھ وہ ایک کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا حصول دشوار تھا۔ ہاں رنم کو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ رنم جو خوب صورت دلکش و حسین تھی۔ دولت مند تھی۔ اسے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا تھا۔ اسے اب واپس احمد سیال کے پاس جانا تھا۔ اسے دوبار اپنے سامنے دیکھ کر انہوں نے اسے یقیناً ”معاف کر دینا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ٹہنل کے لہاوے اور چہرے سے وہ ویسے بھی تنگ آچکی تھی۔ اسے اب نئی شخصیت کے ساتھ ملک محل میں دھوم دھام سے واپس آنا تھا۔ بس رنم کے چہرے کے ساتھ پھر سے ایک کی زندگی میں زور دار انٹرکینی تھی۔ وہاب ملک



محل سے نکل کر اس کے ساتھ ہی یہاں تک آیا تھا۔  
اب کل اسے یہاں سے وہاب کے ساتھ ہی روانہ ہونا  
تھا وہ بہت خوش تھی۔



جلالی بابا زیان کے علاج کے لیے کامیابی سے چلہ  
کٹ رہے تھے ایک کے جانے کے بعد سے لے کر  
اب تک زیان بالکل ٹھیک رہی تھی۔  
جلالی بابا کے ٹرانس میں اگر عنہزہ بیگم نے گھر لو  
باتیں بھی انہیں بتادی تھیں۔ اپنی امیر علی سے شادی کا  
احوال زیان کی پیدائش، امیر علی سے علیحدگی، جوان  
ہونے کے بعد زیان کی خود سے نفرت سب کچھ ہی تو  
جلالی بابا کے علم میں آچکا تھا۔ جلالی بابا نفسیات انسانی  
کے ماہر تھے۔

زیان تو سونے کا اینڈا دینے والی مرغی ثابت ہوئی  
تھی۔ چلے کے دوران انہوں نے عنہزہ بیگم کے ساتھ  
ساتھ افشاں بیگم سے بھی خوب مل بانی بنوڑا تھا۔ محل  
میں آنے کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ حالانکہ گھر کے تینوں  
مردوں کو جلالی بابا کے طریقہ علاج سے اختلاف تھا۔  
ملک جہانگیر اور ملک ارسلان دونوں بھائی اپنی اپنی  
بیویوں کی وجہ سے خاموش تھے اور ملک ایک افشاں  
بیگم کی وجہ سے چپ تھا۔ ورنہ اس نے جب رات کو  
زیان کو جلالی بابا کے گھرے میں دیکھا تھا اس کا جی چاہ رہا  
تھا کہ مار مار کر بابا کا حلیہ ہی بگاڑ دے۔ بھلا زیان کو تنہائی  
میں آدھی رات کو بلا کر کون سا علاج ہوتا تھا۔ اس کی  
حساس حس شامہ نے جلالی بابا کے گھرے میں قدم  
رکھتے ہی ایک مخصوص بو فوراً محسوس کی تھی۔ اگرچہ  
یہ بہت ہی خفیف سی تھی لیکن اس نے جان لیا تھا کہ  
یہ شراب کی بو ہے۔ جلالی بابا نے قالین کے اس حصے  
جہاں بوتل ٹوٹی تھی وہاں انگلیٹھی کے انگارے پھینکے  
تھے تاکہ کسی کو شک نہ ہو لیکن اس احتیاط کے باوجود  
بھی ایک کو معلوم ہو گیا تھا۔ تب ہی تو اسے شدید غصہ  
آیا تھا۔ جلالی بابا کی گھبراہٹ اور خوف و ہراس اس نے  
گھرے میں قدم رکھتے کے ساتھ ہی محسوس کیا تھا بعد

ازاں زیان کے جن کی وجہ سے بابا کو خود کو سنبھالنے کا  
موقعہ مل گیا۔ ایک زیان کی طرف سے بے خبر نہیں  
تھا اس نے حویلی میں کام کرنے والے اپنے ایک اعتماد  
کے بندے کی ڈیوٹی لگائی۔

ایک کا یہ ملازم انور بہت سمجھدار تھا۔ وہ کسی کی  
نظروں میں آئے بغیر جلالی بابا کی سرگرمیوں کی نگرانی  
کر رہا تھا۔ اگر جلالی بابا زیان کو دوبارہ تنہائی میں طلب  
کرتا تو اس موقعہ پر اسے لازمی اپنی موجودگی ثابت کرنی  
تھی ایک طرح سے وہ زیان کی حفاظت کر رہا تھا۔

ایک نے اپنے ایک پولیس ڈپارٹمنٹ میں موجود  
قریبی دوست کو عامل جلالی بابا کے بارے میں تفصیلات  
مہیا کر دی تھیں اب باقی کام اس کا تھا، بہت جلد اس کے  
ہاتھ جلالی بابا کی موتی چڑھیلی گردن کو ٹاپنے والے تھے۔

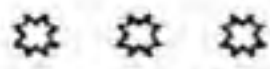


عامل جلالی بابا زیان کے علاج کے آخری مرحلے  
میں تھے اس نے شکر ادا کیا تھا کہ باباجی نے پھر اسے  
اکیلے اپنی خلوت میں طلب نہیں کیا۔ اس رات زیان  
نے باباجی کی آنکھوں میں ٹاپتی ہوس فوراً محسوس  
کر لی تھی۔ باباجی نے جو مشروب اسے پینے کے لیے دیا  
تھا وہ اس نے پھینک دیا تھا بوتل ٹوٹ گئی تھی۔ باباجی  
کی نگاہوں کا سحر اسے بے بس کرنا چاہ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا  
تھا کہ اس کا ذہن عامل جلالی بابا کے قبضے میں جا رہا ہے  
کیونکہ وہ ملک جھبکائے بغیر ان کی آنکھوں میں  
آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
انہوں نے اس کی چال اس پر آنے کی سعی لا حاصل  
کی تھی۔ زیان کچھ دیر اور ان کی آنکھوں میں دیکھتی  
رہتی تو وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو چکے  
ہوتے۔ وہ ویسے بھی انسانی نفسیات اور کمزوریوں سے  
پوری طرح واقف تھے پہلی بار ہی بھانپ گئے تھے کہ  
زیان ڈرامہ کر رہی ہے۔

زیان نے وہ بوتل کیا توڑی گویا باباجی کا ٹرانس توڑ دیا  
جس نے اس کے ذہن کو اپنے کنٹرول میں لیا ہوا تھا۔  
باباجی کے گل پہ لگنے والا پتھر اس بات کا ثبوت تھا کہ



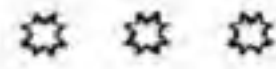
دن ٹی وی دیکھتیں اخبار پڑھتیں کہ شاید کہیں سے  
نہیں کی خبر مل جائے۔



احمد سیال کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔  
یقین تو رنم کو بھی اپنی آنکھوں پہ نہیں آ رہا تھا۔ احمد  
سیال زندہ سلامت اس کے سامنے موجود تھے اور وہ  
اپنے گھر میں تھی۔ وہ بھاگ کر پوری شدت سے ان  
سے لپٹی تھی۔ منظر تو پہلے ہی اس کی آنکھوں میں  
دھندلا رہا تھا اب یہاں سے گلے مل کر آنسوؤں کو بنے  
کا راستہ مل گیا تھا۔ اتنے ماہ کی دوری سخت زندگی اور  
اپنی ضد کے منہ منہ کے اس کے سب کس مل نکال  
دیئے تھے۔ وہ پاپا سے بے حد شرمندہ تھی ان سے  
نگاہیں تک نہ ملا پار ہی تھی۔ وہ اسے لپٹائے اس کا ہاتھ  
ہاتھ بل ہمارا جو متے اس کے ہونے کا یقین کرنا چاہ  
رہے تھے۔ وہ واقعی ان کی ملاؤں رنم تھی ان کا جگر گوشہ۔  
وہ تو تقریباً "مایوس" ہی ہو چکے تھے۔ اب ان پہ شادی  
مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ اتنے سارے دنوں  
کا احوال بل بھر میں معلوم کر لینا چاہ رہے تھے۔  
"پاپا میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گی پہلے اپنا گھر تو دیکھ  
لوں۔ میں نے اپنا گھر بہت مس کیا ہے۔" وہ بھگی بھگی  
آنکھوں سمیت مسکرائی۔ احمد سیال بھی مسکرا رہے  
تھے۔

"او میں تمہیں گھر دکھاتا ہوں۔ تمہارے بغیر تو  
میں جیسے مردہ ہو گیا تھا۔" احمد سیال نے اس کا ہاتھ پکڑ  
لیا تھا۔ وہ چپے چپے گوشہ گوشہ دیکھ رہی تھی۔ خوش  
ہو رہی تھی۔ نہیں بن کر اس نے جو زندگی گزار  
تھی وہ بہت قابل رحم اور مشکل تھی۔ وہ سوچ رہی تھی  
جیسی زندگی اس نے گزارا ہے ویسی زندگی گزارنا وہ  
بھی نہیں بن کر بہت مشکل ہے۔ جبکہ احمد سیال کی  
بٹی کی حیثیت سے اس نے سپر لکڑی لائف انجوائے  
کی تھی وہ اس کے بغیر رہی نہیں سکتی تھی۔ ملک محل  
میں نہیں کی حیثیت سے اس نے اچھی طرح جان لیا  
تھا۔

وہ مکمل طور پر ٹرانس سے باہر آ چکی ہے۔ اس کی عزت  
جلالی بابا جیسے گھیرے سے بچ گئی تھی۔ جلالی بابا نے اس  
کی عقل کی آنکھیں کھول دی تھی۔ تب ہی تو اس  
رات ایک کے سامنا ہونے کے بعد سے اس پہ آتم  
توش نہیں آیا تھا۔ اس نے آخری بار ملک ایک کو اپنا  
رنگ دکھایا تھا۔ عنیزہ بے پناہ خوش تھیں عامل جلالی  
بابا واقعی بہت پہنچے ہوئے تھے۔ زبان کے جن کو قابو  
کر لیا تھا۔ وہ اب پارل طریقے سے معاملات زندگی  
میں حصہ لے رہی تھی۔



نہیں ملک محل سے غائب ہو گئی تھی۔ اس کے  
کمرے سے اس کے ہاتھ سے لکھا ہوا پرچہ ملا تھا۔ اس  
نے بغیر کسی القاب و آداب کے بطور خاص کسی کو بھی  
مخاطب کیے بغیر لکھا تھا۔

"میں اپنی مرضی سے ملک محل چھوڑ کر جا رہی  
ہوں۔ میں اپنی زندگی اور حالات سے نیک آ چکی  
ہوں۔ مجھے اب مزید جینے کی تمنا نہیں ہے۔ میں اپنے  
ہاتھوں زندگی کا خاتمہ کروں گی۔ میں گناہ موت مرنا  
چاہتی ہوں اس لیے برائے مہربانی مجھے تلاش کرنے کی  
کوشش نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ کوشش بے کار ثابت  
ہوگی میں یہاں سے نکل کر پہلی فرصت میں اپنی زندگی  
ختم کروں گی۔"

فقط بد نصیب نہیں۔

خط پڑھ کر عنیزہ کا تو جو حال ہوا سو ہوا بیان بھی  
پریشان ہو گئی۔ افشاں بیگم بھی رو ہانسی ہو رہی تھیں۔  
ملک ارسلان اور ملک جہانگیر نے اسے قریب کے  
علاقوں میں تلاش کروانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ جس  
طرح ایک دن اچانک ملک محل میں آئی تھی اس طرح  
اچانک غائب بھی ہو گئی تھی۔ اس کا کوئی اتنا کسی کے  
پاس نہیں تھا۔ اس کی اصل حقیقت اس کی محسن  
عنیزہ تک کو معلوم نہ تھی جو اسے ہوٹل سے بچا کر  
اپنے ساتھ لائی تھیں۔ ملک محل میں کل دن انہیں  
کے جانے کے بعد سوگوار چھائی رہی۔ عنیزہ تو پورا



پاپا اس کی باتوں میں آکر کسی کے ساتھ اس کی شادی کر بھی دیتے تو یقیناً "اس کا انجام حسرت ناک ہوتا۔ یعنی وہ صرف اس کی سوچ تھی بچکانہ سوچ کہ وہ پاپا سے شادی کے بعد کچھ بھی نہیں لے گی۔ اب سوچتی تو جھڑ جھری آتی۔ سہولیات اور اختیار کے بغیر بھی زندگی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ اور اختیار دولت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ملک محل میں خادمہ کی زندگی نہ گزارتی۔ اب وہ بھی ملک محل کے مکینوں کی ہم پلہ ہو گئی تھی۔

احمد سیال کو اس نے حرف بہ حرف سب داستان کہہ سنائی تھی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے ماہ وہ ملک جہانگیر کی حوٹلی میں رہی اور انہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ کاش دوست کی دعوت پہ وہ ایک کی شادی میں چلے جاتے۔ معاذ کے پاکستان آنے پہ چلے جاتے تو انہیں اتنی اذیت نہ اٹھانا پڑتی۔ رنم ان کے اتنے پاس رہ کر بھی دور رہی تھی۔ وہ انہیں کڑے دنوں کا حسرت ناک احوال سن رہی تھی۔

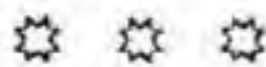
"پاپا آپ کی بیٹی نے وہاں خادمہ کی سی زندگی بسر کی ہے۔ ایک آواز پہ بھاگ بھاگ کے کام کیے ہیں۔ ملازموں کی نگرانی کی ہے دیکھ بھال کی ہے۔ پاپا وہ ایک خواب تھا بھانک خواب۔ میں یہ خواب پھر بھی نہیں دیکھنا چاہوں گی۔ پاپا یہاں ہمارے گھر میں اتنے ملازم ہیں جبکہ وہاں میں خود نوکرانی تھی۔ پاپا یہاں میں پانی مانگ کر پیتی تھی جبکہ وہاں۔۔۔" رنم بھی ہوئی آواز کی وجہ سے اس سے بات بھی مکمل نہ کی گئی۔ احمد سیال نے اس کا راسخنے سینے سے لگا لیا۔ ان کا اپنا دل شدت غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

"میرے بچے ملک جہانگیر نے تمہارا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے ہی تو مانگا تھا۔ میں تمہیں عزت سے دھوم دھام سے رخصت کر کے ملک محل میں بھیجنا چاہ رہا تھا جبکہ تم ضد میں آکر غلط طریقے سے وہاں پہنچی۔ ملک ایک نے کسی بھی قسم کا جینز نہیں لیا تم یہی چاہتی تھی ناں کہ تمہیں صرف تمہارے حوالے سے

قبول کیا جائے۔ تم ایک بار میری بات مان لیتیں تو ایک مضبوط حوالہ لے کر ملک محل میں جاتیں۔ مگر تم نہیں بن کر گھر سے اپنی ضد کی خاطر نکلیں اور سب کچھ گنوا دیا۔" احمد سیال جیسا مرویٹی کا دکھ سہ نہیں پایا تھا۔ وہ دور سے تھے۔ رنم بھی تو دور ہی تھی۔ اس کے دل کو جیسے کوئی سینے میں کسل رہا تھا۔ زبان کی جگہ وہ بھی تو ہو سکتی تھی ملک ایک نے زبان کو ایسے ہی تو قبول کیا تھا۔ وہ بیوی جیسا مضبوط اور باعزت حوالہ لے کر اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اور رنم نے پا کر بھی سب کچھ گنوا دیا تھا۔ دونوں باپ بیٹی اپنے نقصان پہ رو رہے تھے۔

بہت دن بعد رنم اپنے بیڈ روم میں گئے بیڈ پہ تھی۔ اس کا جہازی سائز بیڈ پردے کا ہیٹ ڈیکوریشن پیرس کھڑکی سے باہر دکھائی دینے والے سرسبز مناظر۔ کچھ بھی تو نہیں بدلاتھا۔ حتیٰ کہ اپنا سیل فون جو گھر سے جاتے وقت وہ آف کر گئی تھی ویسا ہی پڑا تھا۔ اس نے عنیزہ بیگم کا دیا ہوا سیل فون بیک سے نکالا۔ سیل فون ہاتھ میں لیتے ہی اس کے لبوں پہ مسخرانہ مسکراہٹ آگئی۔ اس میں ایک وہاب زبان، عنیزہ اور دیگر ملک محل کے مکینوں کے فون نمبر تھے۔ ورنہ وہ یہ کبھی بھی اپنے ساتھ نہ لاتی۔ احمد سیال کی بیٹی کا ذوق ایسا غریبانہ اور تھرڈ کلاس تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اس نے نمبر ڈائری میں نوٹ کر کے سیل فون کمرے میں پڑے آرائشی ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ ایسے اب اس کھٹیا کم قیمت فون کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اپنے بیڈ روم میں بیڈ پہ لیٹتے ہی اسے چین آگیا۔ کل تک وہ ملک محل میں تھی سرونٹ کو ارٹرز کے ایک کمرے میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ اب وہ اپنے اصل ٹھکانے پہ لوٹ آئی تھی۔



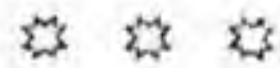
عنیزہ زبان کو لے کر افشاں بیگم کے پاس آئی تھیں۔ زبان نے اتنے ہفتے بعد سسرال میں قدم رکھا تھا وہ بھی بالکل تندرست و توانا ہو کر وہ آتم توش کی قید



سے آزاد ہو چکی تھی۔ ان کے لیے یہ خوشی بہت بڑی تھی۔ انہوں نے شکرانے کے نوافل ادا کر کے بسو کی نظراتاری اور صدقے کے بکرے ذبح کروائے۔ زیان بھی سنوری بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ انہوں نے دل کی گہرائیوں سے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

زیان سب کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ گھر واپس آتے ساتھ ہی اس نے اپنے اور ایک کے مشترکہ بیڈروم کی سیٹنگ تبدیل کروائی۔ اپنے سارے کپڑے الماری میں رکھے۔ زیر لب گنگنائے ہوئے وہ بے حد مسرور تھی۔

افشاں بیگم نے گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا۔ یہ وہی پہلے والی زیان تھی جسے انہوں نے ایک کے لیے پسند کیا تھا۔ آتم توش اس کے اور ایک کے درمیان سے ہٹ چکا تھا۔ دو دن بعد عنیزہ، ملک ارسلان، ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کو دوسرے شہر ایک شادی میں جانا تھا۔ انہیں تین چار دن وہاں قیام بھی کرنا تھا۔ پہلے افشاں بیگم تذبذب میں تھیں جا میں کہ نہ جائیں۔ اب زیان ہی خوشی اپنے گھر واپس آ چکی تھی تو انہوں نے تیاری شروع کر دی۔ ان کے جاتے ہی ایک نے آہنا تھا اس لیے زیان کو ساتھ لے جانے کے لیے انہوں نے اصرار نہیں کیا۔



ملک جہانگیر، ملک ارسلان، افشاں بیگم اور عنیزہ کے ہمراہ تیار ہو کر ملک محل سے جا چکے تھے۔ ملک ارسلان نے اپنے جانے کی اطلاع ملک ایک کو کر دی تھی۔ اس نے یقین دہانی کروائی تھی کہ رات سے پہلے پہلے گھر زیان کے پاس پہنچ جائے گا۔

ملک ایک اس پل اس دن اس ساعت کے انتظار میں تھا۔ زیان سے دو دو ہاتھ کرنے کا ٹائم آ گیا تھا۔ سب کے سامنے ایک کو دیکھتے ہی اس کا جن جلال میں آجاتا تھا۔ دوروں میں بھی جان اور شدت بڑھ جاتی۔ وہ زیان کو سب کی موجودگی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن آج اکیلے میں یہ کام اس نے آسانی سے

انجام دے لیتا تھا۔ قدرت نے یہ موقعہ بن مانگے فراہم کر دیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت کے زمرے میں آتا۔ وہ جلد از جلد ملک محل پہنچنا چاہ رہا تھا۔

آنے سے پہلے اس نے اپنے ہوشیار ملازم انور کو فون کر کے کہا کہ آج رات سب ملازمین کو کسی بہانے رہائشی عمارت سے دور رکھے۔ انور بہت تیز تھا اس نے اسی وقت سوچ لیا کہ یہ کام کس طرح کرنا ہے۔ اس نے بیٹے کا عقیقہ کرنا تھا۔ ملک ارسلان اور ملک جہانگیر خود اس کے گھر جا کر نو مولود کو تحفے تحائف دے آئے تھے آج شام کو اس نے خود بھی گاؤں جانا تھا۔ ملک ایک کی کل آنے سے پہلے وہ چھوٹی لی لی زیان کے پاس اجازت لینے ہی جا رہا تھا۔ اب کل آنے کے بعد اس نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی ترمیم کر لی تھی۔ ملک محل میں کام کرنے والے سب ملازمین کو اس نے اپنے گھر ہونے والی دعوت میں شرکت کی دعوت دی انور کی سب کے ساتھ بہت ہمتی تھی۔ اس لیے جب زیان سے اس نے بات کی تو اس نے بخوشی سب ملازمین کو دعوت میں شرکت کے لیے چھٹی دے دی۔ ایک رات ہی کی تو بات تھی۔

گیٹ پہ دو دو گاڑو تھے خود عنیزہ کی طرف زیبا اور فریدہ تھیں جو گھر کی حفاظت کے نقطہ کے نظر سے انور کی دی جانے والی دعوت میں شریک نہیں ہوئیں۔ عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھا کر اوپر بیڈروم میں آ گئی تھی۔ زیبا اور فریدہ نے اسے پیش کش کی تھی وہاں اس کے ساتھ رکنے کی مگر اس نے انکار کر دیا کیونکہ گیٹ پہ چاقو بوند گاڑ موجود تھے۔ فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔

رات دس بجے کا وقت تھا جب ملک محل کے گیٹ کے سامنے ملک ایک کی گرے ہجھوڑ کی گیٹ پہ موجود گاڑوں نے اسے دیکھ کر زوردار سلام جھاڑا۔ گھر کا مالک آگیا تھا اب وہ دونوں مطمئن تھے۔ ملک ایک نے گیٹ سے ہی ڈرائیور کو ہجھوڑ سمیت ڈیڑے کی طرف روانہ کر دیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ رہائشی



اندرونی عمارت میں داخل ہوا۔ اس کی چال میں ہمیشہ کی طرح وقار اور اعتماد تھا۔ سب اندرونی لائیں آن گئیں۔

دوسری منزل بھی روشن تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر اپنے بیڈروم کی طرف دیکھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ اس کے بیڈروم کا دروازہ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا۔ زبان نے ابھی تک لاگ نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک اندر نہیں گیا تھا۔ اس لیے زبان کی سرگرمیوں سے لاعلم ہی تھا۔



ایک نے بہت آرام سے کوئی آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا۔ کمرے میں خوشگوار حرارت پھیلی ہوئی تھی باہر کے مقابلے میں اندر کا درجہ حرارت معتدل تھا۔ زبان بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ٹیپ ٹاپ گود میں رکھے مصروف عمل تھی۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز بے تکلف آرام و حلیے میں تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس وقت ایک آسکتا ہے۔ اس نے قدم برہائے اور اپنے پیچھے ہاتھ مار کر دروازہ بند کیا۔ آہٹ اور دروازہ بند ہونے کی آواز پہ زبان نے نگاہیں اٹھائیں۔

ملک ایک مضبوط پر اعتماد قدموں سے چلتا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ بے انتہا خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اچانک اس طرح وہ اس کے سامنے ہو گا۔ وہ چیخ مارنا چاہتی تھی پر اسے دیر ہو گئی تھی۔ ایک اس کے منہ پہ اپنا مضبوط ہاتھ رکھ چکا تھا۔ ایک کا ایک ہاتھ بازو سمیت اس کے کندھے کے گرد لپٹا ہوا تھا اور دوسرا مضبوط ڈھکن کی مانند اس کے منہ پر جمنا تھا۔ نہ وہ بھاگ سکتی تھی نہ منہ سے آواز نکال سکتی تھی۔ غنیمت تھا کہ وہ ناک سے سانس لے رہی تھی ایک کی مضبوط گرفت میں اس کا دم گھٹ رہا تھا اس کا نازک وجود گویا چر مرا کر رہ گیا تھا۔

شاید ایک اسے مارنے آیا تھا۔ خوف کسمپرسی و بے چارگی و رماندگی نے اس کی حالت قاتل رحم بتا دی

تھی۔ اس وقت وہ بھی سوچ سکی تھی یقیناً "سب اس سازش میں شریک تھے تب ہی تو اسے گھر میں اکیلا چھوڑا گیا تھا تاکہ ملک ایک کو اپنے منصوبے پہ عمل کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"بعد میں جتنا مرضی چاہے چیخ لیتا ڈرامہ بازی کر لیتا ابھی مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" ایک اس کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لگا کر بولا۔ اس کی آواز اور الفاظ میں شدید قسم کا غصہ تھا۔ اسے یقین تھا اب وہ شور نہیں کرے گی کیونکہ ملک ایک کے الفاظ اور تاثرات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اب اداکاری سے کام نہیں چلے گا وہ اس کی ڈرامہ بازی سے واقف تھا۔ ایک نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا تھا وہ اب اس سے دور بیٹھا تھا۔ اس کے بولنے کے انتظار میں تھا جو اب ہاتھ پاؤں چھوڑ کر مرے مرے انداز میں بیٹھی تھی جیسے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی معصوم گناہگار اور قاتل رحم و سزا نہیں ہے۔ ایک نے آج سے پہلے اسے تم کہہ کر کبھی بھی مخاطب نہیں کیا تھا آج اس کا ہر انداز بدلا ہوا تھا۔ یقینی طور پر وہ غیظ و غضب میں بھرا ہوا آیا تھا۔

"میں وجہ جان سکتا ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا۔ کیوں ڈرامہ رچایا۔ ایسی کیا مشکل تھی جو تم نے ہم سب کو ذہنی عذاب میں ڈالا۔" وہ بڑی کوشش کے بعد اپنے لہجہ کو نارمل کر لیا تھا۔ جواباً "وہ خاموش رہی اس کا وہ حل تھا جیسے کانٹو بدن میں لہو نہیں۔ نگاہیں جھکی ہوئی۔ جیسے وہ اس کے بجائے دیواروں سے مخاطب ہو۔

"کچھ بھی کرنے سے پہلے سوچ لیتا کہ گھر میں اس وقت باہر گیٹ پہ موجود گارڈز کے علاوہ کوئی نہیں ہے میں نے سب کو چھٹی دے دی ہے۔ اور ویسے بھی تمہارے ڈرامے اور اداکاری سے متاثر ہونے والے یہاں نہیں ہیں۔" اس کا اشارہ افشاں بیگم اور ملک جہانگیر کی طرف تھا۔ زبان کٹ سی گئی۔

"اس لیے سچ بولنا اور کوئی الٹی حرکت مت کرنا۔"



ایک نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو اس نے ہراساں  
رحم طلب نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا۔ ایک کی  
نگاہوں میں ترحم یا ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔  
”شباباش بولو جلدی جو بھی ہے۔ میں نے سونا بھی  
ہے سخت تھکا ہوا ہوں۔“ وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔

”میں نے سب کچھ ماما اور آپ کی وجہ سے کیا۔“  
اس کے حلق سے مری مری آواز برآمد ہوئی۔  
”گڈ آگے بولو۔“ وہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔  
”ماما مجھے چھوڑ کر آگئی تھیں میں نے اپنی عمر کا وہ  
حصہ بہت کرب اور اذیت میں بسر کیا ہے۔ مجھے ماما اور  
مما سے وابستہ ایک ایک شے ایک ایک رشتے سے چڑ  
تھی بچن میں آپ بھی شامل ہیں۔“ اب کی بار صاف  
لگ رہا تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

”گڈ اور بھی بتاؤ۔“ وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا۔  
ذیان بولتی چلی گئی بے ربط ٹوٹے پھوٹے فقرے جس  
کالب لباب یہی تھا کہ اس نے سب کچھ ماما اور ان کی  
تمام فیملی کو اذیت دینے کے لیے بدلہ لینے کے لیے  
انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر کیا ہے۔ اسے ملک  
محل کے سب افراد سے ماما کی وجہ سے شدید چڑ ہے۔  
ظاہر ہے ان میں ملک ایک بھی شامل تھا۔

ذیان اپنا پول کھلنے پہ شرمندہ تھی۔ ویسے بھی عامل  
جلالی بابا کی اندرونی خباثت سے واقف ہونے کے بعد  
اس نے فیصلہ کیا تھا کہ جلدی اس ڈرامے کا ڈراپ  
سین کرے گی اور کوئی نیا طریقہ سوچے گی مگر یہ جان کر  
کہ ایک شروع دن سے ہی واقف تھا وہ اب اس سے  
نگاہیں تک نہ ملا پا رہی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے  
بیٹھی تھی شرمندگی سے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زمین  
میں گھس جائے۔ ملک ایک کی پیشانی پہ لکیوں کا جال  
ساہنا ہوا تھا وہ گہری سوچوں میں کم تھا۔ وہ اسے انجان  
اور بے وقوف اور خود کو بہت بڑی چیز سمجھتی رہی جو  
اپنی دانست میں سب کے جذبات سے کھیل کر انہیں  
بے وقوف بنا رہی تھی اور وہ خود انجانے میں نتائج سے  
لا پرواہ ہو کر اتنی بڑی بے وقوفی کر رہی تھی۔

ایک نے بہت دیر بعد سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا

وہ اپنی سوچوں کے حصار سے باہر آ کر کسی نتیجے تک پہنچ  
چکا تھا۔

”ذیان“ آپ کو اب کوئی بھی ڈرامہ یا الٹی سیدھی  
حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے میری  
وجہ سے میری فیملی سے چڑ اور نفرت کی وجہ سے یہ  
سب کیا۔ جس وجہ سے بھی آپ نے یہ سب کیا اب  
آپ اس وجہ سے پریشان نہیں ہوں گی۔ یہ میرا وعدہ  
ہے۔ آپ کو مجھ سے بھاگنے کے لیے یا فیملی کو اذیت  
دینے کے لیے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔  
کیونکہ میں اپنے سے وابستہ کسی بھی رشتے یا شخص کو  
اذیت میں نہیں دیکھ سکتا۔ آپ پہلے بھی اپنی حماقت یا  
نفرت کی وجہ سے ہم سب کے جذبات سے کافی زیادہ  
کھیل چکی ہیں۔ میں آپ کو اور اس عمل کی اجازت  
نہیں دے سکتا۔

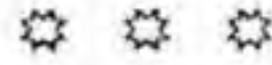
باقی جہاں تک عنیدہ چچی سے نفرت کی بات ہے تو  
دلوں کے حال اللہ جانتا ہے، لیکن ہم نے شروع سے  
ہی انہیں اپنی بیٹی کی یاد میں روتے تڑپتے دیکھا۔ انہیں  
دکھی دیکھ کر ارسلان چچا بھی پریشان ہوتے یہی وجہ ہے  
کہ جب عنیدہ چچی نے آپ کے بارے میں بات کی تو  
وہ پوری خوشی اور آمادگی سے خود آپ کو لینے گئے۔

انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ چچی کی دل جوئی  
کرتے رہے کہ کچھ بھی ہو جائے زندگی میں ایک بار  
کسی طرح بھی سہی انہیں ان کی بیٹی سے ملا دیں گے۔  
قدرت نے خود ہی آپ کو ملک محل میں پہنچا دیا۔ آپ  
کے آنے سے ہم سب نے سالوں بعد چچی کو خوش  
دیکھا مسکراتے دیکھا۔ اس سے پہلے ایسے لگتا تھا جیسے  
وہ خوش نظر آنے کا ڈرامہ کرتی رہی ہیں۔ ارسلان چچا  
خوش ہوئے انہوں نے بہت بار مجھے کہا کہ ذیان مجھے  
اپنی اولاد کی طرح پیاری ہے اگر اللہ مجھے بیٹی دے تو وہ  
ذیان جیسی ہوتی۔ یہ دونوں آپ سے بہت پیار کرتے  
ہیں۔ ان سچے رشتوں کی قدر کیجیے۔ ماضی پہ گڑھنے کی  
ضرورت نہیں ہے۔“ وہ نرم دھیمے پھوار برساتے لہجے  
میں بات کر رہا تھا۔ ایک ایک لفظ دل پہ اتر کر رہا تھا۔  
اس کے لہجے میں سچائی تھی۔



”باقی میں اپنی اور اپنی فیملی کے حوالے سے کوئی وضاحت نہیں دے سکتا نہ دینا چاہتا ہوں اس لیے میری باتوں کو ذہن میں رکھیے گا۔“

زیان بہت کچھ کہنا چاہتی تھی پر اب اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ ایک اپنی بات پوری کر کے جس طرح آیا تھا اس طرح جا چکا تھا۔ وہ نڈھال سے انداز میں بیڈ پہ اوندھی ہو کر گر پڑی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی اپنی جیت پہ ہنسے خوشی منائے یا اپنی ہار پہ سوگ منائے تمام کرے۔



احمد سیال، بیٹی کی پاکستان واپسی پہ سب دوست احباب کو ڈنر پہ انوائٹ کر رہے تھے انہوں نے اس کی گمشدگی کے دوران بہت کراٹھس کو فیس کیا تھا خاص طور پہ سب ایک ہی سوال کرتے تھے کہ رنم سیال اچانک کیوں باہر چلی گئی ہے جبکہ ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا۔ احمد سیال اس دعوت کے ذریعے سب کی سلی کروانا چاہ رہے تھے۔

یہ آئیڈیا رنم کا تھا۔ وہ ملک ایک کی پوری فیملی سے ایک نئی حیثیت میں ملاقات کرنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے احمد سیال نے جب ملک جمائیکر کو فیملی سمیت انوائٹ کیا تو انہیں یہ جان کر اشد خوشی ہوئی کہ احمد کی بیٹی پاکستان واپس آئی ہے۔

رنم نے واپس آکر اپنی ایکٹوٹیز میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے بیونی سیلون کا رخ کیا تھا۔ ملک محل میں رہتے رہتے اس کی اسکن ہاتھ پاؤں کی نرمی اور بالوں کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ اسے اپنا آپ پرانی کنڈیشن میں واپس لانا تھا۔ بیونی سیلون کے بعد اس نے مارکیٹیں اور شاپنگ مالز کا رخ کیا۔ بیونی سیلون میں صرف کیا گیا ٹائم اس کے لیے اچھے نتائج لایا۔ وہ پرانی رنم نظر آنے لگی تھی۔ بالوں کی کٹنگ کروا کر اس نے انہیں نئی لک دی تھی۔ یہ اسٹائل پہلے سے بھی زیادہ اس پہ سوٹ کر رہا تھا۔ اس کی نرم چمکدار جلد کی شادابی مگالوں کی سرخی بالوں کا رسمی ملائم پن ہاتھوں

پاؤں کی نرمی سب کچھ لوٹ آئی تھی۔ احمد سیال نے ملک جمائیکر کی فیملی کو انوائٹ کر لیا تھا۔ ان کے بیٹے کی شادی ہو گئی تھی وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ آرہا تھا۔ رنم بے پناہ خوش تھی۔ سیال نے اس کا ملک محل میں ہینڈ والا روپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں دفن کر دیا تھا۔ یہ حقیقت صرف وہی دونوں جانتے تھے کہ رنم اتنے ماہ کہاں اور کیسے رہی ہے۔ وہ دونوں ہی ہینڈ ٹائی باب کو کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ احمد سیال کو بس اتنا پتا تھا کہ رنم پڑھنے کے لیے باہر گئی تھی لیکن وہاں پایا کے بغیر اس کا دل نہیں لگا تو واپس آگئی۔ انہیں رنم سے بڑھ کر دنیا میں کچھ بھی عزیز نہیں تھا۔

اور رنم جانتی تھی دنیا میں اس کے لیے سب سے بڑھ کر قابل اعتماد اور قابل بھروسہ رشتہ صرف احمد سیال ہی کا ہے۔ رنم خوش تھی اور خوشی سے دعوت کی تیاری کر رہی تھی۔



زیان ملک جمائیکر کے پاس بیٹھی انہیں ایک کتاب سے مختلف اقتباسات پڑھ کر سنارہی تھی۔ افشاں بیگم زیان کو شمار ہو جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں وہ اندرونی خوشی سے سرشار تھیں۔ اتنے دن سے زیان پہ جن نہیں آیا تھا اور نہ ہی دور دور تک کسی دورے کے آثار تھے۔ اس نے خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کی گم صم کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ وہ ہنستی بولتی پہلے والی زیان سے الگ ہی لگتی اور تو اور اب وہ نوکرانیوں سے بھی بات چیت کرنے لگی تھی۔

”پاپا جان کیا ہو رہا ہے؟“ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ ملک جمائیکر بستر پہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ”برسکون زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔“ ملک جمائیکر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ پہلے سے کافی بہتر لگ رہے ہیں۔“ ایک ان کے پاس بیٹھ گیا۔



”میں بس اپنی آنکھوں کی وجہ سے پریشان ہوں  
’ٹھیک طرح سے پڑھ ہی نہیں سکتا زبان کے ذریعے  
اپنا شوق پورا کرتا ہوں۔“ انہوں نے بہت محبت سے  
زبان کی سمت دیکھا تھا۔

”میں آپ کو شہر لے جاؤں گا اچھے ڈاکٹر سے چیک  
اپ کراؤں گا۔“ ایک نے انہیں تسلی دی۔

”اب ڈاکٹر کیا ٹھیک کریں گے مجھ سے جب سے  
آنکھوں میں موتیا اترے یہ مسائل پیش آرہے ہیں  
۔ آپریشن کروانے کے باوجود بھی، کبھی کبھی تو سب کے  
چہرے ہی گنڈھ ہو جاتے ہیں۔ رشتہ داروں کے علاوہ  
کسی کی شکل ہی نہیں پہچان پاتا میں۔ خیر برہائے میں  
یہ سب تو چلتا ہی ہے، میں نے اسے جان کا روگ نہیں  
بنایا ہے۔ تمہاری شادی کی خوشی میں نے اپنے جیتے جی  
دیکھ لی ہے اب معاذ کی فکر ہے۔“

”بابا جان معاذ کا آخری سمسٹر ہے وہ جلد ہی آجائے  
گا۔“ ایک نے نرمی سے ان کے جھریوں بھرے ہاتھ  
کو تھپکا۔ ملک جہانگیر نے اپنے کڑیل جوان بیٹے کو بڑی  
محبت سے دیکھا۔

”تم نے ہمیشہ مجھے طاقت دی ہے اور ہاں احمد سیال  
کے ہاں دعوت پہ بھی جانا ہے۔ اس نے پورے گھر  
والوں کو بلایا ہے۔ اس کی بیٹی پاکستان واپس جو آئی  
ہے۔“ ملک جہانگیر نے ایک بار پھر یاد دہانی کروائی۔

”ہاں بابا جان میں چلا جاؤں گا۔“ وہ سعادت مندی  
سے بولا۔

”تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ زبان بھی ساتھ جائے گی  
اور واپسی پہ تم سیدھے گھر آؤ گے۔ میں نے تم دونوں کو  
شادی کے بعد ایک بار بھی اکٹھے ہنستے بولتے نہیں دیکھا  
ہے۔ اب ٹھیکو کچھ دن گھر میں۔“ افشاں بیگم نے ٹوکا تو  
وہ ہنسنے لگا۔

زبان نے نظر بچا کر اسے دیکھا۔ کھدر کے کرتے  
شلوار میں ملبوس ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے وہ مغرور  
لگ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی زبان کی سمت نہیں  
دیکھا تھا۔

”امی جان آپ کی بہو پہ اگر جن آگیا تو میرا کیا بنے

گا۔“ زبان کو اچھی طرح علم تھا وہ اس پہ طنز کر رہا ہے  
تب ہی تو اس پہ جیسے گھڑوں پالی پڑ گیا تھا۔  
”چلو تم دونوں جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام  
کرو۔“ افشاں بیگم نے حاکمانہ انداز میں بول کر بات  
ختم کرنی چاہی۔ ایک نے فوراً ”سعادت مندی سے سر  
ہلایا۔ وہ زبان سے پہلے اٹھ کر گیا۔

زبان نے مرے مرے قدموں سے بیڈ روم کا رخ  
کیا۔ ایک بیڈ کے بالکل کونے پہ لیٹا ہوا تھا۔ زبان کو  
آتا دیکھ کر اس نے کروٹ بدل کر اس کی طرف پشت  
کر لی۔ زبان کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ ٹوٹی  
کرچیوں کی چھن ناقابل برداشت تھی۔ اس کی  
سسکیوں کی آواز فوراً ”ایک کے کانوں تک پہنچی  
تھی۔ وہ جو تکیہ منہ پہ لیے لیٹا ہوا تھا۔ تکیہ منہ سے ہٹا  
کر اس کی طرف آیا جھٹکے سے کبیل اس کے منہ سے  
سر کایا۔

”اب کیا براہم ہے سب کچھ آپ کی مرضی سے  
ہو رہا ہے، میں آپ پہ کسی قسم کا کوئی شہرہ نہ حق بھی  
نہیں جتا رہا ہوں جو آپ کو اس قسم کے ڈرامے کی  
ضرورت محسوس ہوئی۔“ ایک کا اشارہ اس کی لال  
آنکھوں کی طرف تھا۔ زبان کو اس کی باتیں تیر کی طرح  
لگیں۔ اس کی باقی سسکیاں سینے میں ہی گھٹ گئیں۔

”میرے سر میں درد ہے اس لیے رونا آگیا تھا۔“  
اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

”تو کوئی چین کھلے لیں یا میری موجودگی کی وجہ  
سے آپ کو براہم ہو رہی ہے۔ بتادیں میں دوسرے  
روم میں سو جاؤں گا۔ آپ سے ویسے بھی ڈر لگنے لگا  
ہے جانے کس وقت آپ پہ جن آجائے اور میرا تماشا  
بن جائے۔“ ایک کا لہجہ نرم، مگر الفاظ بہت ٹاٹ دار  
تھے۔ ایک بار پھر زبان کا دل چاہا کہ وہ غائب ہو جائے۔

وہ ایک کی بات کا جواب دے بغیر کبیل تان کر  
لیٹ گئی۔ ایک بھی اپنی طرف آکر گھٹ گیا۔

”میں امی جان کی وجہ سے یہاں آنے اور سونے پہ  
مجبور ہوں کیوں کہ مجھے سب کی نظروں میں موضوع  
گفتگو بننا پسند نہیں ہے۔ پہلے ہی بہت تماشا اور مذاق



بن چکا ہے میرا۔ آپ کے جن کی وجہ سے۔“  
اندھیرے میں اس کی آواز برچھی کی مانند اس کے  
کانوں میں آکر لگی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر  
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔



زیان بغیض احمد بغیض کا نسخہ ہائے وفا ہاتھ میں  
پکڑے بیٹھی تھی۔ فیض کی شاعری اسے حد سے زیادہ  
پسند تھی۔ وہ کتاب میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی  
جب پاس پڑا اس کا سیل فون سریلے سر بکھیرنے لگا۔  
اس نے مبر دیکھے بغیر فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔  
”زیان فون بند مت کرنا ورنہ حد سے بھی زیادہ  
پچھتاؤ گی۔“ اس کی ہیلو کی جواب میں دوسری طرف  
سے وہاب اپنی مخصوص سفاک آواز میں بول رہا تھا۔  
زیان کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گئی۔

”کیوں کیا ہے فون مجھے تم نے۔“ اس نے اپنے  
لہجہ میں اعتماد سمونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
”میں تو تمہارے گھر بھی آیا تھا کیا کسی نے بتایا  
نہیں تمہیں۔ تمہاری ماں سے مل کر گیا ہوں باتیں کی  
ہیں ان سے۔ تم یہ سمجھ رہی تھیں کہ گھر چھوڑ  
کر نکلا جاؤ گی تو بیچ جاؤ گی مجھ سے۔ میں تمہیں پاتل  
سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔ تم تو مل گئی ہو اب مجھے زبردست  
خالہ کو تلاش کرنا ہے۔ بہت حساب ہیں تم دونوں کی  
طرف۔“ حیرتوں کے بہت سے پہاڑ اکٹھے زیان کے سر  
پر ٹوٹے تھے۔ وہاب یہاں ملک محل میں آیا تھا اور  
اسے پتا بھی نہیں چلا۔ وہ ماما سے ملا اور انہوں نے بھی  
اس سے یہ بات چھپائی۔

وہ ملک محل میں کیسے پہنچا؟ کس نے اسے یہاں کا  
پتا دیا تھا؟ اس کا پرسل نمبر وہاب تک کیسے پہنچا۔؟ اور  
اب وہ کس برتنے سے اسے اپنی بڑی بڑی دھمکیاں دے  
رہا تھا۔؟ وہ ملک محل میں آگیا اور اسے ذرا بھی ڈر  
نہیں لگا۔ گارڈ تو کسی اجنبی شخص کو ملک محل کے گیٹ  
سے اندر تک نہیں داخل ہونے دیتے اور اس نے  
عنیزہ سے ملاقات بھی کر لی۔ وہ ان سوالوں کے جواب

اپنے ذہن اور سوچ کے مطابق حاصل کرنے کی تمک و  
دو کر رہی تھی۔

”آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش مت کرنا۔“  
زیان نے کمزور لہجہ میں اسے دھمکی دینے کی کوشش کی  
جیسے واقعی وہ ڈر جائے گا۔ اس کی توقع کے برخلاف وہ  
نور نور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہسی آج سے پہلے اسے  
کبھی اتنی مکروہ نہیں لگی تھی۔

”تمہیں فون کرنا کیسے چھوڑ دوں۔ تم میری زندگی  
کی ضمانت ہو، میری محبت ہو۔ کتنی مشکل سے تو تمہارا  
سراغ پایا ہے اور تم کہتی ہو کہ مجھے فون ہی نہ کرو۔ یہ  
کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے ٹوٹ کر محبت کی ہے تم سے  
زیان۔ اور تم میری محبت، چاہت، وفاسب کچھ ٹھکرا کر  
مجھ سے دور یہاں آگئیں۔ تم سوچتی ہو گی کہ میں کبھی  
بھی تم تک نہیں پہنچ پاؤں گا، لیکن دنیا گول ہے اور  
میرے لیے اتنی بڑی نہیں ہوئی ہے کہ تمہیں تلاش  
نہ کر سکوں۔“ اس بار وہ بڑی ملاحت سے بولا تھا۔

”دیکھو مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔ میری شادی  
ہو گئی ہے۔ میرے گھر میں سے کسی کو پتا چل گیا تو بہت  
برا ہو گا۔“ وہ دہانسی ہو رہی تھی۔ وہ وہاب کے ساتھ  
بات کرتے ہوئے پوری طرح چو کنا تھی اور ادھر ادھر  
بھی دیکھ رہی تھی۔ کوئی آتا تو اسے فوراً پتا چل جاتا۔  
وہاب لمبی بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ زیان نے  
اچانک لائن کاٹ کر اپنا سیل فون ہی آف کر دیا۔

سیل فون آف کر کے زیان عنیزہ کی طرف چلی  
آئی۔ وہ عصر کی نماز میں مصروف تھیں۔ اس نے  
نوکرانی سے ماما کے بارے میں پوچھا تھا۔ زیب نے  
انہیں بتایا تھا اس لیے وہ فوراً اس کی طرف آئیں۔  
جہاں وہ بے قراری سے چکر کاٹ رہی تھی۔ زیان کے  
چہرے پر پریشانی اور اضطراب تھا۔ عنیزہ کے دل میں  
خداشات سر اٹھانے لگے کہیں اس کے اور ایک کے  
ماہین کوئی جھگڑایا تلخی تو نہیں ہو گئی ہے۔

”کیا بات ہے بیٹا۔ آؤ میری پاس بیٹھو۔“ انہوں  
نے محبت سے اپنی طرف بلایا۔ خلاف توقع وہ اعتراض  
اور انکار کیے بغیر ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ورنہ جب



سے زیان نے انہیں اپنی نفرت سے آگاہ کیا تھا اس کے بعد سے ان دونوں میں شائد ٹوڑی بات ہوتی تھی۔ ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات تھی جس نے زیان کی نفرت بھی بھلا دی تھی۔

”مما یہاں وہاں آیا تھا؟“ اس نے انگلیاں باہم ایک دوسرے میں پھنسلتی ہوئی تھیں۔ وہ امید افزا نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جیسے وہ انکار کر دے گی۔ پر ان کا سر اثبات میں ہلکا جو اس کے خوف کو کئی گنا بڑا گیا۔

”تمہیں کس نے بتایا ہے؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔

”میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ جلالی بابا تمہارا علاج کر رہے تھے۔ میں بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ تمہیں اپنے ساتھ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ بتاؤ تمہیں کس نے بتایا ہے۔ میرے علاوہ کوئی اس کا نام نہیں جانتا بلکہ ملک محل میں کوئی بھی اسے نہیں جانتا۔“

”مما ابھی اس کا فون آیا تھا۔“

”کیا۔!“ عنیزہ شاکد تھیں۔

”کیسے فون آیا اس کا؟“ وہ بدحواس ہو گئی تھیں۔

”مما میرے سیل فون پہ ابھی ابھی اس کی کل آئی تھی۔“

”تمہارا نمبر کس نے دیا ہے اسے؟“

”مما مجھے نہیں معلوم۔ میرا پر سیل نمبر کیسے اس کے پاس پہنچا۔ ملک محل سے باہر میرا نمبر کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میرا یہ نمبر بوارحت کے پاس بھی نہیں ہے۔“ وہ بکھرے لہجے میں بولی۔

”پھر تمہارا نمبر اس نے کہاں سے لیا۔ پہلے وہ یہاں تک پہنچا پھر تمہارا نمبر حاصل کیا۔ پر یہ کیسے ہوا سب؟“ عنیزہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

”مما مجھے نہیں معلوم یہ سب۔ اس لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔“ پریشانی سے اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

”تم نے کسی اور سے تو بات نہیں کی۔“

”نہیں ممما میں سیل فون آف کر کے آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”کسی سنی الجھل بات مت کرنا۔“

”مما وہاں یہاں آیا تھا یہ بات کس کس کو پتا ہے۔“ اس نے رک رک کر پوچھا۔

”میں نے یہ بات صرف ملک صاحب کو بتائی ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔“

”مما یہ بات ایک کو تو معلوم نہیں ہے نا؟“ اس بار اس نے ممما سے نظر حرائی تھی۔

”نہیں اسے یہ بات معلوم نہیں ہے اور نہ ہی جہانگیر بھائی کو۔ یہ مصیبت بھی تم پہ میری وجہ سے آئی ہے میرے ماضی کی وجہ سے آئی ہے۔ تمہاری نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہو گا۔“ عنیزہ دل گرفتگی سے گویا ہوئیں تو زیان ان کی طرف بس دیکھ کر رہ گئی۔

”آج تک تم نے جو دکھا سنا وہ ایک طرف کا موقف تھا۔ میں مانتی ہوں برسوں کی دوری نے بہت کچھ بدل دیا ہے لیکن میں چاہتی ہوں تم ایک بار مجھ سے بھی حقیقت کے بارے میں جان لو پھر تمہیں نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہو گی۔“

عنیزہ کے چہرے پہ امید و بہم کی ملی جلی کیفیت تھی جیسے وہ آج ان کی بات سن لے لی۔ زیان ان کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں بولی تھی۔ اس کی خاموشی کو عنیزہ نے اس کا اثبات تصور کیا اور تکلیف و ماضی کی طرف کھٹنے والے درخت پہ نیموا کر لیے۔



عنیزہ طلاق لے کر ابو کے پاس لوٹ آئی تھی۔ امیر علی نے بچی اس سے چھین لی تھی۔ انہوں نے امیر علی کے خاندان کے بڑوں کو درمیان میں ڈال کر مصالحت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ بچی عنیزہ کے سپرد کر دے۔ پر امیر علی نے سب کو ٹکا سا جواب دیا۔ وہ تو بچی کی شکل تک ماں کو دکھانے کا روادار نہ تھا کجا کہ اس کے حوالے کر دتا۔ اسے عنیزہ سے شدید قسم کی نفرت تھی اس نفرت کا نشانہ زیان اور عنیزہ



دونوں ہی بنی تھیں۔ دونوں کو جیتے جی ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔

عنیزہ کے سامنے عدالت سے مدد لینے کا راستہ بھی موجود تھا۔ برابو نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے اگر انہوں نے بیٹی کی کسٹڈی کا کیس دائر کیا بھی تو جیت امیر علی کی ہوگی۔ اس کے پاس پیسے تھے وہ وکیل کو خرید سکتا تھا جھوٹے گواہ پیش کر سکتا تھا۔ ان کی رہی سہی عزت کو سرعام نیلام کر دیا سکتا تھا۔ وہ باپ بیٹی امیر علی کے مقابلے میں کمزور تھے۔ اس لیے چپ سادھ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عنیزہ کی مسلسل خاموشی قاسم صاحب کے دل پہ قیامت ڈھانے لگی۔ وہ خود کو بیٹی کا مجرم تصور کرنے لگے۔ انہوں نے ہی تو شادی کروائی تھی ایک بار بھی اس کی مرضی یا رضامندی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چپ چاپ ان کے فیصلے کی بھینت چڑھ گئی پر اس قربانی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا سب رائے گال ہو گیا۔

راحت نے ملک ارسلان کو اس سانحے کی خبر کر دی تھی۔ اس کے بچے بچے بے رونق چہرے یہ پھر سے خوشی نمودار ہونے لگی تھی۔ ادھر ملک جہانگیر کو بھی عنیزہ کے حالات سے آگاہی ہو گئی تھی۔ وہ پہلی بار چاکر قاسم صاحب اور عنیزہ سے ملے۔ ان کا چھوٹا سا گھر ایک عام متوسط علاقے میں تھا۔ مالی طور پر وہ کسی طرح بھی ملک خاندان کے ہم پلہ نہیں تھے۔ یہاں ان کے چھوٹے بھائی کا دل اٹکا ہوا تھا اس کی خوشی اس چھوٹے سے گھر میں ہی موجود تھی۔ انہوں نے قاسم صاحب سے عنیزہ کا رشتہ اپنے چھوٹے بھائی کے لیے مانگا۔ خلاف توقع عنیزہ نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ کسی صورت بھی دوسری شادی کے حق میں نہیں تھی وہ اس امید پہ بیٹھی تھی کہ امیر علی زبان کو اس کے سپرد کر دے گا۔ وہ بانی زندگی اپنی بیٹی کے ساتھ گزار سکتی تھی۔ اس کے انکار نے ملک ارسلان کو پھر سے مایوسی کے اٹھا ہار میں دھکیل دیا۔

امیر علی نے دھوم دھام سے دوسری شادی کر لی۔ عنیزہ نے قاسم صاحب کے ذریعے اپنی فریاد ایک بار

پھر امیر علی تک پہنچانے کی کوشش کی۔ پر وہ اس سے مس نہ ہوا بلکہ الٹا اس نے دھمکی دی کہ تم باپ بیٹی میں سے کوئی میرے گھر کے آس پاس بھی نظر آیا تو میں دونوں پہ جھوٹا مقدمہ بنوا دوں گا۔

اسی غم میں قاسم صاحب نے ایک رات خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ اب اس اکیلے گھر میں صرف عنیزہ اور اس کی تنہائی تھی۔ محلے والوں نے کچھ عرصہ ساتھ دیا، لیکن کوئی کب تک خبر گیری کر سکتا تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اس کے سامنے تنہائی اور پہاڑی زندگی تھی۔ ملک جہانگیر ایک بار پھر اس کے پاس آئے۔ اس بار ان کے سمجھانے بجھانے پہ عنیزہ نے خاموشی سے ان کی بات مان لی۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

ملک نخل میں سب نے کھلے دل سے اسے خوش آمدید کہا۔ ملک ایک اور ملک معاذ چھوٹے چھوٹے تھے۔ انہیں دیکھ کر عنیزہ کو زبان یاد آنے لگتی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ایک بار پھر اسے ملنے کی سعی کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے بوار حمت کو خط لکھا اور زبان سے کسی بھی طرح چھپ کر ملاقات کروانے کو کہا۔ اس خط کے مندرجات الفاظ دل ہلا دینے والے تھے یہ صرف ایک خط نہیں تھا ماں کے دکھی دل کی فریاد تھی۔ اس نے جس جتن سے یہ خط بوا کو بھیجا یہ وہی جانتی تھی پر اسے خط کا کوئی جواب نہیں ملا۔

ملک ارسلان اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے۔ وہ اسے گھمانے پھرانے کے لیے ورلڈ ٹور پہ لے گئے۔ پر عنیزہ کے دل کی بے کلی ختم نہ ہوئی۔ وہ کافی عرصہ نفسیاتی معالج کے زیر علاج رہیں، لیکن دل سے بیٹی کی یاد کو نہ نکال سکیں۔ ملک ارسلان نے انہیں اندھیری راتوں میں سب سے چھپ کر اللہ کے سامنے فریاد کرتے روتے گڑ گڑاتے دعا میں مانگتے دیکھا۔ عنیزہ کی دعاؤں کی قبولیت میں سالوں لگ گئے۔ پھر ایک دن وہ معجزہ ہو گیا جس کی توقع وہ جانے کب سے کر رہی تھیں۔ بوار حمت نے خود ان سے رابطہ کیا اور زبان کو



اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کہا۔ اٹھارہ برس بعد یہ انہونی ہوئی تھی۔ خوشی سے ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ ملک ارسلان عنہزہ کو خوش دیکھ کر خود بھی شادمان تھے۔ وہ بذات خود جا کر زیان کو لے کر آئے۔ عنہزہ جس بیٹی سے ملنے کی تمنا میں برسوں سے تڑپ رہی تھی یہ وہ نہیں تھی۔ زیان تو ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھی۔



”بس یہ تھی میری زندگی کی کہانی اور سچائی۔“  
عنہزہ ماضی کا سفر کر کے حل میں لوٹ آئی تھیں۔ انہوں نے زیان کی طرف دیکھا دونوں بغیر پلک جھپکائے ایک دوسرے کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ اچانک زیان اپنی جگہ سے اٹھی اور ہاگ کران کے گلے سے آگئی۔ آنسوؤں کی جھڑی اس کی آنکھوں سے بہہ رہی تھی۔ اپنی غلط فہمیوں بھلے سوچوں پہ وہ جی بھر کر شرمندہ تھی۔ اپنی ماں کی مجبوریوں کا اور اک اسے اب آکر ہوا تھا۔

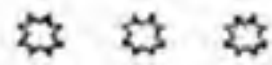
زیان نے انہیں ہمیشہ انہیں قصور وار اور مستوجب سزا ہی تصور کیا، کتنا برا کرتی آئی تھی وہ ان کے ساتھ۔ پھر انہوں نے اپنی تکلیف کا اظہار کبھی بھی نہیں کیا۔ ذہنی اذیت، کرب، آنسو جو وہ انہیں دے چکی تھی کچھ بھی تو بھولنے کے قابل نہ تھا۔ زیان اپنی گزشتہ زندگی اور رشتوں سے بدگمان ہی رہی۔ امیر علی کی کمزوری اور نفرت کی بدولت زہرینہ بیگم کے ہاتھ مضبوط ہوئے جس کی وجہ سے وہ زیان کو اذیت دیتی رہیں۔ امیر علی گھر کے سکون کو خراب ہونے سے بچانے کی خاطر خاموش رہے ان کی یہی خاموشی اور چشم پوشی زیان کو اذیت پرستی اور خود اذیتی کے گہرے اندھیروں میں لے جانے کا باعث بنی۔ وہ خود سے وابستہ خود سے چاہنے والوں کو اذیت دینے کی عادی ہوتی گئی۔

یہ بات بھی قابل غور تھی کہ وہ خود سے وابستہ بہت قریبی رشتوں کو ہی اذیت دیتی آئی تھی سب سے پہلے

امیر علی ہی اس کا نشانہ بنے تھے نفرت کا جو بیج انہوں نے بویا تھا اب زیان کی صورت کاٹنا تو تھا۔ اسے انہیں بے سکون کر کے نظر انداز کر کے عجیب سے خوش ملتی۔ امیر علی کے بعد عنہزہ اور پھر ایک کا نام اس فہرست میں تھا۔ وہ ملک ارسلان سے بھی برگشتہ رہی تھی اس کے خیال میں وہ بھی برابر کے قصور وار تھے۔ اب وہ عنہزہ کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔

ملک ارسلان اچانک اس طرف آئے تھے دونوں ماں بیٹی کو دھواں دھار روتے دیکھ کر وہ بغیر کچھ پوچھے ہی سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے ہی دونوں کو چپ کروایا۔ عنہزہ کے آنسو اب بھی نہیں رک رہے تھے۔ ملک ارسلان کا ایک ہاتھ زیان کے سر پہ تھا وہ اسے تسلی دے رہے تھے وہ ننھے بچے کی طرح ہمک کران کے دائیں بازو سے آگئی۔

”بابا۔۔۔ آئی ایم سوری بابا! میں آپ دونوں کو غلط سمجھتی رہی۔“ ندامت سے اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ملک ارسلان نے ہاتھ برہا کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ عنہزہ زیان اور ارسلان۔ تینوں ایک ساتھ۔ روتی آنکھوں کے ساتھ چہرے پہ مسکراہٹ لیے۔ یہ تصویر اب مکمل تھی۔



احمد سیال کی طرف سے دی گئی دعوت میں ملک جہانگیر، افشاں بیگم ملک ایک اور زیان چاروں ہی آئے تھے۔ زیان کا اس قسم کی دعوت میں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ احمد سیال کا تعلق بزنس کلاس سے تھا ان کے مدعو کئے گئے مہمان، اکثر ان کے سوشل سرکل سے تعلق رکھتے تھے۔

احمد سیال نے بڑی گرمجوشی سے ان سب کی اور خاص طور پہ زیان کی خیر خیریت دریافت کی تھی۔ اسے ایک ٹائیپ کے لیے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے انہوں نے اسے گہری نگاہ سے دیکھا ہو۔ بعد میں یہ احساس پوری تقریب کے دوران اس پہ حاوی رہا۔ احمد سیال نے اپنی اکلوتی صاحبزادی سے ان کا تعارف کروایا۔ ریڈ کلر کے



ماڈرن ڈریس میں ان کی بیٹی شعلہ جوالہ سنی ہوئی تھی۔  
 زیان بھی ڈیپ ریڈ کلر کے کلڈار سوٹ میں ملبوس تھی،  
 مگر نہ جانے احمد سیال کی بیٹی سے تعارف حاصل  
 کرنے کے بعد زیان کو اپنی تیاری اپنا قیمتی ڈریس،  
 میچنگ جیولری نفاست سے کیا گیا میک اپ سب کا  
 سب ہی انتہائی فضول لگنے لگا۔ احمد سیال کی لاڈلی بیٹی  
 پوری محفل پہ چھائی ہوئی تھی۔

زیان اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ احمد سیال کے  
 گھر میں ان کی بیٹی کے روپ میں اس حلیے میں اسے  
 نہ ملتی تو وہ کبھی بھی اسے رنم سیال ماننے پہ آمادہ نہ ہوتی  
 ۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ فیصل کی شہادت لیے رنم  
 سیال ہے، لیکن یہ سونی صد احمد سیال کی بیٹی رنم تھی  
 بھلا کہاں نہ نہں ایک عام سی لڑکی اور کہاں رنم سیال  
 ایک بزنس ٹائیکون کی ماڈرن بیٹی جو پڑھنے کی عرض  
 سے پاکستان سے باہر گئی ہوئی تھی۔

کچھ ایسا ہی حال ملک ایک کا بھی تھا جب احمد سیال  
 نے رنم کا تعارف ملک فیملی سے کروایا۔ وہ بے یقینی  
 سے رنم سیال کو دیکھ رہا تھا جس کے ریڈ لپ اسٹک  
 سے سجے ہوئے بہت خوب صورتی سے مسکرا رہے  
 تھے۔ اس نے انتہائی گرم جوشی سے ملک ایک سے  
 ہاتھ ملایا۔ خیر مقدمی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے  
 جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک بہت غور سے اسے  
 دیکھ رہا تھا جبکہ رنم کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی  
 رمت تک نہ تھی۔

ایک اور زیان تو اسے دیکھ کر چونک گئے تھے جبکہ  
 افشاں بیگم کا روپ نارمل رہا۔ کیوں کہ رنم سیال کی  
 پوری لک ہی چیخ تھی صرف ہلکی پھلکی نقوش کی  
 مشابہت سے کیا ہوتا تھا۔ وہ گئے جہانگیر تو ملک محل  
 میں بہت کم ان کا سامنا نہیں سے ہوا تھا اور انہوں  
 نے اس پہ خاص توجہ ہی نہیں دی تھی۔ ویسے بھی  
 موتیہ کے آپریشن کے بعد ان کے ساتھ بصارت کے  
 مسائل ہو رہے تھے ایک اور زیان دونوں رنم سیال  
 کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے اس کا ہر انداز فیصل  
 سے مختلف تھا۔

ڈنر کے بعد گاؤں واپسی کے لیے ٹائم نہیں رہا تھا۔  
 احمد سیال نے بڑی محبت کے ساتھ انہیں رکنے کی پیش  
 کش کی۔ تقریب ختم ہو چکی تھی ان کے سوا بقی سب  
 مہمان واپس جا چکے تھے۔ رنم نے اپنے کلاس فیلوز میں  
 سے کسی کو بھی مدعو نہیں کیا تھا۔ انہیں اس کے آنے  
 کی ابھی تک خبر بھی نہیں ملی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ان  
 سے ناراض تھی، خاص طور پہ کوئل اور فراز سے تو وہ  
 انتہائی بدگمان اور برگشتہ تھی۔ اس لیے تو اس نے ان  
 دونوں کو ابھی تک اپنی واپسی کا بھی نہیں بتایا تھا۔

رنم بہت خوش تھی ایک پہلی بار اسے ملا تھا وہ رنم  
 سیال کے چہرے کے ساتھ تھی اس کی حیرت دیکھ دیکھ  
 کر محفوظ ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ الجھن تھی۔  
 یہی حال زیان کا بھی تھا، رنم نے اسے خاص اہمیت  
 نہیں دی تھی۔ اس کی پوری توجہ ملک ایک کی طرف  
 تھی۔ ملک جہانگیر افشاں بیگم احمد سیال اور زیان ایک  
 ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے بلکہ زیان صرف سامع  
 کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ جبکہ رنم ایک  
 الگ صوفیہ پہ ملک ایک کے ساتھ بیٹھی باتیں  
 کر رہی تھی۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ  
 معلومات حاصل کرنے کے چکر میں تھی۔

”چھا آپ شہر کے ساتھ ساتھ گاؤں میں بھی  
 راجیکٹ پہ کام کر رہے ہیں واؤ گریٹ۔“ رنم نے  
 آنکھیں پھیلاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔  
 ”جی ہاں میں ایک اسکول بھی بنوا رہا ہوں تعمیر کے  
 مراحل میں ہے وہ۔ اور انڈسٹریل ہوم مکمل ہو کر کام  
 شروع کر چکا ہے۔“

”میں آپ کے گاؤں آؤں گی۔ اسکول اور  
 انڈسٹریل ہوم دیکھنے۔ مجھے بھی ٹائڈ لائن چاہیے جس  
 پہ کام شروع کر سکوں۔“

”آپ آئے گا“ میں آپ کا انتظار کروں گا۔“ ملک  
 ایک بہت خوش ہوا۔ اس ماڈرن لڑکی کے منہ سے  
 غریب اور غریب لوگوں کے مسائل سن کر اسے بہت  
 اچھا محسوس ہوا۔

آہستہ آہستہ سب ہی سونے کے لیے جا چکے تھے



صرف ایک اور رنم ہی وہاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتوں کے دوران انہیں تیزی سے گزرتے وقت کا احساس تک نہ ہوا۔ اچانک سوال کلاک پہ ایک کی نظر پڑی جو ڈھالی بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ تب ایک اسے گڈ ٹائٹ کہہ کر اٹھا۔

زیان صوفے پہ سگری سٹی لیٹی ہوئی تھی پر وہ سو نہیں رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ دوسری نظر اس نے وال کلاک پہ ڈالی۔ عام طور پہ وہ اتنی رات گئے جاگنے کا عادی نہیں تھا کیوں کہ اس کا پورا دن مصروف گزرتا تھا اس لیے وہ رات جلدی سے سوتا اور صبح جلدی بیدار ہوتا تھا۔ آج وہ اپنے معمول سے کلفتی لیٹ تھا۔ زیان کو نئی جگہ اور رنم سیال کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی۔ رنم سیال بالکل نیند کی ہم شکل تھی۔ نیند کی براسرار گمشدگی اور رنم کا اسے مشابہت رکھنا دونوں باتیں اسے ناقابل یقین لگ رہی تھیں جتنا سوچتی اکبھتی جاتی۔

”کیا بات ہے ابھی تک آپ سوئی نہیں ہیں؟“ ایک نے ایک دوستانہ نظر اس پہ ڈالی۔ ورنہ تنہائی میں وہ کم ہی اس سے مخاطب ہوتا۔ وہ شرم میں کلفتی مصروف ہو گیا تھا ہفتے میں دو چکر گاؤں کے لگتے اور تب بھی وہ مصروف ہی ہوتا۔ سارا دن گھر سے باہر رہتا رات کو آتا تو بڑے سو جاتا۔

اس دن کے بعد سے وہ تو زیان کے لیے جیسے بالکل ہی اجنبی ہو گیا تھا۔ افشاں بیگم نے اس کی بے تحاشہ مصروفیت کی وجہ سے گھر میں ٹک کر بیٹھنے اور رہنے کی پابندی لگا دی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی مصروفیت کی وجہ سے زیان نظر انداز ہو رہی ہو۔ تب ہی انہوں نے کہا کہ کچھ دن گھر میں رہو زیان کو گھمانے پھرانے لے جاؤ اسے ٹائم دو۔ جواب میں اس نے نہ انکار کیا نہ اقرار۔

ملک ارسلان نے ایک کا مصروف ترین شیڈول دیکھتے ہوئے زیان کو آگے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ گھر میں کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ وہ

اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرتی تو لامحالہ اسے شرم میں رہنا پڑتا۔ اور شرم میں ملک ایک کے پاس اپنی رہائش تھی اس صورت میں دونوں زیادہ سے زیادہ اکٹھے رہ سکتے تھے۔ کیوں کہ ملک ایک کا زیادہ وقت شرم میں ہی گزرتا تھا آج کل وہ گاؤں میں بھی مصروف تھا۔

”جی نیند نہیں آرہی ہے۔“ زیان نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا کیوں کہ ایک نے اسے خود سے مخاطب کیا تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھ کر شوڑا اتار رہا تھا۔ زیان نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اب ایک پاؤں میں پہنی گئی جرابیں اتار رہا تھا۔ اس کے پاؤں بالکل صاف ستھرے ناخن شیمپ میں تراشے ہوئے تھے اس کے پاؤں کی انگلیوں پہ ہلکے ہلکے بل موجود تھے جو بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اب وہ اپنی شرٹ کے اوپری دو بٹن کھول رہا تھا کوٹ اس نے پہلے ہی اتار کر صوفے کی بیک پہ ڈال دیا تھا۔ اس کی شرٹ کی آستھیں فولڈ تھیں جو صوفے پہ بیٹھے بیٹھے اس نے ابھی ابھی کی تھیں۔ اس کی ہاتھ کی پشت اور بازوؤں پہ بھی کھنہ بل تھے وہ غور سے دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے آپ کا جائزہ مکمل ہو چکا ہے میں چیخ کر لوں ڈرا۔“ ایک نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا وہ ہاتھ روم کی طرف جا رہا تھا۔ زیان اس کی بات پہ جھینپ سی گئی۔ اس نے زیان کی نگاہوں کی چوری پکڑ لی تھی۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ اس نے منہ کبیل کے اندر کر لیا۔ ایک، شاور لے کر آیا تو وہ کبیل میں سر سے پاؤں تک ملفوف تھی یہاں تک کہ اس کی ایک انگلی یا بیل تک بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ ایک لائٹ بند کر کے بیڈ پہ آگیا۔ وہ اب غارغ تھا۔ زیان کی طرح وہ بھی نیند اور رنم کی حیرت انگیز مشابہت پہ حیران تھا۔ لیکن اپنی حیرانی اس نے رنم سیال پہ ظاہر نہیں کی۔



گھر لوٹنے پہ زیان سب سے پہلے عنیزہ کی طرف گئی۔ وہ انہیں کچھ بتانے کے لیے بے چین تھی۔ عنیزہ لان میں بیٹھی خوش گوار دھوپ سے لطف اندوز



ہو رہی تھیں۔ زبان بھانسنے والے انداز میں ان کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ زبان کے چہرے پہ جوش جھلک رہا تھا۔  
”مما۔ ماما میں نے نہیں سے ملتی جلتی لڑکی دیکھی ہے۔“ اس نے دانستہ طور پہ اپنے لہجہ میں مسہنس سمویا تھا۔

”کہاں دیکھی ہے؟“ عنیزہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”مما، ہم جن کے گھر دعوت میں گئے تھے ان کی بیٹی بالکل نہیں کی ہم شکل ہے۔ وہ پاکستان سے باہر تھی حال ہی میں واپس آئی ہے۔“

”اوہ تو تم سب جہانگیر کے دوست احمد سیال کی طرف گئے تھے۔“ عنیزہ نے پرسکون سانس لی۔

”آپ کو جہانگیر انکل نے بتایا تو تھا کہ ہم سب ان کی طرف انوائٹ ہیں۔“

”ہاں میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی۔ جہانگیر بھائی کو اپنے اس دوست کی بیٹی بہت پسند تھی

ایک کے لیے جاگرویکھ بھی آئے تھے ہم سب نے بھی احمد سیال کی بیٹی دیکھنے کے لیے جانا تھا، لیکن پھر بعد

میں پتا چلا کہ وہ پڑھنے کے لیے باہر چلی گئی ہے یوں بات آگے بڑھے بغیر ہی ختم ہو گئی۔“ عنیزہ نے اپنی دھن

میں بے ساختہ اسے بتایا۔ زبان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اس سے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس سے پہلے بھی

ایک کے لیے کسی کو پسند کیا گیا ہے ابھی ماما کی زبانی اسے علم ہوا تھا اور جانے کیوں اسے یہ بات اچھی

نہیں لگی تھی۔ بات مکمل کر کے عنیزہ نے اس کی طرف دیکھا تو انہیں اواسی نظر آئی۔ انہوں نے جیسے

اس کا چہرہ اور نگاہیں پڑھ لی تھیں۔

”اصل میں احمد سیال کی بیٹی جہانگیر بھائی کو معاذ کے لیے پسند تھی پر اس نے کہا کہ میں لڑکی دیکھے بغیر شادی

نہیں کروں گا اس نے جہانگیر بھائی کو ٹال دیا تھا۔ معاذ نے کہا میں تو ابھی شادی کروں گا نہیں آپ کو اپنے

دوست کی بیٹی اتنی ہی پسند ہے تو آپ ایک بھائی کے لیے بات چلا میں۔ یہ بات جہانگیر بھائی کے ذہن میں

بیٹھ گئی۔ حالانکہ افشاں بھابھی اس کے لیے قطعی طور پہ راضی نہیں تھیں اور ایک بھی خاموش خاموش سا

رہنے لگا تھا۔ پھر بعد میں خود بہ خود ہی بات ختم ہو گئی۔

تمہاری آئیں تو افشاں بھابھی کو پہلی نظر میں ہی بھاگ گئیں۔ جہانگیر بھائی کا بھی یہی حال تھا اور رہا ایک تو

اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا اس نے خوشی سے تمہارے ساتھ شادی کے لیے رضامندی دی تھی۔“

عنیزہ کو ٹوٹ کر زبان پہ پیار آیا اس وقت وہ چھوٹی سی بچی لگ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں اسے رنم سیال سے حسد محسوس ہو رہا تھا اپنا آپ اسے کمتر لگ رہا تھا وہ اپنا اور اس کا

موازنہ کر رہی تھی۔ رنم سیال ایک امیر باپ کی بیٹی تھی جبکہ وہ کرب، ناک حالات سے گزر کر حویلی پہنچی تھی۔

رنم سیال کے ساتھ شادی کی صورت میں ایک کو بے پناہ مالی فوائد حاصل ہوتے، لیکن اس نے زبان کو بغیر

کسی لالچ کے اور جینز کے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ جوں جوں وہ سوچتی جا رہی تھی احساس کمتری کے گہرے

غار میں اترتی جا رہی تھی۔



”پاپا مجھے گاؤں جانا ہے، ایک کے ساتھ مجھے بھی وہاں ایک پراجیکٹ شروع کرنا ہے۔“ وہ انہیں مطلع کر رہی تھی۔

احمد سیال نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھے جس طرح وہ ایک میں کھلے

عام دلچسپی لے رہی تھی وہ انہیں بہت کچھ بتانے کے لیے کافی تھا۔ جبکہ آئی تھی اس نے تفصیل سے پاپا کو

ایک ایک بات سے مطلع کیا تھا۔ ایک سے اپنا گاؤں اور پسندیدگی ظاہر کرنے میں اسے کسی بھی قسم کی

چھکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ایک شادی شدہ ہے۔ وہ

اسے بری طرح بھاگیا تھا۔ احمد سیال نے صرف اس کی خواہش پہ ملک جہانگیر کی فیملی کی خاطر اتنی بڑی تقریب

منعقد کی تھی۔ وہ اس کی کوئی بات بھی نہیں ٹال سکتے



تھے۔ وہ ضدی تھی اس نے روتے ہوئے پیپا سے التجا کی تھی کہ وہ اسے کسی بھی طرح ایک سے ملوادیں شادی کروادیں۔ وہ رو رہی تھی اور ان کا دل کٹ رہا تھا۔ پہلے بھی اپنی بات نہ ماننے یہ وہ گھر چھوڑ گئی تھی اس بار وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا لیتی تو وہ کیا کرتے۔ انہوں نے اس کی آنکھوں میں ایک نیارنگ دکھا تھا یہ جنون کا وحشت کا رنگ تھا۔

وہ ملک ایک یہ صرف اور صرف اپنا حق سمجھ رہی تھی کیوں کہ ایک کا رشتہ پہلے اسی کے لیے ہی تو آیا تھا۔ وہ گھر چھوڑ کر نہ جاتی تو آج ایک کی بیوی بن کر ملک محل میں بیٹھی ہوتی۔ اس کی محبتوں پہ بلا شرکت غیرے صرف اور صرف اسی کا حق ہوتا۔ کاش یہ بات اسے ملک محل میں رہتے ہوئے ہی معلوم ہو جاتی تو وہ کسی صورت بھی ایک اور فیان کی شادی نہ ہونے دیتی۔ بھلا فیان ہوتی کون ہے ایک کی زندگی میں آنے والی۔ جہاں تکیر انکل نے اسے اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا تھا۔ ایک صرف اسی کا ہے۔

وہ گاؤں میں ایک کے قریب رہنے کے لیے پلاننگ کر رہی تھی۔ احمد سیال نے اس مقصد کے لیے بھاری رقم اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروادی تھی۔ رنم سیال ملک محل آرہی تھی۔ ملک جہاں تکیر اس کے لیے کیسٹ روم از سر نو ڈیکورٹ کروا رہے تھے۔ ملک جہاں تکیر رنم سیال کی آمد پہ خوش تھے وہیں پہ فیان پریشان تھی۔ ایک کے ساتھ صرف ایک ملاقات کے بعد ہی اس نے گاؤں آنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جواباً ملک ایک نے بڑے خلوص سے اسے گاؤں آنے کی دعوت دی تھی۔



”معاذ ہم ان کے گھر گئے تھے دعوت یہ۔ یقین کرو وہ بالکل نہیں جیسی ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر چونک گئی تھی وہ ہو بہو نہیں جیسی تھی شکل و صورت میں صرف ڈرنگ کا فرق تھا۔ حیرت انگیز مشابہت دیکھی ہے میں نے تو پہلی بار۔“ وہ معاذ کے ساتھ اسکاٹپ

بات کرتے ہوئے جوش و خروش سے احمد سیال کے گھر جانے اور ان کی بیٹی سے ملنے کا احوال بتا رہی تھی۔ معاذ کو کچھ دن پہلے ہی انہوں کی گمشدگی کے بارے میں علم ہوا تھا۔ وہ اپنی پرہیزی کی وجہ سے مصروف تھا اس لیے اتنی توجہ نہ دے سکا تھا۔ آج فرصت سے فیان سے بات ہو رہی تھی تو وہ اسے نئی نئی باتیں بتا رہی تھی۔

”تو آپ سب سے وہ کیسے ملی؟“ معاذ اندر سے چونک گیا تھا، لیکن فیان کے سامنے اس نے اظہار نہیں کیا۔

”ہم سب سے تو اچھے طریقے سے ملی تمہارے بھائی جن کو تو اس نے خاص طور پہ کمپنی دی ہے۔ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو گئی اور اب وہ ہمارے گھر بھی آرہی ہے کیسٹ روم تیار ہے اس کے لیے۔“ آخر میں فیان جل کر بولی تو معاذ ہنسنے لگا۔

”وہ ہمارے گھر کیوں آرہی ہے؟“  
”گاؤں دیکھنے آرہی ہے اور کچھ سوشل ورک کرنے۔“ فیان نے سادگی سے بتایا۔

”سوشل ورک کے لیے اسے شہر میں کچھ نظر نہیں آیا جو گاؤں آرہی ہیں وہ اتنی دور۔“ معاذ دل میں کچھ سوچ رہا تھا۔

وہ اسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ رنم کی طرف سے ہوشیار ہو جائیں۔ فیان پریشان ہو جاتی۔ احمد سیال کے گھر جب اس نے ان کی بیٹی کے فوٹو دیکھے تو نہ جانے کیوں آپ ہی آپ اس کی سوچوں کا دھارا انہوں کے گرد مڑ گیا تھا۔ معاذ اسے جان کر تنگ کرتا تھا۔ بہت سے مواقع پہ معاذ کو ایسا محسوس ہوا کہ انہوں اصل میں وہ ہے نہیں جو وہ خود کو ظاہر کرتی ہے اگرچہ اس نے خود کو ملک محل کے رنگ میں ڈھالنے کی پوری پوری کوشش کی تھی پھر بھی معاذ کی حساس اور زیرک نگاہ کو کسی گزیر کا احساس ہوتا رہا۔ وہ معاذ کے سوالوں سے ڈر جاتی۔ اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتی۔

احمد سیال کی بیٹی اب اچانک بیرون ملک سے واپس آگئی تھی جس طرح اچانک گئی تھی۔ انہوں غائب ہوئی



تو وہ منظر عام پہ آگئی۔ جانے کیا گورکھ دھندا تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی ایک سے بے تکلفی بھی معنی خیز تھی۔ معاذ اس کے بارے میں شاید کبھی بھی ایسے تجسس کا شکار نہ ہوتا اگر وہ اسے اتفاقاً ”ذیان بھائی“ کی طرف عجیب حسد سے بھری نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نہ پکڑتا۔ وہ کیسی عجیب مبہم نگاہیں تھیں جن کی نفرت کا جواز پیش کرنا مشکل تھا۔ معاذ کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے نیندیں اور اب رنم سیال ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ اس نے اپنے اندازے اور محسوسات سے ذیان کو لاعلم ہی رکھا تھا۔ وہ بے پناہ حساس طبیعت کی مالک تھی پریشان ہو جاتی۔



ملک ایک بیمار ہو کر رفیوم اسپرے کر رہا تھا۔ سلی اوھر ہی پاس بیٹھی اس کے جوئے پالش کر رہی تھی۔ ذیان سیل فون ہاتھ میں تھامے خواجواہی مصوف نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک رفیوم اسپرے کر کے بیٹھ گیا تھا۔ ذیان نے گردن موڑ کر ایک کی طرف دیکھا وہ صاف دھلی ہوئی جراثیں پس رہا تھا۔ اس کی ظاہری حالت بھی بہت منظم تھی اس کی شخصیت کی طرح۔ وہ اسے مجبور کر رہا تھا کہ ذیان اس کی طرف دیکھے کچھ ایسا سحر تھا اس کی شخصیت میں۔ سلی نے آخری بار اپنے دوپٹے کے کونے سے ایک کے شوز پہ لگی ٹیڈیہ گرد جھاڑی۔ اس سے اس کی نگاہوں میں ایک کے لیے خاموش سی عقیدت تھی کیوں کہ وہ بغیر اس کے اس کی ضرورتوں کو سمجھ کر اکثر و بیشتر اس کی مدد کرتا تھا اس لیے وہ اس کا بے پناہ ادب کرتی تھی۔ ذیان کے اندر تک جلمن اور کڑواہٹ پھیلی تھی۔

”سلی جاؤ میرے لیے پانی لے کر آؤ۔“ اس کی آواز اس سے غراہٹ سے مشابہ تھی۔ سلی نے دہل کر چھوٹی بی بی کی طرف دیکھا۔ بہت تیزی سے وہاں سے بھاگی۔ چھوٹی بی بی کے جن سے وہ بھی بڑتی تھی۔ ”آپ سلی سے آرام سے بھی یہ بات کہہ سکتی

تھی۔“ ایک نے خاصے رسن سے ذیان کو اس کے روپے کی بد صورتی کا احساس دلایا تھا۔ ”تجس نے کیا کیا ہے؟“ ذیان کے انداز میں حیرت آمیز رنج تھا جیسے اسے ایک کی بات سے تکلیف پہنچی ہو۔

”سلی کو ہم نے کبھی بھی نوکر نہیں سمجھا ہے۔ ان لوگوں کی بھی عزت نفس ہوتی ہے آپ نرمی سے محل سے بات کیا کریں سب کو وہم ہی رہتا ہے آپ کے بارے میں۔ نہ جانے آپ بول رہی ہیں یا آپ کا جن۔!“ وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا گیا تھا۔ وہ آرام سے بول کر اس کے پاس گزرتا جا چکا تھا۔ ذیان کو شدید غصہ آرہا تھا، لیکن وہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے جن کی آڑ میں وہ خوب چیخ چلا سکتی تھی، لیکن ایک جن کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا اب وہ صبر اور جبر ہی کر سکتی تھی خود پہ۔



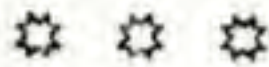
رنم سیال ملک محل آگئی تھی۔ نوکرانیاں اسے دیکھ کر ششدر تھیں ایسے لگ رہا تھا نیندیں کپڑے بدل کر ماڈرن سوانگ بھر کر پھر سے آگئی ہے۔ حیرت انگیز مشابہت تھی دونوں کی۔ عنیدہ بھی اسے دیکھ کر چونک گئی تھیں پر رنم سیال کی نگاہوں میں شناسائی کی کوئی بھی رتق نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا ملک محل میں اسے ایسے رد عمل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس لیے وہ ذہنی طور پہ خود کو سمجھا بچھا کر لائی تھی۔ اپنی اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب تھی۔ کیونکہ نوکرانیاں اور ملک محل میں رہنے بسنے والے اللہ کی شان کے گن گار ہے تھے وہ چاہے تو کیا نہیں بنا سکتا پھر ایک جیسی شکل کے دو انسان کیوں نہیں بنا سکتا۔

عنیدہ انشاں بیگم خاصی محبت سے ملی تھیں اس سے ایک اسکول کی طرف تھا۔ وہ بھی رنم سیال کی وجہ سے جلدی گھر آگیا تھا۔ کھانے میں خاصا اہتمام تھا ڈانگ ہل میں سب کے ساتھ کھانا کھا کر رنم کو اپنی انا اور عزت نفس کے سرخرو ہونے کا احساس



بک شاپٹ سے ایک کتاب نکل کر بیڈ پر آگیا۔  
 آوے گھٹنے بعد زیان بھی آگئی۔ دروازہ بند کر کے اس  
 نے اپنا کبل اٹھایا اور صوفے پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر  
 بعد ایک نے اس کی طرف دیکھا سوچکی تھی۔ اس  
 نے کتاب رکھ دی۔

آج سردی کافی زیادہ تھی اس نے فالتو کبل لا کر  
 صوفے پر دراز زیان کے اوپر ڈالا۔ کچھ بھی سہی وہ اس  
 کی ذمہ داری تھی۔ زیان ہلکی نیند میں تھی۔ ایک نے  
 اس کے اوپر کبل ڈالا تو وہ پوری طرح بے دار ہوئی۔  
 ایک اس پر کبل ڈال کر جاچکا تھا۔ وہ اس دن کے بعد  
 سے بیڈ پر نہیں سوئی تھی آخر کو وہ بھی عزت نفس  
 رکھتی تھی۔ اتنی گری پڑی نہیں تھی۔ جب وہ اسے  
 اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا تو اسے بھی زبردستی  
 بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سوچوں سے پیچھا  
 چھڑاتے سونے کی کوشش کرنے لگی۔



(آئندہ ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

**ادبیات و محکمہ تعلیم**

**کتاب کے لیے خاص صفحہ**

**مکتبہ عمران ڈائجسٹ**

**عمر کے مطابق**



قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اندو بازار، کراچی

ہوا۔ اس ملک محل میں وہ نہیں کی عام حیثیت میں  
 رہی تھی اب رنم سیال کی حیثیت میں سب کیسی  
 عزت اور وقار کے ساتھ پیش آرہے تھے۔ اس کے  
 جلتے دل پہ پھوار پڑ رہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے موڈ میں نہیں  
 تھی جھٹ ملک ایک سے اسکول اور انڈسٹریل ہوم  
 دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ ایک اسے اپنی گاڑی میں  
 پہلے انڈسٹریل ہوم دکھانے لایا۔ یہاں آکر رنم کو طاقت  
 اور اختیار کا احساس ہوا۔ یہاں وہ میڈم کی حیثیت میں  
 بیٹھا کرتی تھی۔ چھٹی ہو چکی تھی ورنہ سب عورتیں  
 اسے دیکھ کر حیران ہوتیں۔ اس نے اشتیاق سے ایک  
 ایک حصہ دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ یہاں اچھا  
 خاصا ٹائم لگ گیا تھا۔ اسکول دیکھنے جاتے تو رات کا  
 اندھیرا پھیل جاتا۔ سو ایک نے اسے واپسی کا کمل اس  
 نے فوراً مان لیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ کافی دیر  
 ایک کے ساتھ سنگھاریا میں بیٹھی رہی۔

زیان بیڈ روم میں معاذ کے ساتھ بات کرتے  
 ہوئے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔  
 ایک اٹھ کر آیا تو زیان اور معاذ میں رنم سیال کی باتیں  
 چھڑی ہوئی تھیں۔ ایک کے آتے ہی زیان نے فوراً  
 موضوع تبدیل کر دیا۔ ویب کم میں معاذ ایک کو دیکھ  
 کر اس تبدیلی کی وجہ جان چکا تھا۔ زیان نے جلدی  
 بات ختم کر دی۔ وہ نما کر آیا تو زیان کمرے میں نہیں  
 تھی۔ ایک نے تو لپے سے بل خشک کرتے ہوئے  
 دروازے سے باہر نظر دوڑائی وہ سخت سردی میں ٹیرس  
 کی دیوار پہ کنیاں نکائے کھڑی تھی۔

”باہر ٹھنڈ ہے زیان آپ بیڈ روم میں آجائیں۔“  
 وہ اس کے پیچھے پیچھے آگیا تھا۔ ایک ہلکی سی شرٹ میں  
 بغیر کسی گرم کپڑے کے تھا۔

”میں چاند کو دیکھ رہی ہوں“ آجاؤں گی۔“ وہ  
 قدرے رکھائی سے بولی تو ایک سر ہلا ٹاپلٹ گیا۔ اس  
 نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا نے اندر کی  
 حرارت کو سروپنے میں تبدیل کر دیا تھا اور اسے زیان  
 نے ہیٹر بھی آن نہیں کیا تھا۔ ایک نے ہیٹر آن کیا اور



# کچھ کچھ کھڑی

پر مصروف تھا اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس نے فون پر اختتامی کلمات کہے اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے فائل آگے بڑھائی۔ وہ اسے پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ہانیہ نے وال کلاک میں دیکھا پانچ پینتیس ہو چکے تھے اس کے ہونٹ بھنج گئے آج بے عزتی سے بچ جانا ناممکنات میں سے تھا۔

اس نے ایک کی طرف دیکھا جو فائل کے بجائے خود اس کے مطالعے میں محو تھا۔ ٹیبل پر کھٹی ٹکائے ہاتھ کی مٹھی بنا کر اس پر ٹھوڑی رکھے اپنی طلسمی نگاہیں ہانیہ پر جمائے بڑی دلجمعی سے اسے دیکھ رہا تھا وہ سٹٹاسی گئی اسے متوجہ دیکھ کر اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کی اور کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر بازو سینے پر باندھ لیے نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں جاؤں سر۔“ اس نے اجازت طلب کی۔

”بیٹھیں میں نے چائے منگوائی ہے۔“

”نہیں سر پلیز میں آل ریڈی بہت لیٹ ہو چکی ہوں۔“

”ہو چکی ہیں نا تو کچھ دیر اور سہی چائے پی کر کچھ فریش ہو جائیں گی۔“

”ساری فریش نیس نکل دیں گی تیلی ای۔“

وہ بے بسی سے سوچ کر رہ گئی تھی اسی اثنا میں چائے آچکی تھی اس نے اتنی تیزی سے چائے ختم کی کہ اس کا آخری گھونٹ بھی بہت گرم تھا مگر وہ اس کے ٹھنڈی ہونے کے انتظار میں مزید دیر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی سو فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھتے ہی ایک بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اس نے اپنا کپ

آج کام بہت زیادہ تھا ہانیہ کے ہاتھ بہت تیزی سے کی بورڈ پر چل رہے تھے وہ کسی طرح سے بھی پانچ بجے تک کام نمٹالینا چاہتی تھی کہ ٹائم سے کھر پانچ سکے پچھلے دو دن سے کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ لیٹ پانچ رہی تھی اور اس کے نتیجے میں ’نائی ای کی سخت ست بھی سننا پڑی تھیں۔ آج وہ کام جلدی کرنے کے چکر میں لپچ بھی نہیں کپائی تھی۔ اب بھی چائے کی شدید طلب کو دیا ہے وہ مصروف تھی۔

”ٹھک ٹھک“ دو انگلیوں سے اس کی ٹیبل بجائی

## کالم ولٹ

گئی اس نے حیرت سے انگلیوں سے چہرے تک کا سفر طے کیا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ”جی سر“

”بیٹھئے پلیز۔“

ایک۔ اس کا باس ہاتھوں میں چند پیپر لیے کھڑا تھا اسے متوجہ پا کر وہ پیپر اس کی طرف بڑھا دیے۔

”نہیں بھی فیڈ کر دیجیے۔“

”ہیس سر۔“ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یعنی مزید

”کیا بات ہے آپ تھک گئی ہیں یا۔“

”نہیں سر میں کھتی ہوں۔“

وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر واپس اپنے آفس چلا گیا۔ ”توبہ آنکھیں ہیں یا ایکسرسے اندر باہر دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ پھر سے مصروف ہو گئی پھر جیسے ہی کام ختم ہوا وہ کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر کے پیپر ز سمیٹ کر قافل میں لگا کر پاس کے آفس میں آگئی۔ وہ فون



جب تھکی ہوئی ہوتی ہیں تب ہی لیتی ہیں۔ ”اپنے اتنے  
 قریب سرایک کی آواز سن کر وہ اچھل ہی پڑی۔  
 ”سر آپ۔“ وہ ہکلا سی گئی۔

”جی میں۔“ وہ اسی طرح اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ  
 گیٹ کی طرف بڑھ گئی اور وہ پارکنگ کی طرف آ بھی وہ  
 گیٹ سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کی کار اس کے قریب  
 آکر رکی، ساتھ ہی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔  
 ”آئے مس ہانیہ“  
 وہ چکر اسی گئی۔ ”سر پلیز میں چلی جاؤں گی۔“

وہیں چھوڑ دیا جو آدھا چائے سے بھرا ہوا تھا کیوں کہ وہ  
 بہت آرام سے لی رہا تھا۔

”او کے سر میں اب جاؤں۔“  
 ”چلیں۔“ اس نے اس کے لیے دروازہ کھولا، وہ  
 تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر باہر نکلی، اس کی  
 مسکور کن خوشبو اس کے ساتھ ساتھ آئی تھی، اس  
 نے ایک لمبا سانس لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر  
 محفوظ کر لیتا چاہا تھا۔  
 ”یہ اتنے لمبے لمبے سانس آپ عادتاً لیتی ہیں یا





”نوفار ملیٹی“ آئے ویسے بھی آپ لیٹ ہو چکی ہیں۔“

اس کے حتمی لہجے پر وہ بے بس ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ باس تھا شو فروں کی طرح اس کے انتظار میں رکا نہیں رہ سکتا تھا۔ کار میں وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو اس کے حواس سلب کرتی تھی۔ اس کے استے پاس بیٹھنا اس کی خوشبو کو محسوس کرنا یہ سب کوئی خواب لگ رہا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے اس خواب میں رہنا چاہتی تھی اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا وہ مکمل طور پر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ تھا، گھور سیاہ آنکھیں سامنے فوکس تھیں۔ ہانیہ نے کبھی کسی کی اتنی سیاہ آنکھیں نہیں دیکھی تھیں، اتنی کلل اور چمکدار آنکھیں، مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھیں، سیاہ گھنی پلکیں، جڑے ہوئے ابرو، اس کی آنکھوں کی خوب صورتی کو برساتے تھے، وہ بہت شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ وہ نظر چرا کر ہی بات کرتی تھی۔

”ہتا نہیں کون خوش نصیب اس عالی شان دندے کی بیوی بنے گی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

”ویسے گاڑی میں اے سی تو چل رہا ہے۔“ یہ اس کی ٹھنڈی سانس پر کھنٹ آیا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”جی جی سر۔“

”اچھا میں ایک بات کلینے کروں، مجھے کراچی کے سارے راستوں کا ٹلم ہے، لیکن میں کسی کو اس کے گھر تک بغیر ایڈریس معلوم کیے نہیں پہنچا سکتا۔“

اس کے بیٹھے طنز پر ہانیہ کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا تھا۔

”میں ایڈریس بتاتی ہوں سر۔“

ایک نے مسکراہٹ چھپانے کو ہونٹ بھیج لیے تھے۔ وہ ایڈریس بتاتی گئی اور گاڑی کو اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق گھماتا مطلوبہ روڈ تک لے آیا۔

”بس سر یہ روڈ کراس کر کے آگے چلی میں ہمارا گھر ہے۔“

اس نے گاڑی روکی۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے اتر آئی۔

”آئے سر ہمارے گھر تشریف لائیے۔“

اس نے اخلاقاً ”دعوت دی“ لیکن اس وقت حیران رہ گئی جب اس کے گاڑی سے اترتے دیکھا۔

”جی جی۔“ وہ اتنی تیزی سے مڑی کہ اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ دیکھ ہی نہ پائی تھی۔ گھر کی نکل بجاتے ہوئے وہ خوف زدہ تھی۔ ایک البتہ حیران سا اس عالی شان عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ گیٹ پر تایا جان نرودار ہوئے تھے۔

”اتنی دیر۔“ ایک پر نگاہ پڑتے ہی انہیں بریک لگ گئی۔

”یہ میرے باس ہیں سر ایک تیمور صاحب، آج زیادہ دیر ہو گئی تو سر مجھے چھوڑنے کے لیے آگئے۔“

اس نے جلدی سے وضاحت کی، مبادا تایا جان مفلوک ہو کر کچھ اور سمجھ بیٹھیں۔ باس کاسن کر تایا جان کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ ”آئیے تشریف لائیے۔“

”نہیں اب میں چلتا ہوں۔ اوکے مس ہانیہ۔“ وہ روڈ سے لہجے میں معذرت کرتا واپس چلا گیا۔ وہ تایا جان کے پیچھے چلتی لاؤنج میں آئی تھی۔

”یہ تمہارے آنے کا ٹائم ہے، اور یہ مالکان کب سے اپنے زور کرز کو گھروں تک چھوڑ کر آنے لگے؟“

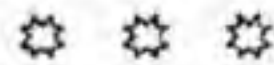
”نہیں تایا جان، سر کبھی کسی کو چھوڑنے نہیں جاتے، آج بہت دیر ہو گئی تو شاید اس لیے مجھے بھی اپنی گاڑی میں بٹھالیا، آج کل کام بہت ہے۔ میں کتنی ہی کوشش کر لوں، مگر ٹائم پر حتم نہیں کپاتی۔“ اس نے بے بسی سے انگلیاں چٹکائیں۔

”اچھا۔ جاؤ اپنے کمرے میں، آج شیریں گھر پر نہیں ہے سمانہ کے ساتھ اپنی فرینڈ کی بیٹی کے انگریج منٹ لائن کشن میں گئی ہوئی ہے، ورنہ تمہاری اتنی تاخیر پر بہت غصہ کرتی۔“

اس کی تو آدھی تھکن ہی اتر گئی تھی۔ تائی امی کے



گھر پر موجود نہ ہونے کا سن کر، ورنہ تو آتے ہی ان کی عدالت میں حاضر ہونا اور ان کے فیصلے سننا۔ ہانیہ کے امی، ابو ایک ایگسڈنٹ میں انتقال کر چکے تھے۔ تایا جان کو مجبوراً اسے اپنے پاس لانا پڑا تھا۔ مائی جان تو بہت مجبوری میں اسے برداشت کر رہی تھیں۔ اس کا بے پناہ حسن انہیں ہولائے دیتا تھا۔ ان کے چار بچے تھے۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں، عاصم بھائی سب سے بڑے تھے، انگلینڈ گئے تھے رخصتے کے لیے پھر وہیں جا ب کرلی اور وہیں شادی کر گئے وہیں کے ہو گئے۔ رومانہ شادی کے بعد وہی چلی گئیں۔ پیچھے عرصہ اور سمانہ تھے۔ بے حد لاڈ و پیار سے ملے ہوئے۔ مائی امی کو خطرہ اس کے حسن بے مثل سے تھا، وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ ان کی بھانجی زرش کو چھوڑ کر ہانیہ کا نام ان کے سامنے پیش کرے، حالانکہ عرصہ بہت لایا بلی سال کا تھا جو اپنی ہی دلچسپیوں میں مشغول رہتا تھا اور سمانہ اپنے حسن کی تابناکیوں میں اضافہ کے لیے پارلوں کے چکر لگانے کے علاوہ جو ٹائم بچتا اس میں اسی حسن میں گرفتار اپنے پروانوں سے فلن پر بالمشافہ ملاقاتوں میں مصروف رہتی تھی۔ اب ایک وہی فالتو بچتی تھی۔ جس پر مائی امی اپنے ستم آزمائی رہتی تھیں۔ اگر وہ جاب نہ کر رہی ہوتی تو ہر وقت مائی امی کی طنز و تشوہ سن کر پاگل ہو گئی ہوتی۔



”ہانیہ لگتا ہے سر تمہارے لیے ”کچھ کچھ“ محسوس کرنے لگے ہیں۔“ مومنہ بڑے شرارتی لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ وہ گڑبڑا گئی۔ ”کیا مطلب؟ فضول مت بولو۔“ ”خیر فضول تو ہرگز نہیں ہے، یہ تمہاری ٹیم کے پاس آکر رک جانا، کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی۔ بلاوجہ تمہیں مخاطب کرنا اور کتنی کتنی دیر تک تمہیں دیکھنا بلکہ دیکھتے ہی رہنا۔“ ”مومنہ پلیز۔“ وہ شرم سے سرخ پڑ گئی تھی۔ مومنہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”اوہو، ہانیہ صاحبہ کے دل میں تو لٹو پھوٹ رہے ہیں اور کیوں نہ پھوٹیں، سر ایک کوئی عام انسان تو نہیں، اگر وہ تمہارے ساتھ سیولس ہیں تو یہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے۔“

”بس کرو مومنہ پلیز، کسی نے سن لیا تو کتنی سبکی ہوگی۔ ضروری نہیں جو تم سمجھ رہی ہو وہی بات ہو اور اگر یہی بات ہو تب بھی اتنا آگے کا سوچنا ٹھیک نہیں ہی میں ہوں تو ان کی ملازم ہی بنا۔“

”یار ایسے تو نہ کہو۔“ مومنہ نے خفگی سے کہا۔ ”کیسے نہ کہوں مومنہ، میری مائی عرصہ بھائی کو مجھ سے یوں بچا بچا کر رکھتی ہیں کہ کسی طرح میں انہیں متاثر نہ کر لوں تو سر ایک کی والدہ نے اپنے اسٹینڈرڈ کی لڑکی نہیں ڈھونڈی ہوگی ان کے لیے ایک آفس ورکر ان کی چوائس کبھی نہیں ہو سکتی۔“

”شاید“ مومنہ اس بڑھیلی پڑ چکی تھی۔ ”میں اسی لیے اتنے اونچے خواب ہی نہیں دیکھتی۔“ وہ افسردگی سے کہہ کر سرگرمی کی بیک پر رکھ کر آنکھیں موند کر خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگی، مگر دل بھر آیا۔ کتنے ہی آنسو دائیں بائیں کنپٹیوں میں جذب ہوتے رہے۔ مومنہ خاموشی سے اپنی جگہ پر چلی گئی تھی۔ کافی دیر بعد جب دل ہلکا ہو گیا تو وہ چہرہ پر پھٹتی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی سامنے نظر پڑی تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بالکل سامنے کھڑا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے متوجہ پا کر قدم آگے بڑھ آیا۔ ”مائی براہ کرم مس ہانیہ؟“

”تو سر کک کچھ نہیں۔“ وہ ہٹلا سی گئی۔ ”تو آپ رو کیوں رہی تھیں ابھی؟“ ”یونہی می پاپا یاد آ گئے تھے۔“ اسے بہانہ سوجھ ہی گیا۔

”تو رونے کی کیا بات ہے، مل آئیں ان سے کہاں ہیں نہ؟“ وہ حیران سا تھا۔ ”ان کی تو وفات ہو چکی ہے۔“ ہانیہ کی آنکھیں لہلہا بھر گئیں۔ ایک توب بستہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔ ”اوہ سوینڈ“ پھر وہ ہلکے سے کھنکارا۔



”نہیں، بس چائے منگوائی تھی پی کر میں آگئی۔“  
اس نے مومنہ کو بل دیا، لیکن سچ تو یہ تھا کہ اسے ایک  
کے لیے میں موجود تبدیلی کا سرغل مل گیا تھا۔



سر ایک کے بڑے بھائی کی شادی تھی، سارے  
آفس کو کارڈز بانٹے گئے تھے۔

”تم چلو گی ہانیہ؟“ مومنہ نے پوچھا۔  
”کچھ کہہ نہیں سکتی، اگر پریشانی ملی تو۔“ اس نے  
بے بسی سے کندھے اچکائے۔

”کارڈ کتنا شاندار ہے۔“ مومنہ نے توصیفی  
نظروں سے کارڈ کو دیکھا۔

”ظاہر ہے جیسا پیسہ ہوگا، ویسی ہی چیز ہوگی۔“  
”صحیح بات ہے۔ ویسے نام تو دیکھو کیسے شاہانہ ہیں۔  
ہیرک تیمور، سن آف زرک تیمور اور ہمارے سر ہیں  
ایک تیمور اور ایک بہن ہے ان کی سبک تیمور، ایک  
دفعہ سر کے فادر کے ساتھ آئی تھی، اسکول کی  
اسٹوڈنٹ ہے۔“

”اتنی چھوٹی؟“ ہانیہ حیران ہوئی۔  
”ہاں، چوہہ، پندرہ سال کی ہوگی، چلو پھر تم گھر سے  
پوچھ کر تاؤ تو ذرا تیاری تو کریں۔“  
”ٹھیک ہے، میں بتا دوں گی۔“



ہانیہ کی توقع کے برعکس اسے بہت آرام سے  
اجازت مل گئی تھی۔ بارات والے دن وہ ہل میں کچھ  
لیٹ ہی پہنچی تھی۔ ہل کچھ بھرا ہوا تھا، اتنے ہجوم  
میں کسی شناسا چہرے کو ڈھونڈنا بھی کوئی آسان کام نہ  
تھا۔ اتنے میں اس کے سیل پر کل آنے لگی۔ اس نے  
دیکھا مومنہ کا نام ہلنک کر رہا تھا۔ ”ہاں مومنہ! کہاں  
ہو؟“

”لہفٹ رو سے تیسری ٹیبل پر۔“ اس نے باتیں  
طرف دیکھا، مومنہ کھڑی ہو کر دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے  
متوجہ کر رہی تھی۔ وہ تیزی سے وہاں پہنچی، مومنہ کے  
ساتھ تین اور آفس کی خواتین بھی تھیں۔ مل کر وہ بھی

”آپ اب اٹھ جائیں۔ ہاتھ منہ دھو کر فریش  
ہو جائیں، میں چائے منگواتا ہوں۔“ وہ منع کرنے لگی،  
لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ وہ اٹھ کر واش روم  
چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد آئی تو وہ اپنے آفس جا چکا تھا۔  
مومنہ نے بتایا کہ وہ اسے بھی پوچھنے آئے گا کہہ گیا ہے۔  
وہ اندر آگئی جہاں بیون چائے ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔

”بیٹھیں۔“ وہ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں سوچ سی  
گئی تھیں اور ٹاک اور گل سرخ ہو رہے تھے۔ وہ اتنی  
خوب صورت لگ رہی تھی کہ ایک مبہوت سا اسے  
دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی کہ  
ایک کی نظروں کے ارتکاز نے چونکا دیا۔ اس نے اس  
کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ کو  
اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ سرخ موڑ کر سامنے رکھی فائل کی  
طرف متوجہ ہو گئی۔ ”یا حیرت!“ ہانیہ کو جھٹکا سا لگا تھا۔  
پہلی ملاقات سے لے کر اس دن تک اس نے کبھی  
اپنی نظروں کا رخ نہیں موڑا تھا جب بھی دیکھتا تھا۔ نظر  
جما کر دیکھتا تھا وہ کنفیوژ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتی  
یہ وہ یونسی دیکھتا رہتا۔ اب اسے اس تبدیلی سے جھٹکانہ  
لگتا تو کیا ہوتا۔ بغیر دیکھے ایک نے اس کی حیرت کو  
محسوس کر لیا تھا اور لیوں پر بے ساختہ در آنے والی  
مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے چائے کا کپ منہ سے لگا  
لیا تھا۔ چائے ختم کر کے وہ اٹھ گئی۔ ”میں جاؤں سر؟“  
ایک نے سر کی جنبش سے اجازت دی تھی فائل  
میں اس کا انماک قابل دید تھا، حیران پریشان ہانیہ جیسے  
کسی جادو کے اثر میں اپنی کرسی پر آکر بیٹھی تھی۔ وہ  
یوں ٹھنکی باندھ کر دیکھتا تھا تو شرم آمیز منہ بھر اسے  
گھیر لیتی تھی اور جب بے نیاز ٹافائل دیکھتا رہا تو الجھن  
ہونے لگی۔

”ہانیہ! سر نے کچھ کہا تم سے؟“ وہ آکر بیٹھی ہی تھی  
کہ مومنہ آٹھکی۔  
”کیا مطلب کچھ ہوا؟“

”میرا مطلب ہے کہ وہ ہمارے بالکل پیچھے ہی  
کھڑے تھے جب ہم ان ہی سے متعلق باتیں کر رہے  
تھے تو سن لینے کے بعد کوئی رسپانس تو نہیں دیا۔“



ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

”اللہ ہانیہ“ کتنی پیاری لگ رہی ہو، ماشاء اللہ سے۔“ مومنہ نے بے اختیار اس کی تعریف کی۔ وہ مسکرا دی تھی۔ مہجنتا Majenta پرپل اور شانگ پنگ کنٹراسٹ کے لباس میں میسجنگ جیولری اور میک اپ نے اس کے حسن کو وہ نکھار دیا تھا کہ مومنہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اس پورے ہل میں کوئی بھی اس کے مقابلے کی حسین لڑکی نہیں تھی۔

”ہیلو ہانیہ۔“ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور سامنے کودیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ سامنے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”حیران ہو گئی ہوتا۔ اچھو ملی پایا بھی انوائنڈ تھے“

لیکن تمہیں سر پر انزدینے کے کیسے نہیں بتایا۔“ ہانیہ مسکرا دی۔ اس نے مومنہ اور سامنے کا آپس میں تعارف کروایا۔ مومنہ سامنے سے متاثر نظر آرہی تھی اور کیوں نہ ہوتی، سامنے اہلٹھٹ کلاس کی نمائندہ جو بنی کھڑی تھی۔ منگاترین سوٹ، منگے پارلر سے کروایا گیا میک اپ اور وہ بہت متاثر کن نظر آرہی تھی۔

”تائی امی بھی آئی ہیں؟“

”ہاں، وہ اپنی جاننے والیوں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔“ اتنے میں دولہا، دلہن اسٹیج پر آگئے، شوخ و شرارتی رسمیں ہونے لگیں، ہر طرف قہقہے بکھر رہے تھے، ہبرک بھی ایک ہی کی طرح بہت خوب صورت تھا، دلہن بھی بہت حسین تھی۔ ایک بلیک کرتے اور سفید شلوار میں بہت مختلف اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہنستا، مسکرتا، چھیڑ چھاڑ کرتا ہانیہ مسلسل اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ معا“ اسے اس کی نظروں کا احساس ہوا تھا وہ ایک دم مڑا اور ہل میں نظریں دوڑانے لگا۔ ہانیہ نے گھبرا کر سرخ موڑا اور سامنے اور مومنہ کی طرف توجہ کر لی تھی۔

”ہیلو۔“ اس کے بالکل نزدیک ایک کی آواز آئی تھی۔ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ ”السلام علیکم سر۔“

”ہیٹھیں پلیز یہ آئیں نہیں ہے۔“ وہ بڑی دلکشی سے مسکرا رہا تھا۔ مومنہ و دیگر بھی احتراماً کھڑی ہو چکی

تھیں، اس کے کہنے پر پھر سے بیٹھ گئیں، مگر ہانیہ اسی طرح کھڑی رہی۔ ایک کے سامنے اس کے حواس یونہی کم ہو جاتے تھے، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

”اوہ اسی ڈارلنگ، آپ کے ڈیڈ بلار ہے ہیں۔“ ایک بہت ہی خوب صورت اور ماڈ خاتون ایک کے پاس آئیں اس کے بازو سے پکڑ کر ساتھ لے جانا چاہا۔

”لیس مام، میں چلتا ہوں، آپ ان سے ملیجے۔“ وہ فردا“ فردا“ سب کا تعارف کرواتے سامنے پر آکر رک گیا۔

”یہ میری کزن ہیں سامنے بلال۔“ ہانیہ نے تعارف کروایا۔

”آئی میں مسز شیریں بلال کی بیٹی ہوں۔“ سامنے نے بتایا۔

”اوہ لیس، میں پہچان گئی، آئی ہیں ناشیریں، میں ملتی ہوں ان سے۔“ پھر وہ ہانیہ کی طرف مڑیں۔ ”آپ کیا نام بتایا آپ نے؟“

”ہانیہ منصور۔“

”ہاں، ہانیہ بیٹا، میں آپ سے دوبارہ ملنا چاہوں گی کبھی فرصت میں، آج تو ٹائم کی بہت کمی ہے۔ بہت اچھا لگا آپ سے مل کر، سو کیوٹ اینڈ پریٹی۔“ انہوں نے پیار سے اس کا گال چھوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ہنس پڑیں، اسی پل ایک کم عمری پیاری سی لڑکی انہیں پکارتی ہوئی پاس پہنچی آئی۔

”مام اینڈ بھائی، ڈیڈ آپ کو بلار ہے ہیں۔ اوہ مائے گڈ نیس۔“ اس کی نظر ہانیہ پر پڑی تو وہ بات ہی بھول گئی۔

”ہاؤ بیوٹی فل شی از“ وہ ہانیہ کے پاس آئی اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ آئی ایم سبک۔

”ہانیہ۔“ اس نے تعارف مکمل کیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ کا تو نام بھی آپ ہی کی طرح خوب صورت ہے۔“

”آپ بھی بہت پیاری ہیں۔“ وہ حقیقتاً بہت کنفیوژ ہو رہی تھی۔ اس کی کیفیت سمجھ کر ہی ایک



نے اپنا سرخ موڑ لیا تھا۔

”آپ ولیمہ فنکشن میں بھی آئے گا“ میں آپ سے فرینڈ شپ کر دوں گی اور آپ ہمارے گھر بھی آئے گا“ اسی بھائی۔

”اب آپ کو دیر نہیں ہو رہی“ آپ تو ہمیں بلانے آئی تھیں۔“ ایک نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔

وہ تینوں کے چلے جانے کے بعد گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ اتنی تعریف اور وہ بھی ایک کی موجودگی میں جس کے لبوں پر مسلسل مسکراہٹ رقص کر رہی تھی، ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد پھر وہ اسے دیکھ ہی نہیں پائی تھی، بن دیکھے اسے سب محسوس ہو رہا تھا اور صرف اس کے ہی نہیں، مومنہ اور سمانہ کو بھی سب کچھ نظر آیا تھا۔

”آپ نے دیکھا سمانہ“ لوگ کیسے اس کے حسن سے امپرئیس ہوتے ہیں؟“ مومنہ نے شرارت سے ہانیہ کو دیکھا۔

”یہ ایک صاحب آفس میں بھی یونہی مسکرا مسکرا کر ہانیہ کو دیکھتے ہیں۔“ سمانہ نے ایک کٹھلی نظر اس پر ڈالی تھی۔ ہانیہ کا رنگ سفید پڑ گیا تھا، مومنہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے“ آفس میں تو بہت سخت لباس ہیں، یہ تو ظاہر ہے، ان کے بھائی کی شادی کا فنکشن ہے تو وہ اتنے خوش ہیں۔“ اس نے سنبھل کر محتاط الفاظ کا انتخاب کیا۔ سمانہ کندھے اچکا کر اٹھ گئی۔ ”میں ماما کے پاس جا رہی ہوں۔“

”توبہ ہے، کتنی تیز ہے“ اتنی سی دیر میں کیسے ٹھیک انداز لگا لیے۔“ اس کے جانے کے بعد مومنہ نے لمبی سانس آزاد کی تھی۔ اتنے میں کھانا سرو ہونا شروع ہو گیا چونکہ نیبل سروس تھی اس لیے وہ بھی خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ کھانا آخری مراحل میں تھا کہ سبک اور اس کی مام آگئیں، کھانا ٹھیک سے لینے کی ہدایت کر کے وہ تو مسکرائی ہوئی آگے بڑھ گئیں، مگر سبک اس کے پاس ہی ٹک گئی

تھی۔ وہ اتنی پیاری اور معصوم سی باتیں کر رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے کی ساری کوفت جالی رہی تھی۔

”میں نے اسی بھائی سے کہا کہ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ آپ کے آفس میں اتنی پیاری لڑکی آتی ہے میں ان سے ضرور ملتی۔“

”تو انہوں نے کیا کہا؟“ مومنہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”Silly girl“ اس نے بھاری آواز بنا کر ایک کی نقل اتاری۔ تینوں ہی ہنس پڑی تھیں۔

”ڈیڈ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر آواز دی۔ زرک صاحب مسکراتے ہوئے پاس آئے۔ ”یس؟“

”ڈیڈ ان سے ملیں یہ ہانیہ ہیں۔ اسی بھائی کے آفس میں ہوتی ہیں۔ کتنی کیوٹ ہیں نا۔ میں نے ان کو اپنی فرینڈ بنا لیا ہے۔“ وہ تیز تیز بول رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اسے سن رہے تھے۔ ہانیہ اور مومنہ نے اٹھ کر انہیں سلام کیا تھا۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اب میں جا سکتا ہوں؟“

”جسٹ آمنٹ“ وہ اٹھ کر ان کے پاس گئی اور بچوں کے بل اونچی ہو کر ان کے گلن میں کچھ کہنے لگی، وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکے ہوئے تھے، اس کی بات سن کر انہوں نے باقاعدہ ہانیہ کو دیکھا تھا اور ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ پھر انہوں نے بھی اس سے سرگوشی میں کچھ کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئے

تھے۔ سبک بھی ان کے پیچھے ہی گئی اور کچھ ہی دیر میں ایک کا ہاتھ پکڑ کر آتی دکھائی دی، ہانیہ تو ویسے ہی ندوس ہو رہی تھی، اب توجہ بچ بزل ہو گئی، جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھی اور کولڈ ڈرنک بھی سائیڈ پر رکھ دی۔

مومنہ ایک کو آتے دیکھ کر واش روم کے بہانے کھسک گئی اور دیگر خواتین آپس میں مصروف تھیں۔

”اسی بھائی“ آپ ہانیہ کو بولیں کہ ولیمہ میں بھی ضرور آئیں اور ہمارے گھر بھی۔“

”گھر پر تو آپ انوائٹ کریں، ولیمہ سرمئی کے لیے میں آپ کو پرسنل انوائٹ کر رہا ہوں کہ آپ ضرور آئیں۔“ وہ سبک سے اور ہانیہ سے بیک وقت مخاطب ہوا تھا۔



”پیس سر میں ضرور آؤں گی۔“ اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا تھا۔ سبک نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”اور ہمارے گھر؟“

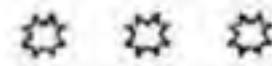
”وہاں بھی آؤں گی ان شاء اللہ۔“ اتنے میں سیل پر تایا جی کی کل آنے لگی وہ اسے باہر بلا رہے تھے۔ ”اوکے میں اب چلوں۔“

”ہانیہ میں آپ کے ساتھ ایک Snap بنوالوں؟“ اب وہ سٹیٹائی تھی۔ ”مجھے دیر ہو جائیں گی۔“

”نہیں بس فوٹو سنس بھائی جلدی کریں۔“ وہ ہانیہ کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ ایک نے اپنا سیل نکالا اور اس میں ان دونوں کی تصویر کھینچ لی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل رکھے تھے کیوں کہ ہانیہ کی کیفیت دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے والی ہے۔

”اچھا اب تو جاؤں نا؟“ وہ مری مری آواز میں بولی تھی سبک اس سے لپٹ گئی۔ ”آئی لو یو ہانیہ اینڈ سی یو۔“

اس نے مسکرا کر اس کے گل پر پیار کیا۔ بہت ہی پر خلوص بچی تھی۔ اسے واقعی بہت پیار لگی۔ ایک کے ساتھ باہر تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔



ولیمہ فنکشن میں اس کا سوٹ گرین اور بلیک کنٹراسٹ میں تھا۔ وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ اس بار اسے کچھ اور ہی طرح سے دیکھ کر دیا گیا تھا۔ زرک تیمور اور ان کی مسز بہت پیار سے اس سے ملے تھے اور رو میٹ۔ تیمور نے اسے اپنی چند دوستوں سے بھی ملوایا تھا۔ ایک بلیک سوٹ میں اپنی شان دار لک کے ساتھ موجود تھا۔ اس سے سرسری سامنے کے بعد اسٹیج پر ہی مصروف رہا تھا سبک البتہ اسے پورا ٹائم دے رہی تھی۔ آج اس کی دوست بھی اس کے ساتھ تھیں جن سے اس نے ہانیہ کا تعارف کروایا تھا۔ وہ گفت دینے کے لیے اسٹیج پر آئی تو ایک آکر اس کے

بالکل ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ ”بولی! یہ مس ہانیہ ہیں۔“ سبک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”تھینک یو۔“ اس نے مسکرا کر گفت اور بکے باری باری دونوں کے حوالے کیے۔

”آمین، بیٹھیں نا۔“ علیشا نے اپنے برابر ہاتھ رکھا۔

”نہیں میں اب چلتی ہوں لیٹ ہو جاؤں گی۔“ ”یہ ہمیشہ لیٹ ہونے کے ڈر سے لیٹ ہو جاتی ہیں۔“ ایک کے تبصرے پر وہ دونوں ہنس پڑے تھے جبکہ ہانیہ خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔ وہ مڑی تو علیشا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ”کتنی خوب صورت ہے یہ اسی بھی ٹھیک۔“ آگے وہ سن نہیں پائی تیز تیز قدم اٹھاتی وہ مل سے باہر جا رہی تھی۔

”کیا ہل میں ہم پلاسٹ ہونے کی اطلاع آئی ہے جو آپ یوں اسپید سے یہاں سے نکلنا چاہ رہی ہیں۔“ اپنے بالکل پاس ایک کی آواز سن کر یوں اچھلی کہ گرتے گرتے بچی تھی۔

”ریلیکس“ وہ اس کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”سرپلیز میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے اسے منع کرنا چاہا۔

”نہیں کب کہہ رہا ہوں کہ آپ ہمیشہ یہیں رہیں گی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح لاجواب ہو گئی۔

”آئے“ وہ اسے ساتھ لیے اپنی گاڑی تک آیا اور دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”سر آپ زحمت نہیں کریں میرے تایا جی آئے ہوئے ہیں انہوں نے کہا تھا میں گفت دے کر آ جاؤں وہ یہیں ہوں گے۔“ اس نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔

”وہ جا چکے ہیں۔“ وہ بہت رسلان سے بولا تھا۔ ہانیہ کی متلاشی نگاہیں تھک کر ایک کے چہرے پر آئیں جو بہت اطمینان سے اسے دیکھنے میں مصروف تھا اس نے رخ موڑ لیا تھا اس کے موبائل پر رنگ ٹپل ہونے



گئی۔ تایا جی تھے۔  
 ”ہانیہ بیٹا میں تمہیں بتا نہیں سکا مجھے ایمر جنسی  
 میں اسپتال آنا پڑا ہے، میرے دوست شفاعت کا  
 ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے، تم آ جاؤ گی یا میں عرصہ سے کہہ  
 دوں۔“

”میں آرہی ہوں تایا جی۔“ اس نے فون بند کر دیا۔  
 ہمیشہ وہ نئے سرے سے دکھ محسوس کرتی تھی۔ ہونا تو یہ  
 چاہیے تھا کہ وہ عادی ہو جاتی پر وہ نہیں ہوتی تھی۔ اب  
 بھی دل میں یہی خیال آرہا تھا کہ اگر سمانہ یہاں اس کی  
 جگہ ہوتی تو کیا تب بھی تایا جی یونہی چلے جاتے اس کا  
 کھلا ہوا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ ایک بہت غور سے اس کے  
 چہرے کے آثار چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ”چلیں آئیں“ میں  
 آپ کو پہنچا دوں۔“  
 ”آپ کو زحمت ہو گی۔“

”Don't mention“ وہ اپنی گاڑی نکال  
 کر روش پر لے آیا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔  
 ”آپ کو ہماری فیملی آئی مین۔ میرے بہن بھائی  
 مام ڈیڈ سب کیسے لگے۔“

”بہت اچھے بہت ہی اچھے ہیں سب۔“  
 ”اور میں‘ میں کیسا ہوں؟“ اس نے مسکراتے  
 ہوئے پوچھا۔ ہانیہ کے چہرے پر سرخی لہرائی ”آپ بھی  
 بہت اچھے ہیں سر۔“

”اپنی تعریف تو میں نے زبردستی کروائی ہے پھر بھی  
 تھینکس۔“ اس کے شرارت سے کہنے پر وہ  
 کھلکھلا کر ہنس پڑی اور یہی ایک چاہ رہا تھا کہ وہ  
 افسردگی جو اس پر چھا گئی ہے وہ دور ہو جائے۔



ہیرک کی شادی کے بعد وہ لندن چلا گیا تھا۔ تقریباً  
 دو ہفتوں کے بعد واپس آیا تھا۔ آتے ہی اس نے فون  
 کر کے ہانیہ کو اندر بلایا تھا۔

”لوہ۔ بہت دن ہو گئے دیکھے ہوئے آتے ہی  
 بلا لیا۔“ مومنہ شرارت سے کھنکھاری تھی۔ وہ بغیر کوئی  
 جواب دیے آگے بڑھ گئی۔ دروازہ ٹاک کر کے آئی تو وہ

فون پر مصروف تھا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس نے  
 فون نکالیا تو سیل فون گنگنا نے لگا تقریباً ”دس منٹ وہ  
 بات کرتا رہا“ اسے بند ہی کیا تھا کہ اکرام صاحب  
 آگئے۔ ظاہر ہے وہ اتنے دن بعد آیا تھا تو کام بھی پیچھے  
 ٹھیک ٹھاک جمع ہو گیا تھا۔ ان سے ڈسکشن کرتے  
 ہوئے پندرہ منٹس مزید گزر گئے، وہ رخصت ہوئے تو وہ  
 لمبی سانس لیتا اس کی طرف متوجہ ہوا جو کب سے چپ  
 چاپ بیٹھی اپنے بلوائے جانے کی وجہ جاننے کی منتظر  
 تھی۔

”کیسی ہیں آپ اور کام کیسا چل رہا ہے؟“

”سب ٹھیک ہے سر۔“

”آپ سے کچھ پرسنل سوال پوچھ سکتا ہوں؟“

”پرسنل سوال؟“ اس کا دل دھڑک گیا۔ ”جی سر“

”آپ جاب کیوں کرتی ہیں؟“

”جی سر؟“ وہ حیران رہ گئی تھی اس سوال پر۔

”آپ کے انکل تو ویل آف ہیں ان کی اپنی بیٹی بھی

کوئی جاب وغیرہ نہیں کرتی تو آپ کیوں کر رہی ہیں کیا  
 وہ آپ کو سپورٹ نہیں کرتے؟“

”میرے خیال میں یہ بہت زیادہ پرسنل ہے۔“ وہ  
 خشک لہجے میں اپنی طرف سے بات ختم کرتے ہوئے  
 بولی۔

”آپ گھر بیٹھنے کو قید سمجھتی ہیں؟“

”پلیز سر یہ میرا اپنا پرسنل میٹر ہے۔“ وہ اٹھ کر

کھڑی ہو گئی۔ ”میں جاسکتی ہوں اب۔“

وہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔ ابھی  
 ابھی سی باہر آئی تھی۔



دن بہ دن ایک کا رویہ بدلنے لگا تھا، وہ بلا وجہ ہی  
 ہانیہ کو جھڑک دیتا تھا اس کے کاموں میں نقص نکالنے  
 لگا۔

”یہ کیا کیا ہے آپ نے۔ یہ دیکھی ہیں آپ نے  
 اپنی غلطیاں۔ میں کیا یہی ٹھیک کرتا ہوں گا پھر آپ  
 کیا کرنے آتی ہیں۔ دلغ کہاں ہوتا ہے آپ کا؟“ اس



نے فائل زور سے سامنے ٹیبل پر پٹنی تھی۔ ہانیہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

”اب کھڑی کیا دیکھ رہی ہیں، جائیں یہ سب ٹھیک کر کے آئیں۔“ وہ فائل لے کر آئی، اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا، اس کے پوائنٹ کیے ہوئے الفاظ کو دوبارہ سے صحیح کیا۔ اندر آئی تو اکرام صاحب اور اسرار صاحب کو بیٹھے دیکھ کر اسے مزید گھبراہٹ نے آن گھیرا۔ ان کے سامنے بھی اگر سر نے کچھ کہہ دیا تو وہ تو مارے شرمندگی کے مر جائے گی۔ اس نے فائل ایک کے سامنے رکھی۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور فائل کھول کر دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے آپ جائیں۔“ اس بار لہجے میں نرمی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر تیزی سے باہر آئی تھی۔ مومنہ اس کے پاس آئی۔

”کیا ہوا ہانیہ! کیا سر نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں، بس کچھ غلطیاں ہو گئی تھیں، وہ ٹھیک کی ہیں۔“

”مجھے تو تم ٹھیک نہیں لگ رہیں، کیا بات ہے؟“

”طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں گھر جا رہی ہوں۔“ اس نے ہنڈ بیگ اٹھایا اور مسز جنید سے اجازت لے کر گھر آگئی۔ اپنے کمرے میں آکر وہ بری طرح سے رو پڑی تھی۔ پتا نہیں وہ کیوں اتنا بدل گیا تھا۔ کیوں اس کی اس طرح انسٹلٹ کر دیتا تھا۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔



گھر میں خاصی چہل پھل سی تھی۔ تائی جی کا موڈ بھی خاصا اچھا رہنے لگ گیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ہنس بول لگتی تھیں۔ یہ راز اس دن کھلا جب انہوں نے اسے بتایا کہ اس اتوار کو سلمانہ کی منگنی ہے۔ کہاں اور کس کے ساتھ؟ یہ نہ انہوں نے بتایا نہ اس نے پوچھا۔ اسے شریک کیا جا رہا تھا یہی بڑی بات تھی۔ منگنی کا فنکشن بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا، اس لیے ہوٹل میں اینجمنٹ کی گئی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا

تھا کہ لڑکے والے کوئی زوردار پارٹی تھے۔ اسے بھی ظاہر ہے شرکت کے لیے اچھی طرح ڈریس اپ ہونا تھا تو یہ عرصہ کے ساتھ بازار آئی تھی، وہ گاڑی سے اتر رہی تھی جب اس کی نظر ایک پر پڑی۔ وہ اس شانگ مل سے باہر آ رہا تھا۔ عرصہ گاڑی پارکنگ میں لے گیا تھا۔ اکیلی ہی آگے آئی۔

”السلام علیکم سر“

”وعلیکم السلام یہ کون تھے آپ کے ساتھ؟“

”سر، میرے کزن ہیں عرصہ بھائی۔“

”بھائی؟“ اس نے طنزیہ اسے دیکھا۔ ”اور کتنے بھائی ہیں آپ کے؟“

”آپ کتنا کیا چاہتے ہیں سر؟“ اس بار اس کا لہجہ بھی تیز ہو گیا تھا۔

”آپ اچھی طرح سمجھ چکی ہیں۔“ وہ تلخی سے کہتا تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ وہ سن سی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس پر شک کر رہا تھا۔ اس کی کس بات، کس حرکت سے اسے اس پر شک ہوا تھا۔ وہ اپنے چکراتے داغ کے ساتھ سوچ رہی تھی اور مزید الجھ رہی تھی کہ عرصہ نے اسے چونکا یا۔ ”ہانیہ، کیا یہیں کھڑی رہو گی۔“



وہ سب تیار ہو کر ہوٹل پہنچے تو تائی جی نے اسے اپنی بہن کے پاس بیٹھا دیا، وہ ان کے ساتھ باتوں میں ایسی الجھی کہ لڑکے والوں کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

”لڑکا تو ماشاء اللہ سے بہت ہی پیارا ہے۔ بہت اچھا کپل بنا ہے دونوں کل۔“ آنٹی کے کہنے پر اس نے چونک کر اسٹیج کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کو تو آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ سلمانہ کے ساتھ ایک بیٹھا ہوا تھا۔ ”تو یہ وجہ بھی اس کے بدلنے کی۔“

اس نے دکھ سے سوچا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ چہرے کا رنگ خطرناک حد تک سفید ہو چکا تھا۔ ابھی تو اس نے اس کے حوالے سے خواب دیکھے ہی شروع کیے تھے، ابھی تو اسے اپنا سمجھنے کی خوشی کو

[[بندر کرن 2015 اکتوبر 2015]]



”نہیں، ٹھیک ہوں، بس کچھ سست ہو رہی ہوں۔“  
اس نے مسکرا کر ٹالنے کی کوشش کی تھی، وہ کچھ دیر  
اسد دیکھتی رہیں، پھر کھانے کی طرف توجہ کر لی تھی۔



وہ ددن آفس نہیں چلیا، تھی، اپنے آپ کو  
سمجھانے کے لیے ددن کافی تو نہیں، پھر بھی بہت حد  
تک اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔ ایک نے اس سے  
کوئی وعدے نہیں کیے تھے حتیٰ کہ محبت کا اظہار تک  
نہیں کیا تھا پھر وہ خوش فہمیوں میں گھری تو اس کی اپنی  
غلطی۔ اس نے اپنے لیے سہر چل اپنے اسٹینڈرڈ کی  
لڑکی ہی چنی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی جسے تسلیم کرنا  
ہی وقت کا تقاضا تھا۔ ایک اور سامانہ اکثر باہر ملنے لگے  
تھے سامانہ کی توجہ خود پر بہت بڑھ گئی تھی۔

اس دن بھی وہ ڈنر پر اس کے ساتھ باہر گئی ہوئی  
تھی۔ ہانیہ اپنے آفس کے لیے کپڑے رہیں کر کے  
ہنگ کر رہی تھی جب کل نکل کی آواز گونجی۔ گھر پر  
کوئی بھی نہیں تھا۔ تیا جان اور تائی جی کسی کے انتقال  
پر گئے ہوئے تھے اور عرصہ اپنے دوستوں کے ساتھ سی  
ویو گیا ہوا تھا سو ہانیہ ہی کو گیٹ پر آنا پڑا تھا۔ ”کون؟“

”ہانیہ میں ہوں سامانہ۔“ اس نے گیٹ کھولا، سامانہ  
کے پیچھے ایک بھی تھا، وہ پیچھے ہٹ گئی۔ وہ لاؤنج میں  
آگئے۔

”ہانیہ کافی پلواد یار۔“ وہ سر ہلاتی ہوئی کچن میں  
آگئی۔ دودھ بواٹل کرتے، کافی پھینٹتے ہوئے کہتے ہی  
آنسو اس کے گالوں کو بھگوتے رہے۔ اسے اندازہ ہی  
نہیں ہوا۔ کافی تیار کر کے اس نے چینی الگ سے رکھی  
اور اچھی طرح سے منہ صاف کر کے ٹرے لے کر  
لاؤنج میں آگئی۔ سامانہ نہیں تھی، وہ اکیلا بیٹھا اپنے سیل  
کو چیک کر رہا تھا۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ ”کتنی  
چینی سر؟“

وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ”ایک  
چمچ“ اس نے ایک چمچ چینی ملا کر کپ اس کی طرف  
برہایا۔ اس نے کپ یوں تھا کہ ہانیہ کی انگلیاں بھی

محسوس بھی نہیں کر پائی تھی کہ وہ پرایا بھی ہو گیا تھا۔  
اسے خود پر قابو پانا بہت مشکل لگ رہا تھا، مگر سہل کوئی  
ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں وہ چھپ سکتی۔ اتنے میں  
عرصہ اسے بلانے آگیا۔ ”مئی بلارہی ہیں۔“

وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ عرصہ اس کے  
ساتھ ساتھ چل رہا تھا، کچھ باتیں بھی کر رہا تھا جو اس  
کے سر سے گزر رہی تھیں، اپنی کیک پاتی ٹانگوں پر قابو  
پا کر وہ اینیج پر پہنچی جہاں تائی جی اور دودھ صہہ آنٹی  
موجود تھیں۔ بہت پیار سے اس ملیں۔

”آؤ ہانیہ، بہن کے ساتھ مودی بنو، تصویر  
کھنچو۔“ کیسا شہد چسپا لہجہ تھا، لیکن وہ اس کی لذت  
سے بے بہرہ ہو چکی تھی۔ حالانکہ وہ بہت کوشش  
کر رہی تھی خود پر قابو پانے کی، مگر دل و دماغ میں کوئی  
رابطہ ہی نہیں تھا۔ وہ سامانہ کے ساتھ بیٹھی اور کچھ ہی دیر  
میں اٹھ گئی۔ کھانا شروع ہوا تو وہ پلیٹ میں تھوڑے  
سے چادل ڈال کر چمچ سے ادھر ادھر کرتی رہی۔ کھانے  
کے لیے جس خواہش کی ضرورت تھی، وہ اسے تھی ہی  
نہیں۔

”ہانیہ میں آپ کو جوائن کر سکتی ہوں۔“ دودھ صہہ  
کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔  
”جی جی آنٹی“ وہ اس کے پاس بیٹھ گئیں، اس نے  
پلیٹ ان کی طرف برہائی انہوں نے مسکرا کر تھامی۔  
”آپ سبک کا نہیں پوچھیں گی؟“ اس نے نا بھی  
سے انہیں دیکھا۔

”وہ امریکا گئی ہوئی ہے، بہرک اور علیشا کے ساتھ،  
وہاں اپنی آنٹی کے پاس ایک مہینے تک کے لیے گئی ہے،  
ایک نے اتنی جلدی مچائی کہ ان کی غیر موجودگی میں ہی  
یہ فنکشن کرنا پڑ گیا۔ اب اسے پتا چلے گا تو بہت شور  
کرے گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ وہ  
بہت مشکل سے ہلکا سا مسکرائی تھی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ انہوں نے اب غور سے  
اسے دیکھا تھا۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ وہ سنبھل کر بیٹھی۔  
”مجھے تو کچھ آپ سیٹ سی لگ رہی ہیں۔“



اس کی گرفت میں چلی گئیں اس کے تو پورے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور کھڑی ہو گئی۔

”آپ کے چوہے سے کیا دھواں بھی لکھتا ہے؟“

”جی؟“ اس نے حیرت سے ایک کونہ کھلا۔

”آپ کی آنکھیں اتنی ریڈ کیوں ہو رہی ہیں؟“ ہانیہ کے ہونٹ بھیج گئے تھے۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کی آنکھیں رونے کی چغلی کھا رہی ہیں۔ اتنے میں سمانہ اندر داخل ہوئی۔

”سوری ایک میری فرینڈ کی کل آگئی تو دیر ہو گئی۔“

”میں بھی اب چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کیوں؟ ابھی کچھ دیر تو بیٹھو۔“ سمانہ نے اصرار کیا۔

”مجھے کچھ کام ہے ڈیڑھ بج رہا ہے۔“

ہانیہ جاتے جاتے رک گئی۔ ”سر آپ نے کافی تو پئی ہی نہیں۔“

”بہت کڑی ہے۔ شاید چینی کی جگہ نمک ڈال دیا آپ نے۔“ اسے تو ہانیہ کو دیکھنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ بغیر سمانہ کا خیال کیے وہ مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ نے گھبرا کر سمانہ کو دیکھا وہ کافی کاسپ لے رہی تھی۔

”کافی تو ٹھیک ہے۔“ وہ کچھ حیرت سے بولی۔ ایک نے کندھے اچکائے۔ ”مجھے تو یوں لگا جیسے دودھ کے بجائے آنسو استعمال کیے ہوں۔ اپنی دے“ میں چلتا ہوں بائے۔“

وہ پلٹ گیا۔ سمانہ اس کے پیچھے گئی تھی۔ ہانیہ اپنے کمرے میں آگئی۔ تکیے پر سر رکھ کر اس نے سارے آنسو بہا دیے تھے۔ ہر بار ایک اور سمانہ کو ساتھ دیکھ کر اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ وہ اس کی کیفیت سمجھ لیتا تھا اور پھر بھی اسے دکھ پہنچاتا تھا۔ کتنا بدل گیا تھا وہ کاش اسے بھی صبر آ جائے۔

انوائٹ کیا تھا، سب گئے تھے سوائے ہانیہ کے اس کے نہ جانے سے کسی کو کوئی فرق پڑتا بھی نہیں تھا۔ وہ کھانا کھا کر چائے لے کر کمرے میں آئی تو اس کے میل پر تیل ہو رہی تھی۔ اس نے بغیر دیکھے آن کر لیا۔ ”ہیلو“

”ہیلو ہانیہ! میں ایک بات کر رہا ہوں۔“

ہانیہ کو جھٹکا سالگا اور وہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

”جی سر؟“

”آپ کیوں نہیں آئیں؟“

”جنہیں جانا چاہیے تھا وہ تو چلے گئے، میرا جانا کوئی ایسا ضروری تو نہیں تھا۔“

”مصر صم تو آئے ہیں۔“

”تو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تو آپ کو بھی تو آنا چاہیے تھا۔“

”اچھا مصر صم بھائی جہاں جائیں گے، مجھے بھی وہاں جانا ہو گا۔ کیوں، میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔ اب ان کی بہن کی سسرال میں پارٹی ہے تو انہوں نے جانا ہی تھا۔“

”آپ کا کوئی ریلیشن نہیں۔ ان سے ہم سے؟“ وہ کچھ دیر کے لیے چپ رہ گئی تھی۔ اس نے کچھ بات بدل دی۔

”چلیں جانے دیں، یہ بتائیں آپ آرہی ہیں تو میں ڈرائیور کو بھیج دوں۔“

”نہیں سر بہت بہت شکریہ آپ کے پوچھنے کا۔“

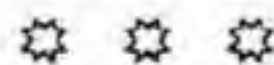
میں اب سونے لگی ہوں۔“

”ننند آجاتی ہے آپ کو؟“ اس کا لہجہ بہت عجیب تھا۔

”جی۔“ وہ اچنبھے سے بولی تھی۔ ”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔ چھوڑیں گڈ بائے اینڈ گڈ نائٹ۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ حیران پریشان فون ہاتھ میں لیے کتنی ہی دیر بیٹھی رہ گئی تھی۔



لادان سے سمانہ نہ صرف گھر پر تھی بلکہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ ”ہانیہ ایک مجھ سے ناراض ہو گیا“

علیشا کی طرف سے خوشخبری سننے کو ملی تو روم صمد نے ایک چھوٹی سی تقریب رکھی تھی اور ان سب کو بھی



ہے پلیز تم میری طرف سے اس سے معذرت کرو اور اسے منادو۔" وہ توبہ کی ہی گئی۔  
 "میں کیوں منادوں؟ تم دونوں کا آپس کا معاملہ ہے تم خود منادو۔"

"پلیز ہائی وہ نہ تو مجھ سے مل رہا ہے نہ میرا فون ہی اٹینڈ کر رہا ہے تم تو اس کے پاس کام کرتی ہو تمہاری تو وہ بہت دھسکٹ کرتا ہے۔"

"تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ مجھے اپنے اتنے ذاتی معاملے میں بولنے کی اجازت دیں گے۔"

"وہ کچھ نہیں کہے گا مجھے پتا ہے تاہم تم سے کتنی۔" وہ ایک دم رکی تھی۔ ہانیہ نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"آئی مین وہ تمہاری بہت عزت کرتا ہے تمہارے متعلق کوئی بات بھی کرتا ہے تو بڑے احترام سے۔" ہانیہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا ایسے کیوں ہو دیکھ رہی ہو بات کرو گی نہ۔" "وہ دن سے سر آفس بھی نہیں آ رہے ہیں کیسے بات کروں۔" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"تم اس کے گھر چلی جاؤ وہاں بات کر لو۔" "تمہارا دماغ ٹھیک ہے سمانہ میں کیوں وہاں جاؤں گی؟"

"تو وہ تمہاری بہن کا سسرال بھی ہے تم کیوں نہیں جاسکتیں۔" (آج وہ بہن ہو گئی) "تم دیکھو آئی سے بات کر لو وہ سمجھالیں گی۔"

"پاگل تو نہیں ہو گئی۔ یہ میرا اور ایک کا ایٹھ ہے اسے میں ان سے کیسے ڈسکس کر سکتی ہوں۔" "تو میں بھی تو تھوڑا پرسن ہوں میں کیسے بات کر سکتی ہوں۔"

"نہیں تمہارے لیے تو ایک بہت کڑی سی شو کرتا ہے تمہاری بات وہ آرام سے سن لے گا۔"

ایک تیرہانیہ کے سینے میں پیوست ہوا تھا کسی نہ کسی طرح دباؤ ڈال کر سمانہ نے اسے رضامند کر ہی لیا تھا اگرچہ دل تو چاہتا تھا کہ وہ میری بلا سے مگر دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بیر بھی تو نہیں رکھا جاسکتا۔ سمانہ

اچھی اپنے مطلب کے لیے بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے ناچار اس کے ساتھ ایک کے محل جیسے گھر میں چلی آئی۔ سمانہ اسے ڈراپ کر کے چلی گئی تھی۔ وہ پہلی بار وہاں آئی تھی۔ ملازم اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ایک کو اطلاع دینے چلا گیا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی۔

"چھوٹے صاحب آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔" وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ "کیوں انہیں یہاں بلا میں نا آپ۔"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔" وہ کچھ دیر گوگو کی کیفیت میں کھڑی رہی پھر اثبات میں سر ہلا کر ملازم کے پیچھے چل پڑی تھی۔ "اور لوگ کہیں ہیں۔"

"جی وہ سب تو امریکا گئے ہوئے ہیں اپنے بڑے بیٹے کے پاس۔" وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ "گھر پر صرف سرائیک ہیں۔"

"ہم سب بھی ہیں جی۔" وہ اس کی کم علمی پر مسکرایا۔ ساتھ ہی طویل کارڈیڈور کے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔ "تیس کم ان۔"

ملازم نے دروازہ کھول کر ہانیہ کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بہت شاندار بیڈ روم اس کے پتھوں بیچ کھڑا وہ شاندار بندہ ایک دم پرلے کٹے۔

"السلام علیکم سر۔" "وعلیکم السلام آئیے مس ہانیہ۔" "آپ کی طبیعت کیسی ہے سر۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اب تو ٹھیک ہوں۔" وہ بھی سامنے بیٹھ گیا تھا۔ ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آگے کیا بات کرے ڈائریکٹ موضوع پر آتا تو بہت مشکل تھا۔

پچھلے دنوں ایک کا جو اس سے رویہ رہا تھا وہ کبھی حوصلہ شکن تھا اور سمانہ سے منگنی کے بعد تو اس نے خود بھی اس سے کتراتا شروع کر دیا تھا وہ بھی شاید قسم کھا



کر بیٹھا تھا کہ وہ بولے گی تو ٹھیک ورنہ یونہی چپ چاپ بیٹھے رہنا ہے۔

”آئی اور سب کہاں ہیں؟“ اب کچھ تو کہنا تھا ورنہ ملازم ہٹا چکا تھا۔

”سب امریکا گئے ہوئے ہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر دلی دلی مسکراہٹ تھی وہ یقیناً ”محفوظ ہو رہا تھا۔“

”کب تک آئیں گے؟“

”شاید۔۔ اگلے ہفتے تک“ پچھلے دنوں کی نسبت موڈ خاصا خوش گوار تھا ہانیہ کا حوصلہ بڑھا۔

”سرمانہ بہت پریشان ہے“ اس سے شاید کچھ غلط ہو گیا ہے وہ آپ سے ایک سکیموز کرنا چاہتی ہے مگر آپ شاید اس کا فون انینڈ نہیں کر رہے تو اس نے مجھے بھیجا ہے۔“

”تو اس لیے آئی ہیں آپ“ اس کے ماتھے پر ہل پڑا۔

”وہ کہہ رہی تھی کہ آپ اس سے ناراض ہو گئے ہیں تو۔“

”تو اس نے آپ کو بھیجا منانے کے لیے۔ اسے کیسے پتا تھا کہ آپ منالیں گی۔“ اس کے لہجے میں سختی آئی تھی۔ ہانیہ کی پیشانی پر پینہ چمکنے لگا۔ مارے شرمندگی کے وہ اٹھ گئی۔

”سوری سر“ اس نے کہا تھا کہ میں آپ سے اس کی طرف سے سوری کروں، آپ اس کا فون انینڈ کر لیں تو وہ خود۔“

”یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے۔“ وہ سرد مہری سے بولا۔

”ٹھیک ہے سر میں چلتی ہوں۔“

وہ مڑنے لگی تھی کہ ایک نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ہانیہ کو لگا جیسے انگارہ اس کے ہاتھ سے آگاہ ہو۔ اسے یقیناً سخت بخار ہو رہا تھا۔ ہانیہ نے سر اٹھا کر دیکھا اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی ساری شرمندگی و غصہ بھاپ بن کر اڑ گیا۔

”آپ میڈسن لے کر آرام کریں“ آپ کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔“

”آپ فرسٹ ٹائم آئی ہیں تو ایسے کیسے جارہی ہیں۔“

”نہیں سر کوئی تکلف نہیں“ پھر سامنے کے آنے کے بعد تو آنا جانا لگائی رہے گا“ آپ پلیز میڈسن لیں۔“

”میں چائے منگوانا ہوں“ پھر میڈسن لے لوں گا“ بیٹھیں۔“ اس نے انٹرکام پر ہدایات دیں۔ جب تک وہ بیٹھ چکی تھی۔ وہ بھی آکر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ہانیہ نے گھبرا کر پیچھے کھسکنا چاہا، لیکن ایک نے اس کے کندھوں پر بازو پھیلا کر اس کی یہ کوشش ناکام کر دی تھی۔ ”ریلیکس ہانیہ۔“

ہانیہ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی اس کا لمس اس کی خوشبودار کے حواسوں پر غالب ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھ گود میں رکھ لیے۔ ایک نے اس کا ہاتھ تھام کر سامنے کیا۔

”آپ کے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں“ ہونے بھی چاہئیں، آپ خود جراتی خوب صورت ہیں کہ کسی کا ایمان بھی خراب کر سکتی ہیں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بڑی دلکشی سے مسکرایا۔ ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے، کہاں تو وہ اس سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہا تھا اور کہاں یہ رویہ۔ وہ کس حد تک پچھے ہونا چاہتی تھی، مگر ایک پوری طرح متوجہ تھا، اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں ستارے سے چمک رہے تھے، ایک انوکھا جذبہ، کوئی الگ سا تاثر تھا ان میں۔ اسی وقت دستک ہوئی۔ وہ گہری سانس لیتا ہوا اٹھ گیا۔ ملازمہ چائے کی ٹرالی ملائی تھی۔

”لو کے اب جا میں آپ۔“

درواندہ بند کر کے وہ دوبارہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”چائے آپ جتنا پس گیا میں بتاؤں؟“

”جی سر“ میں بناتی ہوں۔“ اس نے دو کپوں میں چائے بنائی اور اپنا کپ لے کر چائے کے دو تین سپ لے لیے۔

”یہ بھی لیں نا۔ یہ سب دیکھنے کے لیے تو نہیں رکھ۔“ ایک نے ٹیبل پر موجود لوازمات کی طرف اشارہ کیا۔



”نہیں میں صرف چائے لوں گی۔“ وہ جلد از جلد چائے پی کر سہاں سے جانا چاہتی تھی۔  
 ”میں بھی صرف چائے پیوں گا۔“ اس نے آرام سے ہانیہ کے ہاتھ میں موجود کپ خود لے لیا اور اسی میں سے پینے لگا۔ وہ بھونچکا رہ گئی تھی۔ تھوڑی سی پی کر کپ دوبارہ ہانیہ کو پکڑا دیا۔  
 ”پہیں۔“

”نہیں سر میں نے بس کر دی۔“  
 ”کیوں کپ تو ختم کریں اور جھوٹا کھانے پینے سے محبت بڑھتی ہے۔“ اس نے کپ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ہانیہ نے بمشکل ایک گھونٹ حلق سے اتارا۔  
 ”سر۔“

”جی سر کی جان؟“ وہ مزید سٹٹا گئی۔ سر کو کیا ہو گیا تھا۔ کیسی ہلکی ہلکی باتیں اور حرکتیں کر رہے تھے۔  
 ”آپ کچھ کھالیں پھر میڈیٹیشن۔“

”اف آپ ڈاکٹر کیوں نہیں بنیں۔ جب سے آئی ہیں میڈیٹیشن، میڈیٹیشن آپ بھی تو کچھ لیں پھر میں بھی لیتا ہوں۔“ وہ تو ہرگز یہ رسک نہیں لے سکتی تھی۔  
 چائے والا عمل اگر کباب بسکٹ کے ساتھ دہرایا جاتا، وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں اب جاؤں سر کافی دیر ہو گئی ہے۔“  
 ”سمانہ کو کیا بتائیں گی، مجھے منایا تو نہیں آپ نے۔“ ہانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا، وہ تو سمجھی تھی کہ وہ ناراضگی ختم کر چکا ہے۔  
 ”چلیں مجھے منائیں۔“ وہ ڈٹ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔ ہانیہ بھی بے اختیار مسکرا دی۔

”میں آپ سے سمانہ کی طرف سے معافی مانگتی ہوں، پلیز سر اس سے جو بھی گستاخی ہوئی ہے اس کے لیے اسے معاف کر دیں۔“

”اونہوں یہ تو ایلیکیشن ہے، جیسے اسکول میں دی جاتی ہے۔“

”تو آپ ہی بتا دیں۔“ ابعدہ زنج ہو گئی تھی۔  
 ”بڑے افسوس کی بات ہے ویسے کہ آپ کو منانا

بھی نہیں آتا، آپ سے ناراض بھی سوچ سمجھ کر ہونا چاہیے، خیر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کس طریقے سے آپ کو مجھے منانا چاہیے تھا۔“  
 بڑے آرام سے اس نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ ہانیہ کو تو 440 والٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“  
 ”مجھے تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔“ وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ہانیہ کو اب صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، مگر اس نے اپنی گرفت مزید سخت کر دی تھی۔  
 ”آپ بہت غلط کر رہے ہیں سر۔“

”محبت اور جنگ میں کچھ بھی غلط نہیں ہوتا۔“  
 اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔  
 ”محبت تو آپ سمانہ سے کرتے ہیں نا؟“

”آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں کس سے محبت کرتا ہوں۔“ وہ اس کی اس بات پر اتنی حیران ہوئی کہ سب کچھ بھول کر ہکا بکا سی اسے دیکھنے لگی۔ وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے اس پر جھکا اور اس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں جھانکا۔ ”آپ اتنی سرپرائزڈ کیوں ہیں۔ کیا نہیں جانتیں کہ مجھے کس سے محبت ہے؟“

ہانیہ نے بے اختیار نظریں پھیر لی تھیں۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اتنی غیر متوقع بات نے اس کی مزاحمت کو کمزور کر دیا تھا۔ اسے ڈھیلا پڑتے دیکھ کر ایک کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں میں لگا کچھو کھول دیا۔ گھنے لمبے پل آبشار کی طرح اس کی پشت پر موجود ایک کے بازو پر گرے تھے۔ اس نے نرمی سے انہیں سہلایا۔ ”بیوی فل“ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا، ہانیہ کو پھر پریاں سی آرہی تھیں۔ بہت مشکل سے اس نے کہا۔

”سر پلیز مجھے جانے دیں، بہت دیر ہو گئی ہے، سمانہ انتظار کر رہی ہوگی۔“ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے جھکا اور اس کے گل کو



چھو لیا۔ ہانیہ تڑپ کر پیچھے ہوئی، مگر کتنی پیچھے اس نے دوسرا ہاتھ اس کے سر کے نیچے رکھ کر اسے مزید نزدیک کر لیا۔ ہانیہ اس کے بازوؤں میں پھر پھڑپھڑ رہی تھی، مگر رہائی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اچانک اس کا سیل فون بجنے لگا نہ چاہتے ہوئے بھی ایک کا دھیان بٹ گیا تھا۔ ہانیہ نے مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دانت اس کے بازو میں گاڑ دیے تھے۔ وہ سی کر کے پیچھے ہٹا تھا۔ ہانیہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی، لیکن اس نے بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اسے پھر سے اپنی گرفت میں لے لیا اور کھینچتا ہوا اپنے بیڈ پر لے آیا تھا۔ وہ بری طرح مزاحمت کر رہی تھی، اس نے چیخنے کے لیے بھی منہ کھولا تھا، مگر ایک کا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی ہر مزاحمت دم توڑ گئی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب اتنا دباؤ برداشت نہ کر سکے اور وہ بے ہوش ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔



وہ صرف بے ہوش نہیں ہوئی تھی، اس کا منہ سب سے بڑا ڈاؤن ہو گیا تھا۔ خندہ دل اسے ہسپتال، نرسنگ ہاؤس، گھر آنے کے بعد بھی اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں تھی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ کسی نے بات کی تو دل چاہا۔ جواب دے دیا ورنہ خاموشی، لیکن جہاں کہیں بات کرتے ہوئے کسی نے اسے ہاتھ بھی لگا دیا تو وہ چیخنا شروع کر دیتی تھی۔ ”چھوڑ مجھے، دور ہو جاؤ، مست چھوؤ مجھے۔“

”توبہ ہے، یہ تو اودھم مچا دیتی ہے۔“ مائی امی بڑبڑاتیں۔

”خدا کا خوف کرو شیریں، پتا نہیں بچی کس کیفیت سے گزر رہی ہے، کیا ہوا ہے جو ایسی ہو گئی ہے۔“

تایا جی کی آواز اندیشوں سے لرز گئی۔ انہیں ایک نے اس کی بے ہوشی کی اطلاع دی تھی اور اسپتال والوں کے مطابق اسے اسپتال بھی وہی لایا تھا۔ سامنے نے بتایا کہ وہ اسی کے پاس گئی ہوئی تھی۔ ان کی اطلاع کے مطابق تو ساری فیملی امریکا گئی ہوئی تھی۔ اس کا

مطلب وہ گھر میں اکیلا تھا، خدا نا خواستہ اس نے اسے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ وہ کلب سے گئے۔ ہونے والے داماد کا ان کی بچہ جی کے ساتھ کوئی بھی غلط حرکت کرنے کا مطلب دوطرفہ تباہی تھا۔

”یا اللہ، کوئی غلطی ہوئی ہے تو معافی دے دے۔ مجھے میرے بھائی کے سامنے روز آخرت سرخو رکھنا۔“

سامنے نے البتہ ایک سے پوچھا تھا کہ ہانیہ تو اس کی طرف آئی تھی پھر اس کے ساتھ گیا ہوا کہ وہ ان حالوں کو پہنچ گئی۔ اس نے سرد مہری سے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ ”میں آپ کے سوالوں کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“



”اسی ڈارلنگ، آپ مجھے تھوڑا سا ٹائم دے سکتے ہیں۔“ وہ ڈنر کے بعد ٹیبل سے اٹھا تو مام نے پکارا۔

”شیور مام۔“

”اوکے، میرے کمرے میں آجائیں۔“ وہ ان کے ساتھ ان کے بیڈ روم میں آگیا، ڈیڈ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ وہاں کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”آپ کی اور سامنے کی کیا مس انڈر اسٹینڈنگ چل رہی ہے۔“

”بس یونہی، اس نے مجھے تھوڑا ڈس ہارٹ کیا تھا۔“ اس نے شانوں کو لاپرواہی سے جنبش دی تھی۔

”اس نے آپ سے سوری نہیں کہا؟“

”میں نے موقع ہی نہیں دیا۔“

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ ”سامنے سے میری بات ہوئی تھی اس نے مجھے بتایا کہ ہانیہ سے متعلق کسی بات پر آپ اتنے ناراض ہو گئے۔ آپ کا ریلیشن تو سامنے سے ہے نا، ہانیہ سے تو نہیں، پھر ہانیہ کی وجہ سے سامنے سے ناراض ہونا کچھ ٹھیک تو نہیں ہے۔“ وہ بالکل خاموش تھا۔ کچھ دیر اس کے بغور دیکھتی رہیں۔

”آپ کو اور سامنے۔ دونوں کو اپنا ٹیمپرامنٹ انگریز کرنا چاہیے تب اگر ہانیہ اتنی بیمار نہ ہوئی تو آج کل میں



آپ دونوں کی شادی کے دن طے ہو رہے ہوتے۔“  
اس بات اس نے ہونٹ بچھینچ لیے تھے۔ بولا مگر اب  
بھی نہیں تھا۔

”اور سمانہ بتا رہی تھی کہ ہانیہ کے بیمار ہونے کا بھی  
آپ سے کوئی تعلق ہے، وہ سمانہ کی طرف سے  
معذرت کرنے یہاں آئی تھی اور اس کے بعد  
اسپتال پہنچ گئی۔“

ایک بم تھا جو انہوں نے ایک کے اعصاب پر دے  
مارا تھا۔ ”آپ نے اسے ٹارچر کیا تھا منٹیلی یا  
فرہنگلی؟“

”سمانہ نے کیسے یہ سب کہہ دیا۔ اس نے ہانیہ سے  
پوچھا ہے یا اسے میرے ساتھ دیکھا ہے؟“ وہ بھڑک  
اٹھا تھا۔

”رضیہ اور شادی نے تو دیکھا ہے، اسے یہاں آتے  
آپ کے بیڈروم میں جاتے اور اسے بے ہوشی کی  
حالت میں اٹھا کر باہر لے جاتے، سب دیکھا ہے۔“

اس کے ڈیڈ ہیڈ سے مام کی صلاحیتوں کے معترف  
تھے کہ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے ساتھ یوں حملات  
کو ہینڈل کرتی تھیں کہ آہستہ آہستہ گھیر کر اس پوائنٹ  
پر لے آئی تھیں کہ کوئی راہ فرار نہیں چھوڑتی تھیں۔  
ایکے تو سانس لیتا بھی بھول گیا تھا۔

”کیا کیا تھا آپ نے اس کے ساتھ کہ وہ بھی  
ابنا رہی تھی کی لہٹیں کو پہنچ گئی ہے۔“ اس بار ان کے  
لہجے سے برہمی چھلک رہی تھی۔

”میں ہمیشہ براؤڈ فیل کرتی رہی کہ میرے بچے آج  
کل کی کسی برائی میں ملوث نہیں ہیں، نہ اسموگنگ  
کرتے ہیں، نہ ڈرنک، کسی قسم کی گرل فرینڈز بھی  
نہیں۔ لیکن یہ سب تو ظاہر کر رہا ہے کہ آپ نے ہر  
لمٹ کو کراس کیا ہے۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں  
ہوں جو اپنے بچوں کی غلطیوں پر پردے ڈال کر انہیں  
شہرہ دیتی ہیں۔ آپ نے یہ غلطی ہمیں گناہ کیا ہے اور  
اس کے لیے آپ کو پے کرنا پڑے گا۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں مام، ایسا کچھ بھی نہیں  
ہوا۔“

ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”لو کے، تو پھر وہ بے ہوش  
کیوں ہوئی، اسے نروس بریک ڈاؤن کیوں ہوا؟“ وہ  
خاموش ہو گیا۔

اس بار بار کی خاموشی سے میں کیا سمجھوں؟“  
”آپ ہرٹ ہوئیں اس کے لیے سوری مام، لیکن  
میں نے اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔ ٹرسٹ می  
مام، میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا، جس کی وجہ سے  
آپ شرمندگی محسوس کریں ورنہ مجھے اس پر اتنا غصہ  
تھا کہ۔“

”ہانیہ پر غصہ۔“ وہ حیران رہ گئیں ”کس بات کا  
غصہ۔“ وہ جھجک سا گیا۔

”مجھے شروع سے ہی بہت اچھی لگتی تھی۔ میں  
نے آپ کو اس کے بارے میں بتانے کا سوچا لیکن بولی  
کی شادی میں آپ سب کو ایک ساتھ اتنی پسند آئی کہ  
سب نے فردا فردا مجھے اس کے ساتھ شادی کا مشورہ  
دیا۔ ان ہی دنوں سمانہ اور اس کی ممی نے مجھ سے مل کر  
اس کی بے راہ روی کا بتایا کہ اس کے تو بہت سارے  
بوائے فرینڈز ہیں۔ اپنے حسن سے وہ ہر کسی کو دیوانہ  
بناتی ہے، وہ جاب بھی اسی لیے کرتی ہے کہ نئے نئے  
شکار پھانس سکے۔ سمانہ کا بھائی عرصہ بھی اس کے ساتھ  
انوالو ہے بلکہ عرصہ کے ساتھ تو بہت زیادہ اٹیچ ہے۔  
میں نے اپنے آپ کو بہت روک کے رکھا ہوا تھا ورنہ  
اپنے جذبات کی توہین پر میں اسے معاف کرنے کے  
لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس دن سمانہ کی طرف سے  
معذرت کرنے کے لیے خود ہی آگئی۔ اسے نہیں آتا  
چاہیے تھا۔ مجھے اس پر اتنا غصہ تھا کہ اگر وہ بے ہوش  
نہ ہو جاتی تو میں واقعی آپ کے سامنے آنے کے قابل  
بھی نہ رہتا۔ غصے نے میری عقل بھی چھین لی تھی اور  
آپ کا سامنا کرنے کا خیال بھی، آئی ایم ریسکی ویری  
سوری مام۔“

”اور اس کا سامنا کرنے کا کوئی خیال نہیں آیا کہ  
خدا نا خواستہ اسے کچھ ہو جاتا یا وہ جس کیفیت میں اب  
ہے اس میں ہوتی تو کیسے فیس کرتے یا کہیں عتاب  
ہو جاتے۔“ وہ مہمہ کے جھپٹتے لہجے پر اس نے سر



جھکایا۔ کتنی ہی دیر یہ اذیت ناک خاموشی چھائی رہی جسے رومہ صدمے ہی توڑا تھا۔

”یہ کس قسم کی پسندیدگی تھی کہ کسی نے بھکپا اور آپ بھگ بھی گئے۔ آپ کے دل نے کوئی گواہی نہیں دی کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ وہ بہت معصوم ہے۔ بوبی کی بارات والے دن اس نے صرف ایک دفعہ میرے سامنے آپ کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے جھلکتی محبت نے مجھے اس کا دیوانہ بنا دیا۔ اتنی حسین بچی اور میرے بیٹے سے اتنی محبت کرے اور میرے دل میں نہ اترے۔ آپ کے ڈیڈ نے مجھ سے کہا اس بچی کو اسی کے لیے ریزرو کر لیں، اسی بھی اس میں انٹرنلڈ ہے۔ محبت تو خود ایک گواہی ہے۔ اپنے وجود کا خود ہوتا رہتا ہے یہ محبت تو بھی ہی نہیں یہ تو وقتی جذبات تھے۔ اگر وہ خدا خواست ایسی لڑکی ہوتی بھی تو وہ آپ کے ساتھ کسی رشتے میں جڑی ہوئی تو نہیں تھی نا کہ آپ اس سے بے وفائی کا انتقام لیتے پھرتے، صرف شک کی بنیاد پر آپ نے اپنا اعتماد بھی کھو دیا۔ وہ اعتماد جس کے سہارے وہ آپ کے پیڈ روم تک چلی آئی تھی۔ وہ اعتماد ٹوٹا تو وہ خود بھی ٹوٹ گئی۔ بلال صاحب جتنا رہے تھے کہ سوتے میں سے چیختی ہوئی اٹھ جاتی ہے، کوئی کندھے پر ہاتھ رکھ دے تو اتنا چیختی چلائی ہے کہ وہ لوگ بلا وجہ اس کے پاس بھی نہیں جاتے، اسے ٹرنگولا نرز پر رکھا جا رہا ہے۔ اس کی سو کاڈ بے وفائی پر آپ کو زیادہ اذیت ہوئی تھی یا وہ زیادہ اذیت میں ہے؟“ وہ سخت لال میں گھری ہوئی تھیں۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ بلال صاحب اور ان کی فیملی کو کچھ معلوم نہیں ہوا، انہیں سب پتا چل گیا ہے کہ اس دن آپ اکیلے گھر میں تھے اور اسے اسپتال بھی آپ نے پہنچایا ہے تو اس کی حالت کی وجہ بھی خود بخود معلوم ہو چکی ہے۔ وہ حفظ مراتب میں چپ ہیں۔ ورنہ ایسے لڑکے کو داماد بنا کر انہیں کون سی خوشی مل جائے گی جو ان کے ہی گھر کی دو سری لڑکی کے ساتھ زیادتی کی کوشش کر چکا ہو۔“ ایک کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔

”اب صرف ایک صورت ہے اس کی طبیعت کے بحال ہو جانے کے بعد آپ میرے ساتھ چلیں گے ان کے گھر اور سب کی موجودگی میں ہانیہ سے معافی مانگیں گے، نہ صرف معافی بلکہ اعتراف بھی کریں گے کہ اس سارے معاملے میں صرف آپ قصور وار ہیں، وہ بچی بالکل بے گناہ ہے۔“ ایک دم بخود میں کی شکل دیکھ رہا تھا اتنی سخت سزا۔

”اگر منظور کرتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں سمجھوں گی میرا ایک ہی بیٹا ہے بوبی۔ آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”مام“ اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

”آپ مجھے بس اون کر رہی ہیں؟“

”نہیں۔ ابھی مجھے آپ کے جواب کا انتظار ہے۔“ وہ بڑے ٹھنڈے کعبے میں سخت بات کہتی تھیں۔

”اوکے“ آپ جب کہیں میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“ اس کے ایک دم کہنے پر ان کے دل کو کچھ ہوا مگر یہ وقت کمزوری دکھانے کا نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے اب آپ جائیں آرام کریں۔ گڈ نائٹ“

”گڈ نائٹ مام۔“ وہ چلا گیا تو کتنے ہی آنسو ان کی آنکھوں سے چھلک گئے تھے۔ کتنی مشکل صورتحال سے دوچار کر دیا تھا ایک نے انہیں اور خود کو۔



اپنے کمرے میں آخر وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ دل پر رکھا بوجھ مزید بڑھ گیا تھا۔ ندامت و شرمندگی کا بوجھ۔ وہ تو پہلے ہی ضمیر کی ملامت کا شکار رہتا تھا، مام کی باتوں نے اسے مزید نادام کیا تھا۔ اپنی ہی الجھنوں میں اسے علم ہی نہیں ہوا کہ مام کس طرح ان سے رابطے میں ہیں اور ہر چیز ان کے علم میں ہے۔ اس شام وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے بستر میں ہی تھا جب شاہد نے آکر اسے ہانیہ کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ حیران رہ گیا ”کون؟“



”سر میں ہانیہ ہیں“ آپ سے ملنا چاہتی ہیں؟“ کتنی ہی دیر اسے یقین نہیں آیا۔ وہ کیسے یہاں آسکتی ہے۔ پھر اس نے کبل اتار اور بستر سے نکل آیا۔

”آپ انہیں یہیں لے آئیں“ میں جب تک فریش ہو جاؤں۔“

شاید کے چہرے پر اترتی حیرت کو نظر انداز کرتا وہ واش روم چلا گیا تھا۔ فریش ہو کر آیا تو دستک دے کر وہ اندر آئی تھی۔ گلابی لباس، خود بھی گلابی سی، کتنی پیاری کتنی معصوم نظر آنے والی، اندر سے کتنے کالے دل والی، ایسی ایکٹنگ کرتی تھی کہ شبہ نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ کس کریمٹر کی مالک ہے۔ اس کے بخار کا علم ہونے کے بعد تو وہ اتنی بے چین ہوئی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے گولیاں اسے کھلا کر ہی جاتی۔ وہ دل ہی دل میں اس کی اداکاری کو سراہ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھا تو اس کی خوب صورت قربت اسے بہکانے لگی۔ وہ جو چاہ رہا تھا اس کا ماحول تو خود بخود بن رہا تھا سو وہ مزید بہکتا گیا۔ وہ ہر اسل ہو کر خود کو چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی مگر کسی تو ایک نازک سی لڑکی، تھک کر ہار گئی۔ وہ جیسے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ ہوئی۔ اس کا سارا نشہ بھی ہرن ہو گیا۔ اس کے کال تھپتھپائے۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے لیکن بے سود۔ بے اختیار اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے آیا۔

جب ڈاکٹر نے اس کے نروس بریک ڈاؤن کا بتایا تو اس کے اپنے حواس جاتے رہے۔ اس نے بلال صاحب کو اطلاع دی اور جب تک وہ انہیں گئے۔ وہ وہیں رکا رہا۔ وہ بار بار یہی پوچھتے رہے کہ اسے ہوا کیا ہے؟ آپ ان ہی سے پوچھئے گا۔

وہ وہاں سے آگیا۔ جب تک وہ ہوش میں نہیں آئی وہ عرصہ سے اس کی خیریت پوچھتا رہا۔ زندگی اتنی بری اور اتنی مشکل ہو گئی کہ اسے گزارنا ایک عذاب بن گیا تھا، جو سزا ہانیہ کو دینے لگا تھا وہ خود اس کے اپنے لیے سزا بن گئی تھی۔ مام نے صحیح کہا تھا کہ اس نے اس کے بعد کا نہیں سوچا تھا وہ اسے دور سے دیکھتا تھا تو بے خود

ہو جاتا تھا، اسے چھو کر تو اس نے اپنے آپ کو ایک امتحان میں جکڑ کر لیا تھا، اپنا کمرہ جو اسے جنت لگتا تھا، وہاں آنا ہی ایک اذیت بن گیا تھا۔ ہر طرف ہانیہ ہی نظر آتی تھی، مسکراتی، جھجکتی، روتی، تڑپتی، ایک دم بے جان ہو کر اس کی بانہوں میں جھولتی ہوئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں کتنی بے یقینی تھی، ایک اس حد تک جاسکتا ہے، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اسی بے یقینی نے اسے بے ہوشی کے غار میں اتار دیا تھا۔ ایک کا سارا غصہ، ساری نفرت اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ ایک پچھتاوا تھا جو اسے جینے نہیں دیتا تھا۔

اس نے جیب میں سے اپنا سیل نکالا اور گیلری کے آپشن میں جا کر اس کی تصویر اپنے سامنے کر لی۔ جھنجھکی سی، شرمائی سی، لیکن بہت خوب صورت بھی، وہ روز رات کو اس تصویر کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ انتہائی دلفریب نقوش جنہیں اس نے چھو کر محسوس کیا تھا اور اب؟ اس کون بند کیا اور سائیڈ ٹیبل کی بوراز سے نیند کی گولیاں نکالیں اور دو گولیاں ایک ساتھ پانی کے ساتھ نگل لیں۔

”اسے ٹرنگولا نرر پر رکھا جا رہا ہے“ مام کی آواز اس کے کانوں میں پھر سے گونجی، ایک حزیں مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی تھی۔ وہ تین ہفتوں سے ٹرنگولا نرر ہی لے رہا تھا ورنہ اسے لگتا تھا اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ اس نے نائٹ سوٹ پہنا اور آکر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب تک نیند سے آنکھیں بوجھل نہیں ہو جاتی تھیں، وہ بیڈ پر نہیں جاتا تھا۔ بیڈ کی طرف تو دیکھتا بھی نہیں تھا ورنہ ہانیہ پھر سے اس کے حواسوں پر سوار ہو جاتی۔ اس نے اپنی آستین پٹی، بازو پر ابھی بھی ہلکا سا نشان تھا، اس نے انگلی سے اس نشان کو چھوا تھا۔

”مائے لو“ مائے سوٹ ہارٹ آئی ایم ایکسٹریلی سوری۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور دونوں ہاتھوں سے بالوں کو پیچھے کیا اور ہاتھ پیچھے گدی سے باندھ لیے۔ صوفے کی پشت پر سر نکالے وہ چھت کو دیکھ رہا تھا۔



”آپ کو سب کے سامنے معافی مانگنی ہوگی۔“ وہ  
جھری جھری سی لے کر سیدھا ہو گیا۔ ”یا اللہ“ مجھے  
حوصلہ دے اور معافی بھی۔“  
دعا مانگتے، مانگتے اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں  
اور وہ وہیں صوفے پر ہی سو گیا تھا۔



بہت آہستہ آہستہ، مگر تدریجاً ہانیہ کی ذہنی حالت  
بہتر ہونے لگی۔ دو بار اس سے ملنے کے لیے روم مہم  
آئی تھیں، نری سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں  
اور وہ بھی بہل سی گئی۔ ان کی وہ بہت عزت کرتی تھی،  
وہ بہت اچھی تھیں، اس میں کوئی شک نہ تھا، مگر وہ  
ایک کی ماں بھی تھیں، بے شک ایک نے اسے پاگل  
پن کی سرحدوں تک پہنچا دیا تھا، لیکن اس نے تو اس  
سے سچ سچ محبت کی تھی۔ اس سے وابستہ ہر رشتہ اسے  
بہت عزیز تھا۔

مومنہ بھی آئی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس  
نے اچانک کہا۔ ”سرا ایک اسکاٹ لینڈ گئے ہوئے  
ہیں۔ جانے سے پہلے مجھ سے تمہارے متعلق پوچھنے  
آئے تھے۔ اب تو تم کافی بہتر ہو، آفس آؤ گی نا، میں  
تمہیں بہت مس کرتی ہوں اور۔“ وہ شرارت سے  
بولی۔ ”سرا ایک بھی۔“

”شٹ اپ مومنہ۔ وہ سمانہ کے فیانی ہیں۔“

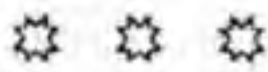
”وہ سوری یار میں بھول ہی گئی تھی۔“ مومنہ نے  
فورا ”معذرت کی تھی۔“

”اٹس اڈ کے۔“ وہ آہستہ سے بولی، سر پر جیسے کوئی  
وزن آگرا تھا وہ آنکھیں موند کر لیٹ گئی مومنہ کو شاید  
کبھی اپنے کمرے پر اتنا افسوس ہوا ہو۔ جتنا اب ہوا تھا وہ  
نہیں جانتی تھی کہ اس نے ہانیہ کے کچے زخم پر دے  
تھے۔ وہ اس کے تصور کو جھٹک جھٹک کر ٹوک چکی  
تھی، مگر وہ تو اس کے اعصاب پر اتنا حاوی تھا کہ سوتی تو  
خواب میں اور جاگتی تو سوچوں میں، ارد گرد وہی نظر آتا  
تھا، وہی محسوس ہوتا تھا، اپنا آپ اس کے بازوؤں کے  
حصار میں، اس کے وجود کی خوشبو میں گھیرا ہوا لگتا۔

اپنے چہرے کے ہر نقش پر اس کے ہونٹوں کا دکھتا ہوا  
لس، اس کی بے چینی کو سوا کر دیتا، وہ رگڑ رگڑ کر منہ  
دھوتی، مگر اس احساس سے بچھانہ چھڑا پاتی۔

وہ تو سمانہ کی امانت تھا پھر اتنی بڑی بددیانتی، وہ خود کو  
سمانہ کی مجرم سمجھتی تھی۔ نماز پہلے بھی پڑھتی تھی، مگر  
اتنی باقاعدگی سے اب ہی پڑھنے لگی تھی، بس وہی  
لمحات تو ہوتے تھے جب وہ اس کیفیت سے آزاد ہو پاتی  
تھی ورنہ تو اسے لگتا تھا اس کے اعصاب جواب دے  
جائیں گے۔ اس وقت بھی وہ عصر کی نماز پڑھ کر تسبیح  
ہاتھ میں لیے استغفر اللہ پڑھ رہی تھی، جب اس کے  
سیل پر بیل ہونے لگی، نیا نمبر تھا، اس نے کچھ دیر سوچا  
پھر اینڈ کر لیا۔ ”ہیلو۔“ ”جوابا“ خاموشی تھی۔ اس نے  
فون کان سے ہٹا کر حیرت سے دیکھا، پھر کان سے لگا لیا۔  
”ہیلو۔“

”کیسی ہیں آپ ہانیہ؟“ وہ ایک تھا۔ ہانیہ کو جیسے  
فون نے کرنٹ مارا تھا۔ اس نے فون دور پھینک دیا،  
ایک ماہ بعد اس کی آواز نے اس پر وہی اثر کیا تھا جو ایک  
ماہ قبل اس کے عمل نے کیا تھا۔ وہ پوری کی پوری  
کلپنے لگی۔ اس نے تو سم ہی چینج کر دی تھی۔ پھر اس  
نے یہ نیا نمبر کس سے لیا، وہ کچھ دیر خود پر قابو پاتی رہی،  
پھر فون اٹھا کر اسے آف ہی کر دیا۔



یہ اس کے کچھ دن بعد کی بات تھی جب روم مہم  
ان کے گھر آئیں اور بہت محبت سے اسے اپنے ساتھ  
لے جانے پر اصرار کرنے لگیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی  
تھی۔ ”نہیں آنٹی پلیز میں نہیں جاسکتی۔“  
”بیٹا پارک تک چلنا ہے، سبک، بہت اصرار کر رہی  
ہے، چلیں بیٹا ذرا دل بہل جائے گا۔“  
”چلی جاؤ ہانیہ، بیٹا فریش ہو جاؤ گی۔“ تایا جی نے  
بھی کہا تو کپڑے تبدیل کر کے ان کے ساتھ چلی آئی۔  
پارک میں بیچ پر بیٹھ کر روم مہم نے اپنے سیل پر نمبر  
ہش کیے۔

”وہ سبک نے فون ہی بند کیا ہوا ہے، میں اسے بلا



کر لاتی ہوں وہ کینٹین میں ہوگی۔“

ان کے جانے کے بعد اس نے بیچ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ معا“ اسے اپنے برابر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ساتوں آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ ایک اس کے برابر بیٹھا اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جھٹکے سے انھی، مگر ایک نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے دوبارہ بٹھالیا تھا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“ ہانیہ نے ہونٹ بچھینچ لیے تھے۔

”بہت ناراض ہیں مجھ سے؟“ وہ بہت نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ ہانیہ نے سر پھیر لیا۔

”میں آپ سے اہکسکیوز کرنا چاہتا ہوں۔“  
”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی نہ سنی ہے۔“  
”پلیز ہانیہ، میں اس سب کے لیے سوری کر رہا ہوں، میں نے مام سے ریکورسٹ کی کہ وہ میری کسی طرح آپ سے بات کرادیں تاکہ میں آپ سے اہکسکیوز کر سکوں۔“

”آپ لوگوں کو تو دھوکا دینے کی عادت ہے۔ آپ ہوں یا آپ کی والدہ، دلغ تو میرا خراب ہے جو ہر بار یقین کر کے ساتھ چلی آتی ہوں۔“ اس کا لہجہ اگر کڑھ تھا تو الفاظ اس سے بھی سوا تر، ایک کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔

”آپ سب کچھ کہہ سکتی ہیں، لیکن صرف مجھے، مام میری نہیں، آپ کی وجہ سے ہمیں ملوانا چاہتی تھیں۔ وہ مجھ سے ناراض ہیں، ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں آپ سے معذرت کروں تاکہ آپ کا کانفیڈنس بحال ہو جائے تو میں آپ سے سوری کر رہا ہوں۔“

یعنی وہ ماں کی ناراضی دور کرنے کے لیے اسے منا رہا تھا۔ ہانیہ کے دل پہ لگے زخموں میں ایک نیا زخم یہ بھی سہی۔ اس نے اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے باہر جانے کے لیے قدم آگے کو بڑھائے۔  
”رکیں ہانیہ۔“

وہ رک گئی، اب وہ کون سا چر کا لگانا چاہتا تھا وہ یہ بھی

دیکھ لینا چاہتی تھی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔  
”میں نے آپ سے کہا تھا تاکہ آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں کس سے محبت کرتا ہوں، جس سے محبت ہو جائے، اسے تو یہ علم ضرور ہوتا ہے، سر حال میں آپ سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں آپ سے کل بھی محبت کرتا تھا، آج بھی کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔“

پہلی دفعہ اظہار کیا بھی تو کس طرح، ہانیہ کی آنکھیں جھلملا سی گئیں، وہ تو کہہ کر ایک دم پلٹ کر وہاں سے چلا گیا، لیکن ہانیہ وہیں بیچ پر دوبارہ بیٹھ گئی تھی۔ جب وہ اسے ممکنہ باندھے دیکھا کرتا تھا یا جب دیر ہو جانے کے احساس سے اسے گھر چھوڑ کر آتا، تب اس کا دل کتنا خوش امید ہو گیا تھا۔ ہرک کی شادی میں ایک کی والدہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ جذبات دونوں طرف یکساں ہیں۔

پھر کیا ہوا کہ وہ دن بہ دن بدلتا چلا گیا۔ دکھ تو اسے ہوا تھا تو شکوہ بھی اسے ہونا چاہیے تھا، مگر اسے تو صبر کی عادت تھی سوائے سارے جذبات کا خون ہوتے دیکھ کر بھی چپ ہو گئی۔ شکایت کرتی بھی تو کیا کرتی۔ ایک نے کون سا اس سے کوئی وعدے کیے تھے۔ حالانکہ یہ تو وہ جذبات تھے جن کے لیے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ سمانہ کے ساتھ مگنی کے بندھن میں بندھ گیا۔ آئے دن اس کے ساتھ گھر آتا یا اسے ساتھ لے کر ہوٹلنگ، آؤٹنگ کرنے جاتا، وہ کس اذیت میں مبتلا ہو جاتی تھی، یہ تو وہی جانتی تھی اور اس دن جب وہ سمانہ کے کہنے پر ایک کے گھر گئی اور جو کچھ ہوا اس میں وہ خود کو وہی قصور وار گردانتی تھی۔ وہ ایک غیر مرد کے بیڈ روم میں کیا سوچ کر چلی گئی جبکہ گھر میں کوئی دوسرا فرد موجود بھی نہ تھا۔ سوائے ملازمین کے جو اپنے مالکوں کے کسی کام میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ ایک نے جو کچھ کہا، وہ تنہائی میں مرد و عورت کے درمیان موجود شیطان لعین کو آتا ہے۔ اب جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کی طلب گار تھی تو ایک نے اسے پھر سے



ڈسٹرب کر دیا تھا۔



”ہانیہ ڈارلنگ، کچھ رہنمائی لیں گی۔“  
رومیہ صدمہ کی آمد کا اسے علم ہی نہیں ہو پایا تھا، سبک بھی  
ان کے ساتھ ہی تھی۔

”نہیں آنٹی، مجھے گھر جانا ہے۔“  
”آج میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔“  
”نہیں۔“ وہ ایک دم اٹھ گئی۔ ”میں گھر جاؤں  
گی۔“

”مجھ پر بھی اعتماد نہیں ہے؟“ ان کے لہجے میں کیا  
تھا کہ وہ چپ رہ گئی اور انہوں نے اپنا بازو اس کے گرد  
پھیلا دیا اور باہر لے آئیں۔ سبک بھی چپ چپ سی  
تھی۔ ان کے گھر کو دیکھتے ہی ہانیہ پر گھبراہٹ طاری  
ہونے لگی۔

”میرے روم میں چلتے ہیں، سبک آپ اپنے کمرے  
میں جائیں، ابھی ہانیہ نہیں ہیں۔“ وہ اس کی طرف  
دیکھ کر مسکرائیں۔ ”ریلیکس ہو کر بیٹھیں، میں چائے  
منگوا لوں۔“ انہوں نے انٹرکام پر چائے کا آرڈر دیا اور  
پھر اپنے فون سے مختصر بات کی۔ ”میرے روم میں  
آئیے گا۔“ پھر مسکراتی ہوئی اس کے پاس  
آ بیٹھیں۔

”ان کے ڈیڈ تورات تک نہیں آنے والے، آپ  
ایزی ہو کر بیٹھیں۔“ اسی اثنا میں دوستک ہوئی۔ ”طیس“  
دروازہ کھلا اور ایک اندر داخل ہوا، ہانیہ کا رنگ  
متغیر ہو گیا، ظاہری بات تھی کہ فون انہوں نے ایک کو  
ہی کیا تھا۔

”ہانیہ، ایک آپ کے سامنے ہے، آپ کا جودل  
چاہے وہ سلوک اس کے ساتھ کر سکتی ہیں، اگر آپ  
چاہیں تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں آپ۔“

”نہیں آنٹی پلیز۔“ اس نے رومیہ صدمہ کا بازو دونوں  
ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ وہ ایک کے ساتھ کمرے میں تنہا  
رہنے کے خیال سے ہی لرز گئی تھی۔ رومیہ صدمہ نے  
انتہائی ملامت بھری نظروں سے ایک کو دیکھا تھا۔ اپنا

بازو اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر اسے اپنے ساتھ  
لگا لیا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ  
دروازہ ٹاک کر کے ملازمہ ٹرائیڈ چلی گئی ہوئی کمرے میں  
آئی۔

”چائے دیں آپ کو؟“

”میں بتاتی ہوں آنٹی۔“ ہانیہ نے پہلے چائے بنا کر  
انہیں دی، دو سرا کپ ایک کے سامنے رکھا اور اپنا  
کپ لے کر رومیہ صدمہ کے پاس بیٹھ گئی۔ ان کے  
ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

میں جب آپ کو دیکھنے گئی تو مجھے خدشہ تھا کہ آپ  
مجھ سے ملیں گی تبھی نہیں۔ ایک کی ماں ہونے کے  
ٹاپے میں بھی برابر کی شریک جرم نہ سمجھی جاؤں،  
لیکن آپ نے مجھے حیران کر دیا۔ ایک کے سامنے میں  
نے ایک شرط رکھی ہے کہ یہ آپ سے سب کے  
سامنے اہکستہ کر دے گا تاکہ سب پر آپ کی بے  
گناہی ثابت ہو جائے۔ اب آپ ڈیپائیزڈ کریں کہ  
کب، آج، کل یا کسی اور دن، جب آپ کہیں یہ سب  
کے سامنے۔“

”نہیں آنٹی۔“ وہ تھرا گئی تھی۔ ”پلیز نہیں۔“  
”کیوں اس نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس کے  
بعد یہ اسی کا مستحق ہے۔“

”انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس کے لیے انہیں  
یہ کرنا پڑے۔ بلوی آنٹی، سر نے ایسا کچھ بھی نہیں  
کیا۔“

”پھر آپ اپنی سید۔“

”ہاں نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا، اس میں سر کا کوئی قصور  
نہیں ہے، سر نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کیا۔“

جلدی جلدی وضاحتیں دیتی، گھبراہٹ ہوئی رومیہ صدمہ  
کے دل میں اترتی چلی گئی۔ انہوں کی آنکھوں میں نمی  
اتر آئی تھی۔ انہوں نے اسے ساتھ لگا کر اس کا ہاتھ  
چوم لیا تھا۔ ”آئی لو یو ہانیہ، آئی ریلیویری میچ لو یو۔“  
”اب میں جاؤں۔“

”پھر آئیں گی نا؟“ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر اثبات  
میں سر ہلایا۔



”ایک آپ کو چھوڑ آئے؟“ وہ خاموش ہی رہی۔  
وہ اسے ساتھ لیے پورچ میں آئیں۔ ایک بالکل  
خاموش تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے فرنٹ  
ڈور کھولا۔ ہانیہ بیٹھ گئی تو وہ مہیضہ نے تھوڑا اندر ہو کر  
ایک سے کہا۔ ”اب مجھے آپ کی شکایت نہیں ملنی  
چاہیے۔“ اس نے ایک نظر میں پر ڈالی اور خاموشی  
سے وینڈا سکرین سے باہر دیکھا رہا۔

”اوکے“ اللہ حافظ۔“ انہوں نے دروازہ بند کیا تو  
اس نے گاڑی اشارت کی۔ وہ خاموشی سے کھڑکی سے  
باہر دیکھ رہی تھی جب گاڑی رکنے پر چوکی۔ حیرت  
سے ایک کو دیکھا جو بہت سکون سے اس کی طرف  
متوجہ تھا۔ ”اگر اجازت ہو تو کچھ باتیں کرنی ہیں آپ  
سے۔“

”کون سی باتیں؟“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ وہ مسکرا دیا۔  
”میں نے جب فرسٹ ٹائم آپ کو دیکھا تو آپ  
مجھے بہت اچھی لگیں، لو ان فرسٹ سائٹ والا معاملہ  
تھا۔ دن بہ دن میں اور سے اور آپ کی محبت میں جلا  
ہونے لگا بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ معاملہ یکطرفہ  
نہیں ہے، میں خواہ مخواہ کے اظہار محبت سے آپ کو  
ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ مام سے  
بات کر کے، انہیں آپ سے ملواؤں گا اور تھوڑے پر  
آپ کو حاصل کروں گا، نام سے بات کرنے کی نوبت ہی  
نہیں آئی اور بولی کی شادی میں سب ہی آپ کے  
دیوانے ہو گئے، اس کی شادی کے دوسرے دن ان  
سب نے مل کر میرا وہ ریکارڈ لگایا کہ میں آپ کو بتا نہیں  
سکتا۔

آپ کی آنٹی اور سمانہ نے بھی سب محسوس کر لیا  
تھا۔ وہ کئی بار مجھ سے ملیں اور آپ کی بے راہ روی کے  
قصے سنائے کہ آپ کی بہت سے لڑکوں کے ساتھ فرینڈ  
شب ہے، ان کے بھائی عرصہ کے ساتھ تو معاملہ بہت  
آگے بڑھا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ان کی باتوں پر  
یقین آنے لگا۔ میں نے غصے سے، آپ کو اذیت دینے  
کے لیے سمانہ سے انکینجمنٹ کی تھی ورنہ مجھے اس  
میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ان دنوں بہت زیادہ

ڈسٹرب تھا یہ دکھ کہ میں نے دل کی گہرائیوں سے جسے  
چاہا، وہ ایسی کیریئر لڑکی تھی۔ مجھے چین نہیں لینے  
دیتا تھا۔ جب آپ کا نمبر بریک ڈاؤن ہوا تو عرصہ  
سمانہ کو ساتھ لے کر میرے پاس آیا۔ اس نے سب  
کچھ بتا دیا۔ سمانہ بھی بہت رو رہی تھی۔ اسے آپ کی  
کنڈیشن سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ وہ اپنے کیے پر بہت  
شرمندہ تھی۔ اسی نے مام کو بھی کلیئر کیا ورنہ وہ مجھ سے  
بہت زیادہ ناراض تھیں، اتنی کہ میں نے پہلے کبھی  
انہیں کسی سے بھی ایسے ناراض ہوتے نہیں دیکھا  
تھا۔ ”ہانیہ ساکت بیٹھی تھی۔

”سمانہ نے میرے متعلق یہ سب کہا، کیوں، میں  
نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟“ اس کے دماغ میں زلزلے کی  
سی کیفیت تھی۔ اب اسے ایک کے بل بل بدلتے  
ریسے اور عرصہ کے متعلق طنزیہ باتوں کی سمجھ آ رہی  
تھی۔ اس نے سر سیٹ کی بیک سے ٹکا دیا۔ کتنے ہی  
آنسو اس کے گل بھگور رہے تھے۔ اسے پتا ہی نہیں  
تھا۔ وہ تو جب ایک نے ٹشو سے اس کے آنسو صاف  
کرنے چاہے تو وہ ہوش میں آئی۔ اس کے ہاتھ سے  
ٹشو لے کر اس نے خود اپنا چہرہ صاف کیا۔

”میرا خیال ہے، مجھے آپ کو یہ سب نہیں بتانا  
چاہیے تھا۔“

”نہیں اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔ ورنہ میں تو ساری  
عمر یہ معہ حل نہ کہانی کہ آپ کے یکایک بدلنے کی  
وجہ کیا تھی؟“

”اچھا یعنی سیشن تھی میرے بدلنے کی۔“ وہ  
شرارت سے بولا۔ ”جواباً“ ہانیہ نے اسے باقاعدہ گھورا  
تھا۔ ایک نے مسکراتے ہوئے کانوں کی لوؤں کو  
چھوا۔ وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

”اب تو دوستی ہے نا؟“ ایک نے ہاتھ بڑھایا۔ ہانیہ  
نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔  
وہ سمجھ کر ہنس پڑا۔

”مام کو بتاؤں نا کہ آپ کی ناراضی ختم ہو گئی ہے۔  
انہوں نے مجھے کہا کہ یہ لاسٹ چانس ہے اگر آپ آج  
ہانیہ کو نہ مناسکے تو پھر ہمیشہ کے لیے اسے کھودیں گے

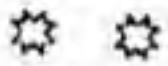


کی رنجش دیکھ کر ایک کے حلق سے بے اختیار تہقہ برآمد ہوا تھا۔ ہانیہ نے اسے کبھی اتنا کھل کر ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے محبت سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے شرارت سے بائیں آنکھ دیا لی۔ وہ گڑبڑائی۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے، پلیز مجھے چھوڑ آئیں۔“  
”آپ کو چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے ہانیہ کو اپنے ساتھ لگایا۔

”سنیں، میرے دل کی ہر دھڑکن ہانیہ، ہانیہ پکار رہی ہے، کان لگا کر سنیں۔“ ایک نے اس کا سراپے سینے سے لگا کر اس پر اپنی ٹھوڑی ٹکا دی اور دھیرے سے گنگنایا۔

ہانیہ نے سکون سے آنکھیں موند لی تھیں، محبت کا آئینہ جو بدگمانی کی دھول نے دھندلا دیا، اب صاف ہو کر کتنے خوب صورت منظر دکھا رہا تھا، آنکھیں سہانے خواب بن رہی تھیں، محبت کی شاہراہ پر ان دونوں کی زندگی کی گاڑی اب بہت رواں رہنی تھی۔ اس کا دونوں کو ہی یقین تھا۔



خواتین ڈائجسٹ

کتابیں، فلمیں، گانے، سوانح

دل کی بات

سائبر رضا

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اولہ پورہ، کراچی 32735021

اور میں آپ کو کھو نہیں سکتا تھا۔“ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ ”اور میں آپ کا بہت تھینک فل ہوں کہ آپ نے مجھے اس شرمندگی سے بچالیا جو سب کے سامنے اہکسکیوز کرنے سے مجھے ہوتی، میں تو یہ سوچ کر بھی پسینے میں ڈوب جاتا تھا۔“ اس نے جھرجھری سی لی۔  
”میں آپ کو شرمندہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”تو پھر اتنی ناراض کیوں تھیں؟“  
”جو کچھ آپ نے کیا اس پر مجھے ناراض بھی نہیں ہونا چاہیے تھا؟“ اس نے ناراضی سے اسے دیکھا۔  
”حالانکہ میں نے کیا کیا تھا؟“ وہ اتنی معصومیت سے بولا کہ ہانیہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ یہ اچانک کیسی قلابازی کھائی تھی اس نے۔  
”پیار ہی تو کیا تھا آپ کو اور میرا تو پھر سے وہ سب کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

وہ سرگوشی میں کہتا اس کے قریب ہوا۔ اس بار ہانیہ نے اسے دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکا دیا تھا اور تیزی سے مڑ کر دروازہ کھولنے لگی۔ ایک نے اس کا بازو پکڑ کر واپس کھینچ لیا۔ وہ جس طرح ہنس رہا تھا۔ ہانیہ سمجھ گئی کہ وہ شرارت کر رہا تھا، اس کے اڑتے ہوئے حواس واپس آنے لگے۔ ایک نے اسے پیچ مچ ڈرا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تلج رہی تھی۔  
”مام کو بیجوں پروپونل کے لیے؟“ وہ خاموش ہی رہی۔

”اہکچو سلی میں چاہتا ہوں اب کسی غلط فہمی کے امکان کو ختم کرنے کے لیے آپ کو اپنے پاس لے آؤں اور وہ سری بات یہ کہ۔“ وہ ہلکے سے کھنکرا۔  
”جس چیز کا ذائقہ معلوم نہ ہو اس کے بغیر تو گزارہ ہو جاتا ہے، لیکن جس کے ذائقے کو چکھ لیا جائے اس کے بغیر رہنا بہت مشکل ہے۔“

ہانیہ نے حیرت سے اس کا فلسفہ سنا۔ نا سمجھی سے اسے دیکھا تو وہ بہت معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔  
اس کی بات اب ہانیہ کی سمجھ میں آئی تھی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی اور دروازے کے ساتھ لگ گئی۔ اس



# میں ہوں گناہگار

میٹل تھے۔ سال دو سال میں ایک چکر لگاتے بہت ساری مجبوریاں بتاتے ڈھیر سارا پھار جتاتے اور پھر چلے جاتے۔ اب تو ان کے بغیر رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ خدیجہ آیا اور وقار صاحب یہیں رہتے تھے۔ خاندان والے چکر لگاتے رہتے تھے خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ صفیہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی گھر قریب ہونے کی وجہ سے وہ روز ہی چکر لگاتی تھی اور چھوٹے بڑے کئی کام نمٹا کے جاتی۔

صفیہ ان کی نند کی بیٹی تھی بہت سادہ دل اور پر خلوص۔ چھبیس برس کی ہو چکی تھی۔ ابھی تک کہیں رشتہ طے نہیں ہوا تھا اس سے چھوٹی بہنیں کب کی گھریار کی ہو چکی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے رشتے نہیں آئے تھے، لیکن خدا جانے ہریار ایسا کیا ہوا کہ رشتہ ہوتے ہوتے رہ جاتا۔ رضیہ بھابھی نے تو صاف کہہ دیا تھا۔

”صفیہ تیرے رشتے میں کسی نے بندش کرا دی ہے اس لیے کہیں بات نہیں بنتی۔“ بات کیوں نہیں بنتی تھی اور یہ بندش کیسی تھی۔ سب ہی کو معلوم تھا سوائے صفیہ کے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سکھڑ تھی اور یہی بات اس کی بد قسمتی بن گئی تھی۔ ہر چیز قرینے سے رکھی سارا گھر دھودھلا کے رکھتی۔

”ہائے صفیہ تمہارا گھر تو ایسے لشکارے مار رہا ہے جیسے ابھی بنوایا ہو۔“ مدحت اس کی خالہ کی بہو نے سراہتی نظموں سے گھر کو دکھا۔

”لا تمیں آپا جی میں کر دیتی ہوں۔“ صفیہ نے خدیجہ کے ہاتھ سے چاول کی پرات لے لی۔  
”ارے رہنے دو صفیہ میں کر لوں گی ابھی تو تم آئی ہو۔ کرتی رہنا کام بھی۔“ خدیجہ شرمندہ ہو کر کہنے لگیں۔

”تو بھلا ابھی کرنا یا بعد میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ پوچھیں تو آپا مجھ سے فارغ بیٹھا نہیں جاتا۔“ صفیہ چاول چستے ہوئے فخر سے بتانے لگی۔

”یہ تو بہت اچھا ہے صفیہ تم خوش نصیب ہو جو کام کرنا مشکل نہیں لگتا اور پھر تمہاری اسپنڈ بھی اچھی ہے جو کام میں ایک گھنٹے میں کروں گی ہم جھٹ پٹ کر لیتی ہو۔ میں تو وقار سے بھی کہتی ہوں۔ اپنی صفیہ جس گھر میں جائے گی اس کی قسمت کھل جائے گی۔“ خدیجہ کی تعریف سے صفیہ پھولی نہیں سارہی تھی۔

”یہ لیں آپا جی چاول صاف کر کے میں نے چڑھا بھی دیے ہیں اور کوئی کام تو نہیں۔“ صفیہ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں بس چاول ہی پکانے رہتے تھے۔ باقی سالن تو میں نے دوپہر کا ہی پچا کے رکھا تھا وہ ہی گرم کر لوں گی۔ قیمہ بنایا تھا آج دوپہر کو ویسے کاویا رکھا ہے یہاں ہوتا ہی کون ہے کھانے والا ہم دو ہی تو میاں بیوی ہیں بچے تو اپنے اپنے روزگار سے لگے پردیس چلے گئے۔“ خدیجہ بچوں کو یاد کر کے اداس ہو گئیں۔

ان کے دو بیٹے ایک سعودیہ اور ایک دینی میں نوکری کرتے تھے اور اپنے بل بچوں کے ساتھ وہیں



کہاں۔ بہت سادہ ہے صفیہ، سارا دن خود کو ہلکان کیے رکھتی ہے، دو سروں کے مسکھ کی خاطر۔" مدحت نے بظاہر ہمدردی جتاتے ہوئے چوٹ کی۔  
 "ارے نہیں نہیں بھابھی میں تو خود ہی کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں اپنی مرضی سے، مجھے ہاتھ پے ہاتھ دھر کے بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ جانے لوگ کیسے بیٹھ جاتے ہیں مجھے تو ابھرن ہونے لگتی ہے۔" صفیہ اس خیال سے کہ گھر میں کسی کو برا نہ لگ جائے الٹا صفائیاں دینے لگی۔ مدحت نے ترحم بھری نظروں سے

"ہاں تو کیوں نہ لگے سارا دن جان کھپاتی ہے۔ بدل چمن سے نہیں بیٹھتی۔ آج کل ایسی لڑکیاں کہاں ملتی ہیں۔ سارا دن چار پائیاں توڑتے رہنے سے تو گھر صاف ہونے سے رہا۔" خالہ نے لگے ہاتھوں بہو کو بھی سنا ڈالی اور صفیہ کو مزید پانی بہ چڑھایا۔ مدحت سمجھ تو خوب گنی ساس کا اشارہ کس طرف ہے، لیکن خون کا گھونٹ بھر کے وہ کئی پرائے گھر میں کھل کے بول نہیں سکتی تھی۔ بات منٹوں میں پورے محلے میں پھیل جاتی۔  
 "ہاں اہل! واقعی آج کل کے دور میں ایسی لڑکیاں





رفیعہ جب یہ فارغ ہوگی تو میں خود توقیر کو بلوالوں  
گی۔ فی الحال چند دن مہر جاؤ۔“ سلمیٰ نے گویا ہری  
جھنڈی دکھائی۔

رفیعہ بہن کی بات سے بد مزہ ہو گئیں اور پلیٹ سے  
پکوڑا اٹھا کے خفگی سے بولیں۔

”چھاتیاں بنا پھر۔“ ان کے نبھے نبھے چہرے کو دیکھ کر  
صفیہ خود کو مجرم سمجھنے لگی۔



”صفیہ یار پرسوں میلاد ہے اور میں نے ابھی تک  
کوئی تیاری نہیں کی۔ ٹائم اتنا کم ہے اور کام بہت زیادہ  
سو کے قریب لوگ ہوں گے میں تو سچ مچ میں بوکھلا کے  
رہ گئیں ہوں کیسے ہو گا سب؟“ عفت ”تایا کی ہو فون  
پے میلاد کی دعوت دینے کے بعد اپنی پریشانی شیر  
کرنے لگی تو صفیہ کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

”ارے بھابھی یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ کر لیں گے  
مل جل کے یہ کوئی پکی دعوت تو نہیں خاندان میں ایسی  
کتنی ہی تقریبات تن تہا بگٹا چکی ہوں۔ آپ بے فکر  
ہو جائیں میں سنبھال لوں گی۔“

”صفیہ تمہاری یہی بات مجھے اچھی لگتی ہے۔ میری  
آدمی سے زیادہ فکر تم نے کم کر دی۔ میرے تو سوچ  
سوچ کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے کہ کیسے ہو گا یہ  
سب پھر عاطف نے ہی مجھے کہا کہ صفیہ ہے نا وہ مدد  
کر دے گی تمہاری۔ آج کل کے دور میں اپنی سگی  
نندوں سے بھی مجھے مدد کا آسرا نہیں تھا۔ اگر تم نا  
ہو تیں تو میں یہ سب کچھ کبھی نا کہ پاتی۔“ الفاظ تھے یا  
تمغے جو صفیہ کو پے در پے اپنے شانوں بے ستم محسوس  
ہوئے۔ وہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔ لوگ کتنا مجھے

چاہتے ہیں کتنی قدر کرتے ہیں۔ وہیں میلاد میں جب  
وہ مستطیم بنی، ادھر سے ادھر سب کو سروس دیتی پھر رہی  
تھی۔ اور کھانے کے قہل بھر بھر کے ڈشوں میں الٹ  
رہی تھی۔ میمونہ بیگم نے اسے اپنے بیٹے کے لیے  
پسند کر لیا۔ صفیہ اس بات سے بے خبر تھی میمونہ بیگم  
عفت کی ممالی کیوں بار بار اس سے ہم کلام ہونے کی

اسے دیکھا کاش سکھڑاپے کے ساتھ تھوڑی عقل بھی  
ہوتی تو کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہوتی۔ صفیہ نے  
چائے کے ساتھ پکوڑے اور وہی بھلے بھی بنائے تھے۔  
ساتھ میں بیسن کا گرم گرم حلوہ بھی تھا خالہ تو نمل ہی  
ہو گئیں۔

”میری بچی اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔ سچ  
بتاؤں سلمیٰ میرا اگر توقیر کے علاوہ دوسرا کوئی بیٹا ہوتا تو  
میں صفیہ کو اس کی دلہن بناتی۔“ رضیہ خالہ نے  
حسرت سے کہا۔ اتنا تو سب ہی سمجھ چکے تھے کہ اگر توقیر  
کے علاوہ ان کے چار اور بیٹے بھی ہوتے تو وہ قبول  
صورت سفید پوش صفیہ کو کبھی بہونہ بناتیں۔ وہ ہمیشہ  
پیسہ اور حیثیت دونوں دیکھ کر ہوڈھوٹتی تھیں۔  
ورنہ جوڑ تو توقیر کے ساتھ بھی اس کا خوب بننا۔ سلمیٰ  
نے بہن کی بات پر بد مزہ ہو کر پہلو بدلا۔

”بس بہن یہ تو قسمت کے کھیل ہیں جس کا جہاں  
نصیب لکھا ہو گا وہیں رشتہ ہو گا۔ نکاح تو اوپر والے کے  
پاس طے ہوتے ہیں۔“ سلمیٰ نے مفاہمتی انداز میں  
بات کو سمیٹا۔

رفیعہ کو اچانک کچھ یاد آیا وہ چائے کا بڑا سا گھونٹ  
نگل کے جو بولیں۔

”ارے لو میں تو بھول ہی گئی۔ صفیہ بیٹی تم کل شام  
تک فارغ ہو کر مجھے کل کرنا میں توقیر کو بھیجوں گی  
تمہیں لینے کے لیے۔ تھوڑا سلائی کا کام رہتا ہے وہ  
مجھے پورا کر کے دو مجھے تو اب سوئی میں دھاگہ ڈالنا  
مشکل ہو رہا ہے۔ نظر کی کمزوری کی وجہ سے۔ کتنے  
دنوں سے لحافوں کے کور بنانے کے لیے کمر لا کر رکھا  
ہے وہ ہی سی کے دینے ہیں۔“ رفیعہ خالہ شکر کھلے لہجے  
میں بولیں تو صفیہ انکار نہ کر پائی۔

”چھا خالہ میں سی دوں گی۔ آپ بھیجے گا کل توقیر  
بھائی کو۔“ سلمیٰ بیٹی کے اس سیدھے پن سے عاجز  
آچکی تھیں۔

”ارے کل کیسے جاؤ گی تمہارے آمرے سارے  
بستر کھلوائے ہیں دھوپ دینی ہے۔“ تکیے کھول کے  
روٹی دھکنی ہے۔ پتا نہیں کتنے دن لگیں۔





کہتے ہیں جو دن نکاح کا لکھا ہو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ سمیر کے رشتے میں گھر بھرنے جتنے کپڑے نکالنے تھے خوب نکالے۔ کسی کو وہ عمر میں زیادہ لگا تھا۔ کسی کو بولنے میں تلخ۔ حالانکہ وہ ذرا اسٹریٹ فارورڈ تھا جو بات ہوتی صاف صاف کرتا۔ لگی لپٹی رکھنے والا نہیں تھا اور سات آٹھ سال کا فرق کچھ خاص بھی نہیں تھا۔ لیکن مفت کی سہولت کون اٹھا کے دوسرے کی جھولی میں ڈالنا چاہے گا۔ بھابھیوں نے جو جو روڑے اٹکانے تھے وہ اٹکانے غصے کی تیز ہے، گھنی ہے، لیکن سب بے کار گیا۔ میمونہ بیگم بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ انہوں نے جو ہیرا تلاش کیا تھا اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھیں۔ لڑکی والوں نے جو جو اعتراض کیے سب پورے کیے۔ جہانگیر خاتون تھیں خوب جھجکتی تھیں سب کی چالیں۔ گھر بھر کو مفت کی نوکرائی ملی ہوئی تھی کوئی بھی اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔

دکھ تو اس بات کا تھا کہ سگی ماں کو بھی اپنے بڑھاپے کی فکر تھی۔ صفیہ کے بعد ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ کھانا کھانا منسلانا دھلانا سب صفیہ کرتی تھی بھابھیوں کو تو ابھی سے ہول اٹھ رہے تھے پتا نہیں ساس کس کے حصے میں آئیں گی۔

سارا گھرانہ دنوں بھانت بھانت کے مشوروں کا گڑھ بن چکا تھا۔ کوئی کسی کی بات سے متفق نہیں ہو پا رہا تھا۔ میمونہ بیگم نے بھی چوکھٹ پکڑ لی۔ تھک ہار کے سب کو ہتھیار پھینکنے پڑے اور یوں صفیہ، صفیہ سمیونہ گئی۔



آج اس کی شادی کا ساتواں دن تھا۔ حمیرا اس کی جھٹائی پھلی سامنے رکھے کھڑی برے برے منہ بن رہی تھی۔ صفیہ کچن میں چائے کا کپ رکھنے آئی تو چونک کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا بھابھی برشان لگ رہی ہیں۔“ حمیرا نے

کوشش کر رہی تھیں مارے خلوص کے ان کو اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دے آئی۔

بہت ذمہ داری سے اور بھرپور طریقے سے اس نے میلاد کی پوری تقریب نمٹائی تھی۔ تھکن سے اس کا بدن چور چور ہو رہا تھا لیکن چہرے بے جی مسکراہٹ ایک لمحے کو ہونٹوں سے الگ نہ ہو پائی تھی۔ مہمان چلے گئے وہ عفت بھابھی کے ساتھ بیٹھی آج کی تقریب کو ڈسکس کر رہی تھی۔ جب عاطف اندر آیا۔ ”بہت تھک گیا یار آج مہمانوں کو نمٹاتے نمٹاتے“ اس نے زور سے انگڑائی لی اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”میرا تو سر دکھ رہا ہے بول بول کے مسلسل اتنے لوگوں کو ڈیل کرنا آسان نہیں ہے۔“ عفت نے اپنی ناسازی طبیعت کا اعلان کرتے ہوئے عاطف کو کسی بھی مزید فرمائش سے روکا۔ بیوی تھی خوب جانتی تھی آگے کیا کہا جانے والا ہے۔ دوسری طرف صفیہ بھی پوری تقریب تنہا شانوں بے اٹھائے رہی پورا دن اور اب بھی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا اور بلا مچانا۔ تھکن تو سب کو ہوتی ہے کام کرنے سے یہ اولیٰ۔ آ۔ او چھ۔ کیا ہوتا ہے وہ نہیں جانتی تھی اور اس بے خبری کا نتیجہ اسے اگلے پل ہی مل گیا عفت اور عاطف دونوں کی نظروں میں ابھی وہ تازہ دم تھی یا پھر وہ جان بوجھ کر آنکھیں چہرے پر ہے تھیں مل مفت دل بے رحم۔

”صفیہ یار چائے پلاؤ میرا تو سر درد سے لگتا ہے پھٹ جائے گا۔“ عفت کنپٹیوں کو دباتے ہوئے بولی۔ ”جیو بیگم جیتی رہو میرا بھی یہی دل چاہ رہا تھا۔“ کام کوئی اور کرے اپریشن ملے کسی اور کو یہی دستور زمانہ تھا۔ عفت نے مسکرا کے شوہر کو دیکھا۔

”اچھا میں بنا دیتی ہوں۔“ سدا کی مور کی صفیہ کمر کس کے کھڑی ہو گئی حالانکہ تھکن سے اس کا بھی برا حال تھا۔

”سنو صفیہ تھوڑا گاجر کا حلوہ بھی گرم کر کے لے آنا۔“ عاطف نے پیچھے سے آواز لگائی۔



ایک نظر اس پے ڈالی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔  
 ”کیا بتاؤں صفیہ تم تو ابھی نئی آئی ہو آہستہ آہستہ  
 ماحول کو سمجھنے لگو گی۔ پتا نہیں امی کو مجھ سے کیا بیر ہے  
 ہزار مرتبہ کہا ہے مجھ سے پچھلی صاف نہیں ہوتی  
 الٹی آنے لگتی ہے اس کی بوسونگہ کے لیکن نہیں ان  
 کو تو مجھے نچا دکھانے کا شوق ہے۔ ہر دو سرے تیسرے  
 دن پچھلی منگو الٹی ہیں۔ کب سے ایسے کھڑی ہوں  
 ہمت ہی نہیں ہو رہی ہاتھ ڈالنے کی۔“ حمیرا بے چارگی  
 سے بولیں۔

”ارے اتنی سی بات کو لے کر اتنا پریشان کھڑی  
 ہیں۔ لائیں میں صاف کر دیتی ہوں۔“ صفیہ آستین  
 چڑھا کے آگے آئی۔

”ارے تمہیں نہیں سمیر بھائی نے دیکھ لیا تو خیر  
 نہیں بہت سنائیں گے پھر۔ اور اچھا بھی نہیں لگتا  
 ابھی تمہاری شادی کو ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔“ حمیرا سا  
 منع کرنا نہیں بھولی تھی مبادا کسی نے دیکھ لیا تو یہ تو کہہ  
 سکے گی کہ میرے منع کرنے کے بعد بھی نہیں مانی۔

”کچھ فرق نہیں پڑتا شادی نئی رانی ہونے سے اور  
 سمیر کو پتا بھی نہیں لگے گا اس بات کا۔“ صفیہ دھودھو  
 کر پیس دو سرے برتن میں رکھنے لگی۔

”پتا تو خوب لگے گا دلہن رانی جب اسے تم سے کچی  
 پچھلی کی بو آئے گی ہائے بے چارا۔“ کھی کھی کھی۔ حمیرا  
 دل ہی دل میں ہنسنے لگی۔



صفیہ بیٹی آج شازیہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں  
 تم ایسا کرنا دھوپ کے کھانے میں کو فتنے بریانی کباب اور  
 نہاری بنالینا۔ تان باہر سے مناوالینا ہاں سلاڈ رائیہ  
 ضرور ہونا چاہیے ورنہ دعوت ادھوری سی لگتی ہے۔  
 حمیرا کو بھی میں نے کہہ دیا ہے۔ کام آپس میں بانٹ لو۔  
 دو چیزیں تم بناؤ دو حمیرا بنادے گی۔“ ساس کی بات پے  
 سرہلائی وہ حمیرا بھابی کے کمرے میں آگئی۔ حمیرا سر  
 تک کبل لیے کھٹی تھی۔ صفیہ کو دیکھتے ہی بولی۔  
 ”ہائے کب سے دعائیں کر رہی تھی کوئی کمرے

میں آئے لیکن کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا کہ مر  
 گئی ہوں یا زندہ ہوں۔ شکر ہے پھر بھی تمہیں تو خیال  
 آیا۔“ صفیہ جو ہاتھ بٹانے کا کہنے آئی تھی ہکا بکا ہو گئی۔  
 ”ارے آپ کو کیا ہوا بھابی طبیعت تو ٹھیک ہے نا  
 ایسے کیوں لپٹی ہیں۔“ صفیہ فکر مندی سے بولی۔

”صبح سے لی پی لو ہو رہا ہے چکر سے آرہے ہیں۔  
 شہباز کو کہا بھی کہ آفس مت جاؤ کہنے لگے گھر میں  
 امیں اور صفیہ بھابی ہیں نا تمہارا خیال رکھنے کے  
 لیے۔ میں آفس سے چھٹی نہیں کر سکتا۔“

”ہاں تو ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے میں ہوں نا اور  
 آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔ اب بھی اگر میں خود  
 سے نا آتی تو کبھی پتا نہ چلتا۔“ صفیہ کی زبان پے  
 اپنایت بھرا شکوہ آگیا۔

”اس حالت میں مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا سیڑھیاں  
 اتر کر نیچے تک کیسے آتی۔ تم پلیز مجھے نمکول بتا کے  
 دے دو عجیب گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“ صفیہ سر ہلا کر  
 واپس آگئی جو کام کہنے گئی تھی وہ کہنے کی ہمت ہی نا ہوئی  
 بھلا ایسی حالت میں وہ کیسے ہاتھ بٹائیں۔ حمیرا کو نمکول  
 دے کر وہ کچن میں واپس آگئی اور کمر کس کے دعوت  
 کے کھانے بنانے میں جت گئی۔ سمیر دوبار بلائے آیا تھا  
 لیکن اسے اس بری طرح کام میں الجھا دیکھ کر واپس  
 پلٹ جاتا۔ تیسری بار وہ کالی غصے میں لگ رہا تھا۔

”کب سے تمہیں بلارہا ہوں تم آ کیوں نہیں  
 رہیں۔“

”سمیر آپ دیکھ تو رہے ہیں کتنا کام ہے۔ مہمان  
 پہنچنے والے ہوں گے اور میں نے ابھی اودھا کام بھی  
 نہیں نمٹایا نا ہی تیار ہوئی ہوں۔“ وہ بے چارگی سے  
 بولی۔

”اتنا کچھ بنانے کی ضرورت کیا تھی دو چیزیں  
 پکالیتیں۔“

”اچھا نہیں لگتا سمیر! شازیہ کے سسرال والے ہیں  
 کل کو خدا نا خواستہ۔ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے  
 ہی سمیر نے بیچ میں اچکل۔

”تو شازیہ کو دھیان کرنا چاہیے تھا وہ خود پکاتی۔ تم



”اچھا۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ حمیرا نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تو خود ہی بول پڑی۔

”میرا تو کمرے سے نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر سوچا شازیہ کی سرال کا معاملہ ہے لوگ باتیں کھڑتے ہیں، اسی لیے منہ پے دو چار پھینٹے مار کے کپڑے بدل لیے، ایسے تو اٹھ کے نہیں آسکتی تھی نا۔“ حمیرا کے صفائی دینے پہ صفیہ شرمندہ ہوئی۔ حقیقت کیا تھی اور وہ خواہ مخواہ غلط فہمی پالے بیٹھے تھی۔ ”آپ چل کر بیٹھیں میں لے آئی ہوں چائے۔“ صفیہ خود کو لعن طعن کرتی چائے کپوں میں اندھیلنے لگی۔



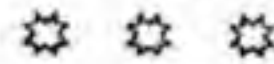
کل سے اسے تیز بخار تھا تکلیف کی وجہ سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میر نے سختی سے اسے اٹھنے سے منع کیا تھا۔ دوسرے کے تین بج چکے تھے کسی نے کھانا بنانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ دوسرے کا کھانا صفیہ ہی بناتی تھی۔ وہ بیمار تھی تو سب کو ڈر تھا کہیں انہیں ہی ٹا بنانا پڑے۔ شازیہ تو کمرے سے باہر ہی نہیں آئی تھی۔ امی

کیا باور چن گئی ہو اس کی۔ ہر کام پے کمر کس لیتی ہو۔ اور حمیرا بھابھی کہیں ہیں۔“ میر کسی سے ڈرنے والا نہیں تھا لہذا اس سے کتراتے تھے۔

”آہستہ بولیں کوئی سن لے گا۔ حمیرا بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی میں نے ان سے کہنا مناسب نا سمجھا۔“ وہ بھی آواز میں بولی۔

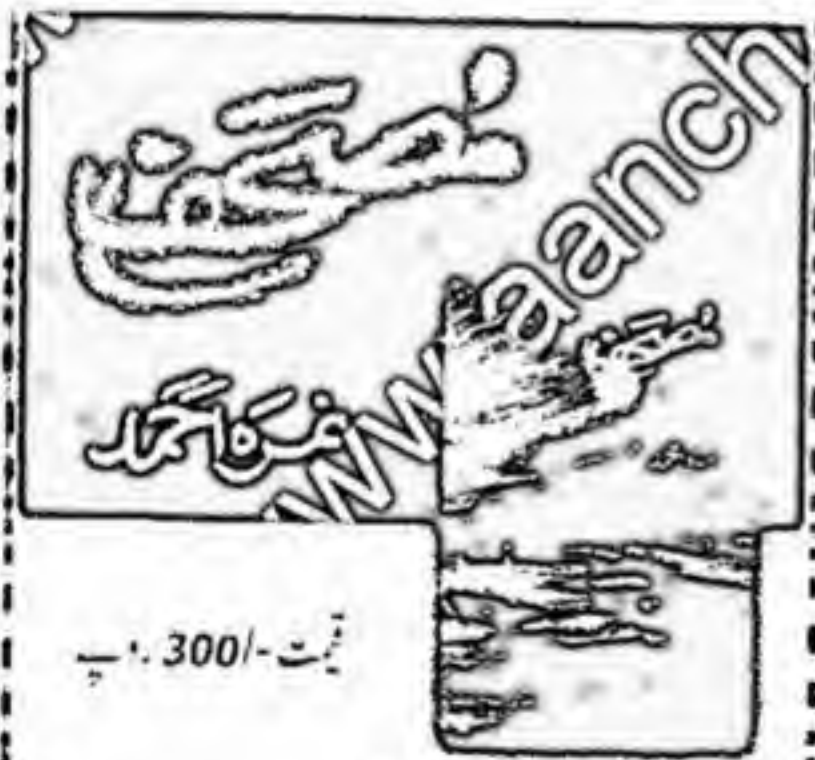
”حمیرا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ شازیہ کی سرال والے آرہے ہیں، وہ کیسے کام کرے۔ امی بوڑھی ہیں ان کو نہیں کہہ سکتی۔ سچ تو یہ ہے صفیہ تمہیں سب کا خیال ہے سوائے اپنے، یہاں سب عقل مند ہیں ماسوائے تمہارے ایسے ہی تو امی سمجھیں ڈھونڈ کے نہیں لائیں۔ خود کو سنبھالو صفیہ ورنہ دنیا والے تمہیں روند کے چلے جائیں گے۔ ابھی دیکھنا تھوڑی دیر تک حمیرا بھابھی تیار ہو کر آجائیں گی۔ بیماری کا بہانہ بتا رہی ہیں وہ۔ میں پچھلے کئی سال سے جانتا ہوں انہیں، تم جی دیکھ لیتا۔“ میر کا بس نہیں چل رہا تھا کیسے اس کم عقل لڑکی کو سمجھائے۔

”اچھا اب بس کر دیں۔“ وہ عاجز آگئی۔ میر پریشان واپس چلا گیا صفیہ سر جھٹک کر کام میں لگ گئی۔ اس وقت اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔



مہمانوں کے آنے کے بعد حمیرا تیار ہو کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی اسے دیکھ کر کہیں سے کہیں لگ رہا تھا کہ وہ بیمار ہے البتہ صفیہ کے چہرے نے چھلکنا واضح تھی جسے وہ مسکراہٹ کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صفیہ کو حیرت تو بہت ہوئی، لیکن چپ رہی میر کی کئی گنی باتیں اس کے دلغ میں چکرانے لگیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ اپنے لیے اور میر کے لیے چائے بنانے لگی جب حمیرا وہاں پہنچی۔

”اچھا تو نہیں لگ رہا تمہیں کہتے ہوئے تم بہت تھکی ہوئی ہوگی لیکن کیا کروں طبیعت ابھی تک سیٹ نہیں ہے۔ اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔“ وہ صفیہ ہی کیا جو انکار کر دے۔



قیمت - 300/- روپے

ممشک انہ کا ہند

مرکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:

32735021

37، اردو بازار، کراچی

[[ کرن 2210 اکتوبر 2015 ]]



نے چائے میں ڈبل روٹی بھگو کے کھلی حمیرا کو بچوں کی وجہ سے آنا پڑا۔ چار انڈے فراکی کیے ڈبل روٹی ملی اور کمرے میں گھس گئی۔ اسے تو جیسے سب بھول ہی گئے تھے۔ بخار کچھ کم ہوا تو شدید بھوک کا احساس ہوا۔ نقاہت سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے شازیہ کو فون کیا وہ دوسری لائن پر مصروف تھی پھر حمیرا کا نمبر ڈائل کیا، نکل ہوئی رہی کسی نے اینڈ نہیں کیا۔ مجبوراً اسے اٹھنا پڑا۔

”ارے صفیہ بھابھی آؤ۔ آؤ اب کیسی طبیعت ہے۔“ حمیرا کا لہجہ شد گھلا ہوا تھا۔

”اب بہتر ہوں بخار اتر گیا ہے۔ نقاہت باقی ہے۔“ حمیرا نے سر ہلادیا۔

”کل سے کچھ کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا اب زور کی بھوک لگی ہے۔ آپ کو اس لیے فون کر رہی تھی کچھ کھانے کو ہے تو دے دیں۔“ وہ مدخل ہونے لگی۔

”آں ہاں۔ فون تو شاید سائنلٹ پے لگا ہو گا۔ اسی لیے آواز نہیں آئی۔“ حمیرا گڑبڑا گئی۔

”تم بسکٹ اور دودھ کھاؤ گی۔ ابھی دیتی ہوں۔ ویسے بھی بخار میں ہلکی غذا لینی چاہیے۔“ وہ اٹھ کر فریج سے دودھ نکالنے لگی۔ صفیہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ اسے بھوک لگی تھی۔ لیکن حمیرا نے تب ٹا۔ صفیہ نے بمشکل دو بسکٹ کھائے۔

”آج میرا امی کی طرف پروگرام تھا سامان بند کر دیا ہے بس شہباز کے آنے کا انتظار ہے۔ کھانا بھی وہیں ہے۔“ حمیرا ادھر ادھر الماریوں میں جھانکتی خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔ کھانے کا نام سن کر اسے پھر بھوک نے آگھیرا۔

”آج دوپہر میں کیا بنا تھا۔ اسی سے کچھ لادیں میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو رہا ہے۔“ صفیہ کو اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔

”ہاں نہیں۔“ بھابھی میں تو گئی نہیں کچن میں صبح سے یہیں مصروف ہوں۔“ حمیرا صاف مگر گئی حالانکہ

صبح سے دو تین بار کچن سے ہو کر آئی تھی۔ صفیہ مایوس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شازیہ کا کمرہ اندر سے لاگ دیکھ کر وہ واپس جاتے ہوئے حمیرا کے کمرے کے پاس سے گزری تھی۔ اس کا فون بج رہا تھا۔ صفیہ کے چہرے پر پھکی ہنسی پھیل گئی۔

”ہیلو۔ ہاں شکر ہے گئی مصیبت ایک تو صبح سے اس کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں اوپر سے آئی فرمائشی پروگرام کرنے۔ میں نے تو ہری جھنڈی دکھادی۔ نا بھئی کچھ سے نہیں ہوتیں یہ خوشامدیوں وہ ہی کرتی پھرے سب کی۔ کھر کو سنبھالوں بچوں کو سنبھالوں۔“ صفیہ میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ سمیرا کی باتیں اب سمجھ میں آرہی تھیں۔

”اپنی آنکھوں سے سب اچھا کاروبار ہٹا کے دیکھو صفیہ، بظاہر جھوٹی تعریف سے لوگ تمہیں پوچھتے ہیں۔ سب اچھے دیکھتے ہیں کیوں کہ تم ان کی ضرورت بنی ہوئی ہو۔ جب وہ تمہاری ضرورت بنیں گے تب تم دیکھو گی کون کتنا اچھا ہے۔“ صفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سمیرا سیڑھیاں چڑھتا ابھی اوپر آیا تھا۔ صفیہ نے جلدی سے آنکھیں خشک کیں۔

”تم رو رہی ہو۔“ سمیرا نے پریشان ہو کر اس کی پیشانی کو چھوا۔

”طبیعت تو۔“

”بھوک لگی ہے بہت۔“ وہ بچوں کی طرح بے بسی سے رو پڑی۔ سمیرا کو ہنسی آگئی۔

”اسی بات شکر ہے۔ جناب کو دو دن بعد بھوک تو لگی۔ یہ تو تمہاری پسند کا رول کباب۔“ اس نے شاپر صفیہ کو تھمایا۔

”آپ کو کیسے پتا۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”کیوں کہ میں آپ سے زیادہ دنیا کو جانتا ہوں۔ آج یقیناً“ حمیرا بھابھی میکے جا رہی ہوں گی۔“ سمیرا نے یقین سے کہا۔ تو صفیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔





# تحریر

غزالہ بڑی عقیدت سے وہ موم جامہ کیا ہوا سفید خوشبو میں بسا، چو کورتہ کیا کاغذ تھا بے بغور اپنے سامنے بیٹھی اکلوتی نند صائمہ کو دیکھ رہی تھی۔ نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ بہت توجہ سے اس کی جانب متوجہ بھی تھی۔ یوں تو نند بھانج کی آج سے قبل کوئی ایسی خاص دوستی نہ تھی مگر کہتے ہیں ناکہ وقت بڑے براگر گدھے کو۔ بس فی الوقت غزالہ کے پیش نظر یہی معاملہ تھا۔ سو وہ بڑی توجہ اور فکر کے ساتھ صائمہ کی جانب متوجہ تھی۔ جو کہہ رہی تھی کہ۔

”تم لاکھ مجھے اپنا دشمن سمجھو۔ مگر میں نے ہمیشہ تمہیں بھابھی نہیں بلکہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے۔ اسی وقت کے آنے سے ڈراتی تھی تمہیں مگر تم نے میری باتوں پر ذرا کان نہ دھرے۔ خیر۔“ وہ بولتے بولتے جیسے خود پر قابو پا کر پھر بولنا شروع ہوئی۔ اس دوران غزالہ بڑی مسمیٰ صورت بنا کر بیٹھی رہی۔

”یہ تعویذ میں نے بڑے جتن کر کے صرف تمہارے اصرار پر ایک اللہ والے بزرگ سے حاصل کیا ہے۔ مگر انہوں نے تعویذ کے ساتھ ساتھ دو تین عمل بھی کرنے کو سختی سے کہا ہے، ورنہ یہ تعویذ بالکل بے اثر ثابت ہو گا۔“ اس نے ڈونڈا دیا۔

”اف اللہ۔ کیا چلہ کاٹنا ہو گا۔ یا پھر مخصوص اوقات میں کہیں جا کر کوئی دیا یا موم بتی وغیرہ جلا لی پڑے گی۔“ سکونے تو ایسا ہی کچھ بتایا تھا۔ اس نے بڑی پریشانی سے اپنی کاموالی کا ذکر کیا۔

”ایک تو تم بے عقل عورتوں کی طرح اپنے گھر اور خاوند کی باتیں سکو سے کرنا چھوڑ دو، کیا تمہیں



تعویذات کے نام پر اس سے بے وقوف بن کر بھی عقل نہیں آئی۔ ”صائمہ سخت برا فروختہ ہو گئی تو غزالہ بوکھلا کر بولی۔

”ارے نہیں باجی۔ اسے تو میں نے اس کا فراڈ سامنے آتے ہی فاسخ کر دیا تھا۔ اب تو میرے ہاں فی الحال کوئی کام کرنے والی نہیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ فی الحال گھر کا سارا کام تم اپنے ہاتھوں سے انجام دو۔ کیونکہ ان بزرگ کا کہنا ہے کہ

گھر کو بے انتہا صاف ستھرا رکھنا ہے۔ ذاتی صفائی ستھرائی کا بھی از حد خیال کرنا۔ پنج وقتہ نماز کا اہتمام تو لازم ہے اور ان کی خاص تاکید ہے کہ ہرگز ہرگز بھی اپنے میاں کے آگے زبان نہیں چلائی، بلکہ اگر وہ کچھ برا بھلا بھی سنائے تب بھی منہ بند کر کے دل ہی دل میں

لاحول پڑھنی ہے اور اس کی خدمت میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھنی۔ اب بھی تم دیکھ لو۔ میں جانتی ہوں یہ سارے کام تمہارے جیسی عورت کے لیے کرنا جوئے

شیر لانے کے مترادف ہے، مگر بات یہ ہے کہ اگر تمہیں اپنی گھر گرہستی عزیز ہے تب اتنی قربانی تو تمہیں

دینی ہی پڑے گی۔“ آخر میں صائمہ بے انتہائی سے بولی۔ پہلے کا وقت ہوتا تو غزالہ اس ”تمہارے جیسی عورت“ کی اچھی طرح وضاحت مانگتی، مگر اب بات ذرا

دوسری ہو گئی تھی، اسی لیے روکھے لہجے میں جلدی سے بولی۔

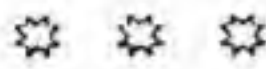
”نہیں باجی۔ میں آپ کی باتوں پر پورا عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔ بس آپ ناصر کو یہ بات ہرگز نہ

پتا لگنے دینا کہ میں نے آپ سے تعویذ منگوایا ہے۔ وہ پہلے ہی سکو سے تعویذات منگوانے پر مجھ سے بہت ناراض ہیں۔“ آخر میں آواز گلو گیری ہو گئی۔

”ہاں۔ ہاں۔ میں کیوں بتانے لگی میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کا گھر بس جائے اور اس کی

گرہستی خاندان میں تماشا نہ بنے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، تمہارے تو قیر بھائی کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ پھر بچے بھی کو جنگ سے لوٹنے والے ہوں گے۔

میں گھر واپسی پر انہیں نہ ملوں تو انہیں اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ایک مطمئن سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ غزالہ نے بطور خاص اس کے وجود سے جھلکتی آسودگی کو محسوس کیا تھا۔



غزالہ اور ناصر کی شادی خالصتاً ”ناصر اور صائمہ کی والدہ، ناہیدہ کے فیصلے کا نتیجہ تھی۔ غزالہ ان کی چھوٹی بہن شاہدہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ شاہدہ ایک چھوٹے سے

قصبے میں بیاہ کر گئی تھیں۔ اس چھوٹے سے قصبے اور وہیں کے رنگ و ہنک کے مطابق غزالہ کی پرورش کی گئی تھی۔ ہاں شکل صورت کی وہ بہت اچھی تھی۔ اسی

لیے جب شاہدہ نے مرض الموت میں مبتلا ہو کر بڑی دل سوزی سے غزالہ کے لیے فکر مندی کا اظہار کیا تب

کچھ بہن کی بگڑتی حالت اور غزالہ کی موہنی صورت کی وجہ سے ناہیدہ نے جھٹ اپنے اکلوتے، نیک، پڑھے

لکھے، برسروز گاربیٹے کا رشتہ نہ صرف پیش کر دیا بلکہ کراچی آکر اسے حسب روایت جذباتی واروں سے

نڈھال کر کے فون پر نکاح بھی کروا دیا۔ گو کہ صائمہ بھی ان کے اس فیصلے پر کچھ ٹالیں سی تھی، مگر وہ بھی ہاں کے آگے مجبور ہو گئی۔

یوں شاہدہ کی وفات کے بعد وہ اسے رخصت کروا کر گھر لے آئیں اور یہاں دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ ناصر بھی اس من موہنی صورت دیکھ کر رام ہو ہی گیا تھا۔ بس اس کی کچھ

عادتیں تھیں، جس پر وہ معترض تھا۔ شادی کو سال بھر ہوا تھا، جب ناہیدہ بھی دو سرے جہاں چل بسیں۔

غزالہ کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ رہا۔ اسے کھلا میدان مل گیا اور اس کی ناپسندیدہ عادتیں پختہ ہو کر ناصر کے لیے وبال بن گئیں۔

یوں تو وہ فطرتاً ہی بری نہیں تھی، مگر اس میں ایک بڑی واضح بری عادت تھی اور وہ یہ کہ اگر اسے کوئی اور یہ کوئی صائمہ یا ناصر کے علاوہ کون ہوتا بھلا؟ اچھی



بات سمجھانے کی کوشش کرتا، اول تو وہ منہ پھلا کر اس کے خلاف دل میں بغض پال لیتی۔ پھر دبدو بھنکا، بحثی پر اتر آتی۔ کچھ کچھ عادیانہ "ست اور کابل بھی تھی۔ آسودگی اور فراغت نے مزید کام چور بنا ڈالا۔ کام والی آکر سارے کام کر جاتی تو ٹھیک، ورنہ ایسے ہی بڑا ریتا۔ کئی بار ناصر نے ٹوکا کہ وہ سکو کے سر پر سوار ہو کر اپنی نگرانی میں تمام کام کروایا کرے۔ ورنہ تو وہ ویسے ہی اٹنے سیدھے ہاتھ مار کر، جھاڑو سے کچرا یہاں وہاں کوٹنے کھدروں میں دھکیل کر گیلانیالا پونچھا فرش پر پھیر کر فرش مزید گندا کر کے صفائی سے قاصر ہو جاتی۔ یہ ہی حال، پچن کا تھا۔ بہتری اور گندگی نے اس "امریکن پچن" کو تیسری دنیا کا کوئی پسماندہ ملک بنا رکھا تھا۔ مگر غزالہ نے تو کیا سکو کے سر پر سوار ہونا تھا۔ الناء اپنی عیاری اور مکاری سے اس کے حواسوں پر سوار ہو کر اسے نت نئی الٹی سیدھی پٹیاں ہمدردی کے لبادے میں لپیٹ کر پڑھانے لگی۔

"بابی جی۔ مجھے تو آپ سے سخت ہمدردی ہوتی ہے، جب آپ کی وہ گھنی مہسنی بن بن کر بونے والی مند آکر آپ کو کھری کھری سنار ہی ہوتی ہے تب ہی بابی میرا بڑا کلیجہ سڑتا ہے۔" وہ آنکھیں گول گول گھما کر کہتی۔

"کھری کھری کب سنائیں مجھے بابی نے۔" غزالہ چونک اٹھی۔

"اے لے۔" اس نے ٹھٹھا لگایا۔ "آپ تو جی سچی میں بڑی معصوم سی ہو۔ وہ آپ ہی کو تو سنار ہی تھی کہ چھوٹے قصوں سے بڑے شہر میں آکر بسنے والیوں کو کیا پتا کر شہری گھر کیسے سنوارا جاتا ہے اور پھر پانی کے چاول ذرا سے نرم ہو جانے پر وہ کیسے جتا رہی تھی کہ چاول میں پانی ہمیشہ حساب سے ڈالنا چاہیے۔"

"ارے ہاں۔ ان باتوں پر تو میں نے غور نہیں کیا۔" اس نے غصے سے کہا اور پھر چھوٹی چھوٹی بے معنی باتوں کو اس نے اس زاویے سے دیکھنا شروع کیا کہ صائمہ جیسی سلجھی ہوئی عورت نے بہت جلد ہی اسے نصیحت کرنے سے توبہ کر لی۔ اس کے گھر آنے

سے حتی المقدور اجتناب بھی برتنے لگی۔

ناصر الگ اس کی عادتوں سے سخت کبیدہ خاطر تھا۔ پہلے اسے پیار سے سمجھانا چاہا جو کہ ظاہر ہے اس نے سمجھ کر نہ دیا۔ پھر ناراضی دکھانی چاہی۔ جو کہ غزالہ نے دیکھنے سے صاف انکار کر دیا، اس کے بعد جو ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ یعنی بالا خراس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو کر اس روز چھلک ہی پڑا کہ جس روز وہ گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانے پر اہتمام کرنے کی بطور خاص تاکید کر کے گیا تھا۔ دراصل اس روز اس نے اپنے ایک دیرینہ دوست، جس کی فیملی اب لاہور میں سکونت پذیر تھی اور خود وہ سعودیہ میں بغرض روزگار مقیم تھا اور آفس کے کسی کام سے صرف دو دن کے لیے کراچی آیا تھا، کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر آنا تھا۔ حالانکہ نوید تو ہوٹل میں اپنی بکنگ بھی کروا چکا تھا۔ مگر ناصر اسے زبردستی اپنے ہاں ٹھہرانے پر بضد رہا۔ وہ صبح اس کے ساتھ ہی آفس کے لیے نکلا اور شام میں واپسی بھی ساتھ ہی ہوئی تھی۔ لہذا پردے وغیرہ کا بھی ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

ناصر اسے لے کر گھر پہنچا تو یہاں کا نقشہ ہی الناء تھا۔ بے ترتیب لاؤنج میں صوفے پر آڑی تر چھی لیٹی غزالہ اور سکو بڑے اطمینان اور فراغت سے نمکو اور کولڈ ڈرنک سے انصاف کرتے ہوئے کسی انڈین فلم سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ آن واحد میں ناصر کے دماغ کا میٹر گھوم گیا۔

"یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے گھر کا؟" وہ اس کے سر پر پہنچ کر چلایا۔ دونوں بری طرح اچھل پڑیں۔ سکو تو ناصر کے تیور بھانپ کر فوراً "ہی پچن میں جاگھسی، جبکہ غزالہ اس کے غصے یا ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے خم ٹھوک کر دبدو مقابلے کو تیار ہو گئی۔

"کیوں۔ کیا ہوا گھر کے حال کو؟ کیا طوفان آگیا ہے؟" وہ جمالت سے بولی۔

"میں تم سے صبح کہہ کر بھی گیا تھا کہ آج تو گھر کو صاف ستھرا رکھنا۔ مگر تم نے میری بات پر کلن نہ دھرے۔"



”نہیں نوید۔ غزالہ کو تو باجی سے ملنی پڑی ہے۔ وہ تو انہیں کسی خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ اب مجھے ہی اپنے لیے کچھ کرنا ہو گا۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی اور انداز فیصلہ کن تھا اور نوید جانتا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے وہ کر گزرے گا۔ اسے لیے وہ آسودگی سے مسکرا کر لہجہ آؤر کرنے لگا۔



پھر تو جیسے اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ اب نہ وہ گندے گھر کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتا نہ بد مزہ کھانا پکانے پر غزالہ کو ٹوکتا۔ ایک عجیب سی بے نیازی اور سرشاری بھرا رویہ تھا۔ بے نیازی تو سمجھ میں آتی تھی۔ مگر یہ اس کے وجود سے پھوٹی سرشاری، ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ آنکھوں سے جھلکتی مستی۔ اپنے لباس پر وہ پہلے سے زیادہ دھیان دینے لگا تھا، ریفنوم بھی ڈھیروں چھوڑتا، لبوں پر محبت بھرے نغمے چلتے رہتے۔ آدمی آدمی رات کو غزالہ نے اسے سیل فون کان سے لگائے ٹیرس پر ٹپکتے بھی دیکھا۔

”باجی جی۔“ سکو نے ایک روز بڑی رازداری سے اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔ آپ کو ہوتا ہے وہ سیدھے ہاتھ والے بنگلے کا صاب شروع میں ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا پھر کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ وہ بیکم صاحبہ پر سوتل لے آیا۔ حالانکہ میں نے تو انہیں بھی خطرے کی بوسونگ کر پہلے ہی خبردار کر دیا تھا، مگر باجی۔ مجھ غریب کی سنتا ہی کون ہے۔ بعد میں لگ گیا تاہم۔ آٹھ آٹھ آنسو روتی رہی پھر اپنے میکے جا بیٹھی۔ آپ کے کو تو جی کوئی اگانہ پچھا (اگانہ پچھا) اگر کچھ ہو، ہوا گیا تو آپ کدھر (کدھر) جاؤ گی جی۔“ وہ بڑے ہمدردانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”خدا کے لیے سکو۔ اچھی باتیں منہ سے پھوٹو۔“ وہ تڑپ کر بے چینی سے بولی۔

”میرے بولنے سے کیا ہوتا ہے جی۔ آثار تو یہی بتا

”میں تنگ آگئی ہوں تمہاری اور تمہاری بہن کی ہر وقت کی نکتہ چینیوں سے، جتنی بھی اپنی جان مار لو۔ تم لوگ کسی طرح خوش ہی نہیں ہوتے۔“ وہ ہاتھ نچا کر دھاڑی۔

”صائمہ باجی کا نام بھی مت لینا۔ ارے ذرا جا کر ان کا گھر دیکھو، کیا آئینے کی طرح جگمگاتا ہے۔ شوہر اور بچے ان کے گن گاتے نہیں جھکتے۔“ وہ سختی سے بولا۔

”بڑے بگڑے تعویذ کروار کھے ہیں انہوں نے تو قیر بھائی پر۔ وہ گن نہ گائیں گے تو اور کیا کریں گے۔“ وہ تمسخرانہ بولی تب وہ بہت تاسف سے اسے کہنے لگا کہ۔

”بہت افسوس ہوا تمہاری ذہنیت جان کر۔ بجائے ان کی اچھائی اور سلیقہ شکاری تسلیم کر کے ان سے سبق لینے کے ملنا تم ان پر الزام لگا رہی ہو۔ لیکن نہیں۔ تمہارے جیسی پست ذہنیت کی عورت سے اور توقع بھی کیا کر سکتا ہوں میں، تمہیں سمجھانے سے اچھا ہے کہ میں ہی اپنا کوئی بندوبست کر لوں۔“ وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہہ کر پلٹ گیا۔ وہ جو ماش کے آنے کی طرح اکڑی کھڑی جوابی حملے کے لیے تیار تھی، اس کے بیگانگی بھرے تاہم سے انداز پر الجھ کر ڈھیلی پڑ گئی۔ ناصر نوید کو لے کر ہوٹل ہی چلا آیا۔ وہ خاصا اپ سیٹ سا تھا۔ پھر نوید اپنے کانوں سے سارا معرکہ سن چکا تھا۔ مرحومہ آنٹی کے نامناسب فیصلے پر سر ہلا بلا کر افسوس بھی کر چکا تھا اور ناصر سے ہمدردی بھی۔ مگر یہ بات اتنی معمولی نہ تھی۔ ناصر کی زندگی بھر کا سوال تھا جو محض ڈیڑھ سال ہی میں جنم کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ اسی لیے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”میری مانو تو صائمہ باجی سے مشورہ لو۔ وہ بہت زیرک اور معاملہ فہم سمجھ دار عورت ہیں۔ شاید کسی تدبیر سے بھابھی کو ان کی غلط روش کا احساس دلا سکیں۔“



رہے ہیں۔“ اس نے مدبرانہ بے نیازی خود پر طاری کرنے کی کوشش کی اور مزید مکار دکھائی دی۔ غزالہ سوچ میں پڑ گئی پھر ناصر کی مزید کھوج میں لگ کر اس پر مزید انکشافات ہوئے۔ وہ واقعی کسی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا اس نے اپنے گناہ گار کانوں سے سنا اور پھٹ پڑی۔

”ہاں تو پھر۔۔۔ کر رہا ہوں میں سولو سے بات۔۔۔ تم کیا کر لوگی میرا۔“ ناصر نے نہ انکار کیا نہ بہانے بنائے جھٹ اقرار کر کے غزالہ کو ششدر کر دیا۔ وہ تو سوچے بیٹھی تھی کہ وہ گھبرا جائے گا، گڑبڑا کر وضاحتیں دے گا تب وہ اس کی اچھی طرح پھینٹی لگائے گی، مگر اس غیر متوقع صورت حال نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔

”کون ہے وہ ڈائن۔“ اتنا تو وہ کہہ ہی سکتی تھی۔ ”جو بھی ہے۔۔۔ تم سے بہت اچھی خوب صورت پڑھی لکھی اور سمجھ دار ہے۔“ ناصر درشتی سے بولا۔ ”تو لے آؤ نا اسے یہاں بیوی بنا کر میں بھی دیکھتی ہوں کتنے دن رہ لے گی وہ تمہارے ساتھ۔“ وہ آگ بگولہ ہو کر بولی۔

”جلد ہی لے آؤں گا۔ مگر اس سے پہلے تمہارا بندوبست ضروری ہے۔“ وہ ٹھنڈے برف سے لہجے میں اطمینان سے کہہ کر گھر سے باہر چل دیا۔ وہ چلا چلا کر بین ڈالنے لگی۔ سکوایر جنسی سروس کی طرح حاضر تھی۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔“ اس نے رٹ مار رکھی تھی اس کی بائچیس کھلی پڑ رہی تھیں متوقع ”آمدنی“ جو پیش نظر تھی۔

”ہائے میں لٹ گئی سکوم۔ برباد ہو گئی نجبانے کون چڑیل ہے جو میرے معصوم سے میاں کو پھانس بیٹھی۔“ وہ زمین پر بیٹھ کر دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ ”فکر مت کرس باجی جی۔ میں پیر سامیں سے ایسے توینڈ (تعویذ) لا کر دلوں گی کہ وہ چڑیل خود ہی جل کر جہنم ہو جائے گی۔ الٹا صاحب جی آپ کے پیروں میں گرے پڑے ہوں گے دیکھنا۔ ایسے ہی جلالی دھاگے دیتے ہیں وہ۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو۔“ وہ رک کر پوچھنے لگی۔ ”دلیس۔ مجھے جھوٹ بول کر جہنم میں جانا ہے کیا۔“ اس نے دھڑلے سے کہا تب جا کر غزالہ کے دل کو کچھ قرار ملا۔



پھر اپنے جیب خرچ سے بچا کر جمع کیے گئے بیس ہزار روپے صرف کر کے سکوم سے اس نے تعویذات منگوائے تھے۔ ناصر کی چائے میں چینی گھول دھاگا اپنے پیر میں باندھ اور تعویذ ناصر کے تکیہ میں دبا کر وہ اپنی ساری فکر اور پریشانی فراموش کر کے ’مزید شیرینی بنی گسوم رہی تھی اسے اس انقلابی دن کا انتظار تھا کہ جب ناصر اس کے پیروں میں گرا“ اپنے کمرہ ناکرہ گناہوں کی

معافی مانگنا دکھائی دیتا۔

وہ دن تو فی الحال اس کی زندگی میں نہ آیا البتہ ایک دن ایک طرح دار ماڈرن سی حسینہ ناصر کے ساتھ گھر آکر گھر کا معائنہ کرنے لگی۔ وہ دونوں آپس میں گھر کے پینٹ، انیٹریر وغیرہ پر مسکرا مسکرا کر تباہ خیال کر رہے تھے اور غزالہ جو تعویذات پر تکیہ کیے بیٹھی تھی اس صورت حال پر بھونچکی رہ گئی۔ اور اس بھونچکے پن میں اس سے اتنی عقل مندی ضرور سرزد ہوئی کہ وہ اس حسینہ کے سامنے ناصر سے الجھنے سے باز رہی (ذہن میں یہ بات بھی مخفی تھی کہ اگر ناصر نے ”ہونے والی سوتن“ کے سامنے ہی عزت افزائی شروع کر دی تب اس کی کتنی سبکی ہوگی) بس خلاف فطرت اتنا ضبط ہی بہت تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ ناصر کا گربان پکڑ کر پوچھنے لگی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی، میرے گھر میں کسی غیر عورت کو لے کر آنے کی۔“ ناصر نے محل سے اپنا گربان چھڑوایا اور سکون سے بولا۔

”یہ گھرا ب اس کا ہونے والا ہے۔ تم کسی زعم میں مت رہنا بہت جلد میں اسے یہاں ملاساؤں گا۔“ ”میں صائمہ باجی سے شکایت کروں گی۔ سارا



خاندان اکٹھا کر لوں گی۔“ اس نے دھمکایا تو وہ بے

ساختمیں بڑا۔

”تم نے کبھی کسی سے ہٹا کر رکھی یا کسی کو خوش دلی سے گھر میں خوش آمدید کہا ہے جو ایسے دعوے کر رہی ہو۔ جاؤ غزالہ لی بی۔ یہ بچکانہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔“ وہ کہہ کر چلتا ہوا۔ اس نے سکو کو گھور کر دیکھا۔

”یہ ہے تیرے لائے تعویذات کا اثر۔“ دوسرے دن سکو نے بتایا۔

”پیر سائیں نے کہا ہے کہ مخالف پارٹی نے بھی صاحب پر بڑے ٹکڑے ٹکڑے تعویذ کروا رکھے ہیں۔ اس کے توڑ کے لیے چلہ کاٹنا پڑے گا آپ کو۔ گھر کے ایک کونے میں روز مغرب کے وقت دھونی دے کر چراغ جلاتا ہو گا قل کے تیل کا پھر دیکھنا اس چیلن کا تیل کیسے لکھتا ہے۔“

”اچھا۔ چراغ تو جلاؤں گی، مگر چلہ۔“ یہ کام مشکل تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں، آپ صرف سات ہزار سات سو ستر روپے مزید دے دیں پیر سائیں آپ کے بدلے چلہ کاٹ لیں گے، آپ کا کام ہو جائے گا۔“ اس نے جھٹ اس کی پریشانی کا حل پیش کیا۔ سات ہزار سات سو ستر روپے چلے گا کیا تال میل تھا یہ سوچنے کا غزالہ کے پاس وقت نہ تھا۔ اب حقیقتاً ”اسے اپنا گھر بچانے کی فکر لاحق ہو چکی تھی۔ اب تک وہ ناصر کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتی آئی تھی، مگر اب اسے صحیح معنوں میں ناصر نے اپنے اختیارات کا مزہ چکھادیا تھا۔ چلہ بھی کاٹ لیا (پیر سائیں نے)۔ قل کے تیلوں کے چراغ بھی روز جلنے لگے (غزالہ کے ہاتھوں) مگر کچھ نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ ناصر کو پتا چل گیا کہ وہ سکو کے لائے تعویذات کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ وہ خوب گر جا برسا۔ اسے چراغ، تعویذ دھاگے سمیت سکو کو بھی گھر سے نکالنا پڑا۔ غزالہ تنہا رہ گئی۔ ایسے میں سوائے اللہ اور مرحومہ ماں کے بعد اسے صائمہ کے علاوہ بھلا کون یاد آتا۔ ان کے ہاں گئی۔ خوب روٹی دھوئی۔ ماجرا کہ

سنایا۔ صائمہ دنگ رہ گئی۔

”باجی۔ بس اب آپ ہی میرا آخری سہارا ہو۔ ناصر نے مجھے طلاق دے دی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔“ وہ روتے ہوئے گزر گزائی۔

”اللہ سے اچھی امید رکھو۔ ماہوس مت ہو میں ناصر کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔“ اس نے حوصلہ، تسلی سب کچھ دیا مگر غزالہ کو کچھ اور درکار تھا۔

”نہیں باجی۔ آپ کو اللہ کا واسطہ مجھے بس آپ وہیں سے تعویذ لادیں جہاں آپ ہر جمعہ کو جاتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ناصر بھی میرا ویسا ہی گرویدہ ہو کر رہے جیسے تو قیر بھائی آپ کے ہیں۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔ صائمہ ہکا بکا رہ گئی۔ ہر جمعے کو وہ بعد مغرب قریبی مسجد میں درس وغیرہ سننے بڑی پابندی سے توقیر ہی کے ساتھ جاتی تھی، مگر وہاں تعویذات وغیرہ کا تو کوئی سلسلہ نہ تھا یہ بات اس نے غزالہ کو بھی سمجھانے کی

بہت کوشش کی، مگر اس کی چھوٹی سی عقل میں یہ بات سمائی ہی نہیں کہ دنیا کی ساری کرامات صرف تعویذات ہی کے مرہون منت نہیں ہیں۔ تب صائمہ نے ٹھنڈی سانس لے کر بس اتنا کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں صرف تمہارے خاطر وہ تعویذ حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔“



اور اب غزالہ وہ تعویذ حاصل کرنے کے بعد بڑی پابندی سے بزرگ کے فرمودات پر عمل پیرا تھی اور جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچنے کی منتظر بھی نہ ہو سکی چھ ماہ گزر گئے نہ ناصر کے روپے میں فرق آیا نہ غزالہ کے پائے استقامت میں، مگر وہ گھبرا ضرور جاتی۔ تب صائمہ کی ”صبر۔ صبر“ کی تلقین اسے حوصلہ دیتی۔ سکو کے بعد ناصر نے اسے کوئی نوکرانی رکھ کر نہ دی۔ اسے سارا کام، گھر کا انتظام و انصرام خود کرنا پڑتا۔ تب بھی ناصر کے ماتھے کے بل درست نہ ہوتے۔ وہ اسے بے وجہ سخت ست ہی سنایا وہ سر جھکا کر دل میں لاجول پڑھتی



رہتی۔ بلکہ اب تو ناصر کے پہلے کے رویے اور اپنی کچھلی روش پر اسے شرمندگی ملا۔ پشیمانی سب کچھ محسوس ہونے لگا تھا۔ اور وہ منتظر تھی اس دن کی آمد کی جب سب کچھ پہلے جیسا ہو جانا تھا۔ مگر وہ نادان نا واقف تھی کہ گزرے ہوئے پل کبھی واپس نہیں آتے۔

”میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں باجی آپ نے میری بد تمیزیوں کو نظر انداز کر کے اس مشکل وقت میں میری مدد کی۔“ غزالہ فون پر خوشی سے چمک رہی تھی۔ ”مدد گار تو وہ ہی رب ہے سب کا۔ ہم تو صرف وسیلہ بنتے ہیں۔“ صائمہ انکساری سے بولی۔ ”پھر بھی باجی اگر آپ مجھے وہ تعویذ نہ لا کر دیتیں تو میرا کیا بنتا۔“

”(اف اللہ۔ پھر وہی تعویذ۔)“ صائمہ نے سخت بد مزگی سے سوچا۔ مگر بولی۔

”دیکھو غزالہ۔ ایک بات، اچھی طرح ذہن نشین کر لو ہر امر حکمِ بلی ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو کوئی تعویذ کچھ نہیں کر سکے گا۔ اور وہ سری بات جیسا کہ تم نے ابھی بتایا کہ ناصر کا رویہ اب تم سے بہتر ہونے لگا ہے۔ تمہارے پکائے کھانے کی تعریف بھی کی۔ تمہیں شاپنگ پر بھی لے کر گیا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ مرد اگر اپنی کرنے پر اتر آئے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ ناصر تو یوں بھی گھر سے باہر کا راستہ دیکھ چکا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم اسے کس طرح اپنا بنا کر رکھ سکتی ہو۔ سبانی میری ہمدردی اور دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”جی باجی۔ میں نے بھی اپنی غلطیوں سے سبق سیکھا ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی کہ آئندہ وہ غلطیاں نہ دہراؤں۔ اس نے نا دم لہجے میں کہا، پھر پوچھنے لگی۔

”اچھا اب اس تعویذ کا کیا کروں؟ کیا ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھنا ہوگا؟“

”ارے نہیں۔“ صائمہ بے ساختگی سے بولی، ”ویسے بھی تمہارا مقصد تو پورا ہو ہی چکا ہے۔ میں کچھ دن میں چکر لگاؤں گی تب تم مجھے واپس کر دینا

میں اسے سمندر میں ڈلوادوں گی۔ اچھا اب رکھتی ہوں وہ سہر کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔“ اس نے فون کان سے ہٹایا۔ سامنے صوفے پر بیٹھانا صبر بھرپور انداز سے مسکرا کر بولا۔

”آپ کے لائے تعویذ نے تو کمال کر دیا۔“ ”بکومت۔“ صائمہ مسکراہٹ دیا کر مصنوعی خفگی سے بولی۔

”سب تمہارا کیا دھرا ہے اگر تم سو نو والا ڈرامہ رچانے سے قبل مجھے اعتماد میں لے لیتے تو غزالہ کو کسی اور طریقے سے بھی سمجھایا جاسکتا تھا۔“

”میں ہر طریقے پر غور کر چکا تھا۔ بہت ٹیڑھی کھیر ہے وہ۔ اول تو وہ کسی کی نصیحت خاطر ہی میں نہیں لاتی کیونکہ وہ اپنے طرز عمل کو غلط سمجھتی نہیں تھی۔ اسی لیے اسے خوفزدہ کر کے جذباتی دھچکا دینا اشد ضروری تھا۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”مگر وہ تعویذ والا کھڑا کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یقین کرو مجھے عجیب سی شرمندگی ہو رہی ہے۔“ ”مروض کو دیکھتے ہوئے اس کے مطابق طریقہ علاج اختیار کرنا چاہیے مائی ڈیر باجی، اگر آپ اسے یونہی اپنے طور پر سب سمجھانے کی کوشش کرتیں تو میں دعوے سے کہتا ہوں وہ کبھی تنہی سے ان باتوں پر عمل نہ کرتی۔ ویسے آپ نے اس تعویذ میں لکھا کیا تھا؟“ وہ شرارت سے پوچھنے لگا۔

”محبت فارغ عالم کے سوا کیا لکھ سکتی تھی میں۔“ وہ سر جھٹک کر مسکرائی۔

”ہا ہا۔“ اس نے قہقہہ لگا۔ ”اس سے پہلے کہ ہماری پول کھل جائے بہتر ہے کہ آپ جلد ہی اس سے وہ تعویذ واپس لے لیں۔“

”ہاں جاؤں گی کل۔ ابھی تو چلو بج کا وقت ہو رہا ہے۔“ وہ اندر بڑھ گئی۔ اور ناصر سوچنے لگا کہ اگر انسان ذرا سی عقل استعمال میں لا کر تدبیر کر لے تو زندگی کے بہت سے مسائل کو ذرا سی کوشش سے سلجھایا جاسکتا ہے۔

☆ ☆



# رہائے گناہ

سوبا اور مایا دونوں ہمیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

گھر کی نجی منزل میں ان کے تایا اور تانی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔ حدید انس عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس سوبا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوبا کی تانی کے سامنے کر دیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے مگر ظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوبا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔ نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط برقرار جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوبا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوبا رخصت ہو کر انس کے گھر آ جاتی ہے۔ حدید کسی کو ذرا پکڑنے جاتا ہے اور اس کا ایک سیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

سوبا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔ حدید عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔ نائلہ شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور مایا سے بھی کر دیتی ہیں۔

حدید انس کی نہ طر نائلہ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو جاتا ہے اور شادی کے بعد پوری سچائی سے نائلہ کو بیوی کا درجہ دینا چاہتا ہے مگر نائلہ نے حدید کو مجبوری کے تحت اپنی زندگی میں قبول کیا اور اس کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا۔









خاموش ہو گیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ناملہ اس کو قبول کر لے گی، مگر حید کی شرافت اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے ناملہ دماغ میں کچھ اور ہی منصوبے بالا ہی بالا تشکیل پانے لگے، جس پر ناملہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی سے عمل پیرا تھی کہ وہ اس کی نہ ہو سکی تو سوہا اور انس کو بھی جدا کر دے گی۔

ماما کی شادی حسیب سے بخیر و خوبی ہو جاتی ہے۔ اما حسیب کے ساتھ دینی چلی جاتی ہے، اما حسیب سے شادی کے بعد اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی سمجھنے لگتی ہے، مگر اس کو پتا چلتا ہے کہ حسیب ایک بیٹے کا باپ ہے اور وہ فوراً پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

سوہا امید سے ہوتی ہے، مگر ناملہ بڑی عمدگی اور کامیابی سے سوہا کو اس خوشی سے محروم کر دیتی ہے اور اس حادثے کے بعد انس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سوچ لیتا ہے کہ اب سوہا کو کوئی غم نہیں دے گا۔ ناملہ اسپتال میں شبیر حسین کو دیکھ کر چلا جاتی ہے وہ سمجھتی ہے کہ شبیر حسین نے اس کو نہیں دیکھا، مگر شبیر حسین ناملہ کا پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور ناملہ نہ چاہتے ہوئے بھی شبیر حسین کے جان میں کھ جاتی ہے۔

حسیب اما کو منالیتا ہے اور پاکستان آ جاتا ہے، مگر اما پھر غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے اور حسیب کے ساتھ جانے سے منع کر دیتی ہے۔ حسیب اکیلا ہی دینی جانے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ عفت کا نکاح معراج کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جس کا حید کو پتا چلتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھئے)

## گیارہویں قسط

حیدر آباد کی دھوپ سے ترختی زمین پر چاند کی نرم کرنوں کی ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ یہ کرائے کا مکان ایک کمرے اور چھوٹے سے دالان پر مشتمل تھا۔ صد شکر تھا کہ مالک مکانوں نے کونے سے اوپر کی طرف جاتی لکڑی کی سیڑھیاں کرائے داروں کے لیے کھول رکھی تھیں۔

شدید گرمی اور جس میں جب لوڈ شیڈنگ مہربان ہو جاتی تو تقریباً ”ہر روز وہ پسینے میں بھیگا جسم اپنی چادر اور تکیے اٹھا کر اوپر چلا آتا۔ ایسے میں اسے اپنے گھر کی چھت اور اس کا نازک اندام وجود بہت شدت سے یاد آتا۔ جسے اللہ نے اس کے دل کی مرضی جانتے ہوئے اس کی زندگی میں شامل کر دیا تھا، لیکن آج معاملہ مختلف تھا۔

آج سوہا کی یاد کے ساتھ دو اور فکریں اس کے ذہن پر سوار تھیں۔ ایک تو اس کے کمرے اور الماری کے کھلے دروازے اور دوسرے ناملہ کا اچانک بے ہوش ہو جانا۔

سربانے لگے موبائل کی لائٹ جلی وائبریشن ہونے لگی۔

”سوہا کالنگ لمحہ بھر میں سارے خیالات اس کے ذہن سے یوں اڑن چھو ہوئے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ وہ سب بھول گیا سوائے اس آواز کے، جو ابھی ابھی اس کی سماعتوں میں اتر کر اس کی روح کو اطمینان دینے کے ساتھ ساتھ اس کے وجود کو اضطراب بخشنے والی تھی۔ اس کی نشانی بڑھانے والی تھی۔

”کیا حال ہیں جان من!“ اس کا مسکراتا لہجہ سن کر سوہا کے لبوں پر بھی چمک پھوٹنے لگی۔

”حال وہی ہے جو آپ چھوڑ کر گئے تھے۔“ وہ رکی پھر بولی۔

”سوہا!“ چند لمحوں بعد اس نے بڑی سنجیدگی اور گہمیرتا سے پکارا۔

”جی۔“ وہ بھی ذرا کی ذرا سنجیدہ ہوئی۔

”بہت یاد آ رہی ہے تمہاری یاد۔“ بے بسی سی بے بسی تھی۔

”مجھے بھی۔“ دونوں خاموش ہو گئے اور یہ خاموشی ایسی ہی تھی کہ کہنے کو دونوں کے پاس کچھ نہ کچھ تھا، لیکن وہ اپنے علاوہ کسی اور کی بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ خاموشی طویل ہونے لگی اور یہ دوری انس پر جھنجھلاہٹ اور سوہا پر



اداسی طاری کرنے ہی لگی تھی کہ انس کو کچھ یاد آگیا۔

”اچھا سنو! ایک بات بتا رہا ہوں تمہیں دھیان سے سننا۔ آج جب میں تمہیں چھوڑ کر گھر گیا تو۔“ اس نے کمرے کے کھلے دروازے سے لے کر نائلہ کی مشکوک حالت تک سب کہہ ڈالا۔ سوہا اچھے میں گھری سنتی گئی۔

”میرا خیال کہ یہ نائلہ کی حرکت ہے۔“

”لیکن میرا یہی خیال ہے۔ نائلہ کے سوا اور کون جاسکتا ہے کمرے میں۔ جبکہ وہ اکیلی بھی تھی۔“

”پتا نہیں وہ کن چکروں میں ہے۔ آپ اس کے بارے میں کوئی گمان مت رکھیں۔ وہ کچھ بھی سوچ سکتی ہے اور کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یاد نہیں میں نے بتایا تھا نا! کہ اس کا رویہ میرے ساتھ کتنا برا ہے۔“ سوہا کو ایک بار پھر نائلہ کی برائی کرنے کا موقع مل گیا۔

”رویہ جو بھی ہو، لیکن وہ کمرے میں کیا کرنے لگی ہوگی میں تو یہ سوچ رہا ہوں۔“

”اچھی طرح تلاشی لیتے کوئی چیز گم تو نہیں ہوئی۔“

”نہیں میں نے دیکھ لیا ہے اور تم بھی کیا بات کر رہی ہوں انڈین ڈراموں والی وہ کیا کمرے میں چوری کرنے ٹھہری ہوگی۔“ اس نے کان پر سے مکھی اڑائی۔

”اگر وہ کسی بری نیت سے نہیں گئی تب بھی گئی وہی ہے۔ مجھے یقین ہے۔ تب ہی تو آپ دونوں کے سوالات سے بچنے کی خاطر بے ہوش ہو گئی۔“

”اے بیچارہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ وہ کوئی ٹانگ نہیں کر رہی تھی۔“

”آپ کو اندازہ نہیں وہ کتنی بڑی نوٹنگی ہے۔“ سوہا ٹھونک بجا کر بولی۔

”اندازہ تو مجھے بھی نہیں تھا کہ تم اتنی بی جملو ہو۔“

”اوہ۔ میں بی جملو ہوں۔“ حسبِ توقع وہ فوراً ہی برامان گئی۔

”اچھا اچھا بس زیادہ منہ پھلانے کی ضرورت نہیں۔ میں اتنی خوب صورت کال کو ناراضی پر اینڈ نہیں کرنا چاہتا۔ کل ایک نئی جگہ اپلائی کیا تھا وہاں انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ اس لیے تم بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔“

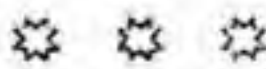
”ہوں۔۔۔۔۔۔“ سوہا خاموش رہی۔ پھر بولی۔

”نیند کس کم بخت کو آتی ہے یہاں۔ آپ کو آجائے گی نیند۔“ اس کے لہجے میں ایک وفا شعار بیوی کی محبت بول رہی تھی۔

”آہی جائے گی۔ لیکن میں کمبخت نہیں ہوں۔“

”انس۔“ سوہا کی ہنسی نکل گئی۔

”ہاں میں بہت بخت آور ہوں۔ کیوں کہ میرے نصیب میں تم لکھی گئیں۔“ اس کا لہجہ مہک رہا تھا۔



آنکھیں بند کر لینے سے ضروری نہیں کہ نیند آ بھی جائے۔ بہت برا تجربہ تھا۔ وہ شدید بے زار ہوا۔

”کیوں رک گیا میں خواہ مخواہ۔ اس نے تو کوئی بات نہیں کی۔ نہ کوئی بات کرنے کا موقع دیا بس۔ اطمینان

ہو گیا تو چلی گئی اور اب۔ کیا کرتی ہوگی۔ اطمینان سے گہری نیند سوتی ہوگی اور ایک میں پاگل ہوں۔“ وہ پہلی بار ان

کیفیات سے نہیں گزرا تھا۔ اس کی ایک خانہ آبادی پہلے ہو چکی تھی۔ وہ ایک بچے کا باپ بھی تھا۔ سوان کیفیت

پر اس کی جھنجلاہٹ بے حد فطری تھی۔ حیرت اسے عفت کے اطمینان پر تھی۔

اور عفت۔ وہ محبت کا ذائقہ چکھ چکی تھی۔ استحقاق کا حسن پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اگر دل کے بہت



مجبور کرنے پر وہ اسے دیکھنے باہر آ بھی گئی تو کیا؟ کوئی اس سے سوال نہیں کر سکتا، لیکن اصل حیرانگی اسے اپنے دل کے پلٹا کھانے پر تھی۔ بھلا کوئی یوں بھی رنگ بدلتا ہے کیا؟

”شاید اسی گونکاج کے بولوں کی طاقت کہتے ہیں۔“ بے حد جھجکتے ہوئے اس نے دل میں اعتراف کیا اور کاریڈور میں آگے کی طرف قدم بڑھائے۔ دل ہی دل میں خود سے الجھتا جھنجھلاتا معراج گلابی آئچل کا سایہ دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ سنان راہ داری میں کوئی آہٹ گئی نہ کوئی ذی روح۔ صرف ایک وہ تھی۔ گلابی پیراہن میں گچی ایک نازک سی لڑکی۔ جو اس کے دل میں یوں دھڑلے سے گھس آئے والی دوسری صفت نازک تھی۔ ابھی عفت کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ بہت دھیرے رک رک کر قدم بڑھا رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا اور جب یقین ہو گیا کہ اب وہ یہاں تک آئے بغیر واپس نہیں پلٹے گی تو جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ عفت وہاں آئی۔ اس نے ذرا کی ذرا جھانک کر دیکھا۔ وہ سامنے ہی لیٹا تھا۔ عفت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ اس کا لمبا چوڑا سراپا اس وقت محو خواب تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

نماز پڑھنے کی جگہ اور کوئی دوسرا مرد نہیں تھا ایک سولہ سترہ سال کی عمر کا نو عمر لڑکا دیوار کی طرف کروٹ لیے سو رہا تھا۔ اس نے نظر بھر کے معراج کے وجود کو دیکھا۔ معراج آنکھوں میں جھری پٹائے اس کی کسی پیش قدمی کا منتظر رہا، لیکن وہ بس چند لمحوں میں گھبرا پڑا پلٹ گئی۔ اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ گلابی آئچل دھیرے دھیرے دور جا رہا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ اپنی بے موقع ایکٹنگ پر خود سے خفا بھی ہوا۔ پھر تیزی سے اٹھ گیا۔

”جب تم بھی جاگ رہی ہو اور نیند ہمیں بھی نہیں آتی۔ تو کیا ضروری ہے کہ جھوٹے ڈرامے کر کے ایک دوسرے کو جانے کیا سمجھانے کی کوشش کی جائے۔“ وہ تیز قدموں سے رضوانہ کے کمرے کی طرف گیا۔ ڈیوٹی پر موجود نرسیں اور نیلی فون آپریٹر کاؤنٹر پر سرگرائے اونگھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی توجہ اس لگا چھپی کے کھیل کی طرف نہیں تھی۔ اس نے چند لمحوں میں پھر ہلکی سی دستک دے کر دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ رضوانہ گہری نیند سو رہی تھیں۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہوا۔

”کیا ضرورت تھی نو عمر لڑکوں کی طرح یہ فضول حرکت کرنے کی۔“ اب باہر جانے یا یہیں ٹھہر کر انتظار کرے۔ داش روم کا دروازہ کھل بند نہیں تھا جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ عفت کمرے میں نہیں آئی۔ تھوڑی دیر یہاں وہاں اس کی موجودگی کے آثار اور اس کے وجود کی خوشبو کو محسوس کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ کسی کا بیڈ روم نہیں اسپتال کا کمرہ تھا۔ وہاں صرف دواؤں اور اسپرٹ کی بوتلی اور بالکل خاموشی۔ گہری سانس لے کر اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور واپسی کے لیے پلٹا۔ تب ہی عفت کھلے دروازے سے اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔ معراج نے محسوس کیا وہ زندگی میں اس سے زیادہ کھسیانہ کبھی نہیں ہوا۔

”آنکھ کھلی تو خیال آیا۔ آپ کو بھی دیکھ لوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“ اپنی آواز میں شامل کھسیاہٹ کے عنصر کو وہ خود بھی چھپانے سے قاصر تھا۔

”میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔ نیند نہیں آرہی۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔“ عفت نے گرم چائے کا کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”جی جی۔ آپ جا میں۔ میں بیٹھا ہوں یہاں۔“

”آپ۔۔۔ وہ رک سی گئی۔“

”آپ کو یہاں رکنے پر کوئی زحمت تو نہیں ہوگی۔“

”نہیں نہیں۔ آپ شوق سے چلی جائیں۔ میں بیٹھتا ہوں۔ آپ جائیں۔“ دل کچھ اور چاہتا تھا۔ زباں کچھ



اور کہتی تھی۔ عفت باہر نکلی تو لبوں پہ بھرتی ہنسی کو بمشکل قابو کیا۔ ابھی چند قدم ہی چلی تھی اور راہ داری کے موڑ تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ اپنے نام کی پکار سنی۔ وہ مڑی تو معراج تیز تیز قدم اٹھاتا اس تک پہنچا۔

”میں نے سوچا میں بھی چلا چلوں باہر۔ آئی تو بہت رملک سدا ہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ تو۔“ عفت نے اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر نظریں جھکا میں۔ لب کا کونا دانتوں میں دبایا اور چل پڑی۔ احاطے کے اندر موجود گھاس کا قطعہ سنان پڑا تھا۔ دور کہیں کسی اکاد کا سنگی ہتھکڑی بر کوئی سویا ہوا تھا۔

”میں چائے بنانے جا رہی تھی۔ تو سوچا آپ سے بھی پوچھ لوں کہ آپ۔“ اس نے بہت محتاط انداز میں بات کی، لیکن مکمل نہیں کر سکی۔

”جی میں نے دیکھ لیا تھا آپ کو۔ جب ہی تو اٹھ کر آیا تھا کہ کہیں آپ۔“ اس کے لبوں سے روالی میں جو بچ نکلا تھا اور جتنی تیزی سے عفت کے چہرے پر اک شرارتی مسکان چھوئی۔ اس نے معراج سے بات مکمل کرنا مشکل کر دیا۔

”تو۔ کہیں کسی چیز۔“ ایک پل کو ان کی نظریں ملیں۔ اگلے پل دونوں ہنس رہے تھے۔



وقت ہمیشہ ایک سا گزرتا ہے۔ صرف لوگوں پر کیفیات الگ وارد ہوتی ہیں تو ایسی وقت کو ہمیشہ لگ جاتے ہیں۔ کہیں ادھ مرے جانور کی طرح گھسینتا ہے۔ وہ رات بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ الگ الگ انسانوں کے لیے الگ طرح کی ایک ہی رات۔ سوہا کے لیے وہ رات بھر کی اضطراب میں گھلی تھی۔ نائلہ کے لیے وہ رات سخت سزا سے مشابہہ تھی۔ ماہا کے لیے وہ رات صرف خدشوں اور وہموں والی رات تھی اور عفت کے لیے وہ رات بے حد حسین۔ ایک نئی مکمل اور خوب صورت زندگی کی طرف پہلے قدم کی رات تھی۔

بحر کے بعد ہی جب سورج کی روشنی نے ذرا کی ذرا اچھپ دکھائی تھی۔ اس نے جلتی آنکھوں کو مسلا اور کروٹ لینے کی کوشش کی۔ پورے جسم میں شدید تھکن کے آثار جاگے۔ شاید یہ شب بے داری کا نتیجہ ہے۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا اور بستر سے اٹھ کر واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ اس نے کتنی دیر نرم اور نرم پھواروں کو جسم پر بننے دیا۔ بند دروازے کے باہر بیڈ روم میں زندگی جاگنے کی نشانیاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ شاید خود اس کی طرح نائلہ بھی پوری رات ڈھنگ سے سو نہیں پائی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔

”یہ بے چین جاگتی راتیں اس نے خود اپنا نصیب بنائی ہیں۔“ پتا نہیں اس کے اندر اتنا غم اور غصہ کیوں بھر گیا تھا۔ یہ ایک مرد کی اتنا پرچوٹ بڑنے کا نتیجہ تھا جو عورت کے ہاتھوں پڑی تھی یا پھر یہ ایک مبہم خواب ایک خیالی تصویر اتنی خوشیوں بھری دنیا کے ٹٹ کے کاٹا تھا۔

عفت کے نکاح کی خبر کوئی انہونی تو نہیں تھی، لیکن اس کے اعصاب اور حواس پر پتا نہیں کیوں کسی بم کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور شاہور سے نکلتے پانی کو جلتے پوٹوں پر تڑا تڑا برسنے دیا۔ نائلہ اور عفت۔ اس کے لیے دو عورتیں، نہیں دو سمیتیں بن گئی تھیں۔ وہ ایک سمت کی طرف بڑھنا چاہتا تھا اور کوئی اسے دوسری سمت دھکیلتا تھا۔ وہ ان دونوں سمتوں کے درمیان دھکم پھیل میں تھکا جا رہا تھا۔ اسے بجھائی نہیں دیتا کہ آگے کا راستہ کیا ہو گا۔ حالانکہ آگے راستہ صاف ہی تھا۔ دفعتاً اس کا کھویا کھویا ذہن بے دار ہوا۔ شاہور سے پانی بننے کی رفتار دھیمی پڑ رہی تھی اور واش روم کے دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

”ناشتا تیار ہے۔“ نائلہ کی آواز بیٹھی بیٹھی سی تھی۔ گلے میں پھنسی ہوئی۔ اس نے شاہور بند کر دیا۔ ناشتا ہمیشہ



کی طرح اس کی پسند کا تھا، مگر وہ بنا کوئی رسپانس دیے نوا لے نکلتا رہا۔  
 ”آپ آفس جائیں گے یا۔“

”یا۔“ اس نے بے حد ناگواری سے نائلہ کو یوں دیکھا جیسے کوئی گھن آتی ہوئی چیز کو دیکھتا ہے۔ نائلہ بھی اس انداز کو سمجھتی ہی تھی۔ اس کے دل میں کوئی تیر سا گڑ گیا۔

”یا اسپتال۔۔۔ وہاں عفت رات سے اکیلی ہے اور۔“ نائلہ نے بات مکمل نہیں کی۔ حدید نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بے چینی سے منہ ہاتھ دھو کر باہر کی طرف لپکا تھا۔ نائلہ نے بے تاثر چہرے سے اس کی بے چینی دیکھی اور رُے اٹھا کر چن میں لے گئی۔ فل اسپڈ سے بانیگ اسپتال کی طرف اڑاتے ہوئے ایک ہی سوال بار بار ذہن میں اٹھ رہا تھا۔

”میں بھول گیا۔۔۔؟ میں کیسے بھول گیا کہ عفت اکیلی ہے۔ اس نے میرا کتنا انتظار کیا ہوگا۔“ وہ ایک بات اور بھول رہا تھا کہ عفت اب اتنی بھی اکیلی نہیں۔  
 ”اس نے میرا کتنا انتظار کیا ہوگا۔ میں نے ایک فون تک نہیں کیا۔ نائلہ نے اپنے چکروں میں اتنا الجھا کر رکھا کہ۔۔۔ اف۔۔۔ وہ بے چاری اب تک میرا انتظار۔“



صبح ساڑھے چھ کا وقت تھا۔ گرمیوں کے موسم میں سورج جلدی چڑھ آتا ہے۔ ابھی دھوپ میں چھن کے اثرات اتنے زور اثر نہیں ہوئے تھے پھر بھی اسے لگا کہ اس نے ہاتھ میں موجود شاپر عفت کی جانب برہایا جس میں ناشتے کا سامان صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”آپ سینڈوچ کھالیں چچی جان!“ عفت اب رضوانہ کی طرف متوجہ تھی۔  
 ”میں اب چلتا ہوں عفت۔۔۔ یہ سامان رکھ لیں۔“ عفت نے اس کے ہاتھ سے شاپر پکڑا اور پھر سے رضوانہ کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”او حدید کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ بیٹا! یہ عفت کو دیکھو مجھے بالکل ہی مریض بنا ڈالا ہے“ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ رضوانہ کی محبت بھری آواز پر عفتوں نے مسکرا نے کی کوشش کی۔ عفتوں کی کوشش ناکام رہی۔  
 ”اور تم اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو۔ تھوڑی دیر رک جاؤ بیٹا۔“ غالباً رضوانہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ صبح صبح ناشتا دینے کے بہانے عفت کو دیکھنے دوبارہ آیا ہے۔

”نہیں جانے دیں چچی۔ یہ رات میں یہیں رک گئے تھے۔ بہت تھک گئے ہیں۔ اب جا کر آرام کر لیں تو بہتر ہے۔“ اسپتال کے تیم تاریک دالان میں بنے اس ٹھنڈے کمرے میں تیز دھوپ نکلی اور سیدھی اس کی آنکھوں میں کھسب گئی۔ اس کی سوچیں اوسوری رہ گئیں اور اسے لگا اس کا وجود بھی اوسور رہ گیا۔ عفت اکیلی نہیں تھا۔ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ وہ وہی شخص تھا جو عفت کے تمام حقوق اپنے نام کروا چکا تھا اور فرائض کی بجائے آوری کے لیے دل سے تیار تھا۔

”اتنی صبح صبح آپ یہاں۔۔۔ خیریت۔۔۔“ حدید سے مسکرایا بھی نہیں جا رہا تھا اور اس نے کوشش بھی نہیں کی۔

”جی بس۔۔۔“ اس سے مصافحہ کرتا معراج اس عجیب و غریب لہجہ و انداز پر گڑ بڑا گیا۔  
 ”یہ حدید ہیں۔ میری بہن نائلہ کے شوہر اور میرے خالہ زاو بھائی بھی۔“ عفت بھی حدید کو دیکھ کر اور اس کی بات سن کر حیران ضرور ہوئی تھی، لیکن حدید کی کیفیت کو اگر وہ نہ سمجھتی تو کون سمجھتا۔ اس نے بروقت خود کو سنبھال



کر پر سکون کر لیا۔ معراج پھیکے پن سے مسکرایا۔ عفت کی آواز بالکل اسی طرح نرم تھی، مگر اس کی پشت پر بیٹھا ہوا  
 حدید ساکت ہو چکا تھا۔  
 معراج سلام کر کے چلا گیا۔ عفت رضوانہ کو سینڈوچ کھلانے لگی، لیکن وہ اپنی پشت پر حدید کے پتھر ہوئے وجود  
 کو محسوس کر سکتی تھی۔

معراج نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی ماں کے ٹٹولتے انداز کو محسوس کر لیا تھا۔  
 ”کہاں تھے تم رات بھر۔“ وہ سلام کے جواب میں سوال کرنے لگیں۔  
 ”بتایا تو تھا ایک دوست کی طرف گیا تھا۔“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں سلام کر کے نزدیکی صوفے پر گر سا گیا۔  
 ”ایسا کون سا دوست نکل آیا تمہارا۔ جس کے لیے تم یوں اپنی راتیں کالی کرو اور آفس سے چھٹیاں کرتے  
 پھرو۔“ اماں کی آواز میں شک نہیں بس ایک واضح الجھن سی تھی۔  
 ”او فوہ اماں آپ بھی بس۔ بتایا تو تھا عفت کی چچی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا ان کی عیادت کے لیے گیا تھا۔“  
 ”ہاں تو۔“ وہ اب بھی نہیں سمجھتی تھیں۔  
 ”تو بس۔ وہیں رک گیا تھا۔“

”ہیں؟“ وہ یوں اچھلیں جیسے پچھونے ڈنک مارا ہو۔  
 ”رک گیا تھا مطلب۔۔۔ پوری رات سے تم وہاں تھے۔“ نہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔  
 ”جی وہیں تھا۔۔۔“

”لیکن کیوں کیا ضرورت تھی تمہیں وہاں رکنے کی۔ ان کے یہاں کوئی مرد نہیں ہے۔“ حسب توقع اماں برا  
 مان چکی تھیں۔ معراج نے ایک گہری سانس لی۔ رات والا ٹرانس گزر چکا تھا۔ عفت غنقریب اس گھر میں آنے  
 والی ضرور تھی، لیکن ابھی آئی تو نہیں تھا۔ یہی سوچ کر اس کی پلکیں غیند سے جڑی جا رہی تھیں۔  
 ”مرد ہیں، لیکن اس وقت نہیں تھے۔ بہنوئی ہیں عفت کے۔ ایک کو حیدر آباد جانا تھا۔ دوسرا اس کی بہن کے  
 پاس تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”اور وہ ان کی چچی محترمہ ان کے پاس کوئی نہیں تھا جو تمہیں کرنا پڑا۔“ ان کا لب و لہجہ تیکھا ہو گیا۔ بیٹے کی زبان  
 پر چڑھی ایک دن پرانے سسرال کی مصروفیات انہیں ایک آنکھ نہیں بھائی تھیں۔  
 ”بھئی نا! عفت وہاں تھی اکیلی۔ اسی کا خیال کر کے رک گیا تھا میں۔“ اس نے اپنی منکوحہ نہیں بلکہ سالوں  
 پرانی بیوی کی طرح عفت کا ذکر کیا تھا، لیکن عفت کے نام پر اس کے چہرے کا جو رنگ بدلا تھا۔ وہ ان جیسی جہان دیدہ  
 خاتون سے کیسے چھپ سکتا تھا۔ اور سے معراج کی بات۔ اس نے گویا ان کے پیروں میں پٹا خا پھوڑا۔  
 ”ہیں۔ ہیں۔“ وہ بدک کر آگے پیچھے سرکی۔۔۔ جزبز ہو میں۔

”تو تم اس کے ساتھ تھے۔ رات بھر۔“  
 ”جی رات بھر اسپتال میں۔“ معراج بھی ان کے انداز پر ذرا کسمسلیا۔ پھر اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔  
 ”سورہا ہے ابھی جاگا نہیں۔ اٹھا دوں کیا۔“ دل میں ہوتی پکڑ دھکڑ کی وجہ سے ایک بے تکلی بات ان کے لبوں  
 سے نکلی۔

”نہیں اماں پلیز اور اگر اٹھ بھی جائے تو میرے پاس مت بھیجے گا۔ رات بھر کا جاگا ہوا ہوں۔ ذرا دیر تک سوؤں  
 گا۔“ اس نے فی الفور انہیں منع کیا۔ پھر اٹھ کر ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا کمرے سے نکلا۔  
 ”ناشتا نہیں کرو گے۔“ انہوں نے صدمے سے باہر نکل کر اسے پکارا وہ دہلیز پر لمحہ بھر کر رکھا پھر متفی میں  
 سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔



”اے ہے۔ یہ کیا ہو گیا گل کو۔ ابھی تو دوسرا دن نہیں گزرا نکاح کیے کہ ایسے لٹو ہو گئے۔ مانوا اپنی نیندیں قربان کرنے کو تیار۔ اے لڑکی ہے کہ جادو گرنی۔“ بات ہی ایسی تھی۔ پیٹ میں درد تو ہوتا ہی تھا۔ جھٹ سے بیٹی کو بلوا بھیجا۔

”اور اماں دیدہ دہری دیکھیں خود بھی اکیلی تھی وہاں اور اسے بھی روک لیا۔ آئے ہائے کیسی بے شرمی کی بات ہے یہ۔“

”اور نہیں تو کیا۔“ اماں نے پان کی گلوری کلمے میں دبائی۔ اور بیٹی کے سامنے مزید پھپھولے کے لیے پوزیشن سنبھالی۔

”لو پورے خاندان میں کسی کو خبر نہیں ہوئی اور یہ دونوں وہاں رات بھر اکیلے پڑے رہے۔“  
”یہ تو ہمارے بھائی کی شرافت ہے کہ ہمیں بتا دیا۔ پتا نہیں اب اس نے بھی کسی کے کان میں یہ بات ڈالی کہ نہیں۔“

”اے لو۔ وہ کیوں بتائے گی۔ ایسی ملاقاتوں کی کسی کو بھٹک دی جاتی ہے کیا۔“  
”مگر میں تو اماں چپ نہیں رہوں گی۔ باتوں باتوں میں عفت کی ماں سے کہوں گی ضرور۔ ان کی ناک کے نیچے یہ کھیل تماشے ہمارے خاندان میں نہیں ہوتا ایسا۔“ بیٹی ان کے جلتے پھپھولوں پر ہمدردی کے پھا ہے رکھنے لگی۔ آخر اسے بلایا کس لیے تھا۔

”چل چھوڑ۔ رہن دے۔ پتا نہیں راجو کو کیسی لگے یہ بات۔“ اب بیٹی جذباتی ہونے لگی تو ماں کو خیال آگیا۔  
”کیسی لگے کیا مطلب۔ جیسی بھی لگے۔ بات ہے ہی غلط۔ ایک تو ہمارے علم میں لائے بغیر رات بھر وہاں رکا رہا۔ اور وہ بھی عفت کے ساتھ۔“ بہت غلط بات ہے۔“ صحیح بات کو غلط کہتے سے وہ بالکل بھول گئیں کہ عفت کوئی اور نہیں ’شرعا‘ اور قانوناً ان کے بیٹے کی عزت اور اس گھر کی بھوتھی۔ گو کہ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کی حیثیت کو دنیا کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اماں نے بیٹی کو گرم ہوتے دیکھا تو بنا کچھ کہنے گلے میں دبا پان چبانے لگیں۔

صبح اپنا ٹھنڈا روپ لے کر جانے کو تیار تھی۔ جب ماہا اور سوہانا شتالے کر اسپتال پہنچیں۔ رضوانہ نے جو دونوں بیٹیوں کو ساتھ آتے دیکھا تو سکھ کا سانس لیا۔

”سوری عفت ہمیں آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی اصل میں رات میں اس قدر دیر سے آنکھ لگی کہ۔“ سوہانری سے عفت سے بات کرنے لگی۔ حدید خاموش سا تھا۔ مگر ان تینوں نے ایک دوسرے میں لگ کر اس کی خاموشی کو محسوس نہیں کیا۔ ان دونوں کے آنے سے پہلے عفت اور حدید کے درمیان ایک تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ تھوڑی بہت بات چیت رضوانہ نے ہی کی حدید سے۔ اس کے بعد وہ باہر چلا گیا تو واپس نہیں پلٹا۔ یہاں تک کہ سوہانے اس سے بہت دل چاہنے کے باوجود ناکام کی خیریت تک نہیں پوچھی۔

وہ جانتی تھی۔ حدید کے دل و دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ وہ سوچیں نہیں تھیں۔ ایک لاوا تھا۔ جو اس کے چھینٹنے پر پھٹ پڑتا۔ اور کچھ خبر نہیں تھی اس کے عزت اور بھرم کے ساتھ ساتھ کردار کو بھی جھلسا کر رکھ دیتا۔ اس نے خاموشی اور لا تعلقی میں ہی عافیت جانی۔ یہی بہتر تھا۔

ماہا اور سوہا کے آنے کے بعد ماحول بدل گیا۔ تینوں ہنسی مذاق کرنے کے ساتھ ساتھ ناشتا نکالنے لگیں۔ ماہا کا دل مستقل حسیب میں ہی انکا ہوا تھا۔

وہ جلد از جلد حدید اور مزہ آبی کی مشاورت سے حسیب کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں کروانے والی تھی۔ اس کے علاوہ اب اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔



”رات میں معراج آئے تھے۔ چچی جان کو دیکھنے۔“ ناشتے کے بعد جب تینوں چائے پینے کے لیے باہر کا ریڈور میں نکلیں تو عفت نے جھکی پلکوں سے انہیں بتا دینا مناسب خیال کیا۔ بعد میں اگر بات کھلتی تو شاید اس کا رنگ وہ نہیں رہتا۔ جو خود سے بتا دینے میں تھا۔

”اوہو۔ وہوہ۔ اچھا۔ پھر۔“ سوہانے شوخی سے عفت کو کہنی ماری۔ وہ ہنس دی۔ ماہا بھی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ۔ یہ۔ یہ ہو رہا ہے۔ ڈیٹس لگ رہی ہیں۔ بھئی۔ اور وہ بھی اسپتالوں میں۔“ سوہانے بات پر وہ سرخ پڑ گئی۔

”جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو عیادت کو آئے تھے پھر۔“ وہ رک گئی۔

”پھر کیا۔“ سوہانے لا پرواہی سے مک منہ سے لگایا۔ ان دونوں کے ہی گمان میں نہیں تھا کہ وہ اگلی بات کیا بتانے

والی ہے۔

”پھر مجھے اکیلا دیکھ کر یہیں رک گئے۔“ سوہانے جلدی سے مک یوں منہ سے ہٹایا کہ اسے اچھو لگتے لگتے بچا۔ ماہا کا بھی منہ کھل گیا۔ اور اتنی دیر تک کھلی آنکھوں اور منہ سے اسے دیکھتی رہی کہ سوہانے کو صفائیاں پیش کرتی عفت نے اس کے گال پر ایک پھٹر رسید کر دیا۔

”کیا ہو گیا۔ کیا دیکھ رہی ہو پانگلوں کی طرح۔“ بری طرح جھینپ رہی تھی۔

”سوہانے دیکھو اس کو۔ کتنے مزے سے کہہ رہی ہے۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے نا! اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ سوہانے کھلے دل سے اس بات کو قبول کر لیا۔

آتے جاتے لوگ، نرسز اور ڈاکٹرز کے ساتھ ساتھ دور کھڑے حدید نے بھی پلٹ کر انہیں دیکھا۔ پھر ان کی طرف چلا آیا۔

”تم لوگ باہر کیوں آگئیں۔“

”ڈاکٹر آئے ہوئے ہیں راونڈر تو ہمیں باہر آنا پڑا۔“

”میں پوچھ کر آتا ہوں۔ چھٹی کب تک مل جائے گی۔“ وہ ڈاکٹر کو دیکھتا آگے بڑھ گیا۔ ماہا کو اسے دیکھ کر ایک بار پھر حسیب کا خیال آیا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے سوہانے اور عفت کو وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔

”یا اللہ خیر! سر آج پھر یہاں۔ یقیناً“ ان کا کوئی قریبی شخص داخل ہے جب ہی روز چکر لگا رہے ہیں۔“

مغیث حسن بالکل اس کے نزدیک پہنچ چکے تھے وہ اس وقت آگے بڑھ کر ریسپشن کاؤنٹر تک آگئی تھی۔ جیسے ہی مغیث حسن وہاں تک پہنچے اس نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔

”و علیکم السلام۔“ ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ ماہانے جلدی سے اپنا تعارف کروایا۔

”سر میں آپ کے اسکول میں جا ب کرتی تھی۔ کیسپس فور میں۔“

”او اچھا اچھا۔“ وہ شفقت سے مسکرائے۔

”اور جس سال میں اپائنٹ ہوئی تھی۔ اسی سال مجھے ہسپتال پر فائمنس کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔“

”اوہ ویش گڈ۔ اب کہاں ہیں آپ۔“

”اب تو سر میری شادی ہو چکی ہے۔“ وہ ذرا جھینپ گئی۔

”یعنی ہم نے ایک قابل استانی کو کھو دیا۔“ وہ خوش گوار لہجے میں بولے۔ ماہا دھیرے سے ہنس دی۔

”سر آپ کے پاس تو میرے جیسے بے شمار نیچرز ہیں۔“ اس نے کسر نفسی سے کام لیا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ

کسی کے پکارنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔



”سربیشنٹ کو دیکھ لیں۔“ وہ شاید ان کا کوئی قریبی ملازم یا سیکریٹری وغیرہ تھا۔ ماہا مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ مغیث حسن سامنے بنے کمروں کی قطار میں سے ایک کی طرف بڑھ گئے۔



یہ وہی آنگن تھا جہاں اس نے زندگی کا پہلا قدم اٹھایا تھا۔ پہلا لفظ لبوں سے ادا کیا تھا۔ پہلی ہنسی، پہلی مسکراہٹ دکھائی تھی۔ پہلا آنسو بہایا تھا۔ اسے پہلی پہلی محبت کا لطف اور درد کا ملا جلا احساس اسی آنگن میں ہوا تھا۔

رخصتی کے سے ملن اور جدائی کے انوکھے سے کے حزن و خوشی میں لپٹے رنگ کا ذائقہ بھی اس نے پہلی بار یہیں چکھا۔ یہیں پہلی بار زندگی میں آنے والے پہلے مرد کی محبت تھی۔ پہلا اعتبار جو خون کے علاوہ کسی رشتے پر اس نے کیا۔ اور وہ پہلا اعتبار اسی شخص نے توڑا جو اپنی پہلی محبت کا دھوکا لے کر اسے اپنے سنگ لے کر گیا تھا۔

وہ کسی کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت نہیں تھی۔ وہ خود کسی کی پہلی محبت نہیں تھی۔ ہاں اس کی محبت جو پہلی تھی۔ اس سے ملنے والا غم ضرور اول اول کا تھا۔ اور جب یہ غم اس کے دل کا مکین بنا تو لگتا تھا۔ اس کا دل بند کر کے ہی چھوڑے گا۔ لیکن وہ بھول گئی تھی۔

ہریات، ہر واقعہ، ہر خوشی، ہر غم، پہلا تو ہو سکتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ آخری بھی ہو۔ خالی سونے گھر میں ایک اکیلی اس کی جان تھی۔ اور وہ بھی کہ اب کسی صورت آنسو نہیں بہانا چاہتی تھی۔

”رونے سے نہ مسئلے حل ہوتے ہیں نہ مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔“ ایک بار حسیب نے ہی اسے سمجھایا تھا۔ جن دنوں وہ نئی نئی پاکستان سے وہی گئی تھی۔ تو جتنی خوش تھی اتنی ہی خوف زدہ بھی۔ ذرا سی بات پر بری طرح گھبرا جاتی تھی۔ ظاہری بات تھی۔ جس نے کبھی کراچی سے باہر قدم نہ نکالا ہو یا گئی بھی ہو تو بیروں کے ساتھ چھوٹی عمر میں صرف سیرو تفریح کے لیے۔ اس کے لیے اتنی ترقی یافتہ ریاست میں تنہا چلے جانا۔ پھر وہیں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنا وہ بھی اپنے کسی گھر والے کے بغیر۔ کوئی مشکل سی مشکل تھی۔

اور اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے حسیب نے اپنی ساری طاقتیں اور توانائیاں محبتوں سمیت اس کے لیے وقف کر دی تھیں۔ ایسے ہی ایک دن جب ایک مال میں حسیب کے ساتھ شاپنگ کرنے کے لیے نکلی تھی تو حسیب سے ذرا سی دیر کے لیے ہچکڑ گئی تھی۔ اس نے ہونٹوں کی طرح اس باس مڑ کر گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ اور پھر بے حد چمکتی دکتی۔ شیشے کی دیواروں سے بھری اس مہکتی ہوئی دکان سے باہر نکلی تو اس کا چہرہ اس قدر سفید پڑ چکا تھا۔ کہ کوئی بھی اس کی شکل دیکھ کر پہچان سکتا تھا کہ وہ کس مشکل میں پڑ گئی ہے۔

اس نے سامنے لگی گرل سے نیچے جھانکا۔ وہ لوگ اس وقت ایک شاپنگ مال کے فرسٹ فلور پر ہی تھے۔ لیکن اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ساتویں آسمان سے بھی اوپر کہیں کھڑی ہے۔ ہر جگہ اجنبی چہرے اور ہر ادھر اجارے تھے۔ ہر چند کہ وہاں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد تھی۔ لیکن اسے نہ کوئی آواز آرہی تھی نہ کوئی زبان سمجھ آتی تھی۔ بس کچھ ہی دیر گزری کہ اس کے آنسو ابنا شروع ہو گئے۔

حالانکہ حسیب دس منٹ سے بھی کم وقت میں اسے ڈھونڈنا واپس پہنچ گیا تھا۔ ماہا اس وقت دھواں دھار آنسو بہاتی دو تین خواتین کے جھرمٹ میں کھڑی تھی اور اس قدر خوف زدہ تھی کہ اپنی جگہ سے ایک انچ سرکنے کو تیار نہیں تھی۔

حسیب کی آواز نے اسے آوازوں کے ہجوم میں سے ڈھونڈا وہ بے قراری سے اٹھی تھی۔ اور حسیب سے چمٹ



کر اسی وقت وہیں اتار دی تھی کہ اچھا خاصا تماشا ہی لگ گیا تھا۔ حبیب ہنس بھی رہا تھا اور پریشان بھی تھا۔ ابھی بھی اس کے لبوں پر ان لمحات کو سوچ کر ایک بھولی بھری مسکراہٹ آن رہی۔ وہ چند لمبے مسکراتی رہی۔ پھر جانے کیا بات یاد آئی کہ بے اختیار ہنس پڑی اپنی ہی ہنسی کی آواز اس کے لیے اجنبی سی تھی۔ وہ چونکی اپنے ارد گرد دیکھا۔ اور اس کے لب سکڑ گئے۔

”کہاں چلے گئے حبیب، کہاں ڈھونڈوں میں آپ کو۔“ صحن میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر گھٹنے موڑے

اس نے بازو پیٹے اور ان پر سر رکھ دیا۔ کوئی اداسی سی اداسی تھی۔ کوئی مایوسی سی مایوسی تھی۔

کیا ہے سفر وفا کی منزل کا  
نہ کوئی حل دلوں کی مشکل کا  
دھڑکن دھڑکن بکھری رہ جیشیں  
سانسیں سانسیں ٹوٹی بندشیں  
کہیں تو ہر لمحہ ہونٹوں پر فریاد ہے  
کسی کی دنیا چاہت میں برباد ہے  
یا رب دے دے کوئی جان بھی اگر  
دلبرہ ہو نہ دلبرہ ہو نہ کوئی اثر

لفظ کسی دکھ کی صورت گنگناتے ہوئے اس کے دل سے سماعتوں تک کا سفر کر رہے تھے تو تب ہی نیچے سے کچھ چل پھل کی سی آوازیں آئیں۔ پھر تائی اماں کی آواز وہ اسے نیچے بلارہی تھیں۔ وہ ڈھیلے ڈھالے! تہہ موں سے بیڑھیاں اتری اور سامنے والے کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی کرسیوں پر مزہ آپی براجمان تھیں۔

”آئی۔! آئی۔! اس کے گمان کی حدوں سے بھی کوسوں دور تھا۔ کہ وہ اس طرح بالکل اچانک اور وہ بھی بغیر اطلاع کے چلی آئیں۔

”ہاں میں۔ کیوں کیا ہوا۔“

”نہیں کچھ نہیں۔“

”کیا ہوا بہت ست لگ رہی ہو۔ لگتا ہے گہری نیند سے جگا دیا میں نے آکر۔“ ان کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔

”نہیں میں جاگ ہی رہی تھی۔“ وہ ان کا چہرہ نہیں دیکھ رہی تھی۔ بوکھلا کر اس نے بالوں میں اٹنے سیدھے ہاتھ مارے۔

”اچھا۔ لگتا تو نہیں۔“ وہ طنز پر طنز کیے گئیں۔ ماہا نے اپنی مدد کے لیے تائی اماں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ تایا ابا بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

”کیا لیں گی آپ! چائے تو نہیں پیئیں گی۔ آج گرمی بہت ہے میں۔ کولڈ ڈرنک منگواتی ہوں۔“ اسے آداب میزبانی کے بہانے سے ان کے سامنے سے اٹھنے کا موقع مل گیا۔

”نہیں یہاں اپنی خاطر میں کروانے نہیں آئی۔ اکلوتا بھائی لا پتا ہے میرا۔ میری تو بھوک پیاس نیندیں سب اڑ گئی ہیں۔ تمہیں ٹھنڈا گرم سوچہ رہا ہے۔“ ان کے تیوروں کی طرح آواز بھی بگڑی ہوئی اور بلند تھی۔

”میرا بھی آرام چین سکون سب ختم ہو گیا ہے آپ! میں خود بہت پریشان ہوں۔ مگر آپ پلیز کچھ خیال کریں۔ میرے تایا ابو بیمار آوی ہیں۔ انہیں حبیب کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔“ وہ حتی الامکان آواز سچی رکھ کر منمنائی تھی۔



”کیا بات ہے بہن! کیا ہو گیا۔ کس بات پر ناراضی ہے۔“ تائی اماں یقیناً ”معاذ بھانپ گئی تھیں۔ اس لیے کمرے میں آکر رسائیت سے پوچھنے لگیں۔

”یہ تو آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں۔ کس بات کی ناراضی تھی اس کی میرے بھائی سے جو اسے اس قدر تنگ کیا۔ اس قدر عاجز کیا۔“

”میرا حسیب سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔“ ماما نے دلی دلی آواز میں جانے کس کو صفائی پیش کی تھی۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ میں نے خود سنی تھیں آوازیں تمہاری جس دن تم میرے گھر سے واپس آئی ہو۔ حسیب تمہیں لے کر جانا چاہتا تھا۔ اس نے سب بتا دیا تھا۔ مجھے۔“

”بہن آپ بیٹھ کر آرام سے بات کریں۔“ تائی اماں نے ایک اور کوشش کی۔

”نہ مجھے بیٹھنا ہے۔ نہ آرام سے بات کرنی ہے۔“

ماما بے بسی سے دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ شدید بے بسی کا وہی احساس اسے لپٹنے لگا جو اس شاپنگ مال میں اسے گھیرے میں لے رہا تھا۔ اسے لگا وہ آج ابھی ابھی حسیب سے پچھڑی ہے۔ اور دنیا کے سب سے رحم لوگوں کے درمیان کھو گئی ہے۔ حسیب کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ نہ حالات کی سفاکی سے۔ نہ بے رحم الفاظ کے لپکتے چابک سے۔ وہ حسیب کو کبھی ڈھونڈ نہیں سکے گی۔ ایسی بھی کیا ضد سوار ہو گئی تھی اسے۔ کونسی ارچن آگئی تھی جو یہ اٹھری گھوڑی کی طرح قابو میں ہی نہ آئی۔

”بہت شوق ہے آپ کو سننے کا۔ کیا ضد تھی مجھے۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں سر اٹھایا۔

”تو سن لیں کان کھول کر۔ ہاں میں نے جھگڑا کیا تھا۔ آپ کے بھائی سے۔ ہاں ہاں۔ میں نے بد زبانی کی تھی۔ میں نے انہیں دھتکار دیا تھا۔“ تائی اماں۔ عفت اور مزہ آلی رک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”کیونکہ آپ کا بھائی کنوارا نہیں ایک بچے کا باپ تھا۔ اور اس نے یہ بات مجھ سے چھپائی تھی۔ جو اتفاق سے مجھے پتا چلی۔ لیکن میں مان گئی تھی۔ خدا گواہ ہے۔ میں ان کے ساتھ جانے کو رضامند ہو گئی تھی۔ لیکن میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس عورت سے آپ کے بھائی کے تعلقات برداشت کرتی۔ جو آپ کے بھائی کے ناجائز بچے کی ماں ہے۔“

عفت کا منہ کھل گیا۔ تائی اماں کی آنکھیں ابل آئیں۔ عفت کے ہاتھ ڈھیلے ہو کر پہلوؤں میں لٹک گئے۔ اور مزہ کے چہرے پر مرگ کی سی سفیدی چھا گئی۔

”کیا بکواس کر رہی ہے لڑکی۔ جو منہ میں آ رہا ہے بولے جارہی ہے۔“ اب کے وہ بولیں تو ان کی آواز ایسی کھوکھلی تھی۔ جیسے کوئی خالی تنے میں منہ ڈال کر بھونپو بجانے کی کوشش کرے۔ پھٹا ہوا اور بیٹھا ہوا بھونپو۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ اس نے بے دردی سے اپنے گالوں پر بہتے آنسو گڑا لے۔

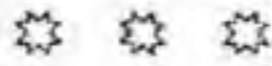
”یقین نہیں آتا تو اس عورت کو فون کریں اور پوچھیں کہ وہ حسیب کے فلیٹ میں کیا کر رہی ہے اتنے دن سے۔“ عفت اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہٹی تھی۔ اس نے صرف گردن گھما کر بولتی ہوئی ماما اور پھر پھٹی ہوئی آنکھیں لیے مزہ کو دیکھا۔

”ہاں یہ سچ ہے۔“ وہ چلائی اور زور سے بلک پڑی۔

”آپ اس اذیت سے نہیں گزریں جس سے میں گزر رہی ہوں۔ آپ تو کچھ بھی نہیں جانتیں۔“ وہ سینے میں منہ چھپائے بری طرح سک رہی تھی۔ عفت بھی قریب آکر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اسے پچکارنے لگی۔ مزہ سر جھکا کر باہر نکل گئیں۔



کچھ دیر پہلے وہ اپنی نیند بھوک اور پیاس اڑنے کا ذکر زور شور سے کر رہی تھیں۔ نیند اڑنا بھوک پیاس مرجانا اور شرم و اذیت کے گڑھے میں اترنا کیسے کہتے ہیں۔ یہ انہیں اب معلوم ہوا تھا۔



حدید کے علاوہ اس وقت اور کوئی مرد اسپتال کے چکر لگانے کے لیے دستیاب نہیں تھا۔ ماہا کی فون پر روٹی روٹی آواز سن کر وہ چونک گیا۔

”کیا بات ہے۔ تم رو رہی ہو۔“ ماہا کے گلے میں پھندے سے لگنے لگے۔

”نہیں بس آپ مجھے لے چلیں امی کے پاس۔“

”اوکے! آؤں سے آؤں گا تو لے چلوں گا۔“ انداز بتا رہے تھے کہ کوئی بات ہے ضرور لیکن اگر وہ نہیں بتاتا چاہتی تھی تو پھر حدید نے بھی اصرار نہیں کیا۔

مغرب کے بعد اس نے نماز ادا کر کے دیر تک امی کی صحت یابی اور اپنی قسمت کی بگڑی لکیوں کی درستی کی دعا مانگی۔ بندے اور دعا کا رشتہ دنیا کا سب سے خاص رشتہ ہے۔ یہ رشتہ انوکھا بھی ہے۔ سب سے مضبوط بھی اور سب سے سچا بھی۔ بندہ جب بھی دعا مانگے دل سے مانگے یا نہ مانگے لیکن جھوٹے منہ کبھی نہیں مانگتا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا دل نہ چاہے اور وہ پھر بھی دعا کرے یا اللہ فلاں بندے کا بھلا کر۔

یہی رشتہ ہے جو ازل سے ابد تک قائم ہے۔ یہی رشتہ ہے جو ربط ہے خالق اور مخلوق کے درمیان بندے اور بندہ نواز کے مابین یہ وہ رشتہ ہے جس کا رنگ کائنات کی کسی اور شے سے نہیں ملتا۔ جس کی خوشبو دنیا کے کسی پھول سے لیے گئے رس سے نہیں بن سکتی۔ اور اس کا ذائقہ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے اس رشتے کو کبھی آزمانے کی کوشش نہ کی ہو۔ کیونکہ یہ دنیا کا بلکہ ماروائے دنیا بھی وہ واحد اور اکیلا رشتہ بھی ہے۔ جو انسان سے اس کی پیدائش کے ساتھ جڑتا ہے اور پھر کبھی ٹوٹا نہیں۔

اللہ اور اس کے بندے کے درمیان دعا کا رشتہ وہ واحد رشتہ ہے۔ جو انسان کبھی نہیں توڑتا۔ موت کے بعد بھی نہیں توڑنا چاہتا۔ کوئی لاکھ اللہ سے ناراض ہو لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں اس کے لبوں سے اللہ کی یاد اور اس کی بات ضرور نکلتی ہے۔

بندہ لا شعوری طور پر ہی خدا سے فریاد کرتا رہتا ہے۔ اور شکوہ کناں بھی ہوتا ہے۔

اس نے بھی جائے نماز رکھ کر اپنے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ ازلی سکون دل میں اترتا محسوس کیا۔ جو خدا کے راز و نیاز کے بعد انسان کی رگ و پے میں اتر کر اسے شانت کر دیتا ہے۔

”حدید بھائی آئے ہیں یا ہریائیک پر تمہیں بلا رہے ہیں اسپتال جانے کے لیے۔“ تھوڑی دیر بعد جب وہ منہ ہاتھ دھو کر تقریباً تیار ہی تھی۔ تب عفت نے اندر آ کر اسے بتایا۔

”تم چچی کو بتاؤ گی مزہ آپی کے بارے میں۔“ اپنا بیگ اٹھا کر اس میں چیزیں رکھتی ماہا کا ہاتھ رک گیا۔ پھر اس نے عفت کو دکھا۔

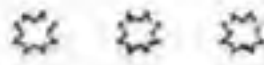
”تم کیا کہتی ہو۔“

”میرا نہیں خیال کہ تمہارا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ اور اگر ہے۔ تو بہت غلط“ ماہا نے سر ہلایا اور بیگ کندھے پر ڈال لیا۔ پھر اپنی بھرتی موقوف کر کے قدم قدم چلتی عفت تک آئی۔ عفت جو کسی اور دھیان میں گم تھی۔ اسے یوں اپنے پیاس رکتے دیکھ کر چونکی۔ ماہا نے اس کے کندھے تھام کر آنکھوں میں جھانکا۔



”زندگی کے سفر میں ہم جس پڑاؤ کو منزل سمجھ لیتے ہیں۔ جب ہم پر منکشف ہو جائے کہ یہ ہماری منزل نہیں۔ تو سفر جاری رکھتے ہوئے پڑاؤ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہیے۔  
کیونکہ وقتی پڑاؤ چاہے کتنا ہی سرسبز شجر کیوں نہ ہو۔ بہر حال وہ وقتی ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے آگے سفر جاری رکھنے کو ترجیح دی۔

وہ مسکرائی۔ دونوں ہاتھوں سے عفت کے گال سہلائے اور اور پھر تیزی سے اللہ حافظ کہتی باہر نکلی۔ جاتے جاتے تائی اماں کو سلام کیا۔ جو اس کی شام والی باتوں پر ابھی تک دکھ اور گہرے غم کے حصار میں تھیں۔ قریب جا کر جلدی سے مگر نرمی سے ان کے شانے دبائے۔  
انہوں نے گہری سانس بھر کر اس کے ہاتھوں کو اپنے بوڑھے ہاتھوں سے تھکی دی۔ وہ باہر نکل کر حدید کے پیچھے بیٹھ گئی۔



سوہا کے سامنے اس نے خود پر ضبط کے کڑے پہرے بیٹھائے لیکن ماں کے سینے سے لگتے ہی کتنے بہت سے آنسو ان کے کمزور سینے میں جذب ہوتے چلے گئے۔ رضوانہ بھی دیر تک اسے خود سے چمٹاتے اپنی ممتا کی پیاس بجھاتی رہیں۔ انہیں اولاد نرینہ کی بہت آرزو رہی تھی۔

اپنے شوہر کی زندگی میں۔ وہ ہمیشہ اپنی مجازی خدا کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرتی تھیں کہ ان کا ایک بیٹا بھی ہونا چاہیے لیکن ان کے انتقال کے بعد جب خواہش نے حسرت کا روپ دھارا تو اس حسرت کو دل کے کسی بے حد پوشیدہ کونے میں دفن کر کے اپنی ساری ممتا ان ننھی نازک بریوں پر بچھا کر دی۔  
ان کی زندگی کا محور و مرکز یہی بیٹیاں بن گئیں پھر ان کے دل سے کبھی اپنے لیے دعا نہیں نکلی۔ سوائے ان بیٹیوں کے نصیب کے انہوں نے باری تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگا۔

”کیا بات ہے۔ آج میری بیٹی۔ بہت اداس ہے۔ کیا حسیب کی یاد آرہی ہے۔ جسے ماں کی آڑ میں چھپایا جا رہا ہے۔“ وہ بنا جواب دیے سینے میں منہ چھپائے پڑی رہی۔

اب ان سے کیا کہتی۔ اسے لگا کہنے سننے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ یا پھر اتنا کچھ ہے کہ لفظوں میں سمیٹا جا نہیں سکتا۔

سوہا البتہ بہت غور سے سنجیدہ چہرہ لیے اسے دیکھتی رہی۔ ماہا کا اس طرح چلے آنا جبکہ ڈاکٹر آج رات ہی ڈس چارج کرنے کو کہہ رہے تھے۔ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی جا کر بات کی تھی۔ پھر امی سے یوں لپٹنا اور آنسو بہانا۔ وہ حدید کو امی کے ساتھ مصروف پاتے ہی ماہا کو لے کر باہر نکلی۔  
”کیا ہوا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“

”مزہ آئی آئی تھیں۔“ اس نے بتانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اسے فیصلہ کرنے اور نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ سوہا کو کوئی بات بتانے یا چھپانے کا فیصلہ کر رہی ہے۔ اسے جلد یا بدیر بات اسے بتانا ہی ہوتی تھی۔ کیونکہ ماں کے بعد وہی اس کی سب سے قریبی رازدار تھی۔ وہ اس سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کرتی تھی۔ سوہانہ صرف تسلی سے سن لیتی تھی بلکہ کبھی اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق مشورہ بھی دے دیتی تھی۔

بہنوں کا رشتہ تو اللہ نے بنایا ہے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ہے۔ بہنوں کو کوئی بات بری لگے تو وہ ناراضی کا اظہار بھی کر دیتی ہیں۔ عمر کا فرق زیادہ ہو تو چھوٹیوں کو ڈانٹ بھی پلا دیتی ہیں۔ بہنوں کے بچ بولنے پر جھڑکتی بھی ہیں۔



اور پھر اپنے آگے رکھی پلیٹ کا کھانا ان کو دے دیتی ہیں۔ ماں جاتی کو اگر ماں کا دوسرا روپ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس نے بھی سب سے پہلے بہن کے سامنے اپنا دل کھولا۔

”تو پھر کیا ہوا۔ کچھ کہہ رہی تھیں۔“  
 ”جو باتیں فون پر کرتی تھیں وہی کر رہی تھیں کہ مجھے اپنے شوہر کی گمشدگی کی کوئی فکر نہیں اور میں پتا نہیں کیا نیندیں پوری کر رہی ہوں اور۔ پتا نہیں کیا کیا۔“  
 ”تم نے کیا جواب دیا۔“ ماں کی نظریں پہلی بار اٹھ کر سوہا سے ملیں۔

”میں نے انہیں جو بھی جواب دیا ہے۔ اب انہیں مجھ سے سوال کرنے سے پہلے سوچنا پڑے گا۔“ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں۔ سوہا نے اس سے دوبارہ نہیں پوچھا بلکہ نظریں ہٹا کر داہنی طرف دور بننے کاؤنٹر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”بہت اچھا کیا۔ کچھ لوگوں کو شرافت کی زبان سمجھ نہیں آتی۔“  
 ”وہ جو صاحب کھڑے ہیں نا!“ رمیہیشن پر۔ ”اس نے سوہا کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے موضوع بدل دیا۔“

”میرے اسکول کے اوزر تھے نا! مغیث حسن۔ ان کا لی اے ہے۔“  
 ”اچھا!“ سوہا نے سرسری سا غور کرنے کے بعد اس کی طرف رخ موڑا۔  
 ”مغیث سر بہت ہمدرد انسان ہیں۔ بہت دریا دل۔ جتنا ان کے پاس پیسہ ہے نا! اسی حساب سے خرچ کرتے ہیں خدا کی راہ میں۔ کبھی کسی ضرورت مند کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔“ وہ چند لمحے مزید ان کی تعریف کرتی رہی۔ پھر سوہا سے بولی۔

”کل میں اور حدید بھائی جائیں گے تھانے۔“ وہ ناخن کھینچ رہی تھی۔ سوہا نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر سرسراہٹ لٹکان کے پیچھے اڑی۔ اور اسی پیار بھرے لہجے میں بولی۔  
 ”تم فکر مند مت ہو ماں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اسے اپنی بہن کی پریشانی کا احساس تھا۔ لیکن وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سوائے زبانی کاامی تسلی دینے کے۔ اب یہ جو پولیس تھانے کے چکر کل سے شروع ہونے والا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ بظاہر اس سے اتنے حوصلے سے بات کرنے والی ماں۔ حقیقت میں اندر سے اس سے بھی زیادہ گھبرا رہی ہوگی۔

وہ بھلا کب گئی تھی زندگی میں تھانے والے۔ وہ تو اسپتال میں بھی شاید اپنی پوری زندگی میں دوسری بار ہی رک رہی تھی۔ ماں نے گہری سانس لی۔ اور تھکے تھکے انداز میں بیچ سے اٹھی۔

اس کا ہر عمل اس کی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ اور بوجھل اعصاب کا غماز تھا۔ وہ چاہے اظہار بے شک نہ کرتی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ بے حد تھک چکی تھی۔ جب سے حسیب کے شادی شدہ ہونے کا انکشاف ہوا تھا تب سے اب تک اس کی ازدواجی زندگی بے حد لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔

وہ ایک ایسی کشتی میں سوار تھی۔ جس میں کوئی سانول نہ تھا۔ وہ حادثات کے منجد ہار میں اپنی ناؤ کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے تن تنہا ہی لڑ رہی تھی۔ اور اتنی ہی اناڑی بھی تھی۔ اور اتنی ہی گہرائی میں بھی۔ نہ اپنی ناؤ واپس موڑ سکتی تھی۔ نہ مہارت سے کھیلنا جانتی تھی۔ بس وقت کی کروٹوں میں دب جانے والے لمحات کھیچتی اور کبھی پشت پر رہ جانے والے وقت کی یادیں بچاتی جاتی رہی تھی۔



وہ بہت دیر سے اپنی بیگم کی بے چینی اور مضطرب کیفیات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ کبھی پاس آکر بیٹھ جاتیں۔ چند لمحے پہلو بدلتیں پھر پنا کچھ بولے اٹھ کر چلی جاتیں۔ کبھی بے مقصد آگے پیچھے شہلقتیں۔ اس پاس کی چیزیں درست کرتیں۔ پھر گناڑتیں۔ پھر درست کرتیں۔

وہ بہت صبر اور تحمل سے ان کی حرکات و سکنات پر غور کرتے ہوئے اس بات کے انتظار میں تھے کہ اپنی اندر کی سوچوں کے گھمسان سے تنگ آکر وہ خود ہی بول پڑیں گی۔ یہ بات بھی ان کے علم میں تھی کہ پچھلے چند دنوں میں ان کے اکلوتے سارے حسیب کی اچانک گمشدگی نے نہ صرف بیگم بلکہ گھر پر بھی اثر ڈالا تھا۔ نہ صرف گھر بلکہ بہت برا بھی۔

وہ خود ایک بے حد زمانہ اور موقع شناس آدمی تھے۔ ان کی اور مزہ کی ساہا سال کی بھرپور خوشیوں، بھری رفاقت میں جہاں مزہ کی وفا اور سلیقہ شعاری کی اپنی جگہ تھی۔ وہیں ان کی مزاج کی نرمی اور صلح جو طبیعت کا بھی بہت ہاتھ تھا۔

مزہ نے اپنی ذات اور زندگی سے جڑی ہر خوشی اگر ان کے ساتھ بانٹی تھی۔ تو زندگی کی طرف سے ملنے والے ہر غم پر آنسو بھی صرف ان کے سامنے بہائے تھے۔ ان کی زندگی لاجواب تھی۔ ان کی جوڑی مثالی تھی۔ ان کی ذہنی ہم آہنگی مکمل تھی۔ ان کی رفاقت بھرپور تھی۔ اسی کا اعتماد اور سہارا لے کر وہ مزہ کی طرف سے بات شروع کرنے کے منتظر تھے۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

رات کے کھانے اور نماز کے فارغ ہو کر بہت دیر تک اللہ کے حضور گڑ گڑانے اور آنسو بہانے کے بعد اپنا چہرہ صاف کر کے وہ دودھ کا گلاس لے کر ان کے پاس آئیں تو نہ صرف خاصی حد تک کمپوزڈ تھیں۔ بلکہ ایک طرح سے کچھ پر سکون بھی لگ رہی تھیں۔

”آج میں گئی تھی ماہا کے گھر۔“ انہوں نے دودھ کا گلاس ان کی طرف بڑھایا۔ اور خود گھوم کر دوسری طرف بیڈ پر آ بیٹھیں۔

”یہ تو آپ نے صبح بھی بتایا تھا مجھے کہ آپ کا ارادہ وہاں جانے کا ہے۔ لیکن اس کی وجہ آپ نے صبح بھی نہیں بتائی تھی۔“

”میں اس کے پاس صرف اور صرف حسیب کی وجہ سے ہی جاسکتی ہوں۔“ حسب توقع اپنی سوچ سے باہر آکر انہیں چیز نے میں دیر نہیں لگی۔

”لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کو وہاں جانے کی ضرورت کیوں پڑی۔ جبکہ وہ بارہا آپ کو بتا چکی تھی کہ اسے حسیب کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ اور اس کا کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔“

”وہ تو۔“ وہ تیزی سے بولنے لگیں۔ پھر بے ساختہ لب بھینچ لیے۔

”میں۔ میں۔ آپ کو بتانا چاہتی ہوں لیکن ہمت نہیں پڑتی۔“

”کیا بات کہی ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔ کچھ تو بتاؤ۔“

”میں اصل میں اسے دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ میں نے اس سے دو چار نامناسب باتیں کہہ دی تھیں۔“

بدلے میں اس نے ایسی بات بولی کہ میں میرا صبر و قرار سب کٹ گیا۔ ”ان کی آواز بھرا گئی۔ گلا رندھ گیا۔“ اس نے کہا کہ حسیب کنوارہ نہیں بلکہ ایک بچے کا باپ ہے اور بچہ۔ بھی۔ نا جائز۔ ”وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ صادق صاحب کے گلے میں پھند الگ گیا۔ انہیں زور کی کھانسی آئی اور دودھ چھلک گیا۔

[[بندہ کرن 25 اکتوبر 2015]]



مرزہ اسبہ قاعدہ رونے لگی تھیں۔

بھرائی ہوئی آواز اور رکے رکے الفاظ میں وہ مستقل ماہا کو ہی برا بھلا کہے جا رہی تھیں۔ جس نے ان کے معصوم بھائی پر اتنا گھناؤنا الزام لگایا تھا۔ صادق صاحب اپنی بیگم کو زندگی میں پہلی بار ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوتا دیکھ رہے تھے۔

گوکہ وہ مستقل ”میرا بھائی ایسا نہیں ہے اور وہ ایسا نہیں کر سکتا“ کے الفاظ دہرا رہی تھیں۔ لیکن شاید وہ خود ہی کہیں اس یقین میں بڑنے والی درازیں دیکھ رہی تھیں۔ انہیں ماہا کی بات کا ذرہ برابر یقین نہیں تھا۔ وہ اسے جھٹلا رہی تھیں، لیکن کھوکھلے پن سے۔

مرزہ کے برخلاف صادق صاحب کو ماہا کی کسی گئی بات پر فوراً ہی یقین آ گیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کا سالا اور اکلوتا سالا کوئی کردار کا کیا شخص تھا۔ بلکہ ایک حد تک اگر دیکھا جاتا تو اس نے زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے جو جدوجہد کی تھی۔ اس پر انہیں خیر ہی محسوس ہوتا تھا، لیکن جس زمانے کی اور جس ماحول کی یہ بات کی گئی تھی اس میں اس کا بہک جانا، مستقل کام اپنوں سے دوری اور جانوروں کی طرح بے فیض ٹھکن سے مدھال ہو کر کچھ دیر کے لیے کسی چھاؤں میں سستالینے کا عمل اتنا بھی انوکھا یا نرالا نہیں تھا۔

وہ یقیناً ”بعد میں“ سب بھول گیا ہو گا۔ لیکن لہجوں کی لغزش یوں اسی کی زندگی پر محیط ہو کر اسے اپنوں اور غیروں کے سامنے رو لے گی، یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔ صرف چند منٹوں کے دوران ہی میں وہ حقیقت اور گمان کا گوسوں لہسا سفر کر کے واپس لوٹے تھے۔ باہر مرزہ ان کی منتظر تھیں اور انہیں ان سے کچھ تو کہنا ہی تھا۔



سوا اٹھ کر اندرائی کے پاس چلی گئی اور حدید بھی ڈاکٹرز کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تب ہی کتنی ہی دیر خالی پن سے وہیں بیٹھی اپنے ہاتھوں کی لکیریں کھوجتی رہی۔ ان آڑی ترچھی لکیروں میں شاید کہیں اس کی زندگی کی وہ خوشیاں چھپی تھیں جو اس سے روٹھ گئی تھیں یا شاید ابھی ان میں مزید آنا کشیں چھپی بیٹھی تھیں۔ حسیب کی گمشدگی کی مشکل جیسی کچھ اور۔ دل کو مردہ کر دینے والی۔ لایعنی سوجوں میں گھرے ایک سے دوسرے سمت تک کا سفر کرتے وہ جانے کتنی دور نکل گئی تھی۔ اپنے آس پاس کے ماحول سے بالکل دور اور بے خبر۔

اس وقت کوریڈور میں اچانک ہی ایک ہنگامہ جاگ اٹھا۔ نرسز وارڈ بوائے اور ان کے ساتھ مغیث حسن کی سیکرٹری کو اس نے تیز قدموں سے ایک کمرے کی جانب بڑھتے دیکھا۔

”سرہوش میں آتے ہی سانس اکھڑنے سی لگی تھی۔“

”فورا“ آئی سی یو میں لے کر جایے کو ٹیکس۔“ ڈاکٹرز کی پیشہ ورانہ آواز اور وہاں مچی ہانپل نے وقتی طور پر ماہا کو کسی گہری سوچ سے باہر نکالا تو وہ ایک دم سہمی گئی۔

”الٹی خیر۔ ہا نہیں کس کی زندگی داؤ پر لگی ہے۔“ وہ گھبرا کر تیزی سے اٹھی اور ای کے پاس جانے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ وہ مر کر بھی یہ بات نہیں سوچ سکتی تھی کہ داؤ پر لگنے والی زندگی کسی اور کی نہیں اس کی اپنی ہے۔ اسے اندر آتے دیکھ کر سوا جو امی کے پاس بیٹھی اٹھ کر کہنے لگی۔

”کینٹین سے چائے ہی لے آؤ۔ سوکھے منہ بیٹھا نہیں جا رہا۔“

”بھی لاتی ہوں۔ باہر ذرا کوئی ایمر جنسی ہے۔“ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ چند لمحوں کی مشترک نسبت اب ذرا سکون تھا۔ وہ باہر نکل کر مست قدموں سے چلتی کینٹین کی سمت بڑھنے لگی۔ کینٹین میں ڈسپوزا بل گلاس ختم ہو چکے تھے۔ اس نے مجبوراً ”وہیں کے چینی کے کپوں میں چائے لی اور تھوڑی دیر میں واپس کرنے کا کہہ کر ہاتھوں



میں تھا۔ سواپس آئی تو کوریڈور کے آغاز پر ہی حدید مل گیا۔  
 ”کہاں چلے گئے تھے آپ۔ میں چائے لینے گئی تھی تو سوچا آپ کے لیے بھی لے لوں، مگر آپ نظر ہی نہیں آئے۔“ حدید اس کی بات کے جواب میں پھلکے پن سے مسکرا دیا۔ ماہا نے اس کے برابر میں چلتے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا بات ہے، بڑے چپ چاپ سے ہیں۔“  
 ”میں چپ چاپ ہوں، نہیں تو ہاں لیکن تم۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ دوسرے سرے سے کسی مریض کو دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ غالباً ”انتہائی نگہداشت میں۔“ حدید جگہ کم ہونے کے باعث تیزی سے آگے نکل گیا۔ حدید چند قدم آگے جا کر رک گیا اور ہٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ نظروں کے تصادم پر وہ ذرا سا مسکرائی اور بالکل برابر سے گزرتے اسٹریچر پر نظر ڈالی۔ ایک بے حد سرسری نظر، لمحے سے بھی کم وقت کی، اچھٹی ہوئی بے معنی۔ اور کبھی کبھی ایک نظر ہماری زندگی بھر کی بصارتوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ لمحے بھر کا منظر پوری زندگی کی فلم کو کرپٹ کر دیتا ہے اور کبھی کبھی چلتی پھرتی زندگی محض ایک بل میں فالج زدہ ہو کر وہیں ٹھہر جاتی ہے، جہاں وہ بھاری لمحہ زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ بھاری لمحہ جو جیتی خوشیوں کے تمام وقتوں کو اپنے وزنی پیر تلے کچل دیتا ہے اور بڑے بڑے دکھ اس کے آگے ہیچ نظر آتے ہیں۔

اس کی زندگی میں بھی وہ لمحہ بے حد آہستگی سے داخل ہوا اور اس کی شہ رگ پر اپنا پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چلتے چلتے ٹھہری۔ پھر ساکت ہوئی۔ پھر بت بنی اور بالا خرے بے جان۔ ابھی ابھی اس نے اپنے بالکل برابر سے جس شخص کو بے حس و حرکت دوسروں کے سہارے پیوں لگے بستر پر جاتے دیکھا تھا۔ جسے وہ اجنبی سمجھ رہی تھی۔ وہ اجنبی نہیں تھا۔ اس کی پوری زندگی کا عنوان تھا۔ اس کے بے جان ہاتھوں سے لبالب بھرے کپ چھوئے اور ایک چھناکے کی زوردار آواز کے ساتھ ٹکڑوں کی صورت میں زمین پر بکھر گئے۔ شاید اس کے اپنے وجود کی طرح۔ اس نے فقط چند لمحے اسٹریچر کو خود سے دھار جاتے دیکھا اور حدید نے اس کو ساکت ہو کر دوبارہ جنبش کرتے کسی شناسنام کی صورت ایک چیخ اس کے حلق سے نکل اور دوسرے بل وہ بھاگتی ہوئی جا کر اس بے سدھ وجود سے لپٹ گئی۔

”حسبِ حسیب!“ وہ نہیں رہی تھی۔ وہ ایک بار کے بعد دوبارہ چیخی بھی نہیں۔  
 اسٹریچر دھکیلتی نرس اور دوسرے لوگ رک کر اس نیمپانگل عورت نما لڑکی کو تعجب سے دیکھنے لگے۔ جو آکسیجن ماسک میں چھپے چہرے اور فلکیوں میں جکڑے ہاتھ پیروں کو بری طرح جھنجھوڑتی شاید اسے جگانے یا ہوش دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

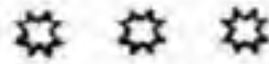
حدید بدحواس سا بھاگ کر آیا اور سارا معاملہ ایک نظر میں سمجھ گیا۔ ڈاکٹر زاب اسے سنبھالنے کی سعی کر رہے تھے۔ حدید نے اسے شانوں سے تھاما۔ گوکہ اس قدر اچانک اور اس قدر شدید ذہنی دھچکا جو حسیب کو وہاں اس حال میں دیکھ کر اسے پہنچا تھا۔ اس سے خود کو فوری طور پر باہر نکال پاتا۔ نہ صرف خود کو بلکہ حواس کھوئی ماہا کو سنبھالنا اتنا آسان نہ تھا۔ مگر یہی انسانی فطرت ہے اور یہی زندگی ہے۔ ماہا نے بے حد تڑپ کر اپنے شانے پر جسے حدید کے ہاتھ جھٹکے اس وقت وہ بالکل جلال میں آئی کسی مست انگ کی مانند لگ رہی تھی۔

”پلیز۔ پلیز۔ ان کو سنبھالیں۔“ ہشٹ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ ایک نرس نے وہیں رک کر التجا آمیز انداز میں حدید سے کہا اور ماہا کو تھاما۔

”ریلیکس لی لی! ریلیکس۔“ اس نے تڑپ کر اپنے بانوؤں سے ٹکٹی ماہا کو دیکھا۔ جواب دہر جاتے حسیب کے بیڈ کو دیکھتی چیخنے لگی تھی۔



”ہٹو۔۔۔ جانے دو مجھے۔“  
 ”پلیز! نہیں سنبھالیں۔“ ایک ڈاکٹر کی پکار پر اس نے ماہا کو چھوڑا۔ حدید سے کہا اور دوڑتی ہوئی دوڑ چلی گئی۔  
 حدید نے فوراً ”آگے لپکتی ماہا کو دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا۔ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی، ماہا تھک کر ناکام ہو کر  
 رک گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی زمین پر ڈھلے گئی۔ اسے بازوؤں سے تھامے اس کے ساتھ بیٹھتا ہوا حدید بے  
 بسی کی انتہا پر پہنچ کر اپنے آنسو پیئے لگا۔



رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کمرے میں مکمل اندھیرے کی وجہ سے آدھی سے زیادہ بیت جانے کا  
 گمان ہو رہا تھا۔ منزلہ کا ہموار شخص گہری نیند میں جانے کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ پوری طرح تسلی کرنے کے بعد  
 کمرے سے باہر آئے اور دھیرے سے دروازہ بند کرتے ہوئے جیب میں تھر تھراتے موبائل کو کچھ کوفت کے ساتھ  
 باہر نکالا۔ ان کے موبائل پر مسلسل کسی کی کال آرہی تھی، لیکن منزلہ کی خراب حالت کے پیش نظر انہوں نے ان  
 کے سامنے کوئی بھی کال اینڈ کرنے سے پرہیز ہی کیا تھا۔ خود منزلہ کا اپنا موبائل انہوں نے کافی دیر ہوئی آف کر دیا  
 تھا۔ ورنہ جس قدر بکھری ہوئی مبالغہ کیفیت میں منزلہ چلی گئی تھیں ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ پھر سے ماہا کو کال کریں یا  
 اس سے منسلک کسی بھی شخص کو فون کر کے کچھ بھی کہنا شروع کر دیں۔ اسکرین پر چمکتے ان جانے نمبر سے۔ ان کا  
 دل بھی انجانے انداز میں دھڑک اٹھا۔ دل ہی دل میں ”یا کریم“ کا ورد کرتے ہوئے انہوں نے فون کان سے لگایا۔  
 ”اسلام علیکم! میں حدید بات کر رہا ہوں۔ آپ مجھے پہچانے۔“ آواز اور انداز انوس ساتھ لیکن۔  
 ”آپ حسیب کے۔“

”جی میں حسیب کا دوست بھی ہوں اور ماہا کے سنوئی انس کا بھائی بھی۔“ اس کی آواز ٹھہری ہوئی اور لہجہ بہت  
 ہموار تھا۔ پھر بھی اس نے تعارف کی غیر ضروری تفصیل شاید خود کو سنبھالنے کے لیے استعمال کی تھی۔  
 ”جی جی۔ فرمائیے۔“ دوسری جانب اس نے ایک گہری سانس لی اور آنکھوں کو زور سے بند کر کے کھولا۔  
 ”حسیب کا پتا چل گیا ہے۔“

”جی۔ کیا۔ کب۔ وہ ٹھیک ہے۔“ ایک پل میں ان کے دل پر کیا کیا نہیں گزر گیا۔ امید۔ خدشہ۔  
 قیامت۔ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو کسی بھی قسم کی بری خبر کے لیے تیار کر لیا۔ لیکن دوسری جانب جو  
 کچھ حدید نے بتایا۔ انہیں سمجھ نہیں آیا کہ وہ نہیں یا وہ ہیں۔ خدا سے شکوہ کریں یا شکر ادا کریں۔  
 ”فی الحال وہ کوئے میں ہے۔“

”ادائی گاؤ۔“ وہ ڈیلے ڈھالے انداز میں صوفے پر گر گئے۔

”منزلہ کی حالت بہت خراب ہے۔ بہت ڈسٹرب ہے۔“

”جی۔“ حدید نے ایک نظر سوہا کے بازوؤں میں بے حال ہوتی ماہا پر ڈالی۔

”اور وہ بچی ماہا۔ وہ کیسی ہے؟“ اسے بتادیا۔ ”نہیں بالآخر ماہا کا خیال آئی گیا تھا۔“

”وہ بھی۔ ڈسٹرب ہے۔“

”اسے بتادیا تم نے۔“

(باقی آئندہ)



# یارِ الٹی

”ارے سنا ہے جمال نے شمن کو طلاق دے دی ہے۔“ عمرانہ نے پاس بیٹھی فرحت کو بتایا تو وہ یہ سن کر اچھل پڑی۔

”ہیں کیا طلاق دے دی، لیکن کیوں؟“ فرحت نے جواباً آنکھیں پھاڑے پوچھا تھا۔

”اندر کی بات ہم کیا جانتے ہیں۔ جو سنا من و عن تمہیں سنا دیا۔“

”چلو۔ اچھا کیا اندر کی بات بھی پتا چل ہی جائے گی، لیکن یقین نہیں آتا۔“ وہ ابھی بھی بے یقینی کی حالت میں تھی۔

”لیسین بھی آجائے گا۔“ عمرانہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ فرحت محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”اچھا چائے پیو گی۔“ عمرانہ نے اس سے پوچھا اور کچن کی جانب جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔



”بس فرحت بہن کیا بتاؤں نصیب مارے ہوں تو بندے کا کیا قصور۔“ اماں نے اک سرد آہ بھری اور پھر بولیں۔

”کم بخت نشہ کرتا تھا۔ نہ کام کا نہ کالج کا، الناشن کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ بس یہی وجہ تھی بہن (اماں بچ چھپا گئی تھیں۔ آخر بچ بولتیں تو بدنامی اپنی ہی ہوتی نا۔)“ اماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا جبکہ پیچھے دروازے پر کھڑی شمن اماں کی اس اداکاری پر داد دیتی رہ گئی تھی۔

”واہ اماں تو بھی کیا کمال کی اداکارہ ہے۔“ وہ ہولے سے بربرائی اور پھر ایک عجیب سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے واپس کمرے کی جانب مڑ گئی۔

”لیکن بہن یہ تو لومینج تھی نا۔“ عمرانہ بھلا کیسے پیچھے رہتی۔

”کیڑی مرچ۔“ اماں نا سمجھی کے عالم میں بولیں۔

”ارے میرا مطلب محبت کی شادی کی تھی نا۔“

”اچھا ہاں بس اس وقت اس لڑکی کی عقل پر پردے پڑ گئے تھے جو اس کے جھانے میں آگئی، ہائے میری پھول سی پنچی۔“ اماں نے ایک دفعہ پھر رونا شروع کر دیا تھا جبکہ عمرانہ اور فرحت ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتیں رہ گئیں۔

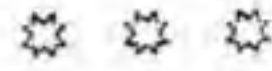


شمن اور جمال کی پہلی ملاقات، نازیہ (شمن کی دوست) کے گھر ہوئی تھی۔ جمال نازیہ کے چچا کے کزن کا بیٹا تھا۔ نازیہ کا چچا سوتیلہ تھا، لیکن پھر بھی ان لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر آ جانا تھا۔ جمال اور شمن کی پہلی ملاقات نازیہ کی منگنی پر ہوئی تھی۔ پھر دوسری دفعہ ایک ہوٹل میں اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور آخر کار یہ ملاقاتیں ایک زور دار محبت میں ڈھل گئیں۔ جمال ایف اے پاس ایک دفتر میں کلرک کے عہدے پر فائز تھا۔ ماں باپ کسی گاؤں میں رہتے تھے، لیکن یہ نوکری کی وجہ سے شرمیں رہائش پذیر تھا۔ شکل صورت اچھی تھی۔ کما بھی اچھا خاصا لیتا تھا۔

”تم نے خبر ہی ایسی ظالم سنائی ہے کہ چائے پینے کا من نہیں کر رہا۔“ فرحت کے لہجے میں دکھ تھا۔ عمرانہ نے جواباً اسے گھور کر دیکھا اور بولی۔

”اری اودھیاری بنی زیادہ جذباتی نہ ہو، چائے پینی ہے تو توتا ورنہ میں اپنے لیے بنالاتی ہوں۔“

”اچھا بنالا۔“ عمرانہ کچن کی جانب بریدہ گئی جبکہ فرحت دھیاری پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔



”میں کہتی ہوں، شمن بتا دے کیوں چپ بیٹھی ہے، طلاق کیوں دی اس نے تجھے۔“ شمن جب سے آئی تھی چپ چاپ کمرے میں بند تھی، سب وجہ پوچھ چکے تھے، لیکن شمن لب سے بیٹھی تھی۔

”اماں جب کوئی وجہ ہے ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔“ آخر وہ جھنجھلا اٹھی تھی۔

”تو ایسے ہی تجھے منحوس پر طلاق کا ٹھپا لگا دیا اس نے۔“ اماں اس کی بے نیازی پر کھول ہی اٹھی تھیں، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔

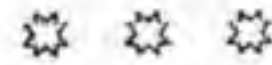
”دیکھ شمن کچھ تو بتا، آخر اتنی بڑی بات بغیر وجہ کے تو ہو نہیں سکتی۔“

”ٹھیک ہے اماں تجھے وجہ چاہیے نا تو سن، لیکن سننے کی بھی ہمت رکھنا۔“ اماں نے اسے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔

”وہ کہتا ہے میں پیسے کی مشین بن جاؤں۔“ آخر اس نے اگل ہی دیا۔

”کیا مطلب؟“

”اماں اتنی بھولی نہ بن سمجھ لے۔“ وہ تلخی سے ہنسی تھی اور یہ سن کر اماں کا لگتا تھا جیج بچ ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔



”ہائے بہن بڑا ہی افسوس ہوا قسم سے سن کر۔“ دوسرے دن ہی عمرانہ اور فرحت شمن کے گھر آ موجود تھیں۔

”لیکن وجہ کیا ہوئی؟“ فرحت نے کرید اٹھا۔



بھابھی نے دھمکی دی تھی۔  
 ”واہ اری او سن یہ گھر میرے ماں باپ کا ہے تیرا یا  
 تیرے شوہر کا نہیں۔ نہ تو میکے سے لائی ہے اس لیے یہ  
 تڑی کسی اور کو دکھانا سمجھی۔“ اس نے نخوت بھرے  
 لہجے میں کہا اور پیر پختی دو سری جانب بڑھ گئی۔ جبکہ  
 بھابھی تو اس کے یہ تیور دیکھ کر جم سی گئی تھیں۔



دن پر لگا کر گزر رہے تھے۔ شمن کو آئے دو ماہ سے اوپر  
 ہو گئے تھے۔ گھر والے جمال کو فون کر کر کے تھک چکے  
 تھے، لیکن (باقی گھر والوں کو اصل کہانی کا ابھی تک پتا  
 نہیں تھا) نہ جمال فون اٹھا رہا تھا اور نہ خود ان سے  
 رابطہ کر رہا تھا۔ شمن کا بڑا بھائی تین دفعہ اس کے آفس  
 بھی ہو آیا تھا اور آفس کی زبانی پتا چلا تھا کہ جمال نوکری  
 چھوڑ چکا ہے یہ صورت حال کافی کشیدہ ہو گئی تھی اور نہ  
 اس معاملے کا کوئی سراہا تھ لگ رہا تھا، لیکن سارے  
 معاملے میں صرف ایک شخص مطمئن تھا اور وہ تھی  
 شمن۔

جو عورتیں گھر بسانا نہیں چاہتیں وہ کوئی بھی  
 معمولی سا بسانا بنا کر گھر کو اور خاص کر کے میاں بیوی  
 کے رشتے کو توڑنے میں پل بھر نہیں لگاتیں پھر چاہے  
 انہیں طلاق ہو یا کچھ اور انہیں رتی بھر فرق نہیں پڑتا  
 کیوں کہ انہیں گھر جو نہیں بسانا ہوتا پھر کا ہے کی  
 پروا۔ اور شاید شمن کی سی ایسی عورتیں ہوتی ہیں  
 جنہیں نہ رشتوں کا تقدس پتا ہوتا ہے اور نہ لحاظ کا  
 پاس۔ انہیں صرف اپنا آپ عزیز ہوتا ہے عورت تو  
 قربانی دے دے کر جیتی ہے اور زیادہ تر قربانیاں عورت  
 کے حصے میں ہی آتی ہیں، لیکن کچھ عورتیں شمن جیسی  
 بھی ہوتی ہیں جنہیں صرف پیسہ، عیش و عشرت اور اپنا  
 آپ ہی اچھا لگتا ہے رشتوں کو نبھانا ان کی طرف سے  
 جائے بھاڑ میں۔ انہیں صرف اپنے آپ سے ہی  
 غرض ہوتی ہے بس۔



”جمال تم کہاں چلے گئے تھے“ بتائے۔ جمال

شمن کے ماں باپ کو اور کیا چاہیے تھا۔ بس پھر چٹ  
 منگنی ہوئی پٹ بیاہ اور یوں شمن اپنے تین کمرے کے  
 مکان سے اٹھ کر دو کمرے کے فلیٹ میں آ بسی۔ شمن  
 اس سب میں خوش تھی آخر محبت کا نیا نیا خمار جو چڑھا  
 تھا۔ پورے محلے کو خبر تھی کہ محبت کی شادی کی گئی تھی  
 لیکن اب طلاق کا ہو جانا محلے کے لیے تعجب کی بات تو  
 تھی۔

پورا محلہ افسوس کر کے گیا تھا اور ساتھ چٹ پٹے  
 قصے بھی، لیکن شمن کو کوئی پروا نہ تھی اور ماں بھی اس  
 کی لاپرواہی دیکھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔ انہیں اپنی  
 معصوم اور پھول سی بچی کی بات کا یقین جو آگیا تھا۔ وہ  
 اس کے کمرے میں آئیں تو دیکھا شمن بیڈ پر بیٹھی ہزار  
 ہزار کے نوٹ گن رہی تھی۔ اس نے اک نظر اماں پر  
 ڈالی اور دوبارہ نوٹ گننے میں مشغول ہو گئی۔  
 ”ارے تیرے پاس اتنے سارے نوٹ کہاں سے  
 آئے۔“ اماں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

”اتنے سارے! اونہ اماں صرف دس ہزار ہیں یہ  
 بھی چرالے آئی ورنہ وہ تو ایک پھولی کوڑی تک نہ  
 دیتا۔“

”اور وہ جو دو تو لے زیور اس نے ڈالا تھا وہ۔“ اماں کو  
 اب زیور کا غم کھائے گیا۔  
 ”اوہو اماں بتایا تو ہے مجھے اتنا موقع نہیں مل سکا کہ  
 کچھ اٹھاتی رات کو اس نے کہیں پھینک آنا تھا۔ بس  
 میں عزت بجا کر بھاگ آئی۔“ اس نے نوٹ گن کر  
 پرس میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

”ہائے کیڑے پڑیں اسے“ مر جائے ٹرک کے نیچے  
 آئے منحوس مارا۔“ اماں پھر بدھما میں دینا شروع  
 ہو گئیں جبکہ شمن اس ڈرامے سے تنگ آکر باہر نکل  
 آئی تھی۔

”ارے شمن ذرا کچن تو صاف کر دو۔“ وہ باہر نکلی ہی  
 تھی کہ آگے بڑی بھابھی نے حکم نامہ سنا دیا تھا۔  
 ”بھابھی مجھے کام کرنے کی عادت نہیں ہے آپ کو  
 پتا ہے۔“ اس نے دو ٹوک کہا۔

”لیکن اب یہاں رہنا ہے تو کام تو کرنا پڑے گا۔“



سب سے پہلے اپنے گاؤں آیا تھا۔  
 ”اماں یہ بڑی لمبی کہانی ہے اور شاید یہ کہانی میری  
 قسمت کی گرہ بھی کھول گئی ہے۔“  
 ”کیا مطلب؟“ اماں نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔  
 ”اماں جس آفس میں میں کام کرتا تھا نا، وہ میرے  
 بچپن کے دوست اکبر کے ابو کا ہے۔“  
 ”کیا رشیدہ کے بیٹے کا۔“ اماں نے حیرانی سے  
 پوچھا۔

”جی اماں۔ بس یہ سب مجھے اتفاقاً پتا چلا اب اکبر  
 چاہتا ہے میں اس کے دینی کے آفس میں بطور مینجر کام  
 کرو، اسی سلسلے میں کراچی چلا گیا تھا اب سب کام نمٹ  
 گیا ہے ایک دو ہفتے تک چلا جاؤں گا۔“ اماں نے یہ  
 سب سن کر اس کا ماتھا چوم لیا۔  
 ”شکر ہے تیرا اللہ تو نے ہم غریبوں کی سن لی۔“  
 اماں نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس پاک  
 ذات کا شکر ادا کرنے لگیں۔ جمال نے محض اماں کو  
 مسکرا کر دیکھا۔

”اماں ثمن کا کوئی فون وغیرہ آیا یا نہیں۔“ اس کے  
 چہرے پر اب پریشانی کے آثار تھے۔  
 ”نہیں کیوں؟“ اماں نے غور سے اسے دیکھا تھا۔  
 ”اماں وہ مجھ سے لڑکے گئی ہے، آپ کو پتا تو ہے  
 تھوڑی جذباتی ہے، میں منالوں گا۔“ اس کے لمبے میں  
 یقین تھا اور اس کے جواب میں اماں نے صرف ایک  
 بات ہی کہی ”یہ جو جذباتی بن ہوتا ہے نا یہ عورت کو تباہ  
 کر دیتا ہے۔“ وہ خاموش ہو گیا تھا۔  
 جمال کئی مرتبہ ثمن کے موبائل پر ٹرائی کر چکا تھا،  
 لیکن اس کا فون پاور آف مل رہا تھا اس کا پرانا موبائل  
 کہیں کھو گیا تھا جس میں ثمن کے گھر والوں کے نمبرز  
 تھے۔ اب ان سے رابطہ کرنا تو کیسے کرتا؟ اسے پتا تھا۔  
 ثمن نے جان بوجھ کر موبائل آف کیا ہوا ہے اسے پتا  
 تھا کہ ثمن کافی ضدی طبیعت کی مالک تھی۔  
 ”میں اسے منالوں گا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے  
 مسکرایا تھا۔

”ثمن تیاری کر لو کل سب ہم تمہارے ابا کے

گاؤں جا رہے ہیں۔“  
 ”میں وہ کیوں؟“ اس نے جواباً پوچھا تھا۔  
 ”تمہارے بڑے تایا کے بیٹے کی شادی ہے انہوں  
 نے دعوت نامہ بھیجا ہے۔“ اماں نے کہا۔  
 ”تو پھر؟“

”کیوں تم نے نہیں جانا کیا۔“ اماں نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ وہ ترنت بولی تھی۔ اماں نے اگ نظر  
 اسے دیکھا اور بولیں۔  
 ”چل جیسے تیری مرضی۔“ اماں نے بھی زیادہ اصرار  
 نہ کیا تھا۔



”عمران کل دوپہر کو میرے گھر آجانا۔“ ثمن نے  
 رات کو اسے پیغام بھیجا تھا۔  
 ”مگر تمہارے گھر والے۔“  
 ”وہ شادی پہ گاؤں جا رہے ہیں، اگر ملنا ہے تو آجانا

اور ہاں کوئی اچھا سا گفٹ بھی لے کر آنا۔“  
 اس نے ساتھ ہی فرمائش کر ڈالی تھی۔  
 ”ٹھیک ہے، پھر کل ملاقات ہوتی ہے۔“  
 ”اوکے بائے۔“ اس نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا  
 تھا۔

اس نے سب کے جاتے ہی داخلی دروازے پر تالا  
 لگا دیا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو گھر میں کوئی نہیں ہے، عمران کو  
 اس نے دو بجے کا ٹائم دیا تھا اور دو بج چکے تھے۔ اس نے  
 گھر کی پچھلی سائیڈ والا دروازہ کھولا تھا۔ گھر کے پچھلی  
 سائیڈ والی گلی ویران پلاٹ پر مشتمل تھی اس لیے  
 عمران کو وہاں سے آتے جاتے کوئی نہ دیکھتا۔ وہ پوری  
 تیاری کر کے بیٹھی تھی۔

سوا دو بجے پچھلے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک  
 دی تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ آگے عمران تھا۔  
 وہ اسے پچھلے کمرے کی جانب لے آئی تھی۔  
 ”پورے پندرہ منٹ لیٹ آئے ہو۔“ وہ مصنوعی  
 ناراضی سے بولی۔

”یار تمہارے لیے گفٹ لینے چلا گیا تھا وہاں دیر



ہو گئی تھی۔

”اچھا کیا لائے ہو۔“ اس نے بے تلی سے پوچھا تھا۔

”اپنا دل۔“ وہ بوفرانہ انداز سے بولا۔

”بدمیز بتاؤ نا“

”یہ لو خود دیکھ لیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپرا سے تھمایا تھا۔

”واہ، میک اپ کٹ۔“ اس نے ڈبا کھول کر دیکھا اور خوشی سے چلائی۔

”پسند آئی۔“

”ہاں بہت اچھا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”اچھا چائے پوٹے یا ٹھنڈا۔“ اس نے میک اپ کٹ ڈبے میں ڈالا اور پچن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کچھ نہیں، بس تم میرے پاس بیٹھو۔“ جواباً عمران نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”پہلے کچھ تمہاری خاطر مارت کر لوں پھر۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور بڑے اشائل سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”ہماری خاطر مارت یہی ہے کہ تم میرے پاس بیٹھو۔“ یہ کہتے ہی عمران نے اسے زور کا جھٹکا دیا تھا اور وہ اس کے اوپر آگری بھی اور اچانک ہی کوئی کمرے میں داخل ہوا تھا شمن کی نظر فوراً پر پڑی اور پھر اٹھنا بھول گئی تھی۔

\*\*\*

”ارے ٹیپو جا کر دیکھ دروازے پر کون ہے۔“ کوئی بڑی دیر سے دروازہ کھٹکا رہا تھا۔

”دروازہ تڑوائے گا کیا۔“

”سن لیا اماں، تو تو کان کھا جاتی ہے۔“ وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

”اماں کوئی جمال نامی مرد آیا ہے، شمن باجی کا پوچھ رہا تھا۔“ عمرانہ کے سر پر پہاڑ گرا۔

”جمال، ارے اندر بلا اسے، کم بخت۔“ عمرانہ زور

سے بولی تھی اور پھر ایک جھٹکے میں اٹھ کر پلنگ پر سیدھی بیٹھ گئی، کمر کا دروازہ کھیں اور جاسویا تھا۔

”السلام علیکم! مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ شمن کے گھر والے کہاں گئے ہیں، میں جمال ہوں، شمن کا شوہر۔“ وہ اس وقت عمرانہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا پوچھ رہا تھا۔ عمرانہ کو یہ سب سن کر اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”شش۔ شوہر، مگر شمن۔“ وہ منہ میں بڑبڑائی۔

”آپ نے کچھ کہا۔“ جمال نے شائستہ لہجے میں پوچھا تھا۔

”نہیں۔ نہیں کچھ نہیں، آپ چائے پیئیں گے یا ٹھنڈا۔“

”نہیں، کچھ نہیں، پلیز آپ کے پاس اگر شمن یا اس کے گھر والوں کا نمبر ہے تو دے دیں۔“ اس نے جواباً کہا تھا۔

”یہ شکل سے تو اچھا خاصا مہذب اور شریف دکھتا

ہے اور پڑھا لکھا بھی لگتا ہے، مگر شمن۔“ اس نقطے پر آکر پھر اس کی سوچ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

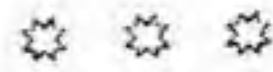
”پلیز مجھے ذرا جلدی ہے۔“ وہ دوبارہ بولا تو وہ چونکی۔

”میرے پاس صرف گھر کا نمبر ہے، موبائل نمبر نہیں ہے آپ تھوڑا انتظار کر لیں، ابھی آتے ہی ہو گئے، کل کے گئے ہوئے ہیں۔“ عمرانہ نے بھی شگفتہ انداز میں کہا۔

”لیکن امی، ان کا پچھلی گلی والا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، میں سلیمان کے ساتھ گیند لینے پچھلے پلاٹ پر گیا تھا تو کسی آدمی کو پچھلے دروازے سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ ٹیپو کے بتانے پر جمال عمرانہ چونکی تھی وہاں جمال بھی چونک گیا تھا۔

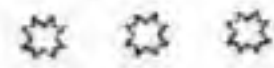
”اوکے باجی آپ کا بہت بہت شکریہ، میں جا کر دیکھ لیتا ہوں۔“ اجازت لے کر وہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد عمرانہ نے فوراً فرست کو فون ملا لیا تھا۔





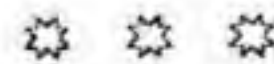
”یہ ثمن نے تالا کیوں لگا دیا۔ دروازے پر۔“ اماں نے گیسٹ رتالا لگا دیکھ کر کہا تھا۔  
”تمہیں گنی ہوگی۔“ بڑا بھائی بولا۔  
”تو اب کیا یہاں گری میں ہی سڑتے رہیں گے۔“ اماں کو غصہ آگیا تھا۔

”اماں میرے پاس پچھلے دروازے کی چابی ہے چلیں آجائیں سب۔“ درمیانہ بھائی بلند آواز کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا اور اس کے پیچھے وہ سب۔



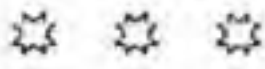
دروازے پر کوئی اور نہیں جمال کھڑا تھا وہ یک دم ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی، لیکن اب دیر ہو چکی تھی کیوں کہ اب ابا، اماں، بھائی، بھابھیاں سب اس کمرے میں آگئے تھے۔ وہ سب کبھی حیرت سے جمال کو دیکھتے اور کبھی اسے۔ وہ ہمیشہ کے لیے گر چکی تھی گندگی کی طرف پستی کی طرف دھرم دھرم نیچے بہت نیچے اس کی بساط، الٹ چکی تھی۔ سب خاموش تھے، کوئی کچھ نہ بولا تھا۔ ابا کے کندھے اور جھک گئے تھے بھائیوں کی نظروں اور نیچے ہو گئی تھیں۔ بھابھیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز سرگوشیاں کر رہی تھیں اور اماں وہ تو پتھر اگئی تھیں۔ جمال وہ تو ساکت کھڑا تھا، بے جان، لیکن جب سکتہ ٹوٹا تو۔

”میں اب تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں،“ ثمن میں، ”تمہیں طلاق دیتا ہوں“ کہہ کر نکلا نہیں تھا۔ نکل گیا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ سب راز کھل چکا تھا اس عورت کی اصلیت سامنے آچکی تھی۔ اس عورت کو عورت کہنا تذلیل نہیں ہے عورت کی؟ عورت ایسی تو نہیں ہوتی۔ ثمن سر جھکائے کھڑی تھی۔ کبھی نہ اٹھانے کے لیے۔



”میں کہتی تھی نا یہ ثمن کے لچھن ٹھیک نہیں توبہ توبہ مرد کو طلاق کا پتا نہیں اور بیوی نے مشہور کر دیا“

طلاق دے دی۔ لڑائیاں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں، لیکن جن عورتوں نے گھر نہ بسائے ہو وہ تو معمولی بات کو بھی رائی کا ہار بنا لیتی ہیں، ایسی عورتیں کسی ایک کے پاس نہیں نکلتیں۔ شکر ہے جمال کی جان چھوٹی۔ ”عمرانہ محلے کے ہر گھر جا کر ثمن نامہ بیان کر رہی تھی۔ لوگوں کا اور کام ہی کیا ہے، پھیلتی بات کو اور پھیلاتا۔“



”تو پیدا ہوتے ہی کیوں نا مر گنی ثمن مرجاتی تو اچھا ہوتا۔ ارے مجھے کیا پتا تھا میں ایسی لڑکی پیدا کرنے جا رہی ہوں جو ہمارے لیے باعث شرمندگی ہوگی تو نے تو ہمیں جیتے جی مار دیا، مرجا گندگی کی پوٹ مرجا۔“ باقی گھر والوں نے تو چپ سا دھلی بھی۔ صرف اماں ہی تھیں جو اسے کوس رہی تھیں، لیکن وہ ساکت تھی خاموش۔

”بس، تو ایک اور احسان ہم پر کر دے تو یہاں سے چلی جا۔“ اماں نے اسے حقارت کی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”میں کہاں جاؤں گی اماں۔“ سکتہ ٹوٹا تو سہم گئی۔  
”مست بول اماں میں تجھ جیسی بد کردار کی ماں نہیں ہو سکتی۔“ ایک اور تیر اس کے دل میں کھبا تھا۔ وہ اپنے مقام سے اور نیچے گر گئی تھی۔

”رات گزار لے، صبح ہوتے ہی چلی جانا اور شادی کر لینا اپنے اسی یار سے جس کے لیے تو نے یہ سارا کھیل کھیلا، جمال جیسا میرا تیرے قابل تھا ہی نہیں۔“ اماں چلی گئی تھیں اور وہ اس کے پاس تو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ عزت بھی چلی گئی اور میک اپ بھی فرش پر بکھرا اپنی بد قسمتی پر رو رہا تھا۔ ثمن کی بازی اسی پر الٹ گئی تھی عورت کے پاس اور کچھ ہو یا نہ ہو عزت ضرور ہونی چاہیے۔





سیمانت عاصم

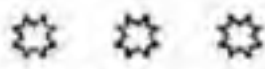
# خاتون





لوگ یونہی تو نہیں اپنوں کی لغزشوں کو درگزر کر دیا کرتے ہیں۔ رشتے، محبت سے منسلک ہوتے ہیں۔ محبت! جو روح میں اتر جاتی ہے۔ پھر اسے اکھاڑ پھینکنا اتنا سہل کہاں ہوتا ہے۔ انسان ٹوٹ جاتا ہے۔ ہار جاتا ہے۔ جھک جاتا ہے۔ یہ ہار، رشتے کو مضبوط کرتی ہے۔ محبت کی بقا ہے۔

ہم اکثر یہ سمجھتے ہیں  
جسے ہم پیار کرتے ہیں  
اسے ہم چھوڑ سکتے ہیں  
مگر ایسا نہیں ہوتا!!  
محبت دائمی سچ ہے  
یہ اکثر ٹھہر جاتی ہے  
ہماری ذات کے اندر  
ہماری بات کے اندر  
مگر یہ کم نہیں ہوتی  
کبھی بھی کم نہیں ہوتی۔



یہ ایک نہ دو سالوں پر پھیلی کہانی تھی  
میری دادی، بیا کے والد کی استاد تھیں۔ انہوں نے  
میرے والد کے ساتھ کلام پاک پڑھا۔ ان دونوں کے  
درمیان بھی دوستی کا ٹوٹ رشتہ تھا۔ میرے والدین کی  
شادی کے کچھ عرصے بعد بیا کے والدین کو محبت نے  
آن کھیرا، جو شادی پر منج ہوئی، امی بارات میں شرکت  
کے ارادہ سے سج دج کر پہنچیں تو ہوتا چلا بارات کسی دور،  
دراز کے گاؤں جائے گی۔ اس وقت بھائی جان ان کی  
گود میں تھے۔ وہ واپس لوٹ آئیں۔ کہ سفر طویل تھا۔  
بعد ازاں امی کی بیا کی امی سے گاڑھی چھنی۔ میں اور بیا  
تقریباً "ہم عمر تھے۔ میں نے آنکھ کھلتے ہی بیا کا ساتھ پایا  
تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ ہماری دوستی انٹوٹ ہوئی  
چلی گئی تھی۔

میرے پاس آج بھی ان یادوں کی یادگاریں موجود  
ہیں۔ تصویریں۔ تحریریں بہت سے انٹ لکھے ساتھ  
رہنا۔ کھیلنا، ہنستا، روٹھنا منانا، پھر چھت پر جا کر چپکے چپکے

صبا میری کزن تھی اور بڑی بھانج بھی!  
"اس کا کہنا کرنا میرے لیے ہمیشہ سے مشکل رہا  
تھا۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی۔ اسی لیے اس رات  
شادی کی سالگرہ کا انویشن فون پر دینے کے ساتھ مجھے  
ڈنر کی تیاری بھی سونپی تو مجھے اپنے ہزار کاموں کو پھنکار  
کر لبیک کہنا ہی تھا۔ یہ اور بات کہ اس سے میرے  
فرشتوں تک کو خبر نہ تھی کہ اگلے روز بھائی جان کے  
گھر کا صدر دروازہ کھولنے والی ٹوپی ہوگی۔ میری دیرینہ  
اور عزیز از جان دوست! جو کبھی میرے لیے بیا تھی!  
عرصہ ہوا، بس اک لغزش و خلش کے سبب تعلق و  
مراسم کی ہر ڈور ٹوٹ گئی تھی۔ شاید میں اگلے قدموں  
لوٹ آئی۔ مگر مجھے صبا سے کیے وعدہ کا پاس تھا۔ پھر  
عدنان مجھے دروازے تک چھوڑ کے جا چکے تھے۔ مجھے  
قدم بڑھانے ہی تھے۔ بیا مسکراتی ہوئی مجھ سے آگئی تو  
مجھے بھی تھوڑی بہت گرم جوشی دکھائی پڑی! گھر میں  
سنائے گونج رہے تھے۔ پتا چلا بھائی جان صبا سمیت  
غائب ہیں! ان کے ٹھنڈے ٹھار بیڈ روم میں بیٹھ کر چند  
لمحے اسے سی کی خنکی خود میں اتار کے سائیں بحال  
ہوئیں جو اس ٹھکانے آئے۔

مہینہ تو گلابی جاڑوں کی آمد کا تھا۔ مگر گرمی کہتی کہ پڑ  
کر اب نہ پڑوں گی! بیا جو س کے گلاس سمیت وارد  
ہوئی تو میں نے بہ غور اسے دیکھا تھا۔ پل بھر کو ماضی کا  
اک نقش لہرایا تھا۔ طویل قامت، بھاری بھر کم گول  
چہرے اور بڑی بڑی آنکھوں والی سانولی سلونی سی بیا۔!  
اب قدرے فہم ہو گئی تھی۔ لمبے گھنیرے بال جدید  
اشاکل میں ترشے کاندھوں پر پڑے تھے۔

"لگتا ہے جیسے وقت گزرا ہی نہیں۔ سب کچھ  
ویسے کا ویسا ہی ہے۔" میں بے ساختہ کہہ گئی۔

"سائی! کیا رشتے اتنے ہی نازک ہوتے ہیں کہ اک  
ذرا سی لغزش پر سارے دروازے بند کر دیے  
جائیں؟" یہ پہلا اور شاید آخری شکوہ تھا۔ اگلے ہی پل  
اس کا موبائل بج اٹھا۔ وہ کان سے لگا کر بات کرتی ہوئی  
بیڈ روم سے نکل گئی، میں گزر کر رہ گئی تھی۔ اس کی بات  
دل میں کھب گئی تھی۔



ڈھیروں ڈھیر باتیں کرنا۔ یہ وہ دن تھے جب عدنان سے میری بچپن کی منگنی باقاعدہ ارنج ہو چکی تھی۔ میں ان سے چھپتی پھرتی۔ اور عدنان مجھ سے بات کرنے اور ملاقات کے لیے بیا کے آگے پیچھے پھرتے۔ آج میرا بیٹا اولیول میں ہر وقت جیسے گزر کر بھی نہیں گزرا ہے۔ ابو کہتے اگر ہم دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھیں تو ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کوالٹی ایسی ضرور ہوتی ہے جو اسے انمول بناتی ہے مجھے یاد ہے وہ دلوں میں گھر کرنے کا ہنر رکھتی تھی۔

اور یہ بیا ہی تھی۔ جس نے ایک بار ہنسی ہنسی میں ہی کہا تھا کہ کسی عورت کا گھر اجاڑنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مگر وہ اک خوش حال زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔

میں ان دنوں انٹر کے ایگزیکٹو تیار کے لیے کرا بند کیے دن رات سر کھپا رہی تھی۔ جب اڑتی اڑتی سنی۔ بیا کا کسی امیر و کبیر آدمی سے معاشرۂ چل رہا ہے میرڈ ہے بال بچے دار۔ میں نے سر جھٹک دیا۔ مگر رانی ہو تو پر تب بنتا ہے! ایگزیکٹو میں ای کے حکم کے موجب تمام گاڈشیکٹ فریز۔ اور نہ ہی یہ موبائلز کا دور تھا کہ اک ایس ایم ایس سے ہی ادھر کی خبر ادھر۔

مجھے ہوا بھی نہ لگ سکی کہ وہ آج کل کن ہواؤں میں ہے۔

خدا کا کرنا۔ ایگزیکٹو بھگتا کر میں وہ کمیشنز منانے لاہور اپنی خالہ کے گھر چکی آئی، لوٹ کر آئی پتا چلا۔ اس نے کورٹ میں ج کر لی ہے۔ اس بے جوڑ شادی پر گھر والوں کے اختلاف نے سراٹھایا۔ اور انتہائی اندام کا ارتکاب ہوا۔ بیا گھر سے بھاگ گئی! دنیا انگشت بدنداں تھی۔ دگنی عمروالے آدمی کے لیے یہ رسوائی۔ جگ ہسالی اور بے مہر! توبہ تو یہ!

یہ صرف میں جانتی تھی۔ بیا نے زندگی تنگ دستی کا عذاب جھیلے گزاری تھی۔ کسی نے میے کی چھب دکھا کر اسے زیر کیا ہو گا۔ وہ خوش حال زندگی چاہتی تھی۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی  
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

مگر میرے دل کو نہیں لگی تھی۔ خوب ہی دھول اڑی تھی۔ مانو اس نے مجھے رو کیا تھا! اور اس روز تو میں گڑ کر ہی رہ گئی جب ہماری اک مشترکہ دوست نے مجھ سے پوچھا۔

”سنا ہے توبہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کر لی۔ کس سے؟ تمہیں تو پتا ہو گا؟“ یوں جیسے میں اس کام میں اس کی دست راست یا ہم قدم ہی تو رہی ہوں۔ ہمارا ساتھ ہی ایسا تھا۔ مانو اسی پل برسوں کے ساتھ پر مٹی پڑ گئی۔

ذرا سی بات پر برسوں کے یار لانے گئے!  
اور بس اک خلش کا خار دل میں کھب کر رہ گیا!  
پھر اس کے متعلق خبریں ہی سننے میں آتی رہیں۔  
میں سن کر سر جھٹک دیتی۔ مگر یہ اتنا آسان نہ تھا بس  
اک احساس کسک و تارتا رہتا۔ پھر سنا وہ اسلام آباد شفٹ  
ہو گئی ہے۔ میری بلا ہے!



بیا کے لوٹنے تک صرف چند لمحوں میں سالوں کا سفر طے ہوا تھا۔

میری نظروال کلاک پر پڑی اور اگلے ہی پل ہم بچن میں تھے۔ مہینو صبا نے رات ہی رٹو ادیا تھا۔ چکن کڑاہی، منن پلاؤ، کباب، دم کا قیمہ، میٹھے میں جو چاہوں۔ اور ہاں کیک بھی مجھے ہی بیک کرنا تھا۔ وقت کم، مقابلہ سخت تھا۔ فریج میں جھانکا۔ گوشت نکال کر بھگونے کے لیے رکھا۔ بچن باسکٹ میں سارا سامان موجود تھا۔ ہم نے کھانا کھٹ کام بھگتنا شروع کیا اور مانو گزر اوقت لوٹ آیا۔

”بیا تم نے ابھی تک یہ کسٹروڈی ڈشز ڈائننگ ٹیبل پر نہیں رکھی ہیں؟“

”کیوں میں تمہاری نوکر لگی ہوں، دیکھتی نہیں ہو میں دھنیا توڑ رہی ہوں۔ خود رکھ کر آؤ۔“

”بیا تم سے خدا سمجھے، ابھی کتنا کام باقی ہے۔ تم ابھی تک دھنیا چھانٹ رہی ہو۔ اس طرح تو رات ہو جائے گی۔“



”سدا ہر جاؤ۔ ورنہ یہی انڈا“ ڈنڈے کی جگہ  
تمہارے سر پر پڑے گا۔“  
”اف خدا یا! میں کدھر جاؤں۔ یا اللہ مجھے موت  
دے دے۔“

”آمین۔ آمین۔ آمین۔“ اس نے کہتے کہتے زبان  
دانتوں تلے داب لی۔ مگر میں ہنس دی۔ مانو چاروں  
طرف اجالا ہی اجالا بکھیر گیا۔ اسی نوک جھونک میں کام  
تمام ہوا۔ اور میں نے جانا۔ رجش کی فسیل گزرتے  
وقت کے ساتھ بھر بھری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہمارے  
درمیان جیسے گزرا وقت آیا ہی نہ تھا۔ بہت کم وقت میں  
شام کی ساری تیاری ہو چکی تھی، ہم ذرا سی دیر سانس  
لینے کو بیٹھے تو سالوں کا نچوڑ لکھوں میں اگل گئی۔

”شوہر کی بزدلی۔ سوتیلے رشتوں کا عذاب۔ ساری  
کھینچ تان جاگیر کے سبب تھی مجھے اندازہ تھا۔ اس  
طرح بھی ہوتا ہے۔ اس طرح کے کاموں میں۔“  
بھیا بھیا بھی لوٹ آئے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ اپنی  
ہر خوشی کا صدقہ غریبوں میں جا کر نکالتے تھے۔ مگر آج  
دیر ہو گئی تھی۔

”رجشوں کی آبیاری سے انسان صرف اچھا وقت  
گناتا ہے۔ حاصل کچھ نہیں ہوتا۔“ بھائی جان نے  
ہم دونوں کو خود سے لگایا۔ اور میں لمبے کے ہزارویں  
حصے میں جانچ گئی۔ یہی رجش مٹانے کو انہوں نے  
ہمیں یہ وقت بخشا تھا۔ میں بیا کے فیصلے پر نہیں اس  
کے غلط طریقے کار پر شاکی تھی۔ یہ آج تک کوئی سمجھ  
ہی نہ سکا تھا۔ مگر جو وقت گزر گیا، لوٹ نہیں سکتا تھا۔  
بھیا کا فرمان درست تھا۔ زخم تو کب کا بھر چکا تھا۔ بس  
اک داغ تھا جو گزرے وقت کی یاد دلاتا۔ میں نے ایک  
نظر بیا کو دیکھا، وہ ہنوز بھائی جان کے کندھے سے لگی  
مسکرا رہی تھی۔ میں بھی مسکرا دی۔

❖ ❖

”شکل اچھی نہیں تو بات ہی اچھی کرلو۔ تم نے  
مجھے اپنی طرح دھکا اشارت سمجھ رکھا ہے؟“ ہماری  
زبانیں تیزی سے چلتے ہاتھوں کو مات دے رہی تھیں۔  
مانو بریکیں قیل ہو گئی تھیں۔

”اوہ گاڈ! یہ تم نے کبابوں کا آمیزہ چوپ کیا ہے؟  
کسی کے سر پر مارو تو سر ہی پھٹ جائے۔ ستیا ناس  
کر دیا! یہ کبابوں کا آمیزہ ہے کہ اکڑا ہوا آٹا۔“  
”اچھا! نیسٹ کرواؤ پھر پتا چلے گا۔“ وہ ندیدے  
بچوں کی طرح میرے قریب آکر بولی۔

”دور ہو جاؤ سب۔ مجھ جتنی ہوں میں یہ بہانے  
بازیاں۔ ایک ذرہ نہیں ملے گا۔“  
”ارے نظر کا صدقہ سمجھ کر ہی دے دو۔ خدا کے  
واسطے۔“

”اف! ہائے ری قسمت۔ یخنی میں اتنا لمبا پانی،  
ان بیل برابر دیدوں سے تمہیں کچھ نظر آتا ہے کہ  
نہیں۔؟“

”ہاں۔ ہاں۔ تم تو بڑی افلاطون ہو۔ جیسے مجھے پتا  
ہی نہیں پاسنگ مار کس لے کر اگلی سیڑگی چڑھتی  
تھیں۔“

”اور تم۔ تمہیں تو دسوس کے مار کس پر آگے داخلہ  
ہی نہیں ملا تھا۔ منہ چھپا کر گھر میں پڑ گئی تھیں۔ بھول  
گئیں۔“

”تم نے لی اے کر کے کون سا تیر مار لیا۔ ڈگریاں  
چولھے میں جھونک کے بچہ پال رہی ہو۔“

”خود کو مٹا دینے ہی میں عورت کی عظمت ہے۔“  
”ہاہ! مکالے بازی!! فضولیات!“

”مکالے نہیں سچائی۔ اور اسے فضولیات نہیں  
حقیقت اور خود شناسی کہتے ہیں۔“

”اللہ۔ اللہ۔ جاؤ جا کے منہ دھو کے آؤ پھر آئینے  
میں اپنی شکل دیکھو۔ دنیا کا بد نصیب ترین انسان ہے  
جس کا مقدر تم سے پھوٹا۔“

”اور خوش نصیب ترین وہ ہے جو تم سے بچ نکلا۔“  
”اف باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ ارے تم سے  
ابھی تک ایک انڈا نہیں ابالا گیا۔ ڈوب مو۔“



# کچھ موتی چنے نہیں

ادارہ

## شیطان کی سواری

خدا گواہ ہے کہ آپ کی طرح ہم نے بھی آج تک شیطان نہیں دیکھا، البتہ کئی بار شیطان کے معاون کی حیثیت سے اس کی سواری پر سفر کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے، نہ جانے یہ بڑے بوڑھے موٹر سائیکل کو شیطان کی سواری کیوں کہتے ہیں۔

منجھلے نوجوانوں کی طرح ہمیں بھی موٹر سائیکل سے والہانہ محبت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے خود کئی مرتبہ شیطان بننے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ہر بار گھر والوں نے تعاون زر کا دامن سکیڑ کر ہمیں بال بال بچا لیا۔ اس تمام واقعے میں قابل رحم شیطانی سواری یعنی غریب موٹر سائیکل ہے۔ آخر اسے ہی شیطان کی سواری کا خطاب کیوں ملا۔ یہ اعزاز منی بسوں اور رکشا جیسی عظیم الحریکت ساریوں کو کیوں نہ حاصل ہو سکا۔ بات جہاں تک ہماری معاف کیجئے گا شیطان کی ہے تو یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ سواری کے لیے منی بس پسند کرے، رکشایا موٹر سائیکل۔

اگر آپ چاہیں تو موٹر سائیکل کے ذریعے خدمت خلق بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو اتنا کرنا ہوگا کہ اپنی موٹر سائیکل کا سائنسور نکالنا پڑے گا۔ صبح ہی صبح اپنے صحن میں بغیر سائنسور کی موٹر سائیکل اشارت کر کے آپ بیک وقت پورے محلے کو خواب غفلت سے بیدار کر سکتے ہیں۔ اس طرح بچے صبح وقت پر اسکول اور بڑے اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر پہنچ کر آپ کو دعا میں دیں گے۔

(محمد یعقوب غزنوی۔ گستاخیاں)

گزیاشاف۔ کھڑوڑپکا

## عزت نفس

جب عورت کو عزت نہ ملے تو وہ اپنی ذات کے خول

میں بند ہو جاتی ہے۔ مرد سمجھتا ہے۔ اس نے عورت کو تسخیر کر لیا ہے۔ بے وقوف مرد۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ خاموشی مرد ذات کی نفی کے لیے اختیار کی گئی ہے اور اس چپ کے پردے میں فقط بے زاری، نفرت اور مصلحت کے جذبے پوشیدہ ہیں۔

(شازیہ چوہدری۔ تو پھر یہ طے ہے کہ)

شازیہ اعجاز۔ لاہور

## خالص

ایک جگہ سے ہم خالص پنجاب کا گھی لایا کرتے تھے، ہمیں تو کچھ ایسا ناپسند نہ تھا لیکن ایک روز اس میں سے ایک چھلا ہوا آلو ثابت نکل آیا اور ایک چربی کا ٹکڑا بھی تو شکایت کرنی پڑی۔ تب اس بزرگ نے وضاحت کی کہ جناب ”گھی تو یہ بناوٹی ہے، میں نے اس کے اصلی ہونے کا دعویٰ کہاں کیا ہے۔ میں تو صرف اس کا ذمہ دار ہوں کہ یہ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے منگاتا ہوں، جو خالص پنجاب میں ہے، سندھ و ندھ میں نہیں ہے۔“

(ابن انشا۔ آپ۔ سے کیا پردہ)

صدف نقی۔ کراچی

## عورت

میں نے عورت کو ہمیشہ بہت کمزور سمجھا تھا۔ موم کی گڑیا کی طرح، لیکن ایک عمر برتنے کے بعد میں نے یہ جانا ہے کہ عورت موم ہے یا پتھر؟ اس کا فیصلہ وہ خود کرتی ہے۔ کسی دوسرے شخص کو اسے موم یا پتھر کا خطاب دینے کا حق نہیں ہوتا، وہ خود چاہے تو محبوب کے اشاروں کی سمت مڑتی رہتی ہے اور پتھر بننے کا فیصلہ کر لے تو کوئی شخص بھکاری بن کر بھی اس کی نگاہ التفات نہیں پاسکتا۔

(بانو قدسیہ۔ راجا گدھ)

شاہدہ نامہ۔ کراچی



(عمیرہ احمدیہ بات ہوتے تک)  
عظمیٰ۔ ڈی جی خان

## نئی نسل

ہماری نئی نسل کسی کے پیچھے چلنے کو تیار نہیں۔ وہ  
”میں خود“ کی قائل ہے۔ اس لیے اب گرو کا فرض  
ہے کہ خود میں داس کی سپرٹ پیدا کرے، لوگوں کے  
پیچھے چلے اور پیچھے چل کر ان کا رخ موڑے۔ آگے  
چل کر رخ موڑنا تو آسان بات ہے، پیچھے چل کر رخ  
موڑنا بڑی بات ہے۔

(ممتاز مفتی۔ تلاش)  
فریدہ افتخار۔ اسلام آباد

## ظالم

راکا پوشی بہت خوب صورت ہے اور جو خوب  
صورت ہوتے ہیں اس سے زیادہ ظالم بھی کوئی نہیں  
ہوتا۔

(نمو احمد۔ قراقرم کاتاج محل)  
سعدیہ بخٹیار۔ کراچی

## روح کا اطمینان

ہم کسی بھی معاملے کی کوئی سی بھی توجہ دے کر  
سامنے والے کا منہ بند کر سکتے ہیں۔ سچی وجہ، جھوٹی  
وجہ۔ ہم جواب دینے سے انکار بھی کر سکتے ہیں مگر  
اصل جواز وہ ہے جو ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں۔ جب  
ہم خود سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ جب ہمیں خود کو بتانا  
ہوتا ہے، خود کو سمجھانا ہوتا ہے، دوسروں کو مطمئن کرنا  
آسان ہوتا ہے مگر اپنی روح کی اطمینانیت۔ ہم اسے  
قائل کریں تو بات ہے۔

(سائرہ رضا۔ تیسری محبت)  
شمس مسکان۔ جام پور



## محبت

یہ محبت ہے میری جان! اسمیل کا پانی نہیں کہ پیاس  
لگی اور کہا ذرا ایک گلاس پانی دینا۔ یہاں پانی اس  
قیمت پر ملے گا جس قیمت پر کربلا کے پیاسوں کو ملا تھا۔  
(خلیل الرحمن قمر)  
نسرین زمان۔ دیر

## سچ

سچ کتنا دکھی اور زخمی ہے آج کے زمانے میں سچ کو  
ثابت کرنے کے لیے کتنے ہی ہزاروں سہاروں کی  
ضرورت رہتی ہے، کتنے دکھ کی بات ہے لوگ اچھی  
نظر رکھنے کے باوجود سچائی کو پہچان نہیں سکتے۔ اسے  
ہاتھ پر لکھا ہوا دیکھ کر پڑھنا چاہتے ہیں، آنکھیں رکھنے  
کے باوجود بینائی سے محروم ہیں لوگ۔  
(آسیہ مرزا۔ اے جنون وشت ہے کہ منزل ہے)  
ہماسل۔ لیہ

## تجربات

زندگی کے تجربات اور لیبارٹری کے تجربات میں  
بہت فرق ہے۔ زندگی کے تجربات لاعلمی کے اندھیروں  
میں ٹھوکیں کھانے کا نام ہے اور لیبارٹری کے  
تجربات، تجربات نہیں بلکہ اعادہ ہوتے ہیں۔ تجربہ تو  
ایک ہی دفعہ ہوتا ہے اور اسے ہوتا ہے جو اس کا نتیجہ  
پہلی دفعہ دیکھتا ہے، اور محسوس کرتا ہے، پھر اس کے  
بعد مقلد ہوتے ہیں، تجربہ کار نہیں۔

(رفعت سراج۔ سوال)  
سدرہ رحمان۔ بہاول پور

## بازی

عورت ہر بازی دل سے کھیلتی ہے مگر کبھی کبھار کوئی  
ایک بازی ایسی ہوتی ہے جسے وہ دماغ سے کھیلتی ہے اور  
اس وقت کم از کم اس بازی میں کوئی اس کے سامنے  
کھڑا رہ سکتا ہے نہ چت کر سکتا ہے اور وہ بازی۔ وہ  
بازی بقا کی بازی ہوتی ہے۔





### گوہر نایاب

☆ کچھ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، پھر وہ کام کرتے ہیں، جس کا حکم خدا نے دیا ہے مگر اپنی زبان سے کئے الفاظ پر غور نہیں کرتے۔ جس سے جانے کتنے خدا کے گھر ٹوٹتے ہیں، یعنی دل۔

☆ آگئی آپ کو اپنے اندر کے پاتال کی خبر دیتی ہے۔ محبت حق نہیں ہوتی، مقدر ہوتی ہے۔

☆ اپنے گناہوں کا شمار نہ کرنے بیٹھو کیونکہ جتنی دیر میں تم اپنے گناہوں کا شمار کرو گے اتنی دیر میں تم کئی نیکیاں کر سکتے ہو۔

☆ خوشی میں آنسو چھلکتے ہیں، بہتے نہیں۔

☆ عادت تو بدل سکتے ہیں۔ مگر فطرت نہیں۔ اس لیے شروع سے فطرت کو اچھائی کی طرف راغب کرنا چاہیے۔

☆ خوشیوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو اور دوسروں کو خوشیاں دینے کی کوشش کرو کیونکہ اس طرح خوشیاں تمہارے پیچھے بھاگیں گی۔

☆ جب بھی سائل کو کچھ دو تو اس سے دعا کے لیے کہو۔

فوزیہ شمس۔ مہجرات

### ایمان افروز واقعہ

ایک بوڑھی خاتون نے ریڈیو اسٹیشن فون کیا کہ وہ کئی دنوں سے بھوکی ہے اور کئی دنوں سے صرف سوکھی روٹی اور پانی پر گزارا کر رہی ہے اور کہا کہ اللہ کی راہ میں اسے کچھ کھانے کے لیے دیا جائے۔ ایک منکر خدا بھی

### غصے پر قابو

ارشاد ربانی ہے۔ ”جو لوگ فراخی اور تنگی میں (اپنا مال اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔“

(سورہ آل عمران، 134)

### دنیاوی زندگی

ارشاد ربانی ہے۔ ”جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا تھا اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا تھا (اور وہ سمجھتے تھے کہ انہیں ہمیشہ دنیا ہی میں رہنا ہے) تو جس طرح یہ لوگ اس دن (آخرت) کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اور ہماری آیتوں سے منکر ہو رہے تھے اسی طرح آج (روز قیامت) ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔“

(سورۃ الاعراف۔ 51)

امینہ ملک۔ کراچی

### بخار کو برانہ کہو

بارگاہ رسالت میں بخار کا ذکر کیا گیا تو ایک شخص نے بخار کو برا کہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بخار کو برانہ کہو“ کیونکہ وہ مومن کو گناہوں سے ایسے پاک کر دیتا ہے، جیسے آگ، لوہے کا میل صاف کر دیتی ہے۔“

(سنن ابن ماجہ)

رشیدہ فیض۔ جام پور



## اچھی باتیں

- ☆ جو شخص دریائے توحید میں غرق ہوتا ہے اس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔
- ☆ اپنی سیرت ایسی کلی کی طرح بناؤ جسے سونگھنے سے اچھالی کی خوشبو آئے۔
- ☆ گناہ پر نام ہونا گناہ کو مٹا دیتا ہے۔
- ☆ توبہ کرنا آسان ہے مگر گناہ چھوڑنا مشکل ہے۔
- ☆ وہ گناہ سب سے بڑا ہے جو کرنے والے کے نزدیک چھوٹا ہے۔

مدیحہ نورین ممک۔ برتالی

## غیبت

حضرت سعدیؒ اپنے باپ کے ہمراہ سفر میں تھے۔ دوران سفر ایک دن اپنے باپ کے ساتھ تلاوت قرآن کرتے رہے۔ تہجد کے وقت آپ نے نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد اپنے باپ سے کہا۔ ”یہ لوگ کیسے بے خبر سو رہے ہیں۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لیں۔“ باپ نے کہا۔ ”اے جان پدرا اگر تم بھی سوتے رہتے تو اس سے بہتر تھا کہ بجائے اس کے لوگوں کی غیبت کر رہے ہو۔“

سعدیہ غالب۔ نارتھ کراچی

## حوالہ کی بیٹی

عورت اور دوا کو کڑوا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ دوا اگر کڑوی ہو تو مریض کے منہ کا ذائقہ خراب رہتا ہے۔ اور عورت کڑوی ہو تو مرد کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اس عورت کو ہرگز کڑوا نہیں ہونا چاہیے۔

جسے ”بیوی“ کہا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے روایتی ماشوں کی طرح پہلے ایک لڑکی سے عشق فرمایا۔ پھر اس سے شادی کر لی۔ وہ بیاں کرتے ہیں کہ جب تک میری بیوی، میری محبوبہ تھی۔ اس وقت تک وہ بڑی شیریں

اس کی گفتگو سن رہا تھا اور اس کو ایک مذاق سوچھا۔ اس نے کھانے پینے کی اشیا خریدیں اور اس بوڑھی عورت کا ایڈریس معلوم کرنے کے بعد اپنے نوکر سے بولا کہ جا کر ”اس بوڑھی عورت کو دے آؤ اور جب وہ پوچھے کہ کس نے بھیجا ہے تو بتانا یہ شیطان کی طرف سے تحفہ ہے۔“ وہ بوڑھی عورت اتنے زیادہ کھانے کا سامان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور جلدی اپنے گھر کے کونے میں وہ رکھنے لگی۔ ایسے میں نوکر نے پوچھا کیا آپ معلوم نہیں کرنا چاہیں گی کہ یہ سامان کس نے بھیجا ہے۔“ یہ سن کر وہ بولی۔

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ کس نے بھیجا ہے، مگر اتنا معلوم ہے کہ جب میرے رب کا حکم آتا ہے تو شیطان بھی حکم کی تعمیل کرتا ہے۔“

حمدا واجد۔ کراچی

## وجہ

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔ ”عورت میں تیری تعریف اس وجہ سے نہیں کرنا کہ تو کائنات میں سب سے زیادہ حسین ہے اور میں اس سبب سے تجھ سے محبت نہیں کرنا کہ تو انسانی راحت کا سب سے موزوں سرچشمہ ہے بلکہ میں اس واسطے تیری تعظیم کرتا ہوں کہ انسانیت تیرے ہی طفیل قائم ہے۔“

فوزیہ۔ گجرات

## بات کا وزن

ایک پہلوان نما آدمی ایک بڑا سا لکڑی کا گٹھا سر پر لادے گالیاں بکتا چلا جا رہا تھا۔ ادھر سے ایک بزرگ کا گزر ہوا، انہوں نے اس سے پوچھا کہ گے گالیاں دے رہے ہو۔

”ایک شخص مجھے گدھا کہہ کر گیا ہے۔“ اس نے بتایا، بزرگ نے فرمایا۔ تو اتنا بڑا بوجھ اٹھا سکتا ہے مگر ذرا سی بات کا وزن نہیں برداشت کر سکتا۔

آمنہ میر۔ گجرات



## == پانچ منٹ ==

بیوی نے شوہر سے کہا۔ یعنی کے ابو میں ذرا مسز  
معین کے پاس جا رہی ہوں آپ آؤ گھنٹے کے بعد  
ہنڈیا چولہے پر سے اتار لیں اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد  
ہنی کو فیڈر تیار کر کے دے دیں۔ میں ابھی پانچ منٹ  
میں آئی۔“

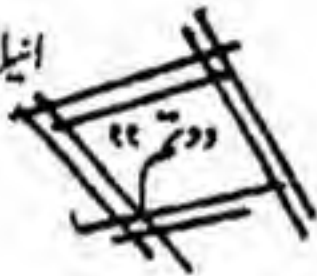
فوزیہ ثمرٹ، آمنہ میر، ام ہانیہ، عمران۔ گجرات

## == لیڈری ==

مل اور زمین الاٹ کراتی ہے لیڈری  
اور کوٹھیوں پہ قبضہ دلاتی ہے لیڈری  
لنچ اور ڈنر مزے سے اڑاتی ہے لیڈری  
عم ساتھ ساتھ قوم کا کھاتی ہے لیڈری  
فرصت ملے تو ٹور پر جاتی ہے لیڈری

مجید لاہوری

انیلا مبین۔ پنڈی



جانتے ہو  
مجھے کیا پسند ہے؟

برستی بارش  
سمندر کی لہریں  
پھولوں کی خوشبو  
چاندنی راتیں  
اچھی شاعری

اور  
اور سب سے زیادہ  
اس تحریر کا  
پہلا لفظ

رباب سرفراز، پتوکی



زبان اور خوش گفتار تھی مگر شادی کے بعد خدا جانے  
اسے کیا ہوا کہ ایک دم کڑوی ہو گئی۔ اب یہ حالت ہے  
کہ اول تو اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی اور  
جب نکلتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں ایک  
عورت کی باتیں نہیں سن رہا۔ بلکہ گریلے کھا رہا ہوں۔  
فوزیہ ثمرٹ۔ گجرات

## کولبس کی کامیابی کا راز

کولبس نے شادی نہیں کی اس لیے امریکہ ڈھونڈ  
لیا اس سے کسی نے نہیں پوچھا۔

۱ کہاں جا رہے ہیں؟

۲ کس لیے؟

۳ کس کے ساتھ؟

۴ کب واپس آؤ گے؟

۵ میں بھی چلتی ہوں؟

۶ مجھے ای کی طرف چھوڑ دیں؟

۷ گھر رہ کے ہی ڈھونڈ لو امریکہ۔

۸ آپ چھوڑ دو کوئی اور ڈھونڈ لے گا امریکہ؟

۹ میں اکیلی گھر میں کیا کروں گی؟

۱۰ اچھا بچوں کو بھی لے جائیں؟

۱۱ میرے لیے کیا لاؤ گے؟

۱۲ کوئی اور چکر بزنس؟

۱۳ اچھا واپس میں دی لیتے آتا؟

شاہدہ عامر۔ لاہور

## == فخر ==

تم کس دنیا پر فخر کرتے ہو؟  
جس کا ”بہترین مشروب“، ”مکھی کا تھوک“  
(شہد) ہے۔ اور بہترین لباس ”کیڑے کا تھوک“  
(ریشم) ہے۔ مجھے اس دنیا سے کیا لینا؟ جس کے  
”حلال“ میں حساب اور ”حرام“ میں عذاب ہے۔

(شیخ سعدی)

حمدا واجد کراچی





مگر جب بھول مر جھائے  
کہو خوشبو بھلا کیسی  
کہا تھا یاد ہے تم نے  
کہ میں ہوں دل  
غم ہو دھڑکن  
مگر دل ٹوٹ جلتے تو  
کہو پھر دھڑکن کیسی  
کہا تھا یاد ہے تم نے  
کہ میں ہوں اس  
اندہم زندگی میری  
مگر جب اس ٹوٹے تو  
کہو پھر زندگی کیسی

زبیدہ، کی ڈائری میں تحریر  
امجد اسلام امجد کی غزل  
کسی ترنگ کسی سرخوشی میں رہتا تھا  
یہ کل کی بات ہے، دل زندگی میں رہتا تھا

کہ جسے چاند کے چہرے پہ آفتاب کی نو  
کھلا کہ میں بھی کسی روشنی میں رہتا تھا

سرشت آدم خاکی، ذرا نہیں بدلی  
فلک پہ پہنچا مگر غار ہی میں رہتا تھا  
کہا یہ کس نے کہ رہتا تھا میں زملے میں  
بحوم درد، غم بے کسی میں رہتا تھا  
کلام کرتا تھا قوس قزح کے رنگوں میں  
وہ اک خیال تھا اور شاعری میں رہتا تھا

مدد کھ نورین مہک، کی ڈائری میں تحریر  
خمار بارہ بنگوی کی غزل  
وہ ہم میں یوں سمائیں، ہم ان میں یوں سمائیں  
وہ ہم کو بھول جائیں، ہم ان کو بھول جائیں

جاتی ہیں آسمان تک فرقت کی شب دعائیں  
آگے مرا مقدر وہ آئیں یا نہ آئیں

کیوں ان وفا پرستوں پر جاں نہ دیں جفائیں  
کھا کھا کے دل پہ چوئیں جو مسکرائے جائیں

راتیں ہیں خوب واقف اے بدلتی محبت  
میں نے تڑپ تڑپ کر دی ہیں تجھے دعائیں

انگڑائیاں نہ لے یوں اوسو کے اٹھنے والے  
ان مست انگڑیوں کے سانچے چھلک نہ جائیں

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر  
ارد گرد ملک کی نظم

کہا تھا یاد ہے تم نے  
کہ میں ہوں چاند  
اور تم چاندنی میری  
مگر جب چاند چھپ جائے  
کہو پھر چاندنی کیسی  
کہا تھا یاد ہے تم نے  
کہ میں ہوں بھول  
اور تم بھول کی خوشبو



گلوں پہ ڈولتا پھرتا تھا اوس کی صورت  
صد اک لہرتا اور نغمگی میں رہتا تھا

نہیں تھی حسن نظر کی بھی کچھ لے پروا  
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

یا سہیل ملک، کی ڈائری میں تحریر  
مگر مراد آبادی کی غزل

طبیعت ان دنوں بیگناہ غم ہوتی جاتی ہے  
میرے حصے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

قیامت کیا یہ، اے حسن و دو عالم! ہوتی جاتی ہے  
کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

وہ ہی مینخانہ و صہبا، وہی ساغر، وہی شیشہ  
مگر آواز نوشا نوش مدہم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے شاہد و ساقی مگر دل بچھا جاتا ہے  
وہ ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہ ہے زندگی لیکن جگر یہ حال ہے اپنا  
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

کرن سرمد، کی ڈائری میں تحریر

شان الحق حقی کی غزل  
تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جلتے  
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جلتے

دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب  
درد بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

کاش اے ابر بہاری ترے بھلے سے قدم  
میری امید کے ٹھکانے میں بھی گناہے جلتے

ہم بھی کیوں دہری کی رفتار سے ہونٹے مال  
ہم بھی ہر لغزشِ مستی کو سراہے جلتے

ہے ترے فتنہ رفتار کا شہرہ کیا کیا  
گرچہ دیکھا نہ کسی نے سراہے جلتے

کم زنگاہی کی ہمیں خود بھی کہاں تھی توفیق  
کم زنگاہی کے لیے عذر نہ چاہے جاتے

لذت درد سے آسودہ کہاں دل ولے  
ہیں فقط درد کی حسرت میں کراہے جلتے

دی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورہ  
اور کچھ دن غم ہستی سے نباہے جلتے

صبا خان، کی ڈائری میں تحریر  
طارق بدایونی کی غزل

اک نہ اک شمع اندھیرے میں جلائے رکھے  
صبح ہونے کو ہے، ماحول بنائے رکھے

جن کے ہاتھوں سے ہمیں زخم نہاں پہنچے ہیں  
وہ ہی کہتے ہیں کہ زخموں کو پھپھائے رکھے

کون جلتے کہ وہ کس راہ گزر سے گزرے  
ہر گزر گاہ کو پھولوں سے سجائے رکھے

دامن یاد کی زینت نہ بنے ہر کرسو  
اپنی پلاروں کے لیے کچھ تو بچائے رکھے





شفق راجپوت — گوجرہ

تقدیر نے، فلک نے، محبت نے، عشق نے  
جس نے بھی چاہا میرا تماشا بنا دیا

فوزیہ نغریٹ — بکرات

میرے ہونے میں کھلے ہیں تیرے بھر کے پھول  
کب آئے ان پہ تیرا موسم و فساد بھی  
کبھی ہو یوں بھی کہ وہ آئے اودھم نہ ملیں  
کبھی تو اہل جفا کا بھی حوصلہ دیکھیں

گردیا شاہ — کھر وڑپکا

ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو  
محبتیں کچھ نہیں کہتیں وفا میں مار دیتی ہیں

حورین زینب — کھر وڑپکا

ایک وہم ہے یہ دنیا اس میں  
کچھ کھوؤ تو کیا اور پاؤ تو کیا  
ہے یوں بھی زیاں اور یوں بھی زیاں  
جی جاؤ تو کیا، مر جاؤ تو کیا

بریرہ اکرام — کراچی

لوگ یاد آتے ہیں بارشوں کے موسم میں  
درد مسکرتے ہیں بارشوں کے موسم میں  
زیر آب آگئی ہیں بستیاں دل و جان کی  
بند ٹوٹ جاتے ہیں بارشوں کے موسم میں

قرأت اکرام — کراچی

بارش کی دم جھم میں جدائیوں کا موسم ہے  
منتظر نگا ہوں میں پانیوں کا موسم ہے  
خواب بن کر نگاہوں میں کوئی نہیں ملے گا  
ان جزیروں میں اب رنجگوں کا موسم ہے

مدیحہ نورین مہک — برنالی

ابھی تو ساتھ چلتا ہے سمندر کی مسافت تک  
کنارے پر اسی دیکھیں گے کنارہ کون کرتا ہے

فرحین ظفر — کراچی

کاش کوئی ایسا ہو جو گلے لگ کر کہے کہ  
پاگل تیرے درد سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے

بینا ظفر — کراچی

مجھے بھی بتا سنا کہ بدل جاتے ہیں لوگ  
مگر تمہیں کبھی میں نے لوگوں میں گناہی نہیں

ثریت راشد — کراچی

کبھی ہونٹوں پہ انگلیاں کبھی یوں سرگوشیاں  
اُف ان کا انداز حق جتنا نا بہت جان لیو ہے

شاہد ظفر — کراچی

میرے سجدوں کے تسلسل کو تو کیا جلنے میرے ہمد  
سر جھکے تیری خوشی مائی ہاتھ آئے تیری زندگی مانگی

سیدہ نسبت ذہرا — کھر وڑپکا

تیمون میرے ہمد میں  
خواہش نا تمام، رات اور اداسی  
آج پھر تیرے نام کی  
شام، رات اور اداسی

صائمہ جمی — کراچی

اک۔ دل کا کہا مانو، اک کام کر دو  
اک بے نام سی محبت میرے نام کر دو  
میری ذات پر فقط اتنا احسان کر دو  
کسی صبح ملو اور شام کر دو

آسیہ جاوید — علی پور چیمہ

باہر تو ہر اک سمت تھا ہنگامہ محشر  
سنائے کا پہرہ تو فقط دل پہ لگا تھا

بیاسامہ انجم — فیصل آباد

دو دن کی زندگی سے کیا کرو گے الجھر کر  
رہو تو پھولوں کی مانند الجھر و تو خوشبو بن کر



نمرہ، اقرا کراچی  
خالی ہاتھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فرائد  
کس طرح لوگ لکڑوں سے نکل جاتے ہیں

اقصی نامہ کراچی  
موسم کی مثال دوں یا تمہاری  
کوئی پوچھ بیٹھا ہے بدلنا کس کو کہتے ہیں

روبی کراچی  
اک لفظ و فاسنا تھا  
ڈھونڈا بہت، ملا ہی نہیں

عند انامہ کراچی  
کبھی حیات کی ضمانت کبھی وصال موت  
نگاہ یاد! تیرا بھی کوئی اعتبار نہیں

یاسمین ملک کراچی  
اس نے ہنسی ہنسی میں عجب کی بات کی  
ہم نے قہقہے اس کو مگر نے نہیں دیا

رموانہ شکیل ڈاڈا کراچی  
تسلل اس کی یادوں کا ہوا ہے ایک یوں جیسے  
کسی جوگی کا منتر ہو کسی دعا کی آہیں ہوں

ندا، فضا کراچی  
تمہارے ہی ہاتھ میں ہے نبض سکون شاید  
قرار دیتے بھی ہو تو ایسے جیسے ادھار دیتے ہو

ماٹ کراچی  
سو تم خواب ہو میرا  
سو تم خواب نہ ہونا  
کبھی میں خواب تھا تیرا  
جو تم نے خواب کر ڈالا

مدد کچھ فہمید کراچی  
ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے  
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدا ٹیل کیا کیا

صائمہ جی کراچی  
چلتی ہیں دل کے شہر میں، یوہنی ملکوتیتیں  
جو اس نے کہہ دیا، وہی دستور ہو گیا

نعل تاج، ٹینڈ تاج کراچی  
وہ بھی رہا بیگانہ، ہم نے بھی نہ پہچانا  
ہاں، اس کو لو لوانہ اپنا بند تو ایسا ہو

حمیرہ قلیشی لاہور  
مذقوں بعد مجھ کو پھر تیرا خیال آیا  
تیرے نہ ملنے کا سمٹ مجھ میں طال آیا

سی سی ظفر کراچی  
تار یک شب میں تنہا جھیل دکھوں کو  
آمد مجھ پر تیری یادوں کا و بال آیا

سعدیہ عرفان کراچی  
بارشوں کے موسم میں بارشیں تو ہوتی ہیں  
دل میں بھیگ جانے کی خواہشیں تو ہوتی ہیں

فقط باتیں اندھیروں کی، فقط قہقہے اُبالوں کے کراچی  
چراغ آندولے کر، نہ تم نکلے، نہ ہم نکلے

صبا، اربہ کراچی  
سکھا دی ہے وفائی بھی، تمہیں ظالم زمانے نے  
کہ تم جو سیکھ لیتے ہو، ہم ہی پہ اُڑاتے ہو

افشاں کراچی  
ہم بھی ہیں کیا عجب کہ کڑی دھوپ کے تلے  
صحرایا خرید لائے ہیں برسات بیچ کر

صف عمران کراچی  
حق ہمسائیگی یوں بھی تو ادا ہوتا ہے  
دھوپ بھی مٹک لی دیوار کو اور پچا کہنے

نادیہ کراچی  
جل جاؤ خوشی سے کڑی دھوپ میں لیکن  
اپنوں سے — کبھی سایہ دیوار نہ مانگو

نازش رحمان کراچی  
مجھ سے مت پوچھ کہ احساس کی حدت کیا ہے  
دھوپ ایسی بھی نہ مٹے کو بھی جلتے دیکھا



# کرن کا دستہ ہلال

خالد جیلانی

ولایتی تکے اشیاء :

گوشت  
کالی مرچیں  
ادرک  
لہسن  
نمک  
آئل  
ایک کلو  
پسی ہوئی ایک چمچ  
پسا ہوا ایک چمچ  
پسا ہوا ایک چمچ  
حسب ذائقہ  
حسب ضرورت

سرکہ  
گرم مسالا  
ٹماٹر  
آئل  
نمک مرچ  
پیتا  
ترکیب :

دو تہے  
ایک چمچ پسا ہوا  
ایک عدد  
150 گرام  
حسب ذائقہ  
ایک انچ کا ٹکڑا

ترکیب :

گوشت کو اچھی طرح سے دھو لیں، پھر اس کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر لیں، اب اس میں ادرک، لہسن، نمک اور کالی مرچیں ڈال کر اچھی طرح ملا لیں اور دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک انچ کے کر لیں۔ سرکہ میں لیموں کا رس اور سب مسالے ملا دیں۔ اب گوشت شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں اور ریفریجریٹر میں دو تین گھنٹے رکھ دیں۔ پیاز اور ٹماٹر گول گول کاٹ لیں۔ اب ایک گوشت کا ٹکڑا، ایک

اب آگ جلائیں اور اس پر جالی رکھ کر بوٹیاں جالی پر رکھ کر سینک کر پختہ کریں۔ اس دوران میں ان پر تھوڑا تھوڑا آئل پکاتے رہیں۔ اس طرح گوشت جلد گلتا ہے اور اس کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے۔

پیاز کا، ایک ٹماٹر اور پھر ایک گوشت کا ٹکڑا سینخوں میں پرو کر کونکوں پر اچھی طرح سینک لیں، ساس کے ساتھ نوش فرمائیں۔

کڑا ہی قیمہ

اشیاء :  
کٹا ہوا قیمہ  
ٹماٹر  
ہری مرچ  
ادرک پیسٹ  
لہسن  
پیاز  
سرخ مرچ  
دھنیا پاؤڈر  
زیرہ پاؤڈر  
نمک

1/2 کلو  
ایک پاؤ  
آٹھ دس عدد  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
دو عدد سلائس کاٹ لیں  
دو چائے کے تہے  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ



شیش کباب

اشیاء :

ران کا گوشت۔ آدھا کلو  
لیموں

ایک عدد

کرن 278 اکتوبر 2015



100 گرام (گٹھلیاں نکلی ہوئیں) کھجور  
 150 گرام ساہ کیک  
 150 گرام (خوب مسلا ہوا) ساہ بسکٹ  
 100 گرام تل  
 آدھا چائے کا چمچہ (پسی ہوئی) دار چینی  
 ایک کھانے کا چمچہ کوکواؤڈر  
 حسب ضرورت کشمش  
 حسب ضرورت ہشو پیپر  
 حسب ضرورت آئل  
 ترکیب :

کھجوریں، ساہ کیک، بسکٹ، دار چینی، کوکواؤڈر اور تھوڑا سا آئل ملا کر گوندھ لیں۔ اب اس میں کشمش بھی ملا دیں اور گوندھے ہوئے اس آمیزے کو رول کی شکل دے دیں۔ ایک ٹرے میں تل پھیلا کر اس رول کو گھما میں تاکہ تل اس پر لگ جائیں۔ اب اس کھجور رول کو ہشو پیپر میں لپیٹ کر فریزر میں رکھ دیں، جب ٹھنڈا ہو کر سخت ہو جائے تو ہشو پیپر سے نکال کر اس کے ٹکڑے کاٹ لیں اور نوش جان کریں۔

### سکھند

اشیاء :  
 دی  
 الائچی پاؤڈر  
 خشک دودھ  
 شکر  
 گھی  
 ترکیب :

دی کو ململ کے کپڑے میں ڈال کر لٹکا دیں۔ جب دی سے پانی نکل جائے تو تمام اجزاء کو یکجا کر کے اچھی طرح پھینٹ لیں اور کیک پن کو گھی لگا کر چکنا کرنے کے بعد یہ آمیزہ اس میں پلٹ دیں۔ دو سے تین گھنٹے تک بخ ٹھنڈا کرنے کے بعد نوش کریں۔



گرم مسالا  
 آئل  
 3/4 کپ  
 آدھا چائے کا چمچہ  
 ہر ادھنیا اور ہری مرچ  
 گارنش کے لیے  
 ترکیب :

پہلے آئل کو گرم کریں، پیاز کو ٹرانسپیرنٹ فرائی کر لیں۔ اب قیمہ ڈال کر نمک اور ادھرنک، لہسن ڈال کر تھوڑا سا بھونیں اور ایک کپ پانی ڈال دیں اور جب قیمہ نیم گل جائے پھر کٹے ہوئے ٹماٹر اور ہری مرچ ڈال دیں اور اس وقت تک بھونیں جب آئل اوپر آجائیں آخر میں گرم مسالا اور ہر ادھنیا شامل کر دیں۔ گرم گرم سرو کریں۔



### کھجور رولز

اشیاء :



# حسن و صیغہ

ادارہ

سے بطور خاص آپ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔  
اس کے علاوہ ہلشور لگانے کی کچھ آسان ٹپس بھی آپ  
کے لیے پیش کی جا رہی ہیں تاکہ آپ اپنے رخساروں  
کو گل انار بناسکیں اور حسن کرشمہ ساز کاراز جان  
سکیں۔

## سرخ اور گلابی

جب بھی ہلشور کے ریڈ یا پینک شیڈز لگانے کا سوال  
آئے تو یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ آپ کی جلد پتلی  
ہے یا قدرے موٹی اور اس کا ٹائپ کیسا ہے، یعنی یہ  
خشک ہے۔ چکنی یا پھر ملی جلی۔ تاہم ریڈ اور پینک کے  
سوفٹ سے لے کر ڈیپ شیڈز میں سے میٹ کھڑا جھم  
رہتے ہیں۔ فاؤنڈیشن لگانے سے پہلے تھوڑا سا کریمی  
ہلشور لے کر رخساروں پر لگالیں۔ اس سے آپ کے  
چہرے پر تازگی اور چمک آجائے گی۔ لیکن جب آخر  
میں مین ہلشور لگانے کا وقت آئے تو رخساروں کے  
ابھاروں پر پاؤڈر ریڈ ہلشور لگائیں۔

## پتلی اور سبک اور کورل

جب بھی ان تینوں رنگوں میں سے ہلشور کا انتخاب  
کرنا چاہیں تو انہیں لگاتے وقت اس بات کا خیال  
رکھیں کہ رخساروں کے ابھار کے عین اوپر قدرے  
گہرے اسٹروکس میں یہ شیڈز لگائیں۔ یہ تینوں رنگ  
آپ کی شخصیت میں گرم جوشی کا ساتھ ساتھ پیدا کرنے  
کے ساتھ تازگی بھی بخشتے ہیں۔ اگر آپ ڈیپ اور سبک  
ہلشور لگانا چاہیں تو اس کے ساتھ بروئزر بھی استعمال



## بلش آن

ہلشور یا بلش آن آپ کے چہرے کا تاثر ایک دم  
بدلی ڈالتا ہے۔ آپ تھکی ہوئی ہوں اور چہرے پر ترو  
تازگی کا تاثر لانا چاہیں تو اس معاملے میں ہلشور سے  
زیادہ کوئی آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال یہ پیدا  
ہوتا ہے کہ کب کون سا اور کیسا ہلشور لگایا جائے کہ  
آپ کا چہرہ ایک دم کھل اٹھے۔ کیونکہ اگر آپ ان  
میں سے انتخاب کرنا چاہیں تو ہلشور کی لاتعداد اور انٹی  
موجود ہے جو آپ کو کنفیوژ کرنے کے لیے کافی ہے۔  
یہاں آپ کے لیے اس بارے میں کچھ تجاویز پیش کی  
جا رہی ہیں کہ مختلف ہلشورز اور بروئزرز میں سے کون



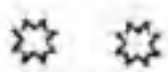
دونوں کے بارے میں ایک مختصر سا جائزہ آپ کے لیے پیش ہے تاکہ آپ اپنے لیے موزوں بلش کا انتخاب کر سکیں۔

### پاؤڈر

ہلشور کی یہ قسم ان خواتین کے لیے موزوں ہوتی ہے جن کی جلد چکنی ہو۔ کریمی ہلشور میں موجود آئل ان کے چہرے پر دانے وغیرہ نکلنے کا سبب بن سکتا ہے اس لیے چکنی جلد کی حامل خواتین کے لیے پاؤڈر ہلشور ہی مناسب رہتا ہے۔ جب بھی پاؤڈر ہلشور لگائیں تو برش پر ہلشور لگانے کے بعد اسے ہلکے سے جھٹک دیں تاکہ اس پر سے اضافی پاؤڈر جھڑ جائے۔ پھر اسے ہلشور لائن کی جانب سے لگاتے ہوئے رخساروں کی جانب لائیں۔ اس طریقے سے ہلشور کی ایک یکساں تہ آپ کے رخساروں کو چمکادے گی۔

### کریمی

کریمی ہلشور لگانا نسبتاً آسان ہوتا ہے اور یہ آپ کی جلد میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ بلیئنڈ ہو جاتا ہے۔ اس سے نہ صرف آپ کی اسکن مونسچورائز ہو جاتی ہے بلکہ آپ کے چہرے پر تازگی کی جھلک بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کی جلد نارمل یا خشک ہے تو آپ کے لیے کریمی ہلشور سے بہتر کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ گرمیوں کے موسم میں بھی آپ کی جلد پر تادیر قائم رہتا ہے۔ کچھ ہلشورز جیل کی شکل میں بھی ملتے ہیں جنہیں آئلی اسکن والی خواتین بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ ان کے ٹکڑوں تک ماند نہیں پڑتے اور یہ آپ کی جلد میں بہت اچھی طرح بلیئنڈ ہو جاتے ہیں۔



کریں تاکہ آپ کا میک اپ پرفیکٹ دکھائی دے۔  
براؤن اور ڈارک گرے

اس قسم کے گرے ہلشور استعمال کرنا چاہیں تو زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ انہیں رخساروں کے ابھار سے نیچے لگائیں۔ اس سے آپ کا چہرہ ہلکا اور پتلادکھائی دے گا۔ ان ڈارک شیڈز کو مہارت کے ساتھ اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی مدد سے آپ کا چہرہ پتلا اور نقوش یکساں نظر آئیں۔

### بروزررز

یہ خواتین میں بہت زیادہ مقبول ہیں کیونکہ ان کے استعمال سے چہرے پر ایک سادہ اور فطری سی چمک آ جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے رخساروں کے ابھار کے عین اوپر بروزررز پھیلا کر لگائیں۔ اس کے علاوہ پیشانی، ناک کے درمیان اور ٹھوڑی پر بھی لگائیں۔ جن خواتین کی رنگت گلابی یا سرخی مائل ہو، انہیں سرخی مائل بروزررز لگانا چاہیے۔ تاہم پیلے شیڈز پر مشتمل بروزررز سب ہی خواتین پر سوٹ کرنا ہے۔

### ہائی لائٹرز

یہ آپ کے چہرے کو ایک دم جگمگا سادیتا ہے۔ ہائی لائٹرز کا مہارت کے ساتھ کیا گیا استعمال چہرے پر تازگی لانے کے ساتھ کم سنی کا تاثر بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی کا چہرہ قدرے لمبا ہو تو ہائی لائٹرز کی مدد سے اسے متوازن لک دی جاسکتی ہے۔ اپنی رنگت سے ایک یا دو شیڈز ہلکا ہائی لائٹرز منتخب کریں اور اس کی مدد سے چہرے کے مطلوبہ حصوں کو ہائی لائٹ کر لیں۔ آپ کا چہرہ چمک اٹھے گا۔

### پاؤڈر یا کریمی ہلشور؟

ہلشورز کا استعمال کرتے وقت یہ مسئلہ بھی غور طلب ہوتا ہے کہ پاؤڈر ہلشور استعمال کریں یا کریمی؟ اور یہ کہ کون سا ہلشور آپ کو سوٹ کرے گا۔ لہذا ان





## رحم دل

بیٹا باپ سے۔ ”ابو جب امی گاتی ہیں تو اپنی آنکھیں بند کیوں کر لیتی ہیں؟“  
 باپ۔ ”بیٹا تمہاری امی بہت رحم دل ہیں۔“  
 بیٹا۔ ”وہ کیسے؟“  
 باپ۔ ”ان کی آواز سننے سے دوسروں کو جو صدمہ ہوتا ہے وہ یہ دیکھ نہیں سکتی۔“  
 مول آفتاب۔ کراچی

## بے بسی

ایک صاحب اپنے دوست سے اپنے بیٹے کی شکایت کر رہے تھے۔  
 ”برخوردار نے جب سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے پڑھائی کی طرف دھیان دینے کی بجائے لڑکیوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ لان میں لڑکیوں کے ساتھ، لائبریری میں لڑکیوں کے ساتھ، کینٹین میں لڑکیوں کے ساتھ، حتیٰ کہ یونیورسٹی سے باہر بھی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یونیورسٹیوں میں یہی کچھ ہوتا ہے تو اسے دکان پر بٹھا دیتا اور خود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا۔“

ثمینہ اعجاز۔ خان پور

## بے خبری

بیوی اپنے شوہر سے۔ ”تم تو کہتے تھے کہ شادی کے بعد بھی مجھے بہت پار کرو گے۔“  
 شوہر۔ ”تو مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری شادی مجھ سے ہی ہو جائے گی۔“

قرۃ العین عمران۔ اسلام آباد

## حفاظت

بیوی شوہر سے۔ ”کیا میں کبھی تمہارے خواب میں آئی ہوں؟“  
 شوہر۔ ”کبھی نہیں۔“  
 بیوی۔ ”کیوں؟“

شوہر۔ ”کیونکہ میں آہستہ الکرسی پڑھ کر سوتا ہوں۔“

بینش خان۔ اٹک

## شامت اعمال

ڈاکٹر۔ ”آپ کے تین دانت کیسے ٹوٹ گئے؟“  
 مریض۔ ”جی وہ میری بیوی نے کڑک روٹی بتائی تھی۔“  
 ڈاکٹر۔ ”تو کھانے سے انکار کر دیتے۔“  
 مریض۔ ”جی وہ ہی تو کیا تھا۔“

نورین ظفر۔ راولپنڈی

## سچائی

بچ۔ ”کیا ثبوت ہے کہ تم گاڑی اسپید میں نہیں چلا رہے تھے؟“  
 مجرم۔ ”سر میں اپنی بیوی کو لینے سسرال جا رہا تھا۔“

بچ۔ ”all Case Dismissed“  
 ”Thats“

حنا کرن۔ چنکی

## آزادی

کسی نے ایک شادی شدہ شخص سے پوچھا۔



”آب شادی سے پہلے کیا کرتے تھے؟“

اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بولا۔ ”جو میرا دل کرتا تھا۔“

شامِ مراد۔ لاہور

### اگر لڑکیاں نہ ہوتیں

ایک لڑکا اور لڑکی انٹرنیٹ پر چیٹنگ کر رہے تھے۔

لڑکی۔ ”ایک بات پوچھوں؟“

لڑکا۔ ”ہاں ضرور پوچھو۔“

لڑکی۔ ”ہم لڑکیاں نہ ہوتیں تو تم لڑکے کہاں جاتے؟“

لڑکا۔ ”اللہ دی قسمیں ڈائریکٹ جنت جے۔“

انیلا۔ پھول نگر

### حقیقت

لڑکی اپنے نابینا عاشق سے ”کاش تمہاری آنکھیں ہوتیں تو تم میرے حسن کو دیکھتے۔“

لڑکا۔ ”اگر تم خوب صورت ہوتیں تو کیا آنکھوں والے تمہیں میرے لیے چھوڑتے اندھا ہوں پاگل نہیں ہوں۔“

فرح اسلم۔ کراچی

### حاضر و ماضی

اٹلی کے ایک قصبے کا حجام نہایت مغرور اور ضدی طبیعت کا مالک تھا۔ ایک دن گاہک نے بتایا کہ وہ چھٹیوں میں روم جا رہا ہے اور وہ پوپ سے بھی ملنے کی کوشش کرے گا۔ حجام نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

”تم اور پوپ سے ملو گے؟ مجھے تو یہ سوچ کر ہنسی آرہی ہے پوپ تو بادشاہوں سے ملتا ہے۔ وہ تم سے کیوں کر ملے گا؟“

گاہک یہ سن کر خاموش رہا۔ ایک ماہ بعد وہی گاہک دوبارہ بال بنوانے حجام کے پاس پہنچا۔ حجام نے اس سے پوچھا کہ

”تمہیں روم کیسا لگا؟“

”بہت مزا آیا اور میں پوپ سے بھی ملا۔“ جواب ملا۔

حجام نے حجت کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو تم نے مرکزی چوک پر کھڑے ہو کر دوسرے لوگوں کے ساتھ اسے دیکھا ہوگا؟“

”ہاں! لیکن وہ گاڑ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ”پوپ تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ پوپ کے نجی کمرے میں لے گئے۔“

”واقعی! پوپ نے تم سے کیا کہا؟“ حجام نے حیرانگی کے عالم میں دریافت کیا۔

گاہک اطمینان سے جوابا بولا۔

”پوپ نے مجھ سے سوال کیا کہ تمہارے بالوں کی اتنی گھٹیا کٹائی کس نے کی ہے؟“

فرح بشیر۔ بھائی پھیرو

### جواب

ڈاکٹر نے مریض کی بیوی کو تھوڑا الگ کر کے کہا۔ ”آپ کے شوہر ٹھیک ہو سکتے۔ بشرطیکہ کہ آپ انہیں کوئی مینشن نہ دیں ان کا خیال رکھیں اور ان کی دل و جان سے خدمت کریں۔“

بیوی واپس آئی تو مریض شوہر نے پوچھا۔

”ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

بیوی نے بے زاری سے کہا۔

”ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔“

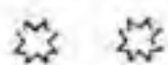
طاہرہ ملک۔ جلالپور پیر والا

### لا علمی

ایک صاحب اپنی بیوی کے بارے میں اپنے دوست کو بتا رہے تھے۔

”شادی سے پہلے مجھے معلوم تھا کہ اس کے باپ نے اسے اسکول کامنہ نہیں دیکھنے دیا۔ مگر مجھے یہ شادی کے بعد ہی پتا چلا۔ کہ اس کی ماں نے کبھی باورچی خانے کامنہ بھی دیکھنے نہیں دیا۔“

ارم۔ کراچی





ذوق عریں



س ذکیہ میمن۔۔۔ تھرپار کر  
آج کل کے لڑکے خود کو شنزادہ کلفام کیوں  
سمجھتے ہیں؟  
ج یہ شنزادہ کلفام کون ہے، ہماری گلی میں تو نہیں  
رہتا۔

س گل یا مین آرزو۔۔۔ حیدر آباد  
زبان کا گھاؤ تیز ہوتا ہے یا نظر کا؟  
ج یہ تو گھاؤ کھانے والے کی ہمت پر منحصر ہے۔  
س عدیلہ الیاس۔۔۔ گوجرانوالہ  
انکل! اگر خدا گنجے کو ناخن دے دے تو؟  
ج کیا سر پر بھی؟

س نصرت۔۔۔ مردان  
نمین بھیا! میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو کبھی الٹا  
کھڑا دیکھوں حقیقت میں؟  
ج آجاؤ کسی دن۔

س عظمیٰ عزیز خان۔۔۔ لاہور کینٹ  
نمین بھیا! چلتی کا نام گاڑی ہے، بڑھتی کا نام  
واڑھی اور کھتی کا نام کیا ہے؟  
ج آج کل ساڑھی ہے۔

س چودھری رومانہ بشیر، چودھری ثمرین بشیر۔۔۔ نامعلوم  
حسن کو چاند، جوانی کو غزل تو بڑھا ہے کو کیا کہتے  
ہیں؟  
ج آزاد نظم۔

س چاند سلطانہ عروج۔۔۔ کراچی  
نمین جی! اگر آنکھوں سے آنکھیں ملیں تو چار  
ہو جاتی ہیں لیکن اگر آنکھوں میں لینس لگے ہوں تو؟  
ج پھر دو چار بلکہ لاچار ہو جاتی ہیں۔



شاہین نزہت۔۔۔ کراچی

س اے زلفی! یہ تو بتاؤ عاشق اور الو میں کیا فرق ہے؟  
ج سچ تو یہ ہے کوئی فرق نہیں، بس فرق اتنا ہے الو  
درخت پر رات بھر جاگتا ہے اور عاشق کو درخت بھی  
میسر نہیں۔

غزالہ خان۔۔۔ شور کوٹ

س آج کل کے تہذیب یافتہ دور میں ہم لوگوں کو  
کتنی آزادی ملنی چاہیے؟  
ج جتنی ملی ہوئی ہے، وہ کیا آپ کے لیے ناکافی ہے۔

عائشہ خاتون۔۔۔ کراچی

س پہلے آغا خان میڈیکل کالج پھر بلدیہ کا گریڈ کالج۔  
جب اتنے ڈاکٹر۔ تو ہم کہاں جائیں گے؟  
ج ڈاکٹروں کے پاس۔





اس ماہ کا خط

رضوانہ ملک۔ جلالپور پیر والا

کرن خوب صورت ٹائٹل سے سجا 13 تاریخ کو ملا۔ کرن کے سارے سلسلے ہمیشہ کی طرح لا جواب تھے "معدا سچل" میں شیفت راحت کو کافی دلچسپی سے پڑھا لیکن انہوں نے کوئی ریسیبی نہیں بتائی۔ حمزہ علی عباسی اور فارس شفیق دونوں سے ملاقات اچھی رہی "مقابلہ ہے آئینہ" میں سدرہ یوسف کو دیکھ کر اچھا لگا اور ان کے جوابات پسند آئے۔ "راپنزل" پہلی قسط سے ہی اچھا جا رہا ہے بس شہرین جلدی سے ٹھیک ہو اور خوش رہنا شروع کر دے۔ نینا کی اپنے باپ سے کیوں ناراضی چل رہی ہے وہ کیوں ان سے خفا سی رہتی ہے؟ سلیم تو نینا کو پسند کرنے لگا ہے لیکن نینا نے تو انکار کر دیا ہے اب دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔

فرحین اظفر کا ناول "ردائے وفا" بڑی دلچسپی سے آگے بڑھ رہا ہے جیب بے چارہ ہاسپتال میں ہے اور اس کی فیملی کو ابھی تک پتا نہیں چل سکا اس کے بارے میں اور ناکملہ دن بہ دن اپنے شوہر کی نظروں سے گرتی جا رہی ہے۔ معراج ابھی تو اچھا ہے عفت کے ساتھ اللہ کرے آگے بھی یونہی رہے۔

"میں گمان نہیں یقین ہوں" میں زیان کو ایک کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اور لگتا ہے ایک کو جلد ہی پتا چل جائے گا کہ زیان کو کوئی جن نہیں چمنا بلکہ وہ ایک تنگ کر رہی ہے اور رنم کو تو پتا چل گیا ہے کہ اس کا باپ زندہ ہے اسے واپس چلے جانا چاہیے تھا۔

"شاید" میں سالار کو ام ہانی سے کس طرح کا پیار ہے کہ اسے اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا، سالار ام ہانی کو کیوں جھکا کا چاہتا ہے۔ سلمیٰ فقیر حسن کا ناول "پھر نہ کہنا" بہت ہی زبردست تھا اس ناول نے بہت ہنسایا ہے جاسوں کا ہاشم علی کو بے وقوف بنانا اور ایک جھوٹ چھپانے کی خاطر اور جھوٹ بولنا اور اینڈ میں ہاشم کا زچ ہو جانا مزا آگیا اس ناول کو پڑھ کر ذیہ سلمیٰ جی آپ اس طرح کے ناول لکھتی رہیں گے۔ نایاب جیلانی کا ناول بھی بہت اچھا تھا اس میں ان کا سات منزلہ مکان اور ساتوں بھائیوں کا آپس میں پیارا اچھا لگا مگر آؤ فلاح کی جوڑی سیٹ بھی حسین کو فخر کے حق پہ ڈاکہ نہیں ڈالنا چاہیے تھا جبکہ اسے پتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ان کا آپس میں رشتہ بھی ہو گیا ہے لیکن مبین کی ساری کوششوں کے باوجود بھی اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور فلاح نے مبین کے لیے اچھی سزا تجویز کی تھی کچھ نہ جتا کر۔

"اب نیند ہوئی برائی" بھی بیسٹ ناول تھا جمشید صاحب کی دوش بھی پوری ہو گئی کہ ان کی پوری فیملی سدھرمئی اور زینا کی بھی دوش پوری ہو گئی شہزادے سے شادی کرنے کی۔

نادیہ احمد کا افسانہ بھی اچھا تھا اس میں حسن کا رویہ غلط تھا کہ اس نے اپنی پہلی بیوی کا بدلہ دوسری سے لیا لیکن ماہانے اچھا فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شوہر کے پاس پلٹ گئی اور رامس کو ماں اور باپ دونوں کا پیار ملا۔ "بس ایک حرف" بھی اچھا افسانہ تھا اور سحرش فاطمہ کا "رواجوں کے قیدی" بھی اچھا تھا۔ "کچھ موتی پننے ہیں" میں صدف سمجھ اور انیلا کرن کا اقتباس پسند آیا نمرا، اقرا اور تحریم کے شعر پسند آئے اور کرن کتاب گوشت کے پکوان میں ساری ڈشٹنر لا جواب تھیں۔

10 اکتوبر کو میری سسرطاہرہ ملک کی سالگرہ ہے۔ سو بیسی برتھ ڈے ٹوٹا ہرہ۔

ج : پیاری رضوانہ! کرن پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ مختصر اور جامع ہے۔

آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہے۔ تبصرے کی غیر ضروری طوالت بعض اوقات تبصرے کے حسن کو ختم کر دیتی ہے اور اصل مقصد سے دور کر دیتی ہے لہذا بہنوں سے گزارش ہے کہ غیر ضروری طوالت کی بجائے مختصر اور جامع تبصرے تحریر کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ قاری بہنوں کے خطوط شامل کیے جاسکیں۔

]]ماہنامہ کرن 285 اکتوبر 2015]]



## ستارہ آئین کو مل۔ پیر محل

ستمبر کا کرن جلدی مل گیا۔ ماڈل بہت بھلی لگی۔ حمد نعت سے دل و دماغ منور کرتے، شیفت راحت سے ملاقات اچھی لگی، کمال خاتون ہیں۔ حمزہ علی عباسی سے ہائے ہیلو خوب رہی۔ سدرہ یوسف ویری ٹاکس۔ "راپنزل" حسب معمول زبردست ہے۔ نایاب جیلانی نے "شہ مات" کے ساتھ بہت انجوائے کروایا "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ جی شاباش "پھر نہ کہنا" سلمیٰ فقیر حسین کے ساتھ بہت مزا آیا۔ مقدس مشعل نے وہی روایتی کہانی لکھی۔ "شاید" فائزہ جی نسیم گریٹ ہو۔ نادیہ اور سحرش نے بھی اچھا لکھا۔ اب جاتے جاتے اک اچھی خبر ہماری مستقل تبصرہ نگار محترمہ امبر گل اکٹوبر کے پہلے چھپتے پیا دس سدھار رہی ہیں ان کے لیے بہت بہت مبارک باد ڈیجیٹل ساری دعا کریں آپ سب۔ اللہ پاک اسے شاد و آباد رکھیں۔

ج کو مل! کرن پسند کرنے کا شکریہ۔ ہماری طرف سے امبر گل کو بہت بہت مبارک ہو۔

## ماریہ طفیل۔ تلعبہ تحصیل، میاں چنوں ضلع خانیوال

ستمبر کے شمارے میں اپنا خط شائع دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور یہ بھی بہت اچھا لگا کہ آپ کو میرا کرن میں شرکت کرنا اچھا لگا۔ اس دفعہ کرن کا ٹائٹل اچھا تھا "میں گمان نہیں یقین" میں نیناں (رہنم) کا کردار بالکل بھی اچھا نہیں لگا اور زیان ٹانگ کر رہی ہے یا ج میں اس کو کچھ ہے۔ فائزہ افتخار کا ناولٹ "شاید" بہت اچھا تھا۔ ام ہانی کو سالار سے ہی ملانا کیونکہ سعد ابھی بہت چھوٹا ہے نایاب جیلانی کا مکمل ناول "شہ مات" بہت پسند آیا اور ماہ مبین پر بہت غصہ آیا کیونکہ جو لوگ کسی کی خوشگوار زندگی میں زہر گھولتے ہیں ان کا انجام یہ ہی ہونا چاہیے۔

اور ایک سب سے اہم بات یہ کہ پلیز میرے شرکا نام ضرور لکھیں میں نے جس کو بھی بتایا کہ میں نے کرن میں شرکت کی ہے وہ مانا نہیں پلیز میرے شرکا نام ضرور لکھیں! ج : پیاری بہن ماریہ! اب کی دفعہ آپ کے شرکا نام لکھ دیا ہے۔ آپ کو جو بھی تحریر بھیجی ہو اسی پتے پر بھیجیے جس پر خط بھیجا ہے۔

تحریم بخاری۔ مظفر گڑھ

ستمبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے سوچ رہے ہیں کہاں سے شروع کریں کرن سے پچھڑے کچھ سال گزر گئے۔ وقت کا پتا نہیں چلتا کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے لیکن آج جب کرن ہاتھوں میں آیا تو خوشی کا ٹھکانہ رہا۔ اب بات ہو جائے کرن کی تحریروں کے متعلق سب سے پہلے جن تحریروں کو پڑھا ان کا ذکر ہو جائے نادیہ احمد کی تحریر "بہت دیر سے ملا ہے" بہت اچھی اور منفرد تحریر ہے۔ شہیار کا افسوس رہا کیونکہ وہ اتنا عرصہ ہی داماں رہا۔

سحرش فاطمہ کا "رواجوں کے قیدی" اچھی تحریر تھی لیکن سوچتی ہوں کہ کیا آج کے دور میں بھی ایسی فرسودہ روایات زندہ ہیں۔

"نیند ہوئی پرانی" بہت ہی زیادہ اچھی لگی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ صدف رحمان کی تحریر "بہی اک حرف" حقیقت پر لگی۔ باقی تو پڑھنا باقی ہے فی الحال تبصرہ ختم کر رہی ہوں۔ ایک تو وقت کم ہے دوسرے تاریخ گزر گئی تو "نائے میرے" نام "میں شامل نہ ہو سکوں گی ان شاء اللہ آئندہ ماہ تفصیلی تبصرہ ادھار رہا۔

ج : پیاری بہن تحریم! کرن سے اس قدر محبت کا شکریہ۔ آپ چار سال کے بعد کرن میں آئی ہیں۔ امید ہے کہ آپ اب غیر حاضر نہیں ہوگی اور کرن کے لیے وقت نکال ہی لیں گی۔

## عاصمہ ابراہیم۔ تلعبہ

ستمبر کا شمارہ خلاف توقع بہت جلد مل گیا تھا۔ ٹائٹل پسند آیا "میں گمان نہیں یقین ہوں" میں لگتا ہے زیان ڈرامہ کر رہی ہے۔ آگے معلوم نہیں حقیقت کیا ہے۔ ایک کتنا خوش تھا اپنی شادی پہ مگر افسوس زیان نے تو ایک الگ ہی صورت حال پیش کر دی۔ نبیلہ صاحبہ سے گزارش ہے اختتام اچھا کریں۔ نایاب جیلانی کا مکمل ناول بھی پسند آیا۔ مبین کتنی چالاک اور خود غرض لڑکی تھی اپنی خوشی کے لیے۔ کسی اور کی خوشی کا بالکل احساس نہیں تھا۔ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑا رہا ہے۔ "ردائے وفا" بہت بور ہے۔ باقی ناولٹ افسانے بھی اچھے تھے۔

ج : عاصمہ! آپ کی تحریر مل گئی ہے قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

سارہ علی۔ سوہا وہ گجر خان

"کرن" میرا موٹ فورٹ رسالہ ہے دس سال کی عمر



میں بڑھتا شروع کیا حالانکہ ہمارے لکھنے پڑھنے پہ پابندی سے مگر سالے میں چھپا کر بڑھتی ہوں خیر اس بار ٹاؤٹر میں ”گمان نہیں یقین ہوں“ اچھی قسط بھی پڑھ کے مزہ آیا مگر مجھے لگتا ہے زبان خود جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے اس پر کوئی جن دن نہیں۔ آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

”راپنزل“ میں کبھی مجھے لگتا ہے شرین اور سمج سلیم اور نینا ہی ہیں مگر اپنے ہی خیال پہ مجھے کچھ شک سا ہے۔ ”ردائے وفا“ میں حدید کے ساتھ شروع میں ہی میں نے عفت کو سوچا تھا ناکہ کو دیکھ دیکھ کے مجھے غصہ آتا ہے۔ اس بار ”مقابلہ ہے آئینہ“ میں سدرہ یوسف سے مل کے اچھا لگا ویسے سدرہ جی ایک سوال ہے کیا آپ وہی والی سدرہ ہے جنہوں نے چک چکورہ کے ایک جامعہ میں نیچنگ بھی کی عالمہ کی نیچر بھی اگر آپ وہی ہے تو ریکی آئی مس یو۔ تنزیلہ کوڑ میں تم سب کو بھی بہت یاد کرتی ہوں مجبوری ہے تم لوگوں سے مل نہیں سکتی۔ یہی سمجھ لو پنجرے میں قید کیا گیا ایسا پرندہ ہوں جو چاہنے کے باوجود نہیں اڑ سکتا۔ پلیز تم لوگوں سے کوئی بھی مجھے پڑھ رہا ہے مجھے ایک کار ملنے آجاؤ میں تم لوگوں کو بہت مس کرتی ہوں۔

ج : پیاری بہن سارہ! کرن کو پسند کرنے کا شکریہ۔ امید ہے سدرہ یوسف اور تنزیلہ کو ٹر تک آپ کا پیغام پہنچ گیا ہو گا۔ آپ اتنی پابندیوں کے باوجود کرن کا مطالعہ کرتی ہیں۔ قارئین بہنوں کی کرن کی اتنی پسندیدگی کرن کو بہتر سے بہتر کرنے کی تحریک پیدا کرتی ہے۔

طاہرہ ملک۔۔۔ جلال پور پیر والا

خوب صورت رنگوں سے جگمگا تا کرن جونہی ہاتھوں میں آیا تو بے پایاں خوشی کے احساس نے ہمیں سرشار کر دیا اور یہ خوشی اس وقت مزید بڑھ گئی جب ”نامے میرے نام“ میں خود کو پایا مدیرہ جی آپ اتنے خوب صورت انداز میں جواب دیتی ہیں کہ دل بے اختیار آپ کی محبت سے بھر جاتا ہے۔

حمد و نعت سے دل کو منور کرتے ہوئے ”شیف راحت“ حمزہ علی عباسی ”فارس شفیع سے ملاقات کی“ ”مقابلہ ہے آئینہ“ سدرہ یوسف سے مل کر بہت اچھا لگا۔

”راپنزل“ کی یہ قسط بھی ہمیشہ کی طرح لا جواب تھی شرین کی قسمت پہ رشک آتا ہے جو اسے ہیرے جیسا شوہر

ملا۔ صوفیہ کے روپ میں مشرقی لڑکی کی محبت خوب دکھائی اب دیکھتے ہیں کہ کاشف کیا قدم اٹھاتا ہے اور نینا کی باپ سے نفرت کچھ سمجھ نہیں آتی سلیم کا خوش مزاج انداز اچھا لگتا ہے۔

”تو بہت دیر سے ملا ہے“ حسن کی سوچ پہ بہت افسوس ہوا پتا نہیں ایسی سوچ مرد کیوں رکھتے ہیں۔ اینڈ اچھا لگا۔

”شاید“ فائزہ افتخار جی کیا کمال لکھ رہی ہیں آپ۔ سعد بے چارے کی حالت پہ افسوس ہوتا ہے اور سالار میں اتنا غور اسے تو صرف اپنے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آتا ایسی محبت کا کیا فائدہ جو دوسرے کا احساس ہی نہ کر سکے ام ہانی کو صرف سعد خوش رکھ سکتا ہے۔

”رواجوں کے قیدی“ پتا نہیں کب ہمارے ملک سے یہ فرسودہ روایات ختم ہوں گی ”اب نیند ہوئی پرانی“ زینا کی نیند نے ہمیں حیران کر دیا کہ منٹوں سیکنڈوں میں نیند قربان ہو جاتی ہے چلیں جی بالا خر جمشید عباسی کی دوش لپوٹا ہو گئی اور ان کا خاندان بھی سرد ہو گیا اور زینا کا جائز مقام بھی مل گیا۔

”میں گمان نہیں یقین ہوں“ زبان جی یہ کیا کر دیا آپ نے ہم تو آپ کے بہت معمول کچھ سنبھلے چینی سے انتظار ہے اب آخری قسط کا۔

”بس اک حرف“ صدف رحمان گیلانی نے بہت اچھا سبق دیا دعا دعا کے حوالے سے ان کی باتیں دل میں گھر کر گئیں۔ ”ردائے وفا“ حبیب کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے اور اس کے اپنوں کو خبر نہیں حدید کی تو زندگی خراب ہو ہی گئی اب عفت کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونا چاہیے۔

”پھر نہ کہنا“ خوب ہنسایا۔ تمام مسئلے سلسلے میں سب کا انتخاب اچھا تھا۔ پلیز 10 اکتوبر کو میری سالگرہ ہے آپ یقیناً ”مجھے wish کر کے میری خوشیوں کو دو بالا کر دیں گی آپ سے ایک اور ریکوسٹ کہ آپ کرن میں ایسا سلسلہ شروع کریں جس سے ہم کرن کے through اپنے پیاروں کو مخاطب کر سکیں۔ اور ہاں کرن کتاب میں گوشت کے اتنے اچھے اچھے پکوان بتا کر آپ نے ہماری عید خوب کرا دی۔

ج : پیاری طاہرہ! آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ آپ کی خواہش نوٹ کر لی گئی ہے۔

کومل خان۔۔۔ کراچی

[[کرن 28 اکتوبر 2015]]



14 تاریخ کو کرن اپنی نرم گرم گندم کی سنہری خوشوں کی مانند گرنیں بکھیر تاملاتو چند گھنٹوں کے لیے اپنی سول اور کرمینل پروسیجر کورٹ کی کتابوں کو ایک طرف پھینک کر (آہ) امتحانات جو اچانک سے دو ماہ قبل ہو رہے ہیں) کرن کی طرف متوجہ ہوئے فائزہ افتخار کا "شاید" میں تمام کردار اپنی اپنی جگہ فٹ ہیں۔

"راپنزل" کی چوٹی پکڑ کر چڑھنا شروع کیا تھا کہ ارے یہ کیا، ابھی تو بہت سے الجھاؤ باقی ہیں، بالوں (کرداروں) کے سلجھتے سلجھتے اور چڑھنے میں دقت تو لگے گا نا۔ نایاب جیلانی نام دیکھتے ہی گالوں پہ ڈمیل بڑ گئے (بج میں بڑتے ہیں)۔ ہم م۔ اس بار مسنگ تھی وہ خصوصیات جو کہ نایاب کی کہانیوں کا خاصا ہوتی ہیں پر اچھا لگا۔ مقدس مشعل کی "اب نیند ہوئی پرانی" میں زینا کی نیندوں پر عیش عیش کر اٹھے۔ صدف رحمان گیلانی کے "بس ایک حرف" میں چھپا گہرا پیغام تھا صبر، نیت اور کلام میں احتیاط کا۔ عمدہ طرز تحریر اور سبق آموز۔ سلمیٰ فقیر حسین کا "پھر نہ کہنا" اف۔ ف۔ آخر میں اتنا الجھا گیا کہ فشار خون تیز کر دیا۔ مزے کی ہلکی پھلکی تحریر تھی۔

"ردائے وفا" ہم عام انسانوں کی پر خطا زندگیوں پر لکھی تحریر۔

ج : پیاری کومل! شکریہ آپ نے امتحانات قریب ہونے کے باوجود کرن پر توجہ دی۔ بہت اچھے نمبروں سے ہماری دعا ہے کہ آپ امتحان میں کامیاب ہوں۔

آسیہ ارم۔ ملیر

اس ماہ کا کرن 12 ستمبر کو ملا ماڈل اچھی تھی۔ میری ایک تجویز ہے۔ وہ یہ کہ آپ لوگ ٹائٹل پر ہمیشہ خواتین ماڈل کو کبھی دلہن تو کبھی باری و سڑ میں دکھاتے ہیں ظاہر ہے یہ تمام ڈائجسٹ خواتین کے زیر مطالعہ رہتے ہیں 99 تو کیوں نہ ٹائٹل پر جس ماڈل کو دکھائیں وہ ہماری آج کی محنت کش خواتین مثلاً "جیسے ڈاکٹر"، "انجینئر"، "پاکٹ نرس"، "ہیپر نیوی شیفت"، "نیوز کاسٹر"، "دفاتر کی ملازمین"، "گاؤں کی خواتین" اور بھی بہت سی ورکنگ وومن وغیرہ۔

میں نے جب بھی خط لکھا کرن میں، کرن نے اسے ہمیشہ جگہ دے کر میرا حوصلہ مان بڑھایا ہے کرن کی موسٹ فوریٹ کہانی (میری) "شاید" فائزہ مزہ آگیا مگر یہ دادا جان کی انٹری اتنی کم کیوں کرتی ہیں سب سے مزے کی

شخصیت ہے ان کی پڑھ کر فیس فیس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی ہوں۔ اس دفعہ عطا اللہ عیسیٰ کے گانے پر داد دینی کے کمٹنس اور حرکتیں مزہ دے لیں۔ اور ام ہانی اور سالار کا سامنا بھی کم دکھائی ہیں مجھے سالار کی شدت پسندی پسند ہے۔ ویسے ام ہانی نام کی بچیاں ہوتی بڑی پیاری ہیں بھی مکھن نہیں لگا رہی میرے پاس بھی اک ام ہانی ہے میری سب سے چھوٹی کیوٹ سی بیٹی۔

فرحین اظفر آپ کا "ردائے وفا" اچھا ہے مگر پلیز اسے تھوڑا سہل کیجیے آپ نے اس میں اس قدر فلسفہ گھول دیا ہے کہ آپ ایک سین کھینچ کر اتنا لمبا کر دیتی ہیں جیسے ہاسٹل سے جدید میسج کرتا ہے نائلہ کو اب اس کے نیچے آپ نے نائلہ کے بارے میں ڈیڑھ بیج (میری رائٹنگ کے حساب سے) کا جو کچھ بھی لکھا ہے پلیز ہم ان دس قسطوں میں اچھی طرح سے نائلہ کو سمجھ چکے ہیں میں تو اب کہانی کا بہت سا حصہ (اسی طرح کا) چھوڑ کر پڑھتی ہوں پلیز ابھی اس میں میرا انٹرسٹ ختم نہیں ہوا مگر اب آپ ویسے بھی اس کہانی کو لمبا کھینچ رہی ہیں قاری بہنیں اگر میری بات سے ایگری ہوں تو ضروری ہوتا میں۔

تزیلہ ریاض کی "راپنزل" اپنے نام کی طرح منفرد ہے مجھے ایسی پرت در پرت چھپی اسٹوریز بہت پسند ہیں ابھی تک میرا (جو شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے) اور اس کے پایا کو سامنے نہیں لائی ہیں آپ اچھا ہے جس سے بھری یہ کہانی بہت انٹرکٹو ہے جس کا ہر ماہ انتظار رہتا ہے۔

کمل ناول "شہ مات" نایاب کی بہت اچھی کاوش تھی مگر صرف فجر ماہ میں اور فلاح پر زیادہ توجہ دی تھوڑا اور بھائیوں کی مستیاں شرارتیں دیکھائیں اتنا اچھا پلاٹ تھا۔ نادیہ احمد کا "تو بہت دیر سے ملا ہے" تھوڑا عجیب سا تھا کافی جگہ بے ربط سا لگا۔ "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابر راجہ آپ نے پلاٹ تو بہت اچھا چنا تھا مگر کہانی میں کئی جگہ جھول ہیں ہاں اس دفعہ جو لکھم آپ نے اس میں شامل کی ہے۔ میری روح تک کو ہلا گئی ہے زبردست۔ صدف رحمان "بس ایک حرف" اچھا موضوع لے کر آئیں۔

"رواجوں کے قیدی" سحرش نے گاؤں کی جمالت دکھائی ہے کیا اب بھی ایسا ہوتا تو ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس رب نے ہمیں اک اچھی سوچ رکھنے والی فیملی کا حصہ بنایا ہے۔ مقدس مشعل کا "اب نیند ہوئی پرانی" بہت اچھا تھا خاص کر زینا کی سونے کی عادت سہی



ہر تدبیر ناکام ہو گئی۔ اور شادی کا دن بھی آگیا۔  
و کھری ٹائپ کے دادا جی کی باتیں ہنساتی رہیں۔  
قسط کا اینڈ ہلا دینے والا تھا۔ ”شہ مات“ بڑی اچھی تحریر  
تھی۔ نگینو کو دارماہ مبین ذرا پسند نہیں آیا۔ مبین کو

ہے۔ بھئی جہاں جگہ ملتی محترمہ سو جاتیں۔ پڑھ کر مزہ آیا اس  
کمانی میں لڑکیوں کے لیے بھی بست اچھا سبق تھا۔  
ہائے سلمیٰ فقیر جی یہ کیا لکھ ڈالا آپ نے ابھی تک پیٹ  
کی آنتیں ابھی بڑی ہیں سچ جڑے دکھ گئے ہتے ہتے اس کو  
پڑھتے۔ ویل ڈن سلمیٰ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ ہمارے  
لیے تفریح سے بھرپور ناول لائیں گی سارے دن کی بے  
زاری اڑن چھو ہو گئی۔

اس کے علاوہ انٹرویوز اور تمام سلسلے بے حد پسند آئے۔  
اب اجازت دیں جب اکتوبر کا شمارہ آئے گا تو عید الفصحی  
گزر چکی ہوگی اس لیے میری طرف سے آپ کو پوری نیم  
کو اور میری پیاری قارئین بہنوں کو دلی عید مبارک۔ ج  
: آسیہ جی! آپ نے خط لکھا ہے بے حد شکریہ۔ یقیناً  
محنت کش خواتین ہمارے لیے رول ماڈل ہیں لیکن ٹائٹل  
ر ماڈل بننا ان کا کام نہیں ہے۔ کمانیوں پر آپ کا تبصرہ بہت  
شائدار اور بھرپور تھا امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے سے  
ضرور آگاہ کریں گی۔ آسیہ جی بیٹیاں تو ہوتی ہی پیاری ہیں  
ان کا نام جو بھی ہو۔

فوزیہ شمس ہاشمیہ عمران آمنہ میر۔ گجرات

ستمبر کا شمارہ بارہ کو ہی مل گیا۔ انتہا کی خوشی بھی اب  
انتظار کی کوفت تو نہیں سہنی پڑتی۔ سرورق ماڈل خوب  
صورت لگ رہی ہیں مگر بالوں میں ہیر رنگ لگانے کی تک  
ہماری سمجھ سے تو باہر رہی۔

شیف راحت، حمزہ علی عباسی اور فارس شفیع سے  
ملاقات اچھی رہی۔ ”مقابل ہے آئینہ“ (پچی گل دساں)  
ہیں اسے سلسلہ کچھ ساوا دی نہیں رہا۔ سب سے پہلے  
”راہنزل“ کو پڑھا۔ اس بار بھی قسط اچھی رہی۔ یہ تنزیلہ  
جی کے کلم کا کمال ہی تو ہے جو ہمیں بور نہیں ہونے دیتا ہے  
تحریر ابھی تو آغاز میں ہی ہے۔ پھر بھی سارے کردار اپنی اپنی  
جگہ سیٹ لگ رہے ہیں۔

دوسرا مکمل ناول ”ردائے وفا“ اس بار قسط کچھ خاص  
نہیں لگی۔ میرے خیال میں اسے ایسے ہی طویل کیا جا رہا  
ہے۔ نائلہ کو شبیر شیطان سے نجات دلائیں اور حدید اور  
نائلہ کے تمام گلے شکوے ختم کریں۔

”میں گمان نہیں یقین ہوں“ نبیلہ جی نے تو سارے  
انکشافات لاسٹ قسط میں چھپا رکھے ہیں۔ ناولٹ  
”شاید“ ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد آیا سعد بچارے کی

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین



450/-	مذہب نامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	مذہب نامہ	دنیا گول ہے
450/-	مذہب نامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	مذہب نامہ	چلتے ہو تو پتھن کو چلیے
225/-	مذہب نامہ	نگری نگری پھر مسافر
225/-	طنز و مزاح	خمار گندم
225/-	طنز و مزاح	اردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاند نگر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈ گراہیلن پو/ابن انشاء	اندھا کنواں
120/-	اد ہنری/ابن انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طنز و مزاح	باتیں انشاء جی کی
400/-	طنز و مزاح	آپ سے کیا پردہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی



اس کی ”مکروغ“ سوچ کا آئینہ نہیں دکھایا۔ مکمل ناول ”پھر نہ کہتا“ مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ معذرت کے ساتھ آپ سنجیدہ تحریر لکھا کرے۔ وہ ہمیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔  
ناولٹ ”نیند ہوئی پرانی“ دادی اماں کا اچھا مضمون تھا۔ شکر دادی اماں کو ناکامی نہیں ہوئی۔

اب کی دفعہ مستقل سلسلوں میں، میں تو کہیں بھی نہیں تھی۔

”نامے میرے نام“ میں سب کے تحریروں کے متعلق، اظہار خیال اچھے تھے۔ مگر یہ کیا جو الائی کے شمارے میں میرے خط کو فٹ پتہ کر دیا اور ستمبر میں مفضل کے اینڈ میں میرے دل کو آپ کی یہ ادا بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ ہاں ناں۔

ہمارے گھر میں ”کرن“ کی دو پرستار شیدائی ہو گئی ہے۔ ایک تو میری بہن شازیہ میرر میں اور دوسری میری محترم بھابھی طیبہ صاحبہ۔ دونوں سرکھائی ہیں جو تحریر اچھی ہوتی ہیں ان پر نشانی لگا دیا کروں، ہم نے پڑھنی ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے بصرے کہ فلاں کا اینڈ ایسے کیوں ہو دیا کیوں نہیں ہوا۔

ج : فوزیہ! خط شامل تو کر دیا نہ آپ کا نمبر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کا بے حد شکریہ جو ہر ماہ پابندی سے کرن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ آپ کی بہن اور بھابھی بھی ہماری قارئین کی فہرست میں شامل ہو گئیں بہت خوشی ہوئی۔

حراقربشی، بلال کالونی۔ ملتان

لیجے آپ نے یاد کیا، حرا کو اور حرا الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح جھٹ پٹ حاضر۔ بھی ہم تو ایسے ہی خوا خواہ ناراض ہوئے اپنے پا کر سے، اب کے تو ٹائم سے قبل از وقت مل گیا کرن، سو ناراضی ختم نہجی اور شد بھی۔!

ہماری محبوب من (کرن) سے جو نسبت ہے اس کے آگے غلطی سے بھی قل اسٹاپ مت لگائیے گا ورنہ ہم (So on) کی علامت لگا دیں گے جو جاری رہتا ہے لا محدود ہوتا ہے۔ لوگ بھاگتے ہیں اسٹیشن پر ٹرین پکڑنے کے لیے۔ جناب ہم دوڑتے ہیں تبصرے کے لیے!

”شاید“ ظالماں! کہاں بیچارے معصوم غریب دل کو لٹکا دیا ہے۔ با خدا! تڑپتا ہے ام ہانی کی کیفیت پہ، کوئی پوچھے فائرہ جی بے اتنا دل خواہ بھی لکھتے ہیں بھلا کہ سیدھی سادی

مصروف شخصیت (اپنی بات کر رہی ہوں، جلنے والے منہ چیخے کر لیں) بھی ایک قسط کو تین دفعہ پڑھے۔  
باسبب تمہاری آمد، غنچے ڈالیوں پر چمک اٹھے!

”راپنزل“ شہرین کا ایمن کے سنگ رویہ سوالیہ نشان؟ (گتھی کھلنے کے خشک رہیں) کاشف اور صوفیہ دونوں کو اپنے رویے میں لچک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ حبیبہ کی شوہر کا ایک سینڈنٹ اور پھر موت کی جاں فزا خبر (یہ ناگمانی کھانا مکس چونکا دینے والا ہے) ”ردائے وفا“ دکھ ہی دکھ، افسوس صد افسوس! نائلہ ڈیر پھنس گئی نا، معراج امید کی کرن اور اندھیرے میں روشن چراغ عفت کے لیے ثابت ہونے لگا ہے۔ ”نیند ہوئی پرانی“ جو کام حبشید صاحب اور اماں جی کرنا چاہ رہے تھے وہ عبید کے دوست نے پلک جھپکتے سہل کر ڈالا۔ مبارک زینالی بی! ”رواجوں کے قیدی“ ناچاہتے ہوئے بھی ابھی بھی ”خوا“ ان فرسودہ رواجوں کے زیر اثر ہے۔ ”دیر سے ملا ہے“ ماہانے حسن کے لیے انتظار کی بڑی بھاری مشقت کی ادا کیگی کی۔ رامس کا ہمراہ ہونا حوصلہ افزائی کا باعث بنا رہا۔ ”بس اک حرف“ عورت ذات کو اتنا تک و دو کی چکی میں پیسنا ضروری ہے کیا جب بنیادی ضروریات سوچ سوچ کر پوری ہو رہی ہوں لبنی کی بس حد ہو گئی تھی اور شارق میاں اپنے مدعا سے ہٹنے کو تیار نہ تھے (کچھ تو گزیر ہوئی تھی نا پھر) ”پھر نہ کہتا“ ارے بھئی! کچھ نہیں کہتے بہت کچھ لکھتے ہیں اور سناتے ہیں! چاروں لڑکیوں کی نوک جھونک، ہاتھ کی برداشت قابل دید ”شہ مات“ زبردست کمال کیتا نسسی ”میں گماں نہیں“ دلچسپی حد درجہ بڑھ گئی ہے۔

نخر اور خوشی کا عنصر غالب آنے لگتا ہے ”جب موتی چننے ہیں“ اپنا ذاتی اقتباس بھیج سکتے ہیں؟ تمام سلسلوں کو برابر فیصد پر رکھا اب کے۔ لیجئے اختتام کرتے کرتے بھی کچھ نہ کچھ تو فرض ادا ہو ہی گیا۔ آپ کی ہمراہی ہمارے سر چشمہ رہنمائی ہے۔ رب سونا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آپ کی ادنیٰ خاکسار۔

ج : حرا! آپ کا کرن کو پسند کرنے کا شکریہ ”نامے میرے نام“ ہمارا مستقل سلسلہ ہے تو بہتر ہو گا کہ اسی ماہ کی کہانیوں پر تبصرہ کیا جائے۔ موتی چننے ہیں یعنی کہ کسی کتاب یا ناول میں آپ کو کوئی اقتباس پسند آئے۔ کیونکہ ہم کتاب یا ناول کا نام ساتھ شائع کرتے ہیں۔





کرن کتاب

# کارلہ کیرلش

ماہنامہ کرلہ  
۳۷، اردو بازار، کراچی





## معدہ

☆ معدے کا نظام درست کرنے کے لیے ترش پھل استعمال کرنے چاہئیں جن میں لیموں، ترش انار، آلوچہ اور آلو بخارا شامل ہیں۔

## گردے

☆ گردوں کی صفائی کے لیے پانی زیادہ مقدار میں پیئیں اور آم، انگور، کیلا اور پستہ استعمال کریں۔

## اعصابی

☆ انگور، سیب، ناشپاتی، کیلا، انجیر، جامن اور کھجور کا استعمال کریں۔

## دانت

☆ دانتوں کی مضبوطی کے لیے سنگترہ، مالٹا، کینو وغیرہ استعمال کریں۔ کیونکہ ان میں کیمیا شیم پایا جاتا ہے جو ہڈیوں کی مضبوطی کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔

## بلڈ پریشر

☆ ہائی بلڈ پریشر کے لیے ناشپاتی کا استعمال مفید ہے۔



☆ آپ کی بیماریوں کا علاج آپ کے کچن میں

پیشاب کی جلن دور کرنے کے لیے

☆ پیشاب کی جلن کو دور کرنے کے لیے ایک چمچ

## گھریلو مسائل کے آسان حل

گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر آپ بہت سے ایسے کام کر سکتے ہیں جو نہ صرف آپ کے لیے معاشی برائیوں کا حل ہوں گے بلکہ آپ ان سے بہت سے گھریلو فوائد حاصل کر سکیں گے۔ اس کتاب میں ہم نے روزمرہ کی گھریلو زندگی میں کام آنے والے نوٹس درج کیے ہیں۔ منگائی اور مصروفیت کے اس دور میں یہ گھریلو نوٹس آپ کے لیے گونا گونا ب ثابت ہوں گے۔ ہر نوٹس کو آسان اور موثر انداز میں درج کیا گیا ہے تاکہ آپ ان سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ یاد رکھیں سنگھڑ عورت وہی ہے جو کم خرچ میں گھر کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے۔ عورت کی پہچان اس کے گھر کے طریقے اور سلیقے سے ہوتی ہے جو کم آمدنی میں بھی گھر کو صاف اور ستھرا اور خوب صورت بنا سکتی ہے۔

## انسانی جسم

☆ انسانی جسم کے لیے پھلوں کی اہمیت۔

## دماغ

☆ کھجور، بادام، سیب، انگور، سنگترہ، اخروٹ۔ کیونکہ ان تمام پھلوں میں فاسفورس زیادہ ہوتا ہے۔

## دل

☆ دل کی کمزوری دور کرنے کے لیے سنگترہ، انار اور مالٹا بہترین پھل ہیں۔

## جگر

☆ جگر خراب ہو جائے تو ٹماٹر، انار، اناس، آڑو اور لیموں استعمال کریں۔ کیونکہ ان پھلوں میں ترشی اور نمکیات ہوتے ہیں جو جگر کے افعال کو درست رکھتے ہیں۔





بھون کر رکھ لیں۔ روزانہ صبح دو بڑے چمچے استعمال کریں اور موسم کے مطابق گرم یا ٹھنڈے پانی کے ساتھ کھائیں۔

## زبان کی لکنت کے لیے

☆ زبان کے نیچے تیز بات کا سفوف بنا کر رکھنا یا پھر پتا ہی توڑ کر رکھنا، لکنت زبان کو درست کرتا ہے۔  
☆ پانی میں دار چینی ڈال کر ابال لیں اور اس سے غرار کریں۔  
☆ پانی میں نمک ڈال کر ابالیں اور غرار کریں۔

## قے اور الٹی کے لیے

☆ دھنیا ایک تولہ گھوٹ چھان کر مصری ملا کر کوٹ کوٹ پلائیں قے بند ہو جائے گی۔  
☆ بلغھی کھانسی کے لیے

☆ ہلدی کو آگ میں بھون کر باریک پیس لیا جائے اور ایک ماشہ خوراک نیم گرم پانی کے ساتھ کھائی جائے بلغھی کھانسی چند روز میں اچھی ہو جاتی ہے۔

☆ سرخ مرچ کے بیج ایک ماشہ باریک پیس کر ایک تولہ گڑ میں ملا میں اور ان کی گولیاں پندرہ عدد بنالیں، ہر روز بوقت صبح ایک گولی استعمال کریں۔ بلغھی کھانسی رفع ہو جائے گی۔

## داد (چنبیل)

☆ روغن کلونجی روزانہ تین مرتبہ مالش کریں۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں داد ختم ہو جائے گا۔

## دانت اور مسوڑھے کا درد

☆ شمد کو سر کے میں گھولیں اور اس کی کلیاں صبح شام کریں دانت اور مسوڑھے مضبوط ہو جائیں گے۔

## دکھتے دانت

چائے والا اجوائن خراسانی کا سفوف ہمراہ پانی روزانہ استعمال کریں۔

## خشک کھانسی کے لیے

☆ خشک کھانسی اور دمہ کے لیے روزانہ ایک تولہ اسپنول دودھ یا پانی کے ساتھ چالیس روز تک استعمال کریں۔

## سر درد کے لیے

☆ سر درد اور مری کے امراض میں الپچی کا شربت بنا کر استعمال کرنا مفید ہے۔

## آدھے سر کا درد

☆ اگر آدھا سر درد کر رہا ہو تو سر کے جس حصے میں درد ہو رہا ہو اس کی ناک کے مخالف نٹھنے میں شمد کی بوندیں ڈال دیں درد بند ہو جائے گا۔

## بد ہضمی کے لیے

☆ دانہ الپچی خور دو تولہ، مرچ سیاہ ایک تولہ، نمک سیاہ ایک تولہ، نوشادر دو تولہ، تمام اشیا کو کوٹ کر چورن بنالیں اور ڈبے یا شیشی میں بند کر لیں۔ حسب ضرورت تقریباً "آدھا ماشہ" ہمراہ پانی صبح دوپہر اور شام ہر کھانے کے بعد استعمال کریں۔

## پیٹ کا درد

☆ ایک چٹکی میٹھا سوڈا ایک گلاس پانی کے ساتھ استعمال کرنے سے پیٹ کا درد دور ہو جائے گا۔

## نزلہ زکام کے لیے

☆ بار بار نزلہ زکام ہونے والے حضرات کو بھنے ہوئے چنوں کا آٹا ایک چھٹانک، مغز بادام دس دانے، سونف آدھ تولہ اور تخم خشخاش تین ماشہ ان تمام اشیا کو گڑ میں ملا لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر پانچ تولے چینی ملا کر





## چھینکیں آئیں تو۔۔

☆ اگر آپ کو بہت چھینکیں آئیں اور رکتی نہ ہوں تو آدھا کلو دودھ میں ایک چائے کا چمچ ہلدی، ایک چمچ اجوائن اور تھوڑی سی دسی شکر لے کر اتنی دیر تک پکائیں کہ دودھ ایک کپ رہ جائے۔ اس دودھ کو روزانہ رات کو ایک ہفتہ تک پییں، نزلہ زکام اور چھینکوں میں مفید ہے۔

## کانچ کا معاملہ

☆ اگر غلطی سے کانچ کا ٹکڑا یا زرے کھالیے ہوں تو اس متاثرہ شخص کو بہت سارے کیلے کھلا دیں۔ کانچ نکل جائے گا۔

## زہریلے جانور کے کاٹے کا علاج

☆ اگر زہریلا جانور کاٹ لے تو کسی کھل میں مولیاں کوٹ کر کپڑے میں سے چھان کر رس کا عرق نکال لیں، کالی ہوئی جگہ پر دو تین دفعہ لگا دیں، ہر قسم کی جلن اور تکلیف ختم ہو جائے گی۔ مولی کا عرق جتنا زیادہ پرانا ہوگا اتنا ہی جلد اثر کرے گا۔ اگر شہد کی مکھی، بچھو یا ایسے ہی دوسرے زہریلے جانور نے کاٹ لیا ہے تو پیاز کا عرق نکال کر کالی ہوئی جگہ پر لگانے سے کافی آرام آجاتا ہے۔

## آگ سے جلنے کے داغ

☆ ایک پاؤ سرسوں کے تیل میں آدھا پاؤ کٹا ہوا گڑ ڈالیں۔ ان دونوں کو ہلکی آنچ پر اتنی دیر پکائیں کہ گڑ جل کر سیاہ ہو جائے، چولہے سے اتارنے کے بعد گڑ نکال لیں اور تیل کو بوتل میں ڈال کر رکھ دیں۔ روزانہ رات کو سوتے وقت اسے داغ پر لگائیں اور صبح دھو لیں، ایک مہینے کے استعمال سے داغ دور ہو جائیں گے۔

☆ دانتوں کی صفائی نہایت ضروری ہے، لیکن دیکھا گیا ہے کہ اکثر صفائی رکھنے کے باوجود بھی مسوڑھوں سے خون آتا ہے اور ان میں درد بھی رہتا ہے ان کا علاج یہ ہے کہ پھٹکری میں ذرا سائمنک ملا کر مسوڑھوں پر مل لیں دن میں دوبارہ یہ عمل کرنے سے درد اور بلیڈنگ کو کافی افاتہ ہوگا۔

## گرمیوں میں جلدی امراض

☆ گرمیوں میں اگر جلدی امراض حملہ کر دیتے ہیں، بعض اوقات خون کے فاسد ہونے کی وجہ سے بھی جسم پر خارش ہو جاتی ہے۔ اس مرض کے دور کرنے کے لیے کریلوں کا رس نکال کر دو چمچ روزانہ صبح کے وقت پییں چند روز کے استعمال کے بعد خون صاف ہو جائے گا اور چہرے کی رنگت نکھرے جائے گی۔

## گرم چائے سے جلنے کے لیے

☆ گرم چائے یا کافی پینے سے زبان جل جاتی ہے، اس کے لیے اگر آپ چینی کے چند دانے لے کر اپنی جلی ہوئی زبان پر ڈال دیں تو آپ کی زبان کو فوراً ہی اس پریشانی سے نجات مل جاتی ہے۔

## مائیکرین سے نجات

☆ چند کافور کی گولیاں لے کر انہیں پس لیں اور پھر پانی میں ملا کر سونے سے پہلے اپنی پیشانی پر ملیں۔ مائیکریشن یا آدھے سر کا درد فوراً ختم ہو جائے گا۔

## بند ناک کھولنا

☆ تھوڑی سی کالی مرچ اور اجوائن لیں اور انہیں گرم تیل میں ملا دیں اور پھر اسے سونگھیں۔ اس عمل سے بند ناک فوراً کھل جائے گی۔ اس کے علاوہ خالص بادام کا تیل ایک قطرہ دونوں ناک کے نتھنوں میں ڈالیں۔ اس سے ناک کھل جائے گی۔





وانے لے کر پیس لیں، ایک چمچہ شہد پیا کریں اور دار چینی کے دو تین چھوٹے ٹکڑے دن میں چوس لیا کریں۔

## آنکھوں کا درد دور کرنے کے لیے

☆ آنکھیں دکھتی ہوں تو گو بھیجی کے پتوں کی ٹکیہ بنا کر آنکھوں پر باندھنے سے درد رفع ہو جاتا ہے۔

## غذا اور غذائیت

## جلے ہوئے گوشت کو ٹھیک کرنے کے لیے

☆ کبھی کبھی گوشت پکاتے ہوئے جل جاتا ہے۔ اس کو ٹھیک کرنے کے لیے پہلے دیگچی چولہے سے اتار کر جلا ہوا گوشت بغیر جلے گوشت سے علیحدہ کر لیجیے اور مسالا پھینک دیجئے۔ پھر دوسری دیگچی میں گھی ڈال کر پیاز براؤن کیجیے اور تازہ مسالا بھون لیں اور گوشت تیار ہونے کے بعد تھوڑی سی میتھی بھی ڈال لیں۔ اس طرح جلے ہوئے گوشت کی بو دور ہو جائے گی اور گوشت ٹھیک ہو جائے گا۔

## پیاز کو کرپی کرنے کے لیے

☆ پیاز کو کر سپ اور اچھا براؤن کرنے کے لیے پہلے سلائس کیے ہوئے پیاز کو پندرہ منٹ کے لیے دہی میں بھگو دیں، پھر فرائی کریں، اس سے پیاز کا رنگ بہت اچھا آتا ہے۔

## پیاز خستہ کرنے کے لیے

☆ پیاز کو فرائی کرنے سے پہلے اگر دودھ میں ڈبو لیا جائے تو پیاز خستہ ہو جاتا ہے۔

## اندوں کی بو

☆ کیک میں اندوں کی بو دور کرنے کے لیے اگر اس آمیزے میں ایک چمچہ شہد کا ڈال دیا جائے تو اندوں کی

## لو سے بچاؤ کے لیے

☆ دھنیے کے پانی میں چینی ملا کر پیس۔ گرمیوں کے موسم میں بار بار پانی پیتے رہنے سے لو لگنے کا خطرہ ٹل جاتا ہے۔ ایک الاچی ہر وقت منہ میں رکھنے سے اس سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ آم کی کیری کا شربت پینا مفید ہے۔ لیموں کے رس میں ایک گلاس پانی اور پسی ہوئی مصری بڈال کر پینے سے لو کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

## خارش کا علاج

☆ خارش خشک و تر کی صورت میں لیموں کا رس پانچ گرام، عرق گلاب دس گرام اور چیمیلی کا تیل پندرہ گرام، تینوں کو ملا کر خارش والی جگہ پر لگانے سے چند روز میں افاقہ ہو جائے گا۔

## گرودہ اور مٹانے کی پتھری کے لیے

☆ گرودہ اور مٹانہ کی پتھریاں ایک ماہ تک کھیرے کی قاشوں پر کالا نمک اور نوشادر لگا کر کھانے سے پیشاب کے راستے ٹوٹ کر نکل جاتی ہیں۔

## خونی بوا سیر کے لیے

☆ کریلے کے پتوں کا پانی پانچ تولہ گائے کے ایک پاؤ گھی میں ملا کر پکایا جائے، جب پانی جل جائے تو باقی ماندہ گھی بوا سیر خونی بادی کے مسوں پر لگانے سے چند دنوں میں مسے غائب ہو جاتے ہیں اور جلن تو ایک ہی دفعہ لگانے سے دور ہو جاتی ہے۔

## نظر کی کمزوری دور کرنے کے لیے

☆ اگر آپ روزانہ ایک امرو دھنیا منہ چالیس دن تک بلا ٹانہ کھا میں تو نظر کی کمزوری دور ہو جائے گی۔

## قوت حافظہ کے لیے

☆ نسیان دور کرنے کی خاطر کلونجی کے سات عدد





بو نہیں آتی۔ کر گر پڑے تو سمجھ لیں کہ انڈا ابھی کچا ہے۔

## کریلوں کی کڑواہٹ

☆ کچا آم لے کر کاٹ لیں۔ تھوڑے سے پانی میں ابلال لیں۔ جب جوش آجائے تو اس میں کریلے کاٹ کر ڈال دیں۔ چارپانچ جوش دیں اور کریلے نکال دیں۔

کریلوں کی کڑواہٹ دور ہو جائے گی۔

## سالن گاڑھا کرنا

☆ اگر سالن پتلا ہو گیا ہے اور آپ کے پاس ٹماٹریا پیاز نہیں ہے تو بجھنی ہوئی سوچی سالن میں ڈال دیں۔ اس سے سالن گاڑھا ہو جائے گا اور ذائقہ بھی اچھا ہوگا۔

## مکھن کی نرماہٹ کے لیے

☆ مکھن نرم کرنے کے لیے ایک آسان سا حل یہ ہے کہ ایک کھلے منہ کے پیالے میں گرم پانی بھر کر مکھن اس میں ڈال دیں، مکھن چند ہی منٹ میں نرم ہو جائے گا۔

## مٹر کا گلانا

☆ مٹر گلانے کے لیے مٹر کے دانوں کو پانی میں بھگو کر معمولی سی شکریا کھانے کا سوڈا اور پودینے کی چند پتیاں ڈال کر پکا میں، مٹر کے دانے کم وقت میں گلانے کے لیے یہ نسخہ سب سے آسان اور آزمودہ ہے۔

## اناج کو کیڑوں سے محفوظ رکھنا

☆ عموماً گھروں میں مہینہ بھر کا اناج ایک ہی وقت میں خرید لیا جاتا ہے اور اناج میں کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ طویل عرصہ اناج ہر قسم کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اناج کے ڈبوں میں تیزبات کے پتے ڈال دیں، اناج تازہ رہے گا اور کیڑوں سے

## بھنڈیوں کو خستہ کرنے کے لیے

☆ بھنڈیوں کو خستہ کرنے کے لیے پکاتے وقت اس میں چند قطرے لیموں کا رس ڈال دیں یا پھر ایک چمچ دہی ڈال دیں۔

## چاول کی نرماہٹ کے لیے

☆ چاول دم پر رکھتے وقت احساس ہو کہ چاول سخت رہ گئے ہیں تو کوئی کپڑا یا اخبار گیل کر کے ڈھکن کے اندر رکھیں اور پھر دم دے دیں تو چاول ذرا نرم ہو جائیں گے اور اگر چاول نرم ہو گئے ہوں تو خشک کپڑا یا اخبار تہ کر کے ڈھکن کے اندر رکھ دیں، زائد پانی خشک ہو جائے گا اور چاول کھلے کھلے پکیں گے، یعنی ہر دانہ الگ الگ ہوگا۔

## گوشت کی بساند دور کریں

☆ قربانی اور بازار سے خریدے ہوئے گوشت میں اکثر بساند آتی ہے جو بہت پکانے پر بھی نہیں جاتی۔ اس بساند کو ختم کرنے کے لیے نہایت سستا اور آزمودہ نسخہ ہے، وہ یہ کہ چھلنی میں آٹا چھانٹنے کے بعد بیچ جانے والی بھوسی کو جمع کر کے گھر میں رکھیں۔ جب گوشت خرید کر لائیں اور اس میں بساند محسوس ہو تو گوشت پر آٹے کی بھوسی اچھی طرح چھڑک کر اسے پندرہ منٹ تک رکھے رہنے دیں اور پھر دھو لیں۔ بساند بالکل ختم ہو جائے گی۔

## ابلے انڈے کی پہچان

☆ اگر آپ نے یہ دیکھا ہو کہ انڈہ ٹھیک طور پر ابلایا ہے یا نہیں تو انڈے کو پانی سے نکال کر گھما کر دیکھیں، اگر لٹو کی طرح سے گھوم جائے تو سمجھ جائے کہ انڈا ابل گیا ہے اور اگر ٹھیک سے نہیں گھومے بلکہ لڑکھڑا





## گھبراہٹوں سے بچنے کے



چاہیے، کیونکہ اس کا زیادہ استعمال چائے کو خراب کر دیتا ہے اور اس کی اگر کمی ہو جائے تب بھی چائے کے ذائقے میں خرابی پیدا ہو جائے گی۔ جھنٹی چائے کی پتی آپ کو درکار ہو اس کی آدھی مقدار ڈالیں اور آدھی پتی کو چھلنی میں ڈالیں جس سے چائے چھانی جاتی ہے۔ جب قہوہ چھلنی سے گزرے گا تو اس میں موجود تازہ چائے کی پتی کی قوت بھی قہوے میں شامل ہو جائے گی اور یوں یہ عمل چائے کو مطلوبہ ذائقہ تک لے جائے گا۔

### مچھلی کی بودا کرنے کے لیے

☆ مچھلی کی بودا کرنے کے لیے اسے پکاتے ہوئے ایک دو باتوں کا خیال رکھیں تو مچھلی کی بودا پختے ہوئے کافی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً "جس مسالے کو بھوننا ہے اس میں تھوڑا سا سرکہ ڈال دیں" اس طرح بودا کم ہو جائے گی۔

### لیموں دیر تک محفوظ رکھنے کے لیے

☆ لیموں بہت مفید ہے، لیکن یہ سال بھر دستیاب نہیں رہتا، انہیں تازہ حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ ایک کلو لیموں کا رس نکالیں۔ انہیں برف جمائے کی ٹرے میں ڈال کر جمادیں، جب ضرورت ہو ایک ٹکڑا نکال لیں اور استعمال کریں، ہر موسم میں تازہ لیموں کے رس سے لطف اٹھائیں یہ رس خراب نہیں ہوتا۔

### فرش جو تے بیگ سب چمک دار

☆ جی ہاں فلور ویکس لگانے سے بیک وقت آپ کا فرش بھی چمک سکتا ہے اور بیگ و جو تے بھی آزمائش شرط ہے۔

### فرش کی چمک کے لیے

اناج کی حفاظت ہو جائے گی۔

### گاجر دیر تک تازہ رکھنا

☆ گاجریں بہت جلد مرجھاسی جاتی ہیں۔ پکانے سے پہلے گاجروں کو برف کے ٹخ پانی میں بھگو دیں، گاجریں تازہ ہو جائیں گی، صاف اور نکھری ہوئی محسوس ہوں گی۔

### سالن میں نمک کا زیادہ ہونا

☆ سالن میں اگر نمک زیادہ ہو جائے تو اخروٹ کے برابر ایک کونٹے کا ٹکڑا سالن میں ڈال دیں۔ دس منٹ بعد نکال کر پھینک دیں، زائد نمک خود بخود ختم ہو جائے گا۔

### گوشت جلد گلانے کے لیے

☆ گوشت گلانے کے کئی طریقے ہیں، مثلاً "ایک کلو گوشت میں اگر ایک کھانے کا چمچہ کچا پیٹنا ڈال دیا جائے تو گوشت گل کر خستہ ہو جائے گا یا پھر تربوز کا خشک یا تازہ چھلکا گوشت پکاتے وقت ڈال دیں۔ گوشت کو گلانے وقت تھوڑی سی شکر ڈال دیں تو گوشت جلد گل جائے گا۔ گوشت کی مناسب سے آدھی یا ایک دو چھالیہ کے ٹکڑے ڈالنے سے بھی گوشت گل جاتا ہے۔

### پیاز کی جلن سے بچنے کے لیے

☆ پیاز کاٹتے وقت آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اگر پیاز کاٹنے سے پہلے ریفریجریٹر میں رکھ دیں، پھر کاٹیں تو آنکھوں میں جلن پیدا نہیں ہوگی، نہ ہی آنسو آئیں گے۔

### چائے کے بہتر ذائقے کے لیے

☆ چائے کی پتی کا استعمال بڑے محتاط انداز سے کرنا





## چھلنی کی صفائی کے لیے

☆ اسٹین لیس اسٹیل کی چھلنی کو صاف کرنے کے لیے اسے آگ پر گرم کریں۔ صاف ہو جائے گی۔  
چائے کے مک صاف کرنے کے لیے

☆ چائے یا کافی کے مک سے چائے کی پتی یا کافی کے داغ دھوے دور کرنے کے لیے ان میں ہیکنگ سوڈا ڈال کر ہلکے ہاتھ سے رگڑیں۔ سب داغ صاف ہو جائیں گے۔

## تیل کے داغ مٹانے کے لیے

☆ اونچی کپڑوں سے تیل کے داغ مٹانے کے لیے متاثرہ جگہ پر ذرا سادھی لگائیں اور کچھ دیر بعد دھولیں۔ تیل کے داغ صاف ہو جائیں گے۔

## ٹوتھ برش کو صاف رکھنے کے لیے

☆ ٹوتھ برش کو ہیکٹریا سے پاک رکھنے کے لیے اسے ہفتے میں ایک بار نمک ملے گرم پانی سے دھوئیں۔ برش صاف ہو جائے گا۔

## سیاہی کے داغ

☆ سیاہی کے داغ دور کرنے کے لیے آلو کو چھیل کر اس کے دو ٹکڑے کر لیں، پھر جہاں سیاہی کا داغ ہو اس جگہ پر خوب ملیں، معمولی اور ہلکے قسم کے داغ دور ہو جائیں گے۔

## شیشے کے برتن چمکائیں

☆ شیشے کے نازک برتن صاف کرنے اور ان برتنوں میں چمک پیدا کرنے کے لیے تین چمچے سرکہ پانی میں ملا کر رکھ دیں، تمام برتن دھونے کے بعد سرکہ ملے پانی سے برتن کھنکھالیں۔ شیشے کے برتن خوب چمک اٹھیں گے۔

☆ فرش اگر پرانا ہو تو صفائی کے بعد بھی چمکتا دکھائی نہیں دیتا، فرش کی کھوئی ہوئی چمک لوٹانے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ ایک پمیلی میں ہیکنگ پاؤڈر ڈال کر ابالیں، جب پانی میں جوش آجائے تو احتیاط سے فرش پر پھیلا دیں، جھاڑو یا برش سے فرش کو رگڑیں، فرش صاف ہو کر چمک اٹھے گا۔ ہر ہفتے یا پندرہ دن بعد یہ عمل کرنے سے فرش کے دھبے صاف ہو جائیں گے اور فرش بھی خوب صاف ہو جائے گا اور اس پر مٹی بھی جمع نہیں ہوگی۔

## کپڑوں کے داغ کے لیے

☆ کپڑوں پر سالن یا کسی اور شے کا بد نما نشان ہو تو لیموں کاٹ کر اس کا عرق متاثرہ جگہ پر لگائیں اور کپڑے کو پانی سے دھولیں، داغ صاف ہو جائے گا۔

## نان اسٹک برتن کے داغ دور کرنے کے لیے

☆ نان اسٹک کے برتن جب زیادہ استعمال ہوں تو ان میں دھبے پڑ جاتے ہیں، ان دھبوں کو صاف کرنے کے لیے تین کپ پانی نان اسٹک کے برتن میں ڈالیں اور اس میں ایک کھانے کا چمچ سرکہ، ایک کھانے کا چمچ بائچنگ پاؤڈر اور ایک کھانے کا چمچ نمک ڈال کر پانچ سے دس منٹ تک ابالیں، پھر نرم برتن دھونے والے فوم سے اور صابن سے رگڑ کر دھولیں۔ نان اسٹک پین اور پتیلیاں وغیرہ بالکل نئی ہو جائیں گی۔

## کپڑوں پر بال پین کے داغ دور کرنے کے لیے

☆ کپڑوں پر بال پین کے داغ بہت مشکل سے صاف ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے ایک آسان ترکیب یہ ہے کہ بال پین کے دھبے کے اوپر ہری مرچ کاٹ کر خوب ملیں، پھر عام پاؤڈر سے دھو کر استری کر لیں، داغ صاف ہو جائے گا۔





لیکن اگر جوتوں کی پالش میں چند قطرے لیموں کے رس کے ملا دیں تو پالش کرنے سے جوتے میں چمک آجائی ہے اور وہ بالکل نئے محسوس ہوتے ہیں۔

## پان کے داغ

☆ کپڑوں پر پان کے داغ بہت بد نما لگتے ہیں اور کوشش کے باوجود صاف نہیں ہوتے، لیکن اگر پان کے داغ دور کرنے کے لیے ایک کچا امرود کاٹ کر داغ پر ملا جائے اور پھر داغ والی جگہ کو پانی سے دھو ڈالا جائے تو پان کے داغ دور ہو جاتے ہیں۔

## کپڑے پر گھی کا داغ

☆ اگر کسی کپڑے پر گھی کا داغ پڑ جائے تو اس حصے پر لیموں اور نمک لگا کر ملیں اور صابن سے دھولیں۔

## چائے کے داغ کو دور کرنا

☆ جس جگہ چائے یا کافی گر جائے تو وہاں فوراً نمک چھڑک دیں اور خشک ہونے کے بعد گرم پانی میں صرف ڈال کر دھولیں۔ کافی کے دھبے صاف کرنے کے لیے اسپرٹ سے صاف کر لیں۔ کافی کے گہرے داغ ہوں تو پیٹرول سے صاف کریں۔

## ریفریجریٹر کو پھپھوندی سے بچائیے

☆ جب آپ شہر سے باہر جا رہے ہوں تو طویل

## قالین کی صفائی

☆ قالین پر برسوں سے پڑے داغ دھبے صاف کرنے کے لیے داغ دھبوں پر پہلے نمک چھڑک کر آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں پھر قالین دھولیں۔ ہر نوعیت کے ان اور نشانات پہلی ہی کوشش میں یکسر صاف ہو جائیں گے۔ قالین بھی چمک اٹھے گا۔

## شیشے پر پینٹ کے دھبے

☆ شیشے پر پینٹ کے دھبے پڑ جائیں تو سرکہ گرم کریں کپڑے کی مدد سے شیشے صاف کریں تو تمام دھبے مٹ جائیں گے۔

## تصاویر کی صفائی

☆ گھروں میں آویزاں تصاویر عموماً گرد و غبار کی وجہ سے کم ہی عرصے میں میلی نظر آنے لگتی ہیں۔ انہیں صاف کرنے کے لیے اسفنج کی مدد سے نیم گرم پانی سے دھوئیں پھر ریشمی کپڑے سے تصویر صاف کر لیں۔ اس سے تصویر بالکل شفاف ہو جائے گی، خراب ہونے سے بھی محفوظ رہے گی۔

## جوتوں میں نیا پن لائیں

☆ گرد و غبار سے جوتوں کا نیا پن برقرار نہیں رہتا





نیم کی پتیاں رکھ دی جائیں تو کتابیں دیمک سے محفوظ رہتی ہیں۔

## چیونگم کا داغ

☆ چیونگم کپڑے پر چیک جائے تو بڑی مشکل سے اترتی ہے، بچوں کو منع کریں، چیونگم کپڑوں پر نہ چپکائیں، چھری ذرا گرم کر کے چیونگم اتار لیں، پھر اسپرٹ میں بھگو دیں اس کے بعد صابن سے دھو لیں۔

## موم کے داغ

☆ آج کل لوڈ شیڈنگ کے باعث گھروں میں موم جی استعمال ہو رہی ہے، ویسے تو موم جی کو کسی چیز میں رکھ کر جلایا جاتا ہے، مگر پر بھی اگر آپ کے قالین پر موم کا نشان لگ جائے تو پہلے اس دھبے کو سخت ہونے دیں، پھر تیز دار چیز مثلاً "چھری کی مدد سے اسے اتار لیں اور پھر متاثرہ حصے پر صاف بلائنگ پیپر کا ٹکڑا بچھا کر گرم استری پھیر کر داغ اتار لیں۔ اگر یہ داغ ہلکا ہو تو تارپین کا تیل لگا کر رگڑ لیں۔

## مکھن یا چکنائی کے داغ

☆ مکھن کے داغ قالین پر لگنے کی صورت میں اس کی صفائی نشو سے کریں۔ نشو میں جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ کپڑے پر تارپین کا تیل لگا کر صاف کر لیں۔ مگر اس کے قریب سگریٹ یا دیا سلائی نہ جلا لیں، کیونکہ اس سے آگ لگنے کا خدشہ ہے۔

## گریس کے داغ

☆ گریس کے داغ پر عام استعمال کا ٹالکم پاؤڈر چھڑکیں۔ یہ داغ جذب کر لے گا۔ پھر ٹالکم پاؤڈر کو ویکو م سے صاف کر لیں۔

## خون کے داغ

عرصے تک ریفریجریٹر بند رکھنا چاہتی ہوں تو صاف کر کے خشک کر لیں۔ اب اس کے اندر کافی سارا ٹالکم پاؤڈر چھڑک دیں۔ کافی عرصے ریفریجریٹر بند رکھنے کے باوجود پھپھوندی یا کیڑے نہیں لگیں گے۔

## کپڑوں سے زنگ کے داغ دور کرنا

☆ اگر کپڑے پر زنگ کا داغ لگ جائے تو دودھ میں ایک گھنٹہ کپڑے کو زنگ والے حصے کی طرف سے ڈبو دیں، پھر صابن سے دھو لیں۔

## جلنے کے نشانات مٹانے

☆ جلد حادثاتی طور پر جل جائے تو نا صرف بہت تکلیف ہوتی ہے بلکہ جلد پر آبلے پڑ جاتے ہیں، آبلوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک آلہ صاف کریں، اس کے چھوٹے ٹکڑے آہستگی سے جلد پر رگڑیں، جلن ختم ہو جائے گی اور آبلے بھی نہیں پڑیں گے۔ یہ نہایت آزمودہ نسخہ ہے۔

## جلنے کے داغ

☆ بچوں کی یونیفارم سفید ہوتی ہے۔ صبح سویرے استری کرتے وقت بعض دفع استری سے جلنے کا داغ یونیفارم پر رہ جاتا ہے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اس دھبے پر کیٹنوں کا رس اور نمک لگا کر رکھ دیں، دھوپ میں پھیلا لیں تو بہتر ہے، پھر سرف سے دھو لیں۔

رنگین کپڑے پر داغ پڑ جائیں تو آپ کارن فلور یا نشاستہ میں پانی ملا کر تھلا کریں، کپڑے پر لگا کر سوکھنے دیں، اس کے بعد دھو لیں۔

## نوشہ رنگین کپڑے پر لگائیں تو زنگ کٹ جائے گا۔

## الماری کو دیمک سے بچایے

☆ الماری کو دیمک سے بچانے کے لیے اس میں اگر





ہو جائے گا۔

ٹیپٹ صاف کرنے کے لیے

☆ کیتلی کے زیادہ استعمال سے اندرونی حصہ کالا ہو جاتا ہے، آپ اس کیتلی میں پانی اور میٹھا سوڈا آدھا چائے کا چمچہ ڈال کر تین سے چار منٹ تک ابالیں، اس کے بعد اچھی طرح سے دھو لیں۔ کیتلی دوبارہ چمک جائے گی۔

چینی کے برتنوں کے داغ دھبوں اور چمک کے لیے

☆ چینی کے برتنوں پر اکثر دھبے پڑ جاتے ہیں جو بڑے بد نما لگتے ہیں۔ ان کے اس نقص کو دور کرنے کے لیے سر کے میں ذرا سائمنک ملا کر برتن کو صاف کیا جائے تو یہ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔

سلور کے برتنوں کو چمکانا

☆ سلور کے برتنوں پر عام طور پر میل کی تھیں جم جاتی ہیں اور داغ دھبے بری طرح سے برتن کو بد نما بنا دیتے ہیں۔

سلور کے ایسے برتنوں کو جو بد نما اور میل دار ہو رہے ہوں، چمک دار بنانے کے لیے پرانے گونے پر صابن یا سرف لگا کر برتن صاف کریں۔

عینک کے شیشے کی صفائی

☆ عینک کا شیشہ جب گندا ہو جائے تو اسے اخبار کے کاغذ سے صاف کریں شیشہ بالکل صاف ہو جائے گا۔

غسل خانے، صحن یا باورچی خانے میں کالی دور کرنے کی ترکیب

☆ غسل خانے، صحن یا باورچی خانے میں مسلسل نمی رہے تو کالی جم جاتی ہے اسے دور کرنے کے لیے بالچنگ پاؤڈر کو متاثرہ مقام پر چھڑک دیں اور بند رہیں

☆ قالین پر خون کے داغ لگنے کی صورت میں اسے ٹھنڈے پانی سے صاف کریں، اس کے لیے بہتر ہے کہ فریج کا پانی لیا جائے۔ اگر خون جم گیا ہو تو اسٹینچ کے ٹکڑے پر ڈنڈا لگا کر صاف کریں۔

جوس کے داغ

☆ قالین پر جوس کے داغ لگ جائیں تو اسے ٹھنڈے پانی سے صاف کریں، اگر داغ گہرا ہو تو پانی میں تھوڑا سا سوڈا ملا کر صاف کریں۔

چاکلیٹ کے داغ

☆ چاکلیٹ کے داغ لگ جانے کی صورت میں اسے گرم پانی سے صاف کرنا ہرگز مناسب نہیں، بلکہ ٹھنڈے پانی سے صاف کریں۔ اگر ڈنڈا ملے پانی میں سرکہ ملا کر انہیں صاف کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

پینے کے داغ

☆ پینے کے داغ اکثر قیص کی بگلوں پر پڑ جاتے ہیں۔ اگر پانی میں سفید سرکہ ملا میں اور صرف بگلوں والے حصے کو پکڑ کر اسے پانی سے دھولیں اور دھوپ میں ڈال کر خشک کر لیں، داغ صاف ہو جائیں گے۔  
لوہے کی کڑاہی صاف کرنے کے لیے

☆ اگر لوہے کی کڑاہی بہت زیادہ سیاہ ہو جائے تو اس کالی کڑاہی میں کسی ڈال کر تین دن تک کے لیے چھوڑ دیں۔ بعد میں مانجھ لیں۔ کڑاہی بالکل صاف ہو جائے گی۔

قیص کا کالر صاف کرنے کے لیے

☆ اکثر قیص دھلنے کے بعد اس کا کالر صاف نہیں ہوتا، قیص دھونے سے پہلے اس کے کالر پر تھوڑا سا شیمپو لگا کر رگڑیں، پھر قیص دھولیں، کالر صاف









☆ ہو جائے گی۔ دودھ بڑے فائدے کی غذا ہے۔ اگر کوئی آدھے سر کے درد میں مبتلا ہو تو سورج طلوع ہونے سے قبل گرم دودھ کے ساتھ جلیبی کھانے سے یقینی فائدہ ہوگا۔ گرم دودھ کے ساتھ اسپنول کا چھلکا یا گلفند کھانے سے قبض دور ہو جاتا ہے۔ یہ ترکیب بواسیر سے نجات کے لیے بھی موزوں ہے۔

جھائیاں دور کرنے کے لیے

☆ اگر چہرے پر جھائیاں نکلتی شروع ہو گئی ہیں تو آپ ایک ٹیبل اسپون دی، ایک ٹیبل اسپون شہد اور ایک ٹی اسپون انڈے کی سفیدی اچھی طرح ملا کر اپنے چہرے پر لگائیں اور چند دنوں میں مکمل دیکھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے دور کرنا

☆ اپنی آنکھوں کے گرد رڑنے والے حلقوں اور گہرے داغ دھبوں کو صاف کرنے کے لیے ایک ٹی اسپون بادام کا تیل، ایک ٹی اسپون گکڑی کارس اور ایک ٹی اسپون آلو کارس ملا کر لگائیں۔

پان یا کتھے کا داغ دور کرنا

☆ کپڑے پر پان یا کتھے کا داغ پڑ جائے تو وہ کپڑے دھونے کے صابن سے دور نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے متاثرہ جگہ کو دودھ سے اچھی طرح دھوئیں۔



☆ اگر آپ کے ناخن کمزوری کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں تو ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچ جیلاشن ملائیں اور پھر اس میں ایک مازہ لیموں پھوڑ کر گرم گرم پی جائیں۔

جسم کی بدبو دور کرنے کی ترکیب

☆ اگر جسم میں بدبو پیدا ہو جائے تو انگور کے عرق میں تھوڑا سا عرق گلاب ملا کر ایک ماہ تک اس کی جسم پر مالش کریں۔ بدن سے ہر قسم کی بدبو کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پپوٹوں کی سو جن دور کرنا

☆ شدید دھوپ کی وجہ سے اگر پپوٹے سو ج جائیں تو ان پر چائے کی استعمال شدہ تھیلیاں رکھیں سو جن جلد ختم ہو جائے گی۔

لمبی پلکوں کو خمیدہ بنانے کی ترکیب

☆ رات کو پلکوں پر کیسٹر آئل لگا کر سوئیں۔ دن کو منہ ہاتھ دھونے کے بعد ان پر تھوڑی سی ویزلین لگا کر انہیں نیچے سے اوپر کی طرف اٹھائیں چند روز یہ عمل جاری رکھیں۔

کیل مہاسے اور داغ دھبے دور کرنے کے لیے

☆ شگترے کے چھلکے سکھا کر پیس لیں اور دودھ یا پانی کے ساتھ ملا کر روزانہ ابٹن کی طرح اسے داغ دھبوں پر لگائیں یا جو کے آنے کے ساتھ ملا کر چہرے پر اس کا ٹیپ کریں اور مسل کر اتار لیں۔ چہرہ چند ہفتوں میں ہی کیل مہاسوں اور داغ دھبوں سے پاک ہو جائے گا۔

جلد کا سیاہ پن دور کریں

☆ اگر آپ کی جلد سیاہ ہے یا بے رونق ہے تو یوں کریں کہ روزانہ چہرے پر دودھ ملیں۔ سارے جسم پر اگر مل لیا کریں تو جلد بے حد خوب صورت اور صاف





☆ صبح منہ دھونے کے بعد منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے اس سے ایک تو مہاسے اور دانے ختم ہو جائیں گے دوسرے چہرے پر شگفتگی پیدا ہو جائے گی۔

## کھنی کے سیاہ دھبے دور کرنے کے لیے

☆ لیموں کاٹ کر رس نکال لیں۔ چھلکوں میں آدھا چائے کا چمچہ دودھ ڈالیں اور کھنی پر خوب رگڑیں چند مرتبہ کے استعمال سے کھنیاں صاف ہو جائیں گی۔

## سر کے گتھ کے لیے

☆ لیموں کے رس میں پسا ہوا آملہ ملا کر سر پر مالش کریں۔ پھر سردھولیں۔ ایک ثابت لیموں کو سرسوں کے تھوڑے سے تیل میں ملا لیں اور تیل چھان کر سر پر مالش کریں۔ لیموں کے بیج پیس کر روزانہ سر پر لپ گریں جہاں گتھ ہو پھر آملہ کے پانی سے سردھولیں خالص کشر آملہ رات کو ملیں۔

## موٹاپا دور کرنے کے لیے

☆ موٹاپا دور کرنے کے لیے کلونجی لے کر لیموں کے رس میں بھگو دیں اور فریق میں ایک رات رکھ دیں اور پھر بوتل میں رکھ کر دھوپ میں رکھ دیں اسے گرینڈ کریں اور روزانہ نہار منہ آدھا چمچہ استعمال کریں۔

☆ دال مسور ایک چمچہ چار گلاس پانی میں ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ ایک گلاس پانی رہ جائے پھر صبح اس میں لیموں کے چند قطرے اور نمک ڈال کر پیئیں یہ نسخہ چالیس دن استعمال کریں۔ وزن میں واضح کمی محسوس ہوگی۔

## چہرے پر اضافی بالوں کا خاتمہ

☆ ایک چمچہ اگر بتی کی راکھ اور اس میں دو حصے پانی یا دودھ شامل کریں اس مرکب کو بالوں پر لگا دیں اور

## خشک ہونٹوں کے لیے

☆ بادام اور ناریل کا تیل ملا جلا پانچ فی اسپون لے لیں پھر اس میں نصف لیموں کا رس لیں۔ اس لوشن کو ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ دن میں تین سے چار بار ہونٹوں پر یہ لوشن لگائیں۔ خشک ہونٹ نرم ملائم ہو جائیں گے۔

## فیس اسکرپ

☆ چار فی اسپون جو پاؤڈر دو فی اسپون چاول کا پاؤڈر چٹکی بھر ہلدی اور دو فی اسپون ملتانی مٹی ملا کر اچھی طرح پیس لیں اور خشک جاہ میں رکھ لیں۔ استعمال کے وقت ایک فی اسپون عرق گلاب میں ذرا سیاہ مرکب ڈال کر چہرے پر لگالیں۔ پندرہ منٹ بعد چہرہ صاف کریں۔ بلیک ہیڈز کا یقینی خاتمہ ہو جائے گا۔



## گھر میں مٹی کیور کیجیے

☆ ہفتے میں ایک بار گھر پر مٹی کیور کرنے کا طریقہ کچھ یوں ہے کہ نصف کپ شہد میں دو لیموں کا رس اور چار فی اسپون شکر ملا لیں۔ اب اس مرکب کو اچھی طرح دونوں ہاتھوں پر ملیں۔ پانچ منٹ بعد ہاتھ دھولیں ہاتھ نہ صرف نرم ملائم ہو جائیں گے بلکہ چمک بھی اٹھیں گے۔

## مہاسے اور دانے ختم کرنے کے لیے



کیڑوں مکوڑوں کو بھگانے کی ترکیبیں



پسو کو بھگانے کا طریقہ

☆ جس گھر میں پسو ہوں اس میں پہاڑی پودینہ لا کر رکھ دیں۔ اس کی بو سے پسو بھاگ جائیں گے۔

چھھرے نجات کی ترکیب

☆ تلسی کے پتوں کا رس نکال کر جسم پر مالش کر لیں۔ چھھرے آپ کے نزدیک نہیں آئیں گے یا یوکلپٹس آئل، روغن سنگتو، روغن الہیجی اور روغن سرسوں کو باہم ملا کر جسم پر لگائیں۔

کھٹل دور کرنے کا طریقہ

☆ گندھک جلا کر اس کی دھونی دینے سے کھٹل بھاگ جاتے ہیں۔

جو میں مارنے کی ترکیب

☆ اگر سر میں جو میں پڑ جائیں تو چقدر کے پتے ایک کلو پانی میں اچھی طرح جوش دے لیں۔ پھر اس پانی سے دو تین روز تک سر کو دھوئیں جو میں مر جائیں گی۔

مکھیوں کو بھگانے کی ترکیب

☆ مکھیوں کو بھگانے کے لیے نیم کی سوکھی پتیاں جلائی جائیں۔ ان کی بو اور دھوئیں سے یہ بھاگ

خشک ہو جائے تو اوپر کی جانب مل کر مٹائیں۔ یہ عمل روزانہ تقریباً دو ماہ کریں نتیجہ بہترین نکلے گا۔

آنکھوں کے گرد حلقے دور کرنے کے لیے

☆ اس کے لیے ٹھنڈے پانی میں روئی کے دو پھائے بھگو کر نچوڑ لیں اور ان پر عرق گلاب چھڑک کر آنکھوں پر رکھیں تقریباً پندرہ منٹ روزانہ یہ عمل کرنے سے حلقے دور ہو جائیں گے یا پھر آنکھوں کے گرد حیاتین ای کا تیل لگائیں۔

بالوں کی خشکی دور کرنے کے لیے

☆ بالوں کی خشکی کو دور کرنے کے لیے خشکاش کو اچھی طرح پیس کر اسے دودھ میں گھول کر اس سے سر کو دھوئیں تو خشکی دور ہو جاتی ہے۔

خواتین کے ہونٹوں کے بال دور کرنے کے لیے

☆ خواتین کے ہونٹوں کے غیر ضروری بال ختم کرنے کے لیے ایفون کو سر کے میں حل کر کے پندرہ بیس منٹ تک ابٹن کی طرح لگائیں۔ پھر ہاتھوں سے اچھی طرح رگڑ کر دھولیں۔

چہرے پر سے دھوپ کا اثر ختم کرنے کے لیے

☆ گرمیوں میں تیز دھوپ کی وجہ سے یا لو کے تھیزے لگنے سے چہرہ بھلس جاتا ہے۔ اکثر دھوپ میں نکلنے سے رنگ بھی کالا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں چہرہ گرم پانی سے دھو کر اس پر ٹماٹر کا رس ملیں۔

چونٹیاں یا دیمک کے خاتمے کے لیے

☆ گھر میں دیمک لگ گئی ہو یا چونٹیاں بھر گئی ہوں تو پھنکری سرسوں کے تیل میں ملا کر ڈالیں سب چونٹیاں غائب ہو جائیں گی۔



ان پر نکالیں۔ تختہ کو خوب صورت بنانے کے لیے اپنی پسند کا کوئی رنگ کر لیں۔

**کپڑوں میں چمک پیدا کرنے کی ترکیب**

☆ دس چھٹانک کلف میں ایک چھوٹا چمچہ سہاگہ شامل کر دیجیے اور کپڑے اس میں ڈبو کر پھیلا دیجیے، استری کرنے سے کپڑے میں چمک آجائے گی۔

**قالین صاف کرنے کا آسان طریقہ**

☆ ایک کپڑے کو روغن تارپن اور گرم پانی میں بھگو لیں اور پھر اس کپڑے سے قالین کو صاف کریں تو اچھی صفائی ہوگی۔

**پلاسٹک کے جگہ اور گلاس صاف کرنے کی ترکیب**

☆ اگر پلاسٹک کے جگہ اور گلاس پہلے ہو جائیں تو گرم پانی میں نمک ملا کر اس سے دھوئیں۔

**پکے ہوئے کھانے کا نمک کم کرنے کی ترکیب**

☆ اگر غلطی سے کھانا پکاتے ہوئے نمک زیادہ ڈال دیا جائے تو مندرجہ ذیل ترکیب استعمال کریں۔

☆ گوندھے ہوئے آٹے کی ٹکیہ بنا بیجیے اور سالن میں ڈال دیں اور کچھ دیر بعد نکال لیں، ایک بار ایسا کرنے سے نمک کم ہو جائے گا۔

☆ لکڑی کا جلتا ہوا کوئلہ لیں، اسے اچھی طرح دھوئیں، سیاہی نکلتی بند ہو جائے تو سالن میں ڈال دیں اور پکا میں پھر کوئلہ نکال لیں تو نمک کی زیادتی کم ہو جائے گی۔

☆ ایک سفید کانگڈ کا ٹکڑا سالن میں ڈال دیں، تھوڑی دیر کانگڈ نمک کو جذب کر لے گا اور نمک کم ہو جائے گا۔

جائیں گی۔ کلوئچی کے دھوئیں سے بھی مچھر اور کھیاں بھاگ جاتے ہیں، صنوبر کی لکڑی کی دھوئی سے یہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔

**متفرق**

**پھنسے ہوئے گلاس نکالنے کی ترکیب**

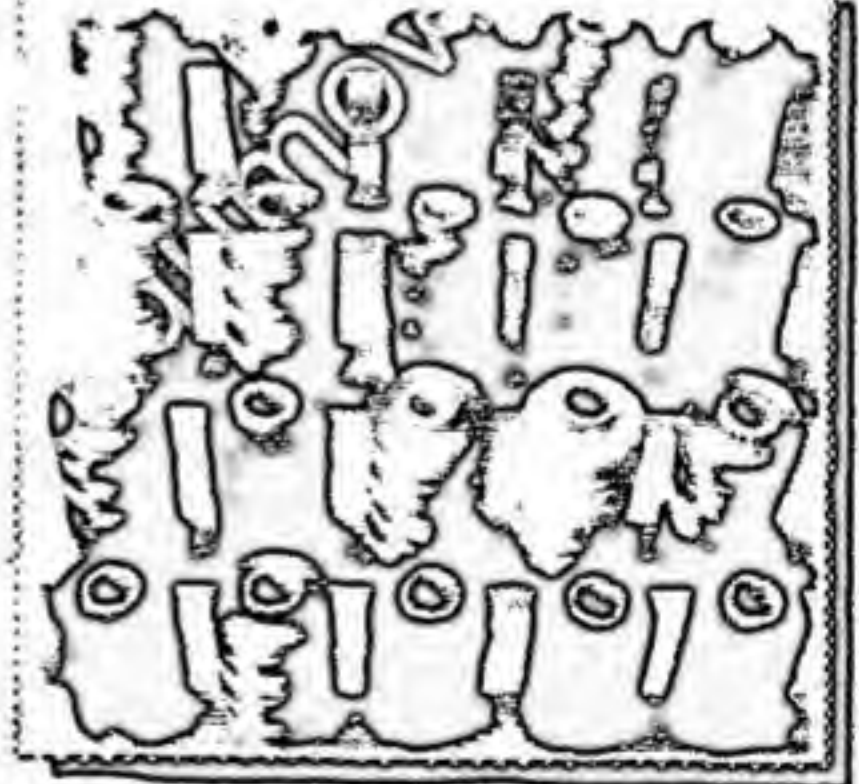
☆ ایک گلاس دوسرے گلاس میں چھس جائے تو انہیں کھینچ کر نکالنے سے گریز کریں، بلکہ شیشے کے پھنسے ہوئے یہ گلاس فریج میں رکھ دیں، خود بخود علیحدہ ہو جائیں گے۔

**بالوں سے چیونٹم نکالنے کی ترکیب**

☆ چیونٹم اگر بالوں سے چپک جائے تو اسے چھڑانا کافی تکلیف دہ ثابت ہو سکتا ہے اس کے لیے روئی کو بے لی آئل میں بھگو کر بالوں میں لگائیں، چیونٹم آسانی سے اتر جائے گی۔

**دھماگے کی نلکیوں کو الجھاؤ سے بچانا**

☆ دھماگے کی نلکیوں کو الجھنے سے بچانے کے لیے لکڑی کا چھوٹا سا تختہ لے کر اس پر برابر فاصلے سے چند کیل ٹھونک دیں، پھر گھر میں بڑی ہوئی تمام نلکیاں







سیہ جائیں۔

نکلی پھولوں اور پتوں کو تازے کچے دودھ سے صاف کریں بالکل چمک جائیں گے۔

بلی کے بال صاف کرنے کے لیے

☆ اگر آپ کے گھر میں پالتو بلیاں ہیں اور وہ گھر میں صوفوں پر، بستر پر سوتے ہوئے پالی جاتی ہیں یا قالین پر وہاں سے اٹھتے ہوئے اپنے بل چھوڑ جاتی ہیں جو خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتے ہیں اور کھانے وغیرہ میں بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ صوفے یا قالین پر کھانا کھا رہے ہوں۔ اس کا ایک آسان حل یہ ہے کہ اپنی انگلی پر کوئی چپکانے والی شیپ لپیٹ کر اسی جگہ پر پھیریں سب بال وغیرہ اس شیپ سے چپک جائیں گے اور آپ کو ایک ایک بال الگ الگ چننا نہیں پڑے گا۔ پھر آپ اس شیپ کو آسانی سے انار کر کوڑے دان میں ڈال دیں۔

گوشت گلانے کے لیے

☆ اگر گوشت نہ گلے تو لہسن کے درمیان والی ڈنڈی دھو کر ڈال دیں گوشت فوراً گل جائے گا۔

کولڈ ڈرنک کو جلد ٹھنڈا کرنا

☆ کولڈ ڈرنک کی بڑی بوتل اگر جلد ٹھنڈی کرنی ہو تو اس کا ڈھکن کھولنے کے فوراً بعد مضبوطی سے ڈھکن بند کر کے فریڈر میں رکھ لیں بوتل جلد ٹھنڈی

ہاتھوں سے مرچ کی جلن دور کرنے کے لیے

☆ اکثر مرچیں پینے سے یا ہری مرچ کاٹنے سے ہاتھوں میں جلن پیدا ہو جاتی ہے اس جلن کو دور کرنے کے لیے تھوڑا سا نیل پانی میں ملا کر ہاتھوں پر لگائیں اور پانچ منٹ بعد دھو ڈالیں یا پانی میں تھوڑا تیل ڈال کر ہاتھوں پر ملیں۔

آٹے اور چینی کو چیونٹیوں سے بچانے کے لیے

☆ آٹے اور چینی کے مارتانوں میں چند لونگیں ڈال دینے سے سرخ چوٹیاں نہیں آئیں۔

تلنے کے دوران تیل کم خرچ کرنے کے لیے

☆ تیل میں تھوڑا سا سرکہ شامل کر دیا جائے تو پکوڑے اور دیگر پکوان تیل کم جذب کریں گے۔

تیل سے مچھلی کی بو ختم کرنے کے لیے

☆ چھلی تلنے کے بعد تیل کو قابل استعمال بنانے کے لیے اس میں لہسن کے دو چار جوے اچھی طرح جلا لیں مچھلی کی بو ختم ہو جائے گی۔

المونیم کے برتن سے جلی چیز دور کرنے کی

ترکیب

المونیم کے برتن میں اگر کوئی چیز پکاتے ہوئے جل کر چپک جائے تو اس برتن میں ایک پیاز کاٹ کر پانی میں ابالیں ایسا کرنے سے تھوڑی دیر بعد برتن سے جلا ہوا کھانا چھوٹ جائے گا اور برتن بالکل صاف ہو جائے گا۔

پھولوں کو زیادہ دیر تک تازہ رکھنا

☆ پھولوں کو زیادہ دیر تک تازہ رکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ گل دستے میں صابن کے فالتو ٹکڑے رکھ





کر استری سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس صورت میں استری کو آلو سے صاف کرنا چاہیے۔ استری تیز گرم کر کے کھروالے سوئی کپڑے پر فدرے دباؤ دے کر استری پھیری جائے۔ استری کی نچلی سطح صاف ہو جائے گی۔ استری کو میٹھے سوڈے کے محلول سے بھی صاف کیا جاسکتا ہے۔

گلاب کے پھولوں کو زیادہ پیدا کرنے کے لیے

☆ چائے کی پتیاں جو استعمال کی جا چکی ہوں ان کو گلاب کے پودے میں ڈالنے سے پھول بڑے اور تعداد میں زیادہ نکلیں گے اور خوشنما بھی ہوں گے۔ روزانہ ایسا کرنے سے بہتر اثر ہوگا۔

گلاب کے پھولوں کو بڑا کرنے کے لیے

☆ گلاب کے پھولوں کو بڑا کرنے کے لیے انڈے کے چھلکوں کو پیس کر گلاب کی کیاری میں ڈال دیں، پھول بڑے اور خوب صورت نکلے گے۔

اچار کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے

☆ اگر اچار خراب ہو رہا ہو تو اس میں لیموں کا عرق یا سرکہ ڈال دیں تو ان شاء اللہ خراب نہیں ہوگا۔

سرخ مرچیں باریک پینے کی ترکیب

☆ اگر سرخ ثابت مرچیں پیستے وقت ان کے بیج ثابت رہتے ہوں تو ان مرچوں میں ایک ٹیبل اسپون پکانے کا تیل ڈال کر پیسیں، مرچیں بالکل باریک پس جائیں گی۔

پانی کو جراثیم سے محفوظ کرنے کے لیے

☆ عام پانی کو پینے کے قابل بنانے کے لیے ڈیڑھ لیٹر پانی کی بوتل میں پانی بھر کے سورج کے سامنے رکھیں۔ تین سے چھ گھنٹے میں پانی ہر قسم کے جراثیم سے محفوظ

ہو جائے گی۔

خالص شہد کا پتہ لگانے کے لیے

☆ خالص شہد کا پتہ لگانے کے لیے روئی کو شہد میں قد کر کے جلائیں۔ اگر شہد اصلی ہوگا تو سارا جل جائے گا۔ اس کے علاوہ شہد کے چند قطرے زمین پر گر کر اکر دیکھیں۔ اگر اسے اٹھانا چاہیں اور یہ موتی کی شکل اختیار کر لیں اور ارد گرد نہ پھیلے تو بالکل خالص ہوگا، ورنہ ملاوٹ آمیز ہوگا۔

پتنگوں سے نجات کے لیے

☆ خصوصاً برسات کے موسم میں روشنی دیکھ کر بلب یا لائین وغیرہ کے قریب بست سے پتنگے یا برساتی کپڑے وغیرہ آجاتے ہیں اور بہت تنگ کرتے ہیں۔

ان کو بھگانے کے لیے بلب، لائین، لیمپ اور ٹیوب لائٹ وغیرہ کے قریب کچھ پیاز کاٹ کر رکھ دیا جائے، پتنگے برساتی کپڑے بھاگ جائیں گے۔

گوٹا کناری کی حفاظت کے لیے

☆ اگر آپ کے پاس گوٹا کناری کافی تعداد میں موجود ہے تو اس کی حفاظت کریں۔ ورنہ کالا پڑ سکتا ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ اسے مومی لفافے میں اچھی طرح بند کر کے رکھ دیں۔ اسی طریقے سے دوپٹے اور قمیص بھی جن پر سلمی ستارہ یا تلے کا کام کیا گیا ہو یا گوٹا کناری لگایا گیا ہو وہ ایک تو بھگنے سے بچائیں۔ ان کی تھیں الٹی کر کے لگائی جائیں۔ انہیں نمی اور ہوا سے بچانے کے لیے پلاسٹک کے لفافوں میں بند کر کے رکھا جائے، اس طرح یہ خراب ہونے سے بچے رہیں گے۔

استری کی سطح سے جلے کپڑوں کو صاف کرنا

☆ بعض اوقات ریشمی اور نائیلون کے کپڑے جل





دوٹی اسپون  
دوٹی اسپون  
تین نی اسپون

شہ  
غلیسرین  
کریم  
ترکیب :

ان تمام چیزوں کو ایک پیالے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں کہ ہر چیز کریم کے ساتھ یک جان ہو جائے۔ اب اس پیسٹ کو چہرے اور گردن پر لگالیں۔ تقریباً "پندرہ منٹ لگا رہنے دیں۔ پھر صاف پانی سے منہ دھولیں۔ اس سے جھریاں دور ہوں گی اور جلد شاداب ہو جائے گی۔

## مہندی بالوں کی حفاظت کے لیے

☆ ایک کپ مہندی لیں۔ اسے پانی میں گھول لیں۔ آدھے لیموں کا رس ملائیں، چار لونگس پیس کر شامل کریں۔ ایک انڈے کی زردی ملا دیں۔ دار چینی کا

ہو جائے گا۔ یہ پانی ایک ہفتہ تک پینے کے قابل رہے گا۔

## پالش سے جوتے چمکانے کی ترکیب

☆ جوتے چمکانے کے لیے پالش میں تھوڑا سا سرکہ ملا کر پالش کریں تو جوتے چمک اٹھیں گے۔

## بارش سے گیلا جوتا نرم کرنے کی ترکیب

☆ بارش میں جب جوتا بھیک جاتا ہے تو خشک ہونے پر سخت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ویزلین لگا کر اسے نرم کیا جاسکتا ہے۔

## رنگ کیسے بنائے جاتے ہیں

☆ آپ مندرجہ ذیل طریقوں سے اپنی مرضی کے رنگ بنا سکتی ہیں۔ مثلاً "نارنجی رنگ بنانے کے لیے سرخ رنگ میں زرد رنگ ملا یا جائے۔ سبز رنگ بنانے کے لیے نیلے رنگ میں زرد رنگ ملا یا جائے، بھورا رنگ بنانے کے لیے سبز اور سرخ رنگ کو ملا یا جائے۔ کانسٹی رنگ بنانے کے لیے سرخ رنگ کو پیلے رنگ میں ملائیں۔ انڈری رنگ کے لیے سبز اور سفید رنگ کو ملا یا جائے۔ سیٹی رنگ بنانے کے لیے کالے یا نیلے رنگ میں سفید رنگ ملانا چاہیے۔ گلابی رنگ بنانے کے لیے سرخ اور سفید کو ملا دیا جائے، بادامی رنگ بنانے کے لیے سفید اور پیلا رنگ ملا دیا جائے۔

## بالوں کو سفید ہونے سے بچانے کا طریقہ

سیکا کائی ماش کی دال اور میتھی باریک پیس لیں، پھر اس سفوف سے سردھویا جائے، نہ صرف بال سفید ہوتا بند ہو جائیں گے بلکہ جھڑیں گے بھی نہیں۔

## جھریاں ختم کرنے کے لیے

اشیاء :

ایک نی اسپون

بیس





## جکڑا آئینہ گھبراہٹ اور شکر



گی اور آنکھیں بے حد حسین اور پر تش معلوم ہوں گی۔

چہرے کے کڑھے دور کرنے کا طریقہ

☆ تھوڑی سی ملین مٹی لے کر عرق گلاب میں ملائیں۔ پھر چہرے پر تقریباً "پندرہ منٹ کے لیے لپ کر دیں۔ بعد میں مازے پانی سے منہ دھو لیں۔ چند دنوں میں کڑھے دور ہو جائیں گے۔

ہاتھوں کی صفائی

☆ اگر ہاتھوں پر میل وغیرہ جم جائے تو کیلے کے چھلکے بار بار گڑنے سے میل دور ہو جائے گا۔  
☆ گلیسرین میں چند قطرے لیموں کے رس کے ڈال کر ہاتھوں پر ملنے سے بھی ہاتھ صاف اور نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔

☆ نمائز کارس ہاتھوں پر ملنے سے بھی ہاتھ نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔

☆ نیتون کا تیل ملنے سے بھی ہاتھ صاف اور نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔

دانتوں کی پیلاہٹ دور کرنا

☆ ایک چمچ کھانے والا شٹھا سوڈا، نمک، سہاگہ لے کر کسی بوتل میں رکھ لیں۔ روزانہ اس سے دانت صاف کریں۔ دانتوں کی پیلاہٹ دور ہو جائے گی۔

☆ سرسوں کے تیل میں ایک چائے کا چمچ نمک ملا کر دانتوں پر لگانے سے دانت سفید ہو جاتے ہیں۔

☆ لیموں کے چھلکے سکھا کر پیس لیں۔ ان میں نمک ملا لیں۔ دانت روزانہ اس سے صاف کرنے سے تمام میل دور ہو جائے گا۔

سفید رنگ کرنے کا طریقہ

☆ کھیرے کا رس نکال لیں، چائے کا نصف چمچ، گلیسرین اور اتنا ہی عرق گلاب سب کو ملا کر لگانے سے

چھوٹا سا ٹکڑا پس کر آخر میں ملائیں اور مندی کو دو گھنٹہ کے لیے ڈھانگ کر رکھ دیں۔ سر میں اچھی طرح لگائیں۔ دو تین گھنٹے بعد مازے پانی سے سر دھو لیں، بعد میں شیمپو کریں عینہ میں ایک بار یہ عمل کریں۔

بال ملائم کرنے کے لیے

☆ نہانے سے پہلے بالوں میں تیل لگایا کریں تو بال ملائم ہو جائیں گے اور اس طرح ان کی جڑیں بھی مضبوط ہو جائیں گی۔



بھنڈیں گھنی کرنے کے لیے

☆ رات کو سوتے ہوئے بھوؤں پر روغن نیتون کی مالش کیجئے۔ اس سے بھنڈیں چند دنوں میں گھنی ہو جائیں گی۔ اکثر سوتے وقت، نیتون کا تیل پلکوں میں لگایا جائے، پلکیں بھی گھنی اور چمک دار ہو جاتی ہیں۔

پلکیں لمبی اور گھنی کرنے کے لیے

1۔ پلکوں کی جڑوں میں روغن کی مدد سے صاف شدہ کشر آئل لگائیے، اس سے پلکیں لمبی اور گھنی ہو جائیں گی۔

2۔ اصلی شہد اور کشر آئل دونوں برابر لیں اور کسی شیشی میں ملا کر رکھ لیں۔ روزانہ رات کو سوتے وقت پلکوں میں لگائیے۔ چند دنوں میں پلکیں لمبی ہو جائیں گی۔





## کارآمد گھریلو ٹوٹکے



چمک دار بنانے کے لیے ان پر لیموں کا رس ملیں صرف چند بار ایسا کرنے سے ناخن چمک دار ہو جاتے ہیں۔  
بال چمکیلے، لمبے اور گھنے کرنے کے لیے

☆ آملہ خشک، ہڑ خورہ، ریشھا اور بیری کے پتے ہم وزن لے کر چار تولہ پانی میں جوش دیں اور ٹھنڈا کر کے رکھ لیں۔ اس سے ہر میسرے روز بال دھونے سے بال لمبے اور سیاہ ہو جائیں گے۔

☆ سرسوں کی کھلی بھی بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔ سردھونے سے دو گھنٹے قبل پانی میں بھگی ہوئی سرسوں کی کھلی کا پانی نتھار کر سردھو میں۔

☆ بیری کے پتے لے کر انہیں چھنی کی طرح چاریک پیسیں۔ جھاگ نکال کر بیس منٹ تک سر میں خوب ملیں اور پھر سردھو ڈالیں۔ صابن کا استعمال نہ کریں۔ اس سے بال لمبے، چمکیلے اور گھنے ہو جائیں گے۔



### پھٹی ایریاں

☆ سر دیوں میں پھٹی ایریاں خاص طور پر تکلیف دیتی ہیں۔ ان سے نجات کا آسان حل یہ ہے کہ چار ٹیبل اسپون گلیسرین میں لیموں کا رس اور ایک چوتھائی پسی ہوئی پھنکری ملا لیں۔ دن میں تین بار یہ مرکب پھٹی ایریوں پر لگائیں، چند دنوں کے استعمال سے افاقہ ہو گا۔

رنگ صاف ہو جاتا ہے اور روزانہ رات کو سوتے وقت لگانے سے آہستہ آہستہ اس سے چہرہ ہلکا سا ہلیچ ہونا شروع ہو جائے گا۔

### ناخن کانیل دور کرنے کے لیے

☆ دروازہ بند کرتے ہوئے یا کسی چوٹ سے اگر انگلی کا ناخن نیلا پڑ جائے تو اس نیلاہٹ کو دور کرنے کے لیے قابل برداشت گرم پانی لیں اور اس میں دس منٹ تک ناخن کو ڈبو رکھیں تو نیلاہٹ دور ہو جائے گی۔

### ناخن لمبے کرنے کے لیے

☆ لہسن کا پانی لگانے سے ہی ناخن مضبوط ہو جاتے ہیں۔ آپ ناخن بڑھانا چاہتی ہیں تو لہسن کا پانی نکال کر رات کو سوتے وقت ناخن پر لگایا کریں۔ ایک ہفتہ یہ عمل کریں، آپ کے ناخن تیزی سے بڑھیں گے، ٹوئیں گے نہیں، اگر آپ کی جلد حساس ہے تو اس میں تھوڑا سا کسٹر آئل ملا لیں۔ اس سے خارش نہیں ہوگی۔

### ناخن ٹوٹنے کے لیے

☆ وٹامن سی کی ایک گولی ضرور کھائیں۔ ایک لیموں کا رس پانی میں ملا کر روز پیا کریں۔ چار لیموں لے کر ان کا رس نکالیں۔ اس میں تھوڑی سی پسی ہوئی پھنکری ملا لیں اور شیشی میں رکھ لیں۔ 20 منٹ کے لیے یہ محلول روئی ہے ناخن پر لگا خشک ہونے دیں اور پھر ہاتھ دھو لیں۔

### ناخنوں کو چمک دار بنانا

☆ جسمانی خوب صورتی میں ناخنوں کو بھی بڑا دخل ہے، لیکن اکثر خواتین ان پر زیادہ توجہ نہیں دیتیں۔ چمک دار ناخن بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ناخنوں کو





# کارآمد گھریلو ٹوٹکے



چھوڑنے سے پہلے پیٹ کے نیچے تکیہ رکھ کر اٹے ہو کر لیٹ جائیں، پندرہ منٹ تک اسی طرح لیٹی رہیں۔ چند ہفتوں میں پیٹ چھوٹا ہو جائے گا۔

ناف میں تیل لگانے کے حیرت انگیز فوائد

☆ سرکی خشکی، دماغ کی خشکی۔

☆ نسیان اور ضعیف دماغ

☆ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانا اور سر کا چکرانا

☆ حتیٰ کہ بعض مریضوں کی آنکھیں پک جاتی تھیں، لیکن جب یہ نسخہ استعمال کیا تو فائدہ ہوا۔

☆ ہونٹوں کا پکنا، خشکی کے مسائل ہونا، ہونٹوں کی سیاہی کے لیے اسی سیرنی نسخہ ہے۔

☆ ناف میں تیل کا لگانا نگاہ کو تیز کرتا ہے۔ جسم کی سستی مٹا دیتی اور ڈھیلے پن کو دور کرتا ہے۔

برسات کے موسم میں بستر اور گدوں کو نمی سے بچانے کے لیے

☆ برسات کے موسم میں بستر اور گدوں وغیرہ کو نمی اور سیلن سے بچانے کے لیے ٹالکم پاؤڈر استعمال کریں۔ اگر گدے پر تھوڑے سا ٹالکم پاؤڈر چھڑک کر اوپر بیڈ شیٹ بچھائی جائے تو وہ نمی سے محفوظ رہیں گے۔

چائے کی خوشبو میں اضافہ کرنا

☆ چائے خوشبودار ہو تو آدمی کو دل کو لبھاتی ہے اور اگر بد ذائقہ ہو تو کوئی بھی اسے پینا پسند نہیں کرتا۔ چائے کی خوشبو کو مزید تیز کرنے کے لیے آگ کے قریب کاغذ بچھا کر اس پر چند منٹ کے لیے چائے کی پتی بکھیر دیں۔ پھر اس سے چائے تیار کریں۔ چائے کی خوشبو میں اضافہ ہو جائے گا۔

فریزر میں پڑے ہوئے گوشت کو پکانا

☆ فریزر میں پڑا ہوا گوشت اگر جم جائے تو اسے پانی

کنگھے صاف کرنے کا طریقہ

☆ کنگھے میلے بہت بڑے لگتے ہیں۔ ویسے بھی کنگھے زیادہ میلے ہو جائیں تو جراثیم پیدا ہونے لگتے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ ہر 15 روز کے بعد کنگھوں کو دھونا چاہیے۔ ایک برتن میں پانی گرم کریں اور کسی تسلیے میں کنگھے ڈال دیں۔ اب کنگھوں پر سرف چھڑک دیں۔ کھولتا ہوا پانی کنگھے میں ڈالیں اور رکھ دیں۔ پانی نیم گرم رہ جائے تو آپ برش سے کنگھے صاف کریں۔ صاف پانی سے دھو کر تھوڑے سے پانی میں ڈینول کے چند قطرے ڈال دیں۔ اس میں کنگھے بھگو کر نکال لینے کے بعد دھوپ میں سکھالیں۔ کنگھے صاف ستھرے ہو جائیں گے۔

وزن میں جادوئی کمی لانے والی چائے

اشیاء :

چائے بنانے کے اجزاء۔

اسپنول

شہد

کلو نجی

آدھے لیموں کا جوس

کالی مرچ پیسی ہوئی

سیب کا سرکہ

پودینہ

چلی ساس

ترکیب :

☆ یہ سب چیزیں ایک گلاس نیم گرم پانی میں ملا کر چھ کپ چائے بنالیں۔ اور دن میں تقریباً "چھ بار" صبح ناشتا سے آدھا گھنٹہ قبل ایک کپ پھنوں اور باقی پانچ کپ وقفے وقفے سے پورا دن استعمال کریں۔

پیٹ چھوٹا کرنے کی ترکیب

☆ پیٹ چھوٹا کرنے کے لیے روزانہ صبح بستر





## کارآمد گھریلو ٹیپس



☆ رکھ دیں۔ خوشبو ہر طرف پھیل جائے گی۔  
تھرماس کی بدبودار کرنے کے لیے  
☆ تھرماس بدبودار ہو جاتا ہے، اگر تھرماس میں تھوڑا

سرکہ ڈال کر ہلا میں اور پھر ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں  
تو بدبودار ہو جائے گی۔

### بادام تازہ رکھیں

☆ بادام چند سال تک بالکل تازہ رکھنے کے لیے  
تقریباً ایک کھانے کا چمچ چینی اس برتن میں ڈال  
دیں۔ جس میں بادام رکھے ہوئے ہیں۔ بادام بالکل تازہ  
رکھیں گے۔

☆ ٹین کی چیزوں کا زنگ صاف کرنے کے لیے

☆ ٹین کی چیزوں سے زنگ صاف کرنے کے لیے  
واشنگ پاؤڈر میں پسا ہوا نمک ملا کر خوب رگڑ کر  
دھوئیں تو داغ دور ہو جائیں گے۔

### استری کے داغ

☆ استری کے نیچے براؤن داغ دور کرنے کے لیے ذرا  
ساٹو تھ پیسٹ مل دیں۔ تقریباً دس منٹ بعد جب  
ٹوٹھ پیسٹ سوکھ جائے تو صاف کپڑے سے پونچھ  
لیں۔

☆ استری جل جائے تو اس کے اوپر ہیکنگ سوڈا مل  
دیں۔ تھوڑی دیر بعد ریگ مال سے صاف کر لیں۔

### گوشت کی بساند دور کرنے کا حل

☆ گوشت میں اگر ہلکی سی خاص قسم کی بساند محسوس  
ہو تو ایک کھانے کا چمچ آٹے کی بھوسی پھڑک دیں اور  
دس منٹ بعد دھو لیں۔

### بوتلوں کی صفائی

☆ بوتلوں کی صفائی کے لیے بوتل میں تھوڑا سا

میں ہرگز نہ ڈالیں، بلکہ اسے اس وقت پڑا رہنے دیں  
جب تک وہ اپنی اصلی حالت پر نہ آجائے، مگر ننگہ پانی  
میں گوشت کی غذائیت کھو جاتی ہے۔

### ابلے ہوئے نرم چاولوں کو سخت کرنا

☆ اگر کبھی اتفاق پابے احتیاطی سے چاول زیادہ ابل  
جائیں اور نرم ہو جائیں تو گرم پانی نچوڑنے کے بعد  
چھلنی میں اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈال کر نچوڑ لیں۔ چاول  
سخت ہو جائیں گے۔

### روٹی کو نرم بنانے کے لیے

☆ اگر آٹے کو نیم گرم پانی سے گوندھ کر کچھ وقت  
کے لیے پڑا رہنے دیں تو روٹی نرم اور مزے دار بنے  
گی۔

### انڈے کا چھلکا با آسانی اتارنا

☆ اگر انڈے کا چھلکا با آسانی نہ اترتا ہو تو تھوڑا سا  
سرکہ لے اس پانی میں ڈال دیں، جس میں انڈا ابالا گیا  
ہو۔

### بلینڈر صاف کرنے کے لیے

☆ بلینڈر کو استعمال کرنے کے بعد صاف کرنے کے  
لیے اس میں اتنا پانی ڈالیں کہ وہ پانی کے اندر ڈوب  
جائیں۔ پھر اس میں صابن یا واشنگ پاؤڈر ڈال کر  
چلائیں۔ ایک منٹ کے بعد سارا پانی نکال کر اس کو دھو  
لیں اور خشک کر کے رکھ لیں۔

### ایر فریشنر بنانے کے لیے

☆ بازار میں قسم قسم کے ایر فریشنرز ملتے ہیں جو خاصی  
قیمت کے ہوتے ہیں۔ آپ خود بہت کم پیسوں میں  
اسے گھر پر اس طرح تیار کر سکتے ہیں کہ سفید سرکے  
میں یو کلیٹس کی پتیاں ڈال کر دو ہفتے کے لیے رکھ دیں،  
پھر چھان لیں اور سرکے کو پیالوں میں ڈال کر کمروں میں





## دسی سرجری

☆ جسم کے کسی حصے میں شیشہ چبھ جائے تو پیاز آدھا کاٹ کر توڑے پر ہلکا سا گرم کریں اور زخم پر باندھ لیں۔ ایک دو گھنٹے کے بعد پٹی کھول کر پیاز زخم سے ہٹالیں۔ شیشے کی نوک نظر آرہی ہوگی۔ پختی وغیرہ سے شیشہ نکال دیں۔

## گوشت پر مکھیاں نہ بیٹھیں

☆ سفید ممل کا ایک ٹکڑا لے کر اسے سرکہ میں پانی میں بھگو کر گوشت کے اوپر ڈال دیں۔ مکھیاں نہیں بیٹھیں گی۔

کچن کی ڈراز کو کیڑے مکوڑے سے بچانے کے لیے

☆ کچن کی درازوں میں اکثر کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان درازوں میں تیزپات کے پتے رکھ دیں تو کوئی کیڑا دراز کے اندر نہیں آئے گا۔

کپڑوں کی سفیدی قائم رکھنے کے لیے

☆ سفید کپڑوں کی پیلاہٹ دور کرنے کے لیے سوئی کپڑوں کو کھنگالتے وقت پانی میں لیموں کا رس ملا لیں اور پھر کپڑوں کو نیچوڑ کر سکھادیں۔ جبکہ ریشمی کپڑوں کی پیلاہٹ دور کرنے کے لیے انہیں کھنگالتے وقت پانی میں سفید سرکہ یا نمک ملائیں۔

میدہ، آٹا اور بیسن کو کپڑوں سے بچانے کے لیے

☆ میدہ، آٹا اور بیسن برسات میں جلد سیل جاتا ہے اور اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ ان چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کے برتن میں چند تیزپات کے پتے ڈال دیں۔ میدہ کو نمی اور سیلن سے بچانے کے لیے اس میں بلائنگ پیپر کا ایک ٹکڑا ڈال دیں تو میدہ نمی

واشنگ پاؤڈر اور ایک اینڈے کا چھلکا چل کر بوتل کے منہ میں ڈال دیں اور بوتل کو ہلائیں پھر یہ سب الٹ کر باہر نکال دیں اور دھو کر صاف کر لیں۔

آلوؤں کی مٹھاس ختم کرنے کے لیے

☆ اگر آلو زیادہ میٹھے ہوں تو انہیں چھیل کر نمک ملے پانی میں چند منٹ کے لیے بھگو دیں۔ اس طرح سے آلوؤں کی مٹھاس کم ہو جائے گی۔

## خراب گلہ کا علاج

☆ آج کل گلہ خراب ہونے کی شکایت عام ہے۔ اس کا بہت ہی آسان اور شرطیہ علاج یہ ہے۔ ایک انچ کا ادورک کا ٹکڑا چبائیں اور 30 منٹ تک کچھ نہ کھائیں اور پھر دیکھیں جاوولی اثر۔

نرم نمائش کو سخت بنانے کے لیے

☆ نمائش اگر بڑے بڑے بہت نرم ہو گئے ہوں تو ان کو نمک ملے پانی میں گھنٹہ بھر کے لیے ڈبو دیں سخت ہو جائیں گے۔

کافی یا چائے کو گرم کرنے کے لیے

☆ چائے کا قہوہ یا کافی اگر ٹھنڈی ہو جائے اور دوبارہ گرم کیا جائے تو ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے گرم کرنے کے لیے ایک پین میں پانی گرم کر کے چائے یا کافی دانی کو ابلتے پانی میں رکھ کر کچھ دیر گرم ہونے دیں۔ اس طرح ذائقہ خوشبو دونوں ہی قائم رہیں گے۔

ہلدی کا داغ دور کرنے کے لیے

☆ ہلدی کا داغ اگر کپڑوں پر لگ جائے تو ٹائری چھڑک کر صابن سے دھو لیں۔ ٹائری نہ ہو تو لیموں کا رس مل کر چند منٹ بعد سرف سے دھو لیں۔





☆ دیمک سے نجات پانے کے لیے مٹی کا تیل چھڑکنا چاہیے۔ اس سے دیمک فوراً ختم ہو جائے گی۔

پودوں کی جڑوں کو دیمک سے بچانا

☆ پودوں کی جڑوں میں بھی دیمک لگ جاتا ہے۔ اگر گھر میں لگائے گئے پودوں کی جڑوں یا کیاری میں دیمک داخل ہو جائے تو مٹی کا تیل چھڑک دینا چاہیے۔ راکھ کو چھان کر کیاری میں ڈالا جائے۔ اس طرح سے پودوں کو دیمک سے نجات حاصل ہوگی اور وہ سرسبز و شاداب رہیں گے۔

چیونٹیوں سے نجات کے لیے

☆ چیونٹیاں گھروں میں جگہ جگہ سوراخ بنا لیتی ہیں اور بہت ہی پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔ چنانچہ ان سے نجات پانے کے لیے ان کے بلوں پر مٹی کا تیل ایک چمچہ بھر کر ڈال دیا جائے تو چیونٹیوں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔

☆ جہاں چیونٹیاں بھگانا مقصود ہوں ہنگ رکھ دیں تو وہ بھاگ جائیں گی۔ ہنگ کی جگہ ہلدی جھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

چھپکلیوں سے نجات کے لیے

☆ گھروں کی کھڑکیاں، روشن دان اور دروازوں کی درزیں چھپکلیوں کا مسکن ہوتے ہیں۔ ان سے نجات

سے بچا رہے گا۔

ڈبل روٹی کے سلائس کاٹنے کے لیے

☆ چھری کو گرم پانی میں ڈبو کر اس سے سلائس کاٹنے جائیں تو آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔

گھر کو مکھیوں سے بچانے کے لیے

☆ پکن سے مکھیاں بھگانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پکن میں تازہ پودے کھلا رکھیں۔ اس طرح مکھیاں نہیں آئیں گی، گھروں میں تازہ پودے کی جڑیں کسی برتن کے اندر پانی میں بھگو کر رکھ دیں۔

کھٹل سے نجات

☆ سرخ مرچیں پانی میں ملا کر اسپرے کرنے سے کھٹل ختم ہو جاتے ہیں۔

☆ اجوائن پس لیں اور تیز گرم پانی میں ملا کر اسپرے کریں۔

☆ نیم کے تے رکھ دینے سے اور نیم کے پانی کا چھڑکاؤ دینے سے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

☆ فرنیچر کی خالی جگہوں پر پودے کی شاخیں ٹھونس دیں۔

☆ کھٹلوں سے نجات کے لیے نیلا تھو تھا، چونے کی قلعی ملا کر دیواروں اور سوراخوں میں بھر دیں۔

دیمک سے نجات







☆ میں ڈال کر ممل کا کپڑا بھگو کر صاف کرنا چاہیے۔

کچے رنگ کے کپڑوں کے لیے

☆ کچھ کپڑے ایسے ہوتے جن کا رنگ اس قدر کچا ہوتا ہے کہ انہیں پانی میں ڈالتے ہی ان کا رنگ نکلتا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو پانی میں ایک چھوٹا چمچہ پسلی ہوئی پھنکری یا ایک بڑا چمچہ پسلا ہوا نمک ڈال دیں تو کپڑے کا رنگ کم اترے گا۔

کریلے کی کڑواہٹ دور کرنا

☆ کریلا بہت کڑوا ہوتا ہے اسی بنا پر لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ اگر کریلے کی کڑواہٹ دور کرنی ہو تو کریلے کو کاٹ کر نمک لگا کر تین چار گھنٹے تک ردا رہنے دیں پھر اسے نچوڑ دیں کڑوا پانی نکل جائے گا اب صاف پانی سے دھو کر پکالیں کڑواہٹ نہیں ہوگی۔

ہچکی روکنے کے لیے

☆ بعض اوقات مسلسل ہچکی لگ جاتی ہے۔ تھوڑی سی چینی کھالینے سے آرام آ جاتا ہے۔  
گو بھی کی بودور کرنے کے لیے

☆ گو بھی کی بودور کرنے کے لیے پکاتے وقت اگر اس میں تھوڑا سرکہ ملا دیا جائے تو گو بھی کی ناگوار بودور ہو جائے گی۔

زعفران کی خوشبو تیز تر کرنے کے لیے

☆ زعفران کو اگر لیموں کے رس میں بھگویا جائے یا تھوڑے سے گرم پانی میں بھگویا جائے تو اس کی خوشبو اور اثرات زیادہ دیر پا ہوں گے۔

کوئلہ جلتے وقت کم خرچ ہو

☆ کوئلہ جلتے وقت تھوڑا سا نمک چھڑک دیا جائے تو کوئلے زیادہ دیر تک جلیں گے۔

پانے کے لیے ایسی جگہوں میں مثلاً "روشن دانوں میں انڈوں کے خول رکھ دیئے چاہیں۔ چنانچہ چھپکلیاں وہاں نہیں آئیں گی اور گھر چھپکلیوں کی آمدورفت سے محفوظ رہے گا۔

مکھیوں سے باورچی خانے کو محفوظ رکھنا

☆ باورچی خانے کو محفوظ رکھنے کے لیے جھار پونچھ کر کے پانی میں نمک اور کپڑے دھونے والا سوڈا ڈال کر گرم کریں اور اس سے فرش کو دھولیں۔ اس طرح گھی وغیرہ سے جمی ہوئی چکنائی صاف ہو جائے گی اور دیگر کپڑے مکھیاں وغیرہ بھی داخل نہ ہوں گے۔

بھڑوں کے چھتے ختم کرنا

☆ گندھک اور لسن کی دھونی دینے سے بھڑ مر جاتے ہیں اگر ان کے چھتوں پر مٹی کا تیل سرکہ ڈال دیا جائے تو وہ مر جاتے ہیں۔

پاؤں کا پسینہ کم کرنا

☆ اگر آپ کے پاؤں میں پسینہ بہت آتا ہے تو گرم پانی میں سرکہ یا لیموں کا عرق ڈال کر اس سے پاؤں دھوئیں۔

چمکتے ہوئے کھانے میں زہریلی چیز کا شک دور کرنے کے لیے

☆ کھانا پکاتے ہوئے اگر آپ کو شک ہو جائے کہ کھانے میں زہریلی کوئی چیز گر گئی ہے تو چمچہ سے مشکوک چیز لے کر آگ میں ڈال دیں اگر نیلے رنگ کے شعلے نکلیں تو سمجھ لیں کہ کھانا زہریلا ہو گیا ہے۔

سنگ مرمر کی آرائشی اشیاء کی صفائی

☆ یہ گندی ہو جائیں تو انتہائی بھدی لگتی ہیں۔ اس صورت حال میں امونیا کے چند قطروں کو نیم گرم پانی





## گھبراہٹ اور سستی دور کرنے کا نسخہ

☆ موسم گرما میں گھبراہٹ اور سستی محسوس ہوتی ہے اور کام کاج میں بھی دل نہیں لگتا۔ رات کو سوتے وقت یا صبح نہار منہ پودینے کی چائے بنا کر پیئیں سارا دن طبیعت ہشاش بشاش رہے گی۔

## نمک کی نمی دور کرنا

☆ نمک کی نمی دور کرنا مطلوب ہو تو نمک دانی میں چند دانے چاولوں کے ڈال دیں نمی دور ہو جائے گی۔

## اینٹی سپیشک ایجنٹ

☆ ایک گلاس پانی کو لوہے کی کڑاہی میں 20 منٹ تک ابالیں۔ آدھا چمچہ نمک ملا دیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو اس محلول کو ایک بوتل میں محفوظ کر لیں۔ یہ محلول ہلکی خراشوں اور معمولی زخموں کے لیے گھریلو ساختہ اینٹی سپیشک ایجنٹ کے طور پر فوری دستیاب ہوگا۔

## پانی کا کھار اپن دور کرنا

کنویں یا بورنگ کا پانی اکثر نمکین اور بھاری ہوتا ہے۔ اس کو ہلکا کرنے کے لیے آپ ایک بالٹی میں ایک چائے کا چمچہ بورک پاؤڈر اور ایک چائے کا چمچہ سرکہ ملا دیں۔ آپ آسانی سے نہانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

## لیموں کو محفوظ کرنا

جب لیموں سستے مل رہے ہوں تو زیادہ مقدار میں خرید لیں۔ تمام لیموں کا رس نکال کر اسے برف جمانے والی ٹرے میں جمالیں۔ جم جانے کے بعد یہ کیوبز نکال کر تھیلی میں ڈال کر فریژر میں رکھ دیں اور ضرورت کے مطابق ایک ایک کیوب نکال کر استعمال کریں۔

## بچے کے نمی رہشز کے آرام کے لیے

☆ بچے کو اگر نمی سے رہشز ہو جائیں تو آدھا حصہ سرسوں کا تیل اور آدھا حصہ پانی ملا کر لگائیں اور پیچھو باندھ دیں۔ دونوں کو اتنا ملانا ہے کہ تیل اور پانی کی رنگت دو دھیا ہو جائے۔

## گرمی دانوں سے نجات کے لیے

☆ بچوں یا بڑوں کو گرمی دانے نکل آئیں تو ایک پاؤ دہی، مکمل کے کپڑے میں باندھ کر لگادیں جب پانی بخڑ جائے تو جتنا ٹوٹھ پک کے سرے پر نیلا تھوٹھا آتا ہے اتنا اس میں ملا کر دانوں پر لگائیں۔ دو تین دفعہ لگانے سے ہی سکون آجائے گا۔

## بواسیر کے لیے

☆ تین قطرے روغن کلونجی اور تین قطرے روغن نیم ایک ایک سیون شمد میں ملا کر منہ میں رکھ کر اوپر سے پانی پی لیں۔ روزانہ استعمال کرنے سے بواسیر کو آرام آجائے گا اور وزن بھی کم ہوگا۔

## پھوڑے کا منہ بنانے کے لیے

☆ بعض اوقات ایسا پھوڑا نکل آتا ہے جس کا منہ نہیں بنتا اور وہ سخت تکلیف دیتا ہے، ایسے میں پتھر حٹ (ایک بودا) کا ایک پتالے کر اور سرسوں کا تیل اچھی طرح لگا کر توڑے پر دونوں طرف سے گرم کر کے پھوڑے پر باندھ دیں۔ اگر صبح لگایا ہے تو شام کو دوسرا باندھیں۔ ان شاء اللہ تین سے چار دفعہ کرنے سے منہ بن کر پھوٹ جائے گا۔

## سردی سے آواز بیٹھ جائے تو

☆ اگر سردی سے آواز بیٹھ جائے تو اس صورت میں تھوڑا سا اورک لے کر اس پر نمک لگا کر کھائیں۔ آواز ٹھیک ہو جائے گی۔





## آنکھوں کی کمزوری

آنکھوں کی نظر کمزور ہو تو ایک کپ خشخاش دھو کر سکھالیں۔ اس میں آدھا کپ بادام، آدھا کپ سونف، آدھا کپ سوکھا دھنیا اور مصری ملا کر پیس لیں اور صبح شام ایک کپ دودھ کے ساتھ ایک چمچ کھالیں۔ ان شاء اللہ کچھ ہفتوں میں نمایاں بہتری ہوگی۔

## لبے مکالے اور گھنے بال

ایک پیالی پانی میں لیموں کا رس نکال کر اس میں آٹے کا سفوف ڈال کر حل کر لیں۔ یہ آمیزہ بالوں پر لگانے سے بال لبے مکالے اور گھنے ہو جائیں گے۔

## اوون صاف کرنا

اوون صاف کرنے کے لیے گرم پانی اور ویکنگ پاؤڈر کا آمیزہ بنا کر رکھ لیں جب بھی اوون صاف کرنا ہو اسفنج کے ساتھ یہ آمیزہ لگا کر دھبوں کو صاف کر لیں دھبے آرام سے صاف ہو جائیں گے۔

سبزیوں کے وٹامن ضائع ہونے سے بچائیں سبزیوں کو یا جنوں وغیرہ کو ابالتے وقت اگر پند قطرے ناریل کا تیل ڈال دیا جائے تو وٹامن ضائع ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

## لسن زیادہ دیر محفوظ کرنا

لسن کو اگر لبے عرصے تک محفوظ اور تازہ رکھنا ہو تو سارے لسن کو چھیلے اور ایک درمیانے سائز کے شیشے کے جار کے اندر ڈال دیں۔ اس کے بعد جار میں اتنا زیتون کا تیل ڈالیں کہ تمام لسن کے جوئے مکمل طور پر اس سے ڈھک جائیں۔ پھر جار کو اچھی طرح بند کر کے فریج میں رکھ دیں۔

## سرسوں کے تیل کی سطح پر جھاگ ختم کرنا

اکثر لوگ جب سرسوں کے تیل میں کوئی چیز فرائی کرتے ہیں تو اس پر بہت سا جھاگ آجاتا ہے۔ اس جھاگ کو ختم کرنے کے لیے سرسوں کے تیل کو اچھی طرح گرم کریں اور فرائی کرنے سے پہلے لسن کے پانچ یا چھ جوئے تیل میں ڈال کر انہیں اچھی طرح سے جلا کر نکال دیں۔ اب اس میں کچھ بھی فرائی کر لیں۔ بار بار کے استعمال کے باوجود بھی تیل پر جھاگ نہیں آئے گی۔

## بچے ہوئے صابن کا استعمال

بچے ہوئے صابن کے ٹکڑوں کو کسی پرانے موزے میں جمع کر لیں۔ قمیص کے کانر اور کف دھوتے وقت اسے رگڑیں تو وہ جلدی صاف ہو جائیں گے۔

## جائفل کو محفوظ رکھنا

جائفل کو زیادہ عرصے محفوظ رکھنا ہو تو چونے کے پانی میں کچھ دیر کے لیے بھگو دیں۔ پھر نکال کر خشک کر لیں۔ کپڑے مکوڑوں سے محفوظ ہو جائے گا۔

## ہری سبزیوں کا رنگ برقرار رکھنا

مٹریا پالک جب تک جاتی ہیں تو ان کا رنگ سبز کے بجائے پیلا یا گہرا ہو جاتا ہے اس کے لیے ابالتے وقت ایک چمکی کھانے کا سوڈا ڈال دیں۔ سبزیاں ہرے رنگ کی ہی رہیں گی۔

## اروی کی جلن دور کرنا

اروی پھیلنے اور کانٹے کے بعد ہاتھ دھو کر اگر ان پر آدھا لیموں کاٹ کر رگڑ لیا جائے تو خارش فوراً ختم ہو جاتی ہے۔

## جلی ہوئی دال یا سبزی کی بودا دور کرنا





# کارآمد گھریلو ٹیپس



دیں 'مرج' کم ہو جائے گی۔

آنکھوں کی سرخی دور کرنے کے لیے

بکری کے دودھ میں روئی کے پھاسے بھگو کر آنکھوں پر رکھیں، چند یوم ایسا کرنے سے آنکھوں کی سرخی دور ہو جائے گی۔

گوشت کی بودور کرنا

اگر گوشت دانے کپڑے کو سرکہ اور پانی سے تر کر دیا جائے اور گوشت اس میں لپیٹ کر رکھا جائے تو بو نہیں آئے گی۔

منہ کی بدبودور کرنے کے لیے

رات کو منہ صاف کریں اور ادھک کا ایک انچ کا ٹکڑا منہ میں چبائیں اور کوشش کریں یہ رس ایک منٹ منہ میں رہے اس کے بعد پانی نہ دوشاؤ۔ صبح دیکھیں بو نام کی چیز کو نہیں پائیں گے۔ اگر یہ عمل ہر کھانے کے بعد کریں تو تمام دن منہ کی بو آپ کے قریب بھی نہیں بھٹکے گی اور آپ کا پیٹ بھی کبھی خراب نہیں ہوگا۔

جلد کی نکھار کے لیے

ایک لیموں میں دو چھوٹے سوراخ کر لیں اور اس میں مصری کے چھوٹے ٹکڑے ڈال دیں۔ پھر سلور فوٹل میں لپیٹ دیں۔ اب لیموں کو تقریباً 30 سیکنڈز کے لیے چولہے پر رکھیں اور پھر ٹھنڈا کر کے فریج میں رکھ دیں استعمال کرتے ہوئے اس کے ایک سے دو قطرے منہ پر لگائیں اور ایک منٹ بعد دھو لیں۔

بچوں کے قبض کے لیے

اگر چھوٹے بچے ہوں تو تھوڑی ہنگ لے کر ایک چائے کا چمچہ گرم پانی میں گھول لیں۔ پھر بچے کی ناف پر

پکاتے ہوئے اگر دال یا سبزی کچھ جل گئی ہو تو اس میں زبرے اور نمائز کا بگھار ڈال دیں۔ جلنے کی بودور ہو جائے گی بلکہ بالکل نہیں آئے گی۔

بیگن کا چھلکا اتارنے کے لیے

بیگن کا بھرتہ بنانے سے پہلے بیگن کے اوپر تیل لگالیں تو چھلکے آرام سے اتر جائیں گے۔

آنکھوں کو چونے سے بچانے کے لیے

آنکھ میں اگر چونے کی چھینٹ پڑ جائے تو تھوڑی سی پھٹکری پانی میں گھول کر آنکھوں میں پانی ڈالیں۔ اس سے جلن اور کھٹک دور ہو جائے گی۔

مسور کی دال جلد گلانے کے لیے

مسور کی دال پکاتے وقت اگر اس میں ہلدی یا گھی شروع میں ہی ڈال دیں تو اس سے دال جلدی گل جائے گی۔

پاؤں صاف رکھنے کے لیے

گرم پانی میں دو چمچے سرکہ ڈال کر اپنے پاؤں پندرہ منٹ کے لیے پانی میں ڈال دیں۔ یہ عمل ہفتہ میں ایک مرتبہ دو ہر امیں۔ پاؤں اتنے صاف ہو جائیں گے کہ جیسے کبھی زمین پر اترے ہی نہیں۔

کچے رنگ پکے کرنے کے لیے

جو کپڑے رنگ چھوڑتے ہیں انہیں کچھ دیر کے لیے ملانی مٹی میں بھگو دیں۔

سالن میں تیز مرچوں کو کم کرنے کے لیے

اگر مرج تیز ہو جائے تو ایک پیاز براؤن کر کے اخبار

پر پھیلا دیں، تھوڑی دیر میں خستہ ہو جائے گی ہاتھ سے چیل کر سالن میں ڈال دیں اور ایک لیموں کا رس ڈال



لگا کر لسی نرم کپڑے سے سکائی کریں۔

ایک عدد گول بیٹن کے چار حصوں میں برابر تقسیم کر کے ایک دیکھی میں سیر بھر پانی اباں لیں۔ جب پانی نیم گرم رہ جائے تو اس سے دونوں پیروں کو دھو لیں۔

ایک دفعہ عمل کرنے سے ایک سال تک پیروں سے بدبو نہیں آئے گی۔ اگر عمل کو ایک ہفتہ پابندی سے کریں تو پیروں سے بدبو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

ہاتھوں کی مہندی کارنگ گہرا کرنے کے لیے

ہاتھوں میں لگی مہندی کارنگ گہرا کرنے کے لیے ہاتھوں پر سے مہندی اتارنے کے بعد دونوں ہاتھوں میں سرسوں کا تیل لگالیں۔ تھوڑی دیر بعد رنگ میں گہری چمک آجائے گی۔

بیگ کی زپ صحیح کرنے کے لیے

آپ کے پرس، قمیص یا پتلون وغیرہ کی زپ اگر خراب ہو کر پھنستی ہو تو اس پر موسم رگڑ دیں۔ زپ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

الرجی کے لیے

جب چھینکوں کا سلسلہ شروع ہو جائے اور ناک سے بے تحاشا پانی بہے تو سفیدے کے چار پارچے سبز پتے لے کر ہتھیلیوں پہ مسلیں پھر ان ہتھیلیوں کو ناک

اگر بڑے بچے ہوں تو ایک منقہ لے کر آدھی پیالی گرم پانی میں ہلکا سا پکائیں۔ پھر رات کو سونے سے پہلے بچے کو منقہ کھلا کر یہی پانی بھی پلا دیں مگر خیال رہے کہ اس کے بعد کوئی اور چیز نہ کھائیں۔

شہد کی مکھی کے زہر سے بچاؤ کے لیے

اگر شہد کی مکھی کاٹ لے تو اس پر پیاز رگڑیں۔ مکھی کے کاٹے کا زہر ختم ہو جائے گا۔

بیٹھی آواز کو درست کرنے کے لیے

اگر آواز بیٹھ جائے تو گڑا ل کر چاول پکائیں۔ رات کو خوب پیٹ بھر کر کھائیں اور کچھ دیر بعد پانی کے دو گھونٹ پی لیں۔ دو تین دن ایسا کرنے سے آواز کھل کر سرری ہو جائے گی۔

کپڑے دھوتے وقت صابن کم خرچ کرنے کے لیے

کپڑوں کو دھونے سے پہلے گرم پانی میں تھوڑی پھٹکری اور چاک کا چورا ڈال دیں۔ یوں صابن کم لگے گا، کپڑے بھی اچلے دھلیں گے۔

پیروں کی بدبو سے نجات کے لیے





کے قریب لے جا کر لیے لیے سانس لیں، تقریباً "پندرہ منٹ ایسا کریں یہ ہی عمل چار یا پانچ دن مسلسل کریں۔

## خونی و بادی بوا سیر کے لیے

بادی و خونی بوا سیر کے لیے شہد خالص لے کر اس کے ساتھ سفوف کرنبوہ ایک ماشا ملا کر چائیں، دوسرے روز دو ماشے، تیسرے روز تین ماشے حتیٰ کہ گیارہ ماشے شہد میں ملا کر چائیں۔ بارہویں روز ایک ماشا گھٹا کر چائیں۔ یعنی دس ماشے تیرہویں روز نو ماشے، چودھویں روز آٹھ ماشے، پندرہویں روز سات ماشے، سولہویں روز چھ ماشے، سترہویں روز پانچ ماشے، اٹھارویں روز چار ماشے، انیسویں روز تین ماشے، بیسویں روز دو ماشے اور اکیسویں روز ایک ماشے چائیں۔ ان شاء اللہ خونی بوا سیر ختم ہو جائے گی۔

## جوڑوں کے درد کے لیے

کدو کش کی ہوئی تازہ اور ک کو ایک پیالی ابلتے ہوئے پانی میں ملا کر پینے سے گھٹیا کا درد ختم ہو جاتا ہے اور طبیعت میں تازگی آ جاتی ہے۔ تھرماس میں چائے کی طرح بنا کر رکھ لیں اور دن میں تین دفعہ استعمال کریں۔

## منہ کے چھالے دور کرنے کے لیے

منہ میں اگر چھالے پڑ جائیں تو دو تولہ سہاگہ پیس کر ایک تولہ گلیسرین میں ملا میں، پھر پانچ تولہ شہد میں حل کر لیں اور انکی سے صبح و شام چھالوں پر لگائیں، ایک دن میں چھالیں دور ہو جائیں گے۔

شرٹس پر لگے بٹنوں کو مضبوط کرنے کے لیے شرٹس پر لگے ہوئے بٹن ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ٹرانسپورٹ نیل پالش لے کر اسے عین اس جگہ

لگا دیں جہاں سے بٹن کو سیا جاتا ہے۔ پھر اسے اچھی طرح خشک ہونے دیں۔ اس کے بعد اس طرح ایک اور کوٹ لگائیں اور اسے بھی مکمل خشک کر لیں۔ اب آپ کے بٹن ٹوٹ کر نہیں گریں گے کیونکہ نیل پالش دھاگوں کو مضبوطی سے ایک جگہ جمادے گی۔

## سوئی کو زنگ سے بچانے کے لیے

سوئی دھاگے کی ضرورت ہر گھر میں رہتی ہے، لیکن کراچی کی نم آلود فضا میں سوئیاں بہت جلد زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ اپنی سوئیں کو زنگ سے بچانے کے لیے انہیں سیاہ رنگ کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھیں۔ ان پر کبھی زنگ نہیں لگے گا۔

## مٹر کو دیر تک محفوظ کرنے کے لیے

مٹر چونکہ صرف سردیوں میں ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ اس لیے مٹر محفوظ کرنے کے لیے انہیں چھیل کر کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیں۔ اگر پانچ کلو مٹر ہوں تو ایک کھانے کا چمچہ چینی اور دو کھانے کے چمچے سفید سرکہ ڈال دیں۔ چند منٹ بعد چھلتی میں ڈال کر پانی نکال دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر محفوظ کر دیں۔

جینز کا رنگ خراب ہونے سے بچانے کے لیے

جینز کا رنگ خراب ہونے سے بچانے کے لیے ایک بالٹی پانی میں چار کھانے کے چمچے سرکہ ڈالیں اور اس پانی سے جینز دھوئیں۔

## ہونٹوں کی سیاہی دور کرنے کے لیے

اگر آپ کے ہونٹ سیاہی مائل ہوتے جا رہے ہیں تو ایک چائے کا چمچہ جو کا آٹا، ایک چائے کا چمچہ نمائز کا رس اور ایک چائے کا چمچہ شہد لے کر مکس کریں اور پورے چہرے کے علاوہ ہونٹوں پر بھی اس کا لپ





## گھریلو ٹیپس



پین میں تھوڑا نمک چھڑک دیں اور پھر اس میں انڈا توڑ کر ڈالیں۔ انڈا فرائی کرنا ہو تو تیل کو زیادہ گرم نہیں کرنا چاہیے۔

لریں۔ آدھے گھنٹے بعد گیلی انگلیوں کی مدد سے آہستہ آہستہ دائروں کی صورت میں اتار دیں۔ اس عمل کو روزانہ دہرانے سے آپ کا چہرہ چمک اٹھے گا اور ہونٹ قدرتی گلابی نظر آنے لگیں گے۔

برمھا ہوا پیٹ کم کرنے کے لیے

حسب ضرورت لوکی، سفید زیرہ، کڑی پتا اور نمک ڈال کر پانی ابالیں، صبح اسے نہار منہ پھیں۔ اس سے برمھا ہوا پیٹ کم کرنے میں مدد ملے گی۔

عینک کے شیشے صاف کرنے کے لیے

اگر عینک کے شیشے پر داغ پڑ جائیں تو بجھا ہوا جوتایا چاک پانی میں بھگو کر اس پانی سے عینک کے شیشے صاف کریں۔ عینک چمک جائے گی۔

پودوں میں پھول زیادہ اگانے کے لیے

موتھے یا چنبیلی کے پودے میں پھول زیادہ لانے کے لیے کسی یا دودھ والی دیکھی دھو کر اس کا پانی کلمے میں ڈالیں۔

پودوں کی حفاظت کے لیے

پودے جلنے لگیں، جڑوں کو کیرا لگ جائے یا مرجھانے لگیں تو تھوڑے سے پانی میں آدھا چمچہ رائی کا گھول کر گملوں یا کیاریوں میں ڈال دیں۔



گردے کی پتھری دور کرنے کے لیے

گردے میں اگر پتھری ہے تو اس کے اخراج کے لیے بھٹے کے بالوں کو پانی میں ابالیں اور یہ جوشاندہ دن میں تین بار استعمال کریں۔ اس سے پیشاب کی نالی کی جلن بھی دور ہوگی۔

آئی ماسک تیار کرنے کے لیے

آئی ماسک تیار کرنے کے لیے ایک کچے آلو کو کش کریں اور پیچھے کی مدد سے دبا کر اس کا جوس نکال لیں۔ اس جوس میں استعمال شدہ فی بیگز کو بھگوئیں اور انہیں دس سے پندرہ منٹ کے لیے آنکھوں کے نیچے رکھ لیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔

ہارمون کی خرابی کی وجہ سے موٹاپا دور کرنے کے لیے

ایک لیٹر کریلے کے جوس میں ایک پاؤ کالے پنے بھگو کر توڑے پر بھون لیں۔ جب سوکھ جائیں تو اس میں ایک کپ میٹھی دانہ، ایک کپ سونف ڈال کر اتنا پکا میں کہ بالکل خشک ہو جائے۔ پھر اس کو پیس کر پاؤڈر بنالیں۔ دن میں دو مرتبہ صبح و شام استعمال کریں۔

اندھے کی زردی کو ٹھٹھنے سے بچانے کے لیے

اکثر جب انڈا فرائی کیا جاتا ہے تو وہ فرائی پین کے پینڈے سے چپک جاتا ہے اور پلیٹ میں نکالتے ہوئے زردی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کا ٹوکا یہ ہے کہ فرائی